BAUR111CCT

تاریخ ادب اُردو

(دکنی دور تا ترقی پسند تحریک)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

برائے

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے)

(پہلا سمسٹر)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

©Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course : Bachelor of Arts

ISBN: 978-93-80322-92-6

Edition: June, 2021

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	جون، 2021
تعداد	:	3000
قیمت	:	170/-
ترتیب وتزئین	:	ڈاکٹر محمد نہال افروز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
مطبع	:	کرشک پرنٹ سولیوشنس، حیدرآباد

تاریخ ادب اردو

(دکنی دور تا ترقی پسند تحریک)

TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

(DECCANI DAUR TA TARAQQI PASAND TAHREEK)

For B. A. 1st semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublication@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 **Website:** manuu.edu.in

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

مجلسِ ادارت

پروفیسر ابوالکلام

پروفیسر مع ڈائرکٹر

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس

صدر شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

پروفیسر نکہت جہاں

پروفیسر (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر ارشاد احمد

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد نہال افروز

گیسٹ فیکلٹی (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد اکمل خان

گیسٹ فیکلٹی (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد-32، تلنگانہ، بھارت

کورس کوآرڈی نیٹر

ڈاکٹر ارشاد احمد

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)، نظامتِ فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	**اکائی نمبر**
ڈاکٹر میر محبوب حسین، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی	اکائی 1,8
ڈاکٹر ارشاد احمد، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 2,3,4
پروفیسر علیم اشرف، شعبۂ عربی، مانو / پروفیسر عزیز بانو، شعبۂ فارسی، مانو	اکائی 5
ڈاکٹر عرشیہ جبیں، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی	اکائی 6
ڈاکٹر نشاط احمد، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی	اکائی 7
ڈاکٹر بی بی رضا خاتون، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 9
پروفیسر نکہت جہاں، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 10,11
پروفیسر نسیم الدین فریس، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 12
ڈاکٹر محمد شمس الدین، ڈائرکٹوریٹ آف ایڈمیشن، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 13
پروفیسر محمد ظفر الدین، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 14
ڈاکٹر مسرت جہاں، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 15,23,24
ڈاکٹر محمد اکمل خان / ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 16
ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 17,19
ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی / ڈاکٹر محمد نہال افروز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 20
پروفیسر مجید بیدار، سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ	اکائی 18
ڈاکٹر عبدالغنی، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 21
پروفیسر ندیم احمد، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ	اکائی 22

پروف ریڈرس:

اول : ڈاکٹر محمد نہال افروز

دوم : ڈاکٹر محمد اکمل خان

فائنل : ڈاکٹر ارشاد احمد / پروفیسر نکہت جہاں

سرِ ورق : ڈاکٹر محمد اکمل خان

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	07
پیغام	ڈائرکٹر	08
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	09

بلاکI : اردو زبان کا آغاز وارتقا

اکائی1	ہند آریائی کا ارتقا	11
اکائی2	مغربی ہندی اوراس کی بولیاں	26

بلاکII : اردو زبان کے آغاز وارتقا کے نظریات

اکائی3	اردو کی ابتدا سے متعلق غیر ماہر لسانیات کے نظریات (سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی، نصیرالدین ہاشمی)	41
اکائی4	اردو کی ابتدا سے متعلق ماہر لسانیات کے نظریات: (ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مسعود حسین خاں)	56

بلاکIII : اردو ادب کے آغاز کا سماجی وتہذیبی پس منظر

اکائی5	ہند عرب اور ہند ایران تعلقات	71
اکائی6	شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی اور تہذیبی پس منظر	86
اکائی7	جنوبی ہند میں اردو ادب کا سماجی اور تہذیبی پس منظر	101
اکائی8	اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	116

بلاک IV : دکنی ادب کا آغاز وارتقا

اکائی 9	بہمنی دور میں اردو ادب	131
اکائی 10	عادل شاہی دور میں اردو ادب	146
اکائی 11	قطب شاہی دور میں اردو ادب	161
اکائی 12	ولی اور سراج کا عہد	176

بلاک V : شمالی ہند میں شعر وادب کا ارتقا

اکائی 13	دبستان دہلی	191
اکائی 14	دبستان لکھنؤ	206
اکائی 15	شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل	221

بلاک VI : ادارے، رجحانات اور تحریکات

اکائی 16	فورٹ ولیم کالج	236
اکائی 17	قدیم دہلی کالج	251
اکائی 18	جامعہ عثمانیہ	266
اکائی 19	علی گڑھ تحریک	281
اکائی 20	اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات	296
اکائی 21	رومانی تحریک	311
اکائی 22	اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات	326
اکائی 23	ترقی پسند تحریک	341
اکائی 24	اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات	356

نمونہ امتحانی پرچہ **371**

پیغام

وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے جس ایکٹ کے تحت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے اُس کی بنیادی سفارش اُردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو ایک طرف اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد بناتا ہے تو دوسری طرف ایک امتیازی وصف ہے، ایک شرف ہے جو ملک کے کسی دوسرے اِدارے کو حاصل نہیں ہے۔ اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ بھی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت رسائل و اخبارات کی اکثریت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہماری یہ تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج آج کے دور کے اہم ترین علمی موضوعات چاہے وہ خود اُس کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، وہ جن مشینوں اور آلات کے درمیان زندگی گزار رہا ہے اُن کی بابت ہوں یا اُس کے گرد و پیش اور ماحول کے مسائل ہوں۔ وہ ان سے نابلد ہے۔ عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے جس کا مظہر اُردو طبقے میں علمی لیاقت کی کمی ہے۔ یہی وہ مبارزات (Challanges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح کی اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ہی اُردو ہے اور اس میں علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمے داری ہے۔ چوں کہ اسی مقصد کے تحت اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔ احقر کو اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمے داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور قلم کاروں کے بھرپور تعاون کے نتیجے میں کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کے بعد اِس کے ذمے داران، عام اردو قارئین کے لیے بھی علمی مواد، آسان زبان میں تحریر کرا کے کتابوں کی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کریں گے تا کہ ہم اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں۔

پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ
وائس چانسلر، انچارج

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیغام

آپ تمام بخوبی واقف ہیں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا باقاعدہ آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا تھا۔ 2004 میں باقاعدہ روایتی طرزِ تعلیم کا آغاز ہوا۔ متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی (UGC-DEB) اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہٗ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بند کر کے خود اکتسابی مواد (SLM) از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھے بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفیض ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ اِس طرح سے یونیورسٹی نے روایتی طریقۂ تعلیم سے پہلے فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے اردو آبادی تک تعلیم پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے پہل یہاں کے تدریسی پروگراموں کے لیے امبیڈکر یونیورسٹی اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے نصابی مواد سے من وعن یا ترجمے کے ذریعے استفادہ کیا گیا۔ اِرادہ یہ تھا کہ بہت تیزی سے اپنا نصابی مواد تیار کرالیا جائے گا اور دوسری یونیورسٹیوں کے مواد پر انحصار ختم ہو جائے گا، لیکن اِرادہ اور کوشش دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو پائے، جس کی وجہ سے اپنے خود اکتسابی مواد کی تیاری میں اچھی خاصی تاخیر ہوئی۔ بالآخر منظّم اور جنگی پیمانے پر کام شروع ہوا، جس کے دوران میں قدم قدم پر مسائل پیش آئے۔ مگر کوششیں جاری ہیں، نتیجتاً بہت تیزی سے یونیورسٹی نے اپنے نصابی مواد کی اشاعت شروع کر دی ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور 5 ذیلی علاقائی مراکز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی) کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ ڈی ڈی اِی نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر ابوالکلام

ڈائرکٹر، نظامتِ فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے طلبا کی تعلیمی ضرورت کے پیش نظر اردو زبان و ادب کے موضوع پر درسی مواد تیار کیا ہے۔ یہ مواد بی اے سال اول کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے، تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبا کے لیے دوران تعلیم ایک نظام تعلیم سے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

اس ہدایت کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جا رہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا ہے۔ یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی۔ اس لیے نئے نصاب کے مطابق نئی اکائیاں لکھوانے کے علاوہ پرانے تحریر شدہ مواد کا کچھ حصہ بھی ضروری ترامیم اور اضافے کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا گیا۔ اس درسی مواد کی تیاری میں اردو ادب کے تقریباً تمام اہم موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعہ تیار ہونے والے اس درسی مواد میں ایک معیاری، ہمہ گیر اور اردو ادب کے پورے کورس کا احاطہ کرنے کوشش کی گئی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ اردو ادب کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوگی بلکہ اردو ادب کے مختلف موضوعات پر قابل قدر تحریری مواد بھی دستیاب رہے گا۔ اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ مضامین میں ایسی ترتیب اختیار کی گئی ہے، جو روایتی اور فاصلاتی تعلیم کی ضرورت بیک وقت پوری کر سکے۔ ہر اکائی کے تحت اپنی معلومات کی جانچ، اکتسابی نتائج، کلیدی الفاظ، نمونہ امتحانی سوالات اور مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں بھی دی گئی ہے۔ امید ہے یہ معلومات طلبا کے لیے بے حد معاون ہوں گی۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی اے اردو کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ پہلے سمسٹر کے اس پرچے کا عنوان ''تاریخ ادب اردو (دکنی دور تا ترقی پسند تحریک)'' ہے۔ اس پرچے میں کل چھ ابواب ہیں، جنھیں چوبیس اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ طلبا کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی معلومات میں اضافے کا باعث بھی بنے۔

میں بحیثیت کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر محمد نہال افروز اور ڈاکٹر محمد اکمل خان کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو نصاب کے عین مطابق بہت عمدگی کے ساتھ زبان اور مضمون کا خیال رکھتے ہوئے ایڈیٹنگ اور ترتیب و تزئین کا کام نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

اب نئی صورت میں یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی بیش قیمت آرا ہمیں اس کتاب کو مزید بہتر، کارآمد اور مفید بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر ارشاد احمد

کورس کوآرڈی نیٹر

تاریخ ادب اُردو

(دکنی دور تا ترقی پسند تحریک)

بلاک I: اُردو زبان کا آغاز و ارتقا

اکائی 1 : ہند آریائی کا ارتقا

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید
1.1 مقاصد
1.2 ہند آریائی کا پس منظر
1.2.1 ہندوستان کے قدیم باشندے
1.2.2 آریاؤں کی آمد
1.3 ہند آریائی کا ارتقا
1.3.1 زبانوں کی گروہ بندی
1.3.2 ہند آریائی کے ادوار
1.4 قدیم ہند آریائی دور
1.4.1 ویدک سنسکرت
1.4.2 کلاسیکل سنسکرت
1.5 وسطی ہند آریائی دور
1.5.1 پالی
1.5.2 پراکرت
1.5.3 اپ بھرنش
1.6 جدید ہند آریائی دور
1.6.1 جدید ہند آریائی زبانیں
1.6.2 جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی
1.6.3 جدید ہند آریائی اور اردو
1.6.4 اردو کا ہند آریائی پس منظر
1.6.5 اردو کی لسانی ساخت، ڈھانچے اور کینڈے پر ہند آریائی عناصر کے نقوش

1.7 اکتسابی نتائج

1.8 کلیدی الفاظ

1.9 نمونۂ امتحانی سوالات

1.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.0 تمہید

دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ان میں سے بعض زبانوں میں یکسانیت ہوتی ہے اور بعض میں اختلاف ہوتا ہے۔ان زبانوں کو یکسانیت اور اختلاف کی بنیاد پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔زبانوں کے ان خاندانوں میں ہند یوروپی خاندان نمایاں حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ ہند یوروپی خاندان کی جن زبانوں کا تعلق ہندوستان سے ہے انھیں ہند آریائی زبانیں کہا جاتا ہے۔ان زبانوں کو ہند آریائی کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ ان زبانوں کا فروغ ایران سے ہندوستان آکر بسنے والے آریاؤں کی زبان سے ہوا ہے۔ آریاؤں کی زبان کے قدیم ترین نمونے ان کی مقدس کتاب ''رگ وید'' میں ملتے ہیں۔ ہند آریائی کا ارتقا تین ادوار میں ہوا ہے:

1۔ قدیم ہند آریائی 2۔ وسطی ہند آریائی 3۔ جدید ہند آریائی

اس اکائی میں آپ ہند آریائی کے تینوں ادوار کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔ہند آریائی کے پس منظر کا بھی مطالعہ کریں گے۔ ہند آریائی خاندان کی ایک مشہور اور مقبول زبان اردو کا تعلق جدید ہند آریائی دور سے ہے۔اس لحاظ سے ہند آریائی کے ادوار پر روشنی ڈالنے کے بعد جدید ہند آریائی دور کے تحت اردو زبان کے آغاز کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو ہند آریائی کے ارتقا سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ سے آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ

☆ ہند آریائی کے مختلف ادوار کا جائزہ لے سکیں۔

☆ ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں کے باہمی تعلق کو سمجھ سکیں۔

☆ ہندوستان کی جدید زبانوں کے آغاز و ارتقا کی معلومات حاصل کرسکیں۔

☆ ہند آریائی سے اردو کے رشتے کو بیان کرسکیں۔

1.2 ہند آریائی کا پس منظر

1.2.1 ہندوستان کے قدیم باشندے

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس میں کہیں اونچے پہاڑ' گہری ندیاں' زرخیز زمین' لہلہاتے کھیت' برف سے ڈھکی چٹانیں' خوبصورت وادیاں' خوشنما اور خوشبو سے مہکتے باغات' خوبصورت مناظر' کہیں گھنے جنگل ہیں اور کہیں ریگستان' کہیں زمین سونا اگلتی ہے اور کہیں دیگر معدنیات نکلتے ہیں۔ یہاں کی ثقافت دنیا کی قدیم ترین ثقافتوں میں ہے۔ اس کی تاریخ گذشتہ پانچ ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں صوفیا' سادھو' سنت سبھی آتے رہے ہیں۔ یہاں کی تہذیب مشترکہ تہذیب ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ' مختلف زبانیں بولنے والے' مختلف رسوم و رواج غرض اس کی رنگارنگی ایک خوبصورت گلدستہ کی مانند ہے۔ یہاں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا حسن ملتا ہے۔ زمانہ قدیم سے لوگ یہاں بستے ہیں اور باہر سے آتے رہے ہیں۔ ذیل میں ہندوستان کے چند قدیم باشندوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) نگریٹو (Negretos): یہ آفریقہ کے کچھ قبائل تھے جو ترک وطن کر کے زرخیز زمینوں کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے۔ ان آفریقی قبائل کے کچھ نشانات جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔

(2) پروٹو آسٹرلوائیڈ (Proto-Australoid): یہ فلسطین سے آئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے علاوہ سیلون' برما' اور آسٹریلیا کا بھی رخ کیا اور وہاں آباد ہوئے۔

(3) آسٹرک (Austric): آسٹرک بحیرۂ روم کے علاقے سے آئے تھے اور انہوں نے عراق کے راستے سے یہ سفر طے کیا تھا۔ یہ شمالی ہندوستان کے بعض حصوں میں بس گئے۔ ان ہی میں سے کچھ لوگ ہند چین اور انڈونیشیا چلے گئے تھے۔

(4) دراوڑی (Dravidians): یہ لوگ بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک کے باشندے تھے۔ وہاں سے نکل کر یہ لوگ کافی عرصہ عراق میں رہے پھر بلوچستان ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ یہ لوگ پنجاب اور سندھ کے علاقے ہڑپا اور موہنجوداڑو میں آباد ہوئے۔ ان کے دو چار گروہ جو کنڑی' تلگو' تامل' ملیالم زبانیں بولتے ہیں' تہذیبی وتمدنی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔

(5) آریا: آریا قوم کے لوگ 1500 قبل مسیح میں اپنے وطن وسط ایشیا سے روانہ ہوئے۔ ایران' افغانستان میں کچھ عرصہ ٹھہر کر ہندوستان آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ وہ مختلف جتھوں کی شکل میں ہندوستان وارد ہوئے۔ ہندوستان آمد پر ان کا مقابلہ مقامی باشندوں دراوڑیوں سے ہوا۔ آریاؤں نے انہیں جنوب کی طرف دھکیل دیا اور خود شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

(6) منگول نسل کے لوگ بھی مختصر عرصہ کے لیے ہندوستان آئے۔ ان کی یادگار آسام اور نیپال کی پہاڑی بولیاں ہیں۔ یہ لوگ آریاؤں کے بعد آئے اور ہمالیہ کے دامن میں بس گئے۔ یونانی لوگ ہندوستان آئے۔ یونانیوں کے بعد شاک اور ہن آتے رہے۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب پر بہت ہی معمولی اثر چھوڑا کیوں کہ ان کا اختلاط وقتی تھا۔

(7) شاکا اور کشان وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبیلے تھے ان کے بعد ہن (Hun) گروہ بھی ہندوستان آیا۔

(8) عرب تاجر قبل اسلام جنوبی ہند آ کر بس گئے۔ ایرانی بھی عرب تاجروں کے ساتھ شریک تھے۔ 712ء میں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمان یہاں آئے اور یہ سلسلہ سلطنت مغلیہ کے سولہویں صدی عیسوی میں استحکام تک جاری رہا۔ بعد میں پرتگیزی' ڈچ اور دیگر یوروپی اقوام کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

1.2.2 آریاؤں کی آمد

آریاؤں کا اصل وطن وسط ایشیا کا ایک خشک پہاڑی علاقہ تھا۔ انہیں اس علاقے کو چھوڑ کر زرخیز زمین اور اپنے جانوروں کے لیے گھاس کے میدانوں کی تلاش میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ 1500 قبل مسیح میں آریا ہندوستان آئے۔ آریا وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ان کے راستے میں مشرقی ایران، افغانستان اور دوسرے مقامات آئے لیکن وہ وہاں صرف تھوڑے عرصے کے لیے ٹھہرے اور ہندوستان کے زرخیز میدان میں پہنچ کر ایسے ٹھہرے کہ پھر کہیں نہ گئے۔ آریا لوگ پہلے سندھ میں داخل ہوئے، وہاں سے پنجاب میں پھیلے اور پھر مشرقی ہندوستان میں آباد ہونا شروع ہوئے۔ آریا ایک ہی وقت میں سارے کے سارے مل کر ہندوستان میں وارد نہیں ہوئے بلکہ رفتہ رفتہ مختلف جتھوں کی شکل میں آتے رہے۔ یہاں پر آریا سیاسی دبدبہ اور عسکری طاقت کے ساتھ نہیں آئے اور نہ اقتدار و حکومت ان کا مقصد تھا بلکہ محض آبادکاری، تلاش معاش اور فراہمی روزگار ان کی غائت تھی۔ ہندوستان آنے کے کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے زراعتی زندگی اختیار کرلی۔

آریا اپنے ساتھ اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے عقائد لائے۔ یہ کھیتی باڑی کی معلومات بھی رکھتے تھے۔ ہندوستان کو آریاؤں کی سب سے بڑی دین زبان تھی۔ قدیم آریائی تہذیب کی ایک اور بڑی دین براہمی رسم الخط ہے جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا اور جو ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں (سوائے اردو) کا ماخذ ہے اور جسے آریوں نے شروع سے اپنی زبانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ دراوڑی جنوبی ہند میں سمٹ کر رہ گئے تھے اس لیے ملک کے دوسرے حصوں میں ان کی زبانوں (تامل، تلگو، ملیالم اور کنڑ) کو فروغ کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس کے برعکس آریا تمام ملک میں پھیلے اور اس وجہ سے ان کی زبان بھی پورے ملک میں پھیل سکی۔

ہندوستان آنے سے پہلے آریا مختلف ذاتوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے۔ جب تک ذات پات کا نظام نہ تھا اس وقت تک زبان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ آریاؤں کے ہندوستان آنے کے بعد ذات پات کے نظام (برہمن، چھتری، ویش، شودر) کے ساتھ مختلف ذاتوں کی زبانوں کے درمیان بہت بڑا فرق پیدا ہوگیا۔ سنسکرت اونچے طبقے کی تہذیب یافتہ زبان ہوگئی تھی اور مختلف پراکرتیں جو اس دور میں رائج رہیں، عوام کی فطری بولیاں بنی رہیں۔ تہذیبی سرمایہ سنسکرت کے گہوارے میں پروان چڑھا تھا۔ ڈراموں میں برہمن، بادشاہ، وزیر اور امیر کبیر کی زبان سے اسے بلوایا جانے لگا تھا۔ عورتوں اور عام لوگوں کی زبان پر پراکرتیں رواں رکھی جاتی تھیں۔ قواعد دانوں اور اعلیٰ ذات والوں نے حد بندیوں میں سختی کی تاکہ سنسکرت صرف خواص کی زبان پر آئے، عوام کی زبانوں پر نہ آئے تاکہ اس کا تقدس اور معیار برقرار رکھا جاسکے۔ اس سختی اور معیار بندی سے بھی پراکرتوں کو فائدہ پہنچا اور ارتقا کا دروازہ مزید کھل گیا۔

آریوں نے دراوڑی مذہب اور تہذیب کے بہت سے عناصر قبول کیے، بعض دیوی دیوتاؤں کے تصورات اور دیومالا، کچھ کھانے پینے کی چیزیں (پان سپاری) اور لباس (دھوتی اور ساری) وغیرہ۔ دراوڑی زبانوں کا آریائی زبان کی قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور آریائی زبان نے ہند ایرانی منزل سے گزر کر ہند آریائی شکل اختیار کرلی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ ہندوستان کے قدیم باشندے کون تھے؟

2۔ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کب ہوئی؟

1.3 ہندآریائی کا ارتقا

1.3.1 زبانوں کی گروہ بندی؛

دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مختلف زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ماہرلسانیات نے دنیا کی کل زبانوں کی تعداد مقرر کرنے کی کوشش کی جس میں مقامی بولیاں شامل نہیں کی گئیں۔مشہور زبانوں کی تعداد قیاساً دو ہزار سات سو چھیانوے (2796) بتائی جاتی ہے۔ان میں سے بعض زبانیں آپس میں ملتی جلتی ہیں یعنی باہم مماثلت رکھتی ہیں اور بعض ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جو زبانیں باہم مماثلت رکھتی ہیں یعنی جن زبانوں میں لسانیاتی بنیادوں پر یکسانیت پائی جاتی ہے انہیں ایک گروہ یا زمرے میں رکھا گیا ہے۔زبانوں کے اسی گروہ یا زمرے کو لسانی خاندان (Language Family) کہتے ہیں۔لسانی خاندان کے لیے خاندان السنہ (زبانوں کا خاندان کی اصطلاح) بھی استعمال کی جاتی رہی ہے۔ دنیا کی زبانوں کو آٹھ اہم گروہوں میں تقسیم کیا گیاہے۔ (1) سامی (2 افریقی بانتو (3) دراوڑی (4) ہند چینی (5) ملائی خاندان (6) منڈا (7) امریکہ کی عہد قدیم کی زبانیں (8) ہند یوروپی خاندان۔

ہند یوروپی خاندانِ السنہ کی مشہور شاخیں یہ ہیں۔ (1 آرمینین (2 بالٹک یا سلافی خاندان (3) البانوی (4) یونانی (5) اطالوی (6) کیلٹک (7) ٹیوٹائی (8) ہند ایرانی خاندان ۔ہمارے موضوع کا تعلق ہند ایرانی خاندان سے ہے۔ ہند ایرانی خاندان دو مشہور خاندانوں میں تقسیم ہو گیا۔ (1) ایرانی خاندان اور (2) ہند آریائی خاندان۔

ہندوستان میں آریا کئی گروہوں کی شکل میں آئے۔ اندازہ ہے کہ وہ پندرہ سو (1500) قبل مسیح اور بارہ سو (1200) قبل مسیح کے درمیان مغربی ہندوستان میں بس چکے تھے۔آریا وسط ایشیا سے آئے تھے۔ان کے راستے میں ایران' افغانستان اور دوسرے مقامات آئے لیکن وہ وہاں کچھ عرصہ ٹھہر کر ہندوستان آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ آریائی زبان لاتے ہیں۔

1.3.2 ہندآریائی کے ادوار

ہندآریائی کے ارتقا کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ ادوار درج ذیل ہیں:

1۔ قدیم ہندآریائی 1500 ق م تا 500 ق م (1000 سال)

قدیم ہندآریائی کے دو ذیلی ادوار ہیں:

(i) ویدک سنسکرت 1500 ق م تا 1000 ق م (500 سال)

(ii) کلاسیکل سنسکرت 1000 ق م تا 500 ق م (500 سال)

2۔ وسطی ہندآریائی دور 500 ق م تا 1000ء (1500 سال)

وسطی ہندآریائی کے تین ذیلی ادوار ہیں:

(i) پالی 500 ق م تا مولود مسیح یعنی ایک عیسوی (500 سال)

(ii) پراکرت مولود مسیح (ایک عیسوی) تا 500ء (500 سال)

(iii) اپ بھرنش 500ء تا 1000ء (500 سال)

3۔ جدید ہند آریائی دور 1000ء تا حال

بعض لوگ ان تاریخوں کو سو سال ادھر ادھر کر کے پیش کرتے ہیں یعنی کلاسیکل سنسکرت اور پالی کی حد 500 ق م کی بجائے 600 ق م پر اور پراکرت اور اپ بھرنش کے ڈانڈے 500ء کی بجائے 600ء سے ملاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبانیں سو پچاس سال میں نہیں بدل جاتیں۔ ان میں عبوری دور سو دو سو سال کا ہوتا ہی ہے۔ اس لیے 500 اور 600 میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

1.4 قدیم ہند آریائی دور 1500 ق م تا 500 ق م (1000 سال)

قدیم ہند آریائی کے دو ادوار ہیں۔ پہلے دور کو ویدک سنسکرت یا ویدک زبان کہتے ہیں۔ دوسرے دور کو عوامی سنسکرت (لوک سنسکرت) یا کلاسیکل سنسکرت کہتے ہیں۔ کبھی کبھی سنسکرت کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ویدک زبان، سنسکرت کی قدیم شکل ہے، علاحدہ زبان نہیں۔ سنسکرت اسم مونث ہے۔ لفظ سنسکرت دو الفاظ سنس اور کرت سے بنا ہے۔ سنس کے معنی پاک، مقدس اور شستہ اور کرت کے معنی کرنے کے ہیں۔ سنسکرت کے معنی پاک صاف کی ہوئی زبان یعنی مقدس، افضل، مکمل، شستہ، اچھی طرح آراستہ کی ہوئی، مزین، عمدہ فائق اور مصفا زبان کے ہیں۔

1.4.1 ویدک سنسکرت

ویدک سنسکرت میں ہندوؤں کی مقدس کتابیں رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید تخلیق کی گئیں۔ رگ وید حمدیہ اور مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے۔ رگ وید کی تصنیف مختلف مقامات میں اور مختلف ادوار میں ہوئی ہے۔ مغربی علما کے مطابق اس کی تصنیف 1500 ق م کے قریب شروع ہو کر 1200 ق م پر ختم ہوتی ہے۔ سام وید اور اتھر وید 1000 ق م کے قریب کی تصانیف بتائی جاتی ہیں۔ رگ وید کی تصنیف مختلف مقامات میں ہوئی۔ کہیں اس میں گندھار کے راجہ کا ذکر ہے، کہیں دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے راجہ کا ذکر ہے۔ ویدک سنسکرت میں قدیم اپنشد، دسوتر یا منتر گرنتھ بھی لکھے گئے۔

1.4.2 کلاسیکل سنسکرت

ویدک سنسکرت کے بعد سنسکرت زبان میں ادبی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے یہ زبان کلاسیکل سنسکرت کہلائی۔ کلاسیکل سنسکرت میں رامائن اور مہابھارت کی تخلیق عمل میں آئی۔ قدیم ہند آریائی دور میں سنسکرت زبان کا ارتقا اور فروغ عمل میں آیا۔ اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ آریوں کے شمال مغربی خطے سے مشرقی خطے کی جانب پھیلنے سے سنسکرت زبان کی مرکزیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ایک معیار پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نیز مقامی بولیوں کے اختلاط کی وجہ سے اس کی تین علاقائی شکلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں جنھیں اُدیچیہ، پراچیہ اور مدھیہ دیشیہ کہتے ہیں۔ اُدیچیہ شمال مغربی خطے میں رائج تھی اور آریوں کی معیاری بولی تصور کی جاتی تھی۔ یہ اس علاقے کی بولی تھی جہاں آج کل سندھی اور لہندا (مغربی پنجابی) زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس میں ''ر'' اور ''ل'' کی جگہ صرف ''ر'' کی آواز پائی جاتی ہے۔ پراچیہ کا چلن مشرق میں تھا اور یہ معیار سے کافی دور جا پڑی تھی۔ اس میں معیاری بولی اُدیچیہ کی بعض آوازوں کا تلفظ بگاڑ دیا جاتا تھا مثلاً اس میں ''ر'' کی جگہ ''ل'' کا چلن عام ہو گیا تھا۔ پراچیہ کا علاقہ وہ سرزمین تھی جہاں ان دنوں بنگالی، آسامی، اڑیا اور بہاری بولیوں یعنی مگہی، میتھلی اور بھوجپوری کا چلن ہے۔ اُدیچیہ اور پراچیہ کے درمیانی علاقے کی بولی مدھیہ دیشیہ کہلاتی تھی۔ یہ نہ تو بہت معیاری بولی تھی اور نہ بالکل غیر معیاری۔ اس میں ''ر'' اور ''ل'' دونوں آوازیں موجود تھیں۔ مدھیہ دیشیہ کا خاص علاقہ وہ تھا جہاں آج کل مغربی ہندی کی بولیاں یعنی کھڑی بولی، برج بھاشا، بندیلی

اورقنوجی بولی جاتی ہیں اور جہاں اردواور ہندی کا چلن عام ہے۔

1.5 وسطی ہند آریائی دور 500 ق م تا 1000ء (1500 سال)

وسطی ہند آریائی دور 500 ق م سے شروع ہوتا ہے جو 1000 عیسوی تک جاری رہتا ہے۔ وسطی ہند آریائی کے تین دور ہیں (1) پالی (اسے پہلی پراکرت یا ابتدائی پراکرت بھی کہا گیا ہے) 500 ق م تا مولود مسیح' 500 سال (2) پراکرت مولود مسیح تا 500 عیسوی' 500 سال (ادبی پراکرت) (3) اپ بھرنش 500ء تا 1000 عیسوی' 500 سال (تیسری پراکرت)۔

سنسکرت کے زوال کے بعد 500 ق م سے پراکرتوں کا ظہور ہوتا ہے پراکرت دراصل ایک ایسی زبان تھی جو سنسکرت زبان میں تبدیلی کے نتیجے میں فطری طور پر ظہور پذیر ہوئی تھی۔ یہ ایک سادہ اور آسان زبان تھی۔ اسے عوام میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہوگئی اور یہ بہت جلد عام بول چال کی زبان بن گئی۔ جب کہ سنسکرت خواص اور طبقۂ اشراف کی زبان بن چکی تھی اور قواعد کے اصولوں میں جکڑ کر جامد بنادی گئی تھی۔ یہ سماج کے اعلیٰ طبقے کے لیے مختص ہو کر رہ گئی تھی اور سماج کے دبے کچلے' نچلے طبقے کے لوگوں کے استعمال کی زبان باقی نہ رہی۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اس دور کے سنسکرت ڈراموں سے ہوتا ہے جن میں اعلیٰ طبقے اور اونچی ذات سے تعلق رکھنے والے کردار سنسکرت میں کلام کرتے ہیں اور نیچی ذات کے کرداروں سے پراکرت میں مکالمے ادا کروائے جاتے ہیں۔

جب سنسکرت زبان کے تلفظ قواعد اور نحوی ڈھانچے میں کافی حد تک تبدیلیاں رونما ہوگئیں تو یہ زبان بالکل بدل گئی۔ سنسکرت کی یہی بدلی ہوئی شکل پراکرت کہلائی۔ زبان میں تبدیلی کا یہ عمل لسانیات کی مختلف سطحوں پر دیکھا جاسکتا ہے کہ سنسکرت کے مصمتی خوشے (Consonant clusters) کا ایک مصمتہ (Consonant) ٹوٹ کر دوسرے مصمتے کے ساتھ مدغم ہوجاتا ہے۔ ذیل کی چند مثالوں سے زبان میں تبدیلی کا عمل واضح ہوجائے گا۔

سنسکرت الفاظ	پراکرت الفاظ	معنی	سنسکرت الفاظ	پراکرت الفاظ	معنی
پُتّر	پُت	پوت	ہست	ہستھ	ہاتھ
شُشک	سکھ	سوکھا	دُگدھ	دُدّھ	دودھ
سرو	سوّ	سب	ادھ	اجّ	آج
سپّت	ستّ	سات	اگن	اگّ	آگ

اس طرح کی بے شمار صوتی نیز قواعدی اور بعض نحوی تبدیلیاں سنسکرت زبان میں رونما ہوئیں جن کے نتیجے میں پراکرتوں کا ظہور عمل میں آیا۔ ان لسانی تبدیلیوں کے پس منظر میں اردو زبان کے ارتقا کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہند آریائی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے وسطی ہند آریائی دور کہتے ہیں۔ یہ دور 500 ق م تا 1000 سنہ عیسوی یعنی پندرہ سو سال تک قائم رہتا ہے۔ جس طرح قدیم ہند آریائی دور میں سنسکرت زبان کا فروغ ہوا اسی طرح وسطی ہند آریائی دور میں پراکرتیں پھلی پھولیں اور پروان چڑھیں۔ اب ہم وسطی ہند آریائی کے تین ادوار پالی' پراکرت اور اپ بھرنش کے متعلق ضروری معلومات حاصل کریں گے۔

1.5.1 پالی (500 ق م تا مولود مسیح) 500 سال

پالی کو پہلی پراکرت یا ابتدائی پراکرت بھی کہا گیا ہے۔ پالی سنسکرت لفظ پنکتی سے ماخوذ ہے۔لسانیات کے علما پالی کے معنی سطر، سیدھی لکیر، کتاب کی اصل عبارت، بودھ گرنتھوں کی سطر، بودھ دھرم شاستر کی سطر بناتے ہیں۔لسانیات میں پالی کو وسط ہند آریائی کی اولین زبان مانا جاتا ہے۔پہلی پراکرت میں پالی اور اشوکی پراکرت دونوں شکلیں شامل ہیں۔

1۔ پالی: سنسکرت میں جب صوتی اور صرفی تغیرات رونما ہوئے تو اس نے اولین پراکرت یعنی پالی کا روپ اختیار کیا۔ پالی بدھ مذہب کی زبان ہے۔ بدھ مذہب کے پیشوا مہاتما گوتم بدھ (وفات 477ق م) پالی بولتے تھے۔انہوں نے اسی زبان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اور اپنے پیروؤں کو بھی اسی زبان میں بدھ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی تلقین کی۔ بدھ مذہب کے عالموں نے اپنے مذہب کے عقائد اور اوراد لکھنے کے لیے اس عوامی زبان کو استعمال کیا۔ گوتم بدھ اور مہاویر جین دونوں نے اس پراکرت کی قدیم شکل کو اپنایا تھا۔ بدھ مذہب کی تمام مستند تصانیف پالی زبان میں ہی پائی جاتی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں مذہبی ستون کے ذریعے یہ زبان آج تک محفوظ رہ سکی ہے۔

2۔ اشوکی پراکرت: ابتدائی پراکرت کی دوسری شکل اشوک کے کتبوں کی زبان کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔اشوک کا زمانہ گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً سوا دو سو سال بعد کا زمانہ (تقریباً 250 قبل مسیح) ہے۔اشوک ایک بہت بڑی سلطنت کا مالک تھا۔ بنگال اور نیپال سے لے کر افغانستان تک کا علاقہ اس کے زیر تسلط تھا۔ ادھر گجرات اور مالوہ تک اس کی حکومت کا ڈنکا بجتا تھا۔ کلنگ (اڑیسہ) کی سلطنت کو بھی اس نے فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔کلنگ کی خونریز جنگ کے بعد اشوک نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔

1.5.2 پراکرت مولود مسیح تا 500 عیسوی 500 سال

پراکرت کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ ایک طرح کی بہت سی زبانوں کے زمرے کا نام ہے۔سنسکرتی تہذیب کو کہتے ہیں۔ پرکرتی فطرت کو کہتے ہیں۔سنسکرت مہذب زبان تھی اور پراکرتیں فطری یعنی غیر مرصع، عوامی زبان۔ یہ ایک عام بات ہے کہ جب زبانیں ترقی کر جاتی ہیں تو ان میں ادب بھی پیدا ہونے لگتا ہے چنانچہ پراکرت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پراکرت جو کلیتاً ایک عام بول چال کی زبان تھی وہ مولود مسیح تا 500 عیسوی کے دوران ادبی بن گئی۔ بعضوں نے پراکرتوں کا زمانہ 100ء تا 600ء تک متعین کیا ہے۔ان پراکرتوں کا استعمال ڈراموں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ وسطی ہند آریائی کا دوسرا دور ادبی پراکرتوں کا دور کہلایا۔ادبی پراکرتوں کی حسب ذیل پانچ قسمیں ہیں:

1۔ شورسینی پراکرت: شورسینی پراکرت شورسین کے علاقے کی زبان تھی جس کا مرکز متھرا (اتر پردیش) تھا۔ یہ اسی علاقے کی زبان تھی جو قدیم ہند آریائی دور میں مدھیہ دیشیہ کہلاتا تھا۔ اس وجہ سے یہ سنسکرت سے بہت زیادہ قریب تھی اور لسانی اعتبار سے اس سے گہرے طور پر متاثر تھی۔سنسکرت ڈراموں میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا اور سنسکرت کے بعد اسے وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اردو زبان کا تاریخی رشتہ شورسینی پراکرت سے جا کر ملتا ہے۔

2۔ ماگدھی پراکرت: ماگدھی پراکرت بنیادی طور پر مگدھ کے علاقے کی زبان تھی جو اب جنوبی بہار کا حصہ ہے۔ یہ علاقہ قدیم ہند آریائی دور میں پراچیہ بولی کا تھا جو آریوں کے تہذیبی مرکز سے کافی دور جا پڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ماگدھی پراکرت کو غیر مہذب بولی تصور کیا جاتا تھا۔ ماگدھی پراکرت میں ''ر'' کی آواز مفقود تھی۔ یہاں کے لوگ ''ر'' کی آواز کو ''ل'' کی آواز سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً راجا کی

جگہ لاجا' دردّر کی جگہ دَلِدَّ (موجودہ بول چال میں دَلِدَّ ر) بولتے تھے۔ ماگدھی پراکرت کی دوسری اہم صوتی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سنسکرت کی تین آوازوں س' ش اورش کی جگہ صرف ایک آواز ''ش'' پائی جاتی تھی۔ ماگدھی پراکرت کا استعمال سنسکرت کے ڈراموں کے نچلے طبقے کے کرداروں کی گفتگو میں بھی پایا جاتا ہے۔

3۔ اردھ ماگدھی پراکرت: اردھ ماگدھی پراکرت کا علاقہ شورسینی پراکرت اور ماگدھی پراکرت کے درمیان کا علاقہ تھا۔ یہ بہار اور الہٰ آباد کے بیچ کے علاقے کی زبان تھی اردھ ماگدھی پراکرت نے جین مذہب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔جین مذہب کی ابتدائی مذہبی ادبی تصانیف اسی پراکرت میں پائی جاتی ہیں۔مہاویر جین نے جس زبان میں جین مذہب کی تعلیمات دیں وہ اردھ ماگدھی کی قدیم شکل تھی۔اردھ ماگدھی پراکرت کا استعمال سنسکرت ڈراموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان تھی۔اس دور کے شاہی گھرانوں میں بھی یہی زبان بولی جاتی تھی۔اردھ ماگدھی میں ''ر'' اور ''ل'' دونوں آوازیں پائی جاتی تھیں لیکن سنسکرت کاش اورش' س کی آواز میں تبدیل ہوجاتا تھا۔

4۔ مہاراشٹری پراکرت: مہاراشٹری پراکرت مہاراشٹر کی زبان تھی اورتمام ادبی پراکرتوں میں یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ادبی پراکرت تھی۔قواعدنویسوں نے اسے مثالی پراکرت کہا ہے۔ان کی توجہ کا مرکز یہی پراکرت تھی۔انہوں نے اس کا مطالعہ کافی تفصیل سے کیا ہے۔سنسکرت ڈراموں میں پراکرت کے نثری اجزا اسی پراکرت کے پائے جاتے ہیں۔اس دور کی بیشتر تصانیف مہاراشٹری پراکرت میں ہی ملتی ہیں۔اس کا استعمال موسیقی میں بھی کیا جاتا تھا۔

5۔ پشاچی پراکرت: پشاچی پراکرت پنجاب اورکشمیر میں بولی جاتی تھی۔اس میں ادبی تصانیف کا فقدان ہے۔پشاچی پراکرت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خالص ہندآریائی زبان نہیں ہے' کیوں کہ اس میں ایرانی زبانوں کے بعض اثرات نفوذ کرگئے ہیں۔

1.5.3 اپ بھرنش 500ءتا1000 عیسوی 500 سال؛

ادبی پراکرتوں کے بعد اپ بھرنشوں کا ارتقا عمل میں آتا ہے۔ یہ پراکرت کے ارتقا کی تیسری اورآخری شکلیں ہیں۔اس لیے انہیں تیسری پراکرت بھی کہتے ہیں۔اپ بھرنشوں کا ارتقا 500ء سے لے کر 1000ء تک ہوتا ہے۔بعضوں نے اپ بھرنشوں کا زمانہ 600ء تا 1000ء طے کیا ہے۔ یہ وسطی ہندآریائی دورکا آخری مرحلہ ہے۔اپ بھرنشوں کے خاتمے کے بعد وسطی ہندآریائی دور کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے اور 1000ء سے جدید ہندآریائی دورشروع ہوتا ہےاورجدید زبانیں وجود میں آتی ہیں۔

اپ بھرنش کے لغوی معنی بگڑی ہوئی بھرشٹ زبان ہے۔ جب دوسری پراکرتیں ادبی بن گئیں تو ان کا ارتقامختلف نہج پر ہونے لگا اور عوام سے ان کا رشتہ ختم ہوگیا۔چنانچہ یہ عوام سے الگ تھلگ ہوگئیں۔عوامی زبان دوسری ڈگر پرارتقا پانے لگی۔عوام نے پراکرت کے الفاظ کوتوڑ مروڑ کر اوران کی شکلیں بگاڑ کر بولنا شروع کردیا۔یہی ٹوٹی پھوٹی (Broken) اوربگڑی ہوئی (Corrupt) زبان اپ بھرنش کہلائی۔اس طرح کی لسانی تبدیلی دبے پاؤں اورفطری طور پر واقع ہوئی۔جس طرح لسانی تبدیلی کے عمل سے سنسکرت سے پراکرت پیدا ہوئی' اسی طرح پراکرت میں تبدیلی کے نتیجے میں اپ بھرنش ظہور پذیر ہوئیں۔دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پراکرت کی نئی شکل یا بگڑی ہوئی شکل اپ بھرنش کہلائی لیکن ماہرین لسانیات اپ بھرنش کو پراکرت کی ہی ایک شکل تسلیم کرتے ہیں اوراسے تیسری پراکرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اپ بھرنش پراکرت سے پیدا ہوئی' اس لیے جہاں جہاں پراکرتیں بولی جاتی تھیں انھیں علاقوں میں اپ بھرنش وجود میں آ گئیں۔ مارکنڈے (قواعدنویس) نے اپ بھرنش کی تین قسمیں بیان کی ہیں یعنی ناگر'اب ناگراور براچڈ۔لیکن بیشتر عالموں نے اپ بھرنش کی مندرجہ ذیل پانچ قسمیں بتائی ہیں۔

1۔ شورسینی اپ بھرنش : یہ شورسینی پراکرت سے نکلی ہے۔اس کا علاقہ وہی ہے جوشورسینی پراکرت کا علاقہ تھا۔اس کے بطن سے کھڑی بولی (اردواور ہندی)' راجستھانی' پنجابی (مشرقی)اور گجراتی زبانیں پیدا ہوئیں۔کھڑی بولی کا تعلق مغربی ہندی سے ہے۔اس سے اردواور ہندی زبانیں ارتقا پاتی ہیں۔مغربی ہندی کی دوسری بولیوں مثلاً ہریانوی' برج بھاشا' بندیلی اورقنوجی کا ارتقا بھی شورسینی اپ بھرنش سے ہوا۔

2۔ ماگدھی اپ بھرنش: اس کا ارتقا ماگدھی پراکرت سے ہوا۔اس کا چلن مشرق کے ایک وسیع علاقے میں تھا جس میں بنگال' آسام' اڑیسہ اور بہار شامل ہیں۔ان علاقوں کی جدید زبانیں یعنی بنگالی' آسامی' اڑیا اور بہار کی تقریباً تمام بولیاں ماگدھی اپ بھرنش سے نکلی ہیں۔مغربی ماگدھی اپ بھرنش کی بولیوں کو جارج گریرسن (ماہرلسانیات) بہاری کے نام سے یادکرتا ہے جس میں تین بولیاں میتھلی' مگہی اور بھوجپوری شامل ہیں۔

3۔ اردھ ماگدھی اپ بھرنش: اردھ ماگدھی اپ بھرنش شورسینی اپ بھرنش اور ماگدھی اپ بھرنش کے درمیان کے علاقے کی زبان تھی۔ اس سے مشرقی ہندی کی بولیاں وجود میں آئیں جن میں اودھی' بگھیلی اور چھتیس گڑھی شامل ہیں۔

4۔ مہاراشٹری اپ بھرنش: اس کا ارتقا مہاراشٹری پراکرت سے ہوا۔ یہ مہاراشٹر کے علاقے کی زبان تھی۔اس کے بطن سے موجودہ مراٹھی کا ارتقا ہوا۔

5۔ شمال مغربی اپ بھرنش: یہ دوزمروں میں منقسم ہے(الف) براچڈاپ بھرنش جس کا ارتقا سندھ کے علاقے میں ہوااوراس سے سندھی زبان پیدا ہوئی (ب) کیکئی اپ بھرنش جس سے مغربی پنجابی پیدا ہوئی۔اسے لہندا بھی کہتے ہیں۔

1.6 جدید ہند آریائی دور 1000 تا حال

1.6.1 جدید ہند آریائی زبانیں

لسانیات کا یہ اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے' ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چنانچہ جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کی تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے (دور) جا پڑیں اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔اسی بولی کی زبانوں کو اس عہد کے قواعدنویسوں نے اپ بھرنش (بگڑی زبان) کہا ہے۔تاریخ لسانیات کی یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ لوگ ہمیشہ زبان کے سنورنے کو اس کے بگڑنے سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں۔ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کی تاریخ 1000ء مقرر کی گئی ہے لیکن اپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی سے لے کر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے۔اپ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پا کر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر محدود ہوگئی تو ہندوستان کی جدید زبانوں نے اس کی گدی چھیننا شروع کی۔ 1000ء میں یہ بہت کچھ جدید زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے یعنی 1000ء کے لگ بھگ اپ بھرنش ہی کے

اندر جدید آریائی زبانوں کے روپ جھلکنے لگے تھے۔ اس طرح ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش اپ بھرنشوں سے ہوتی ہے اور جدید ہند آریائی دور کا آغاز 1000ء سے ہوتا ہے۔

1.6.2 جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی

جدید ہند آریائی زبانیں اور بولیاں مختلف علاقوں کی اپ بھرنشوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس لیے ان میں علاقائی لسانی خصوصیات موجود ہیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں کو ان کی خصوصیات کی بنیاد پر ماہر لسانیات جارج گریرسن نے کئی گروہوں میں تقسیم کیا ہے، جو اس طرح ہیں۔

1۔ **بیرونی زبانیں:** لہندا (مغربی پنجابی)، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، بہاری بولیاں (میتھلی، مگہی، بھوج پوری)۔

2۔ **وسطی زبانیں:** مشرقی ہندی (اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی)۔

3۔ **اندرونی زبانیں:** مغربی ہندی (کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی)، پنجابی (مشرقی)، گجراتی، راجستھانی (مارواڑی/ میواڑی، مالوی، جے پوری، میواتی)، بھیلی، خاندیشی۔

4۔ **پہاڑی بولیاں:** نیپالی/ گورکھالی، کمایونی/ گڑھوالی، شملہ اور اس کے اطراف کے پہاڑی علاقوں کی بولیاں۔

گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کی گروہ بندی کے لیے کئی دلائل دیے ہیں جن سے کئی ماہرین لسانیات نے اختلاف کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپ بھرنشوں کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کا ہندوستان کے مختلف خطوں اور علاقوں میں فروغ ہوا۔ ان زبانوں میں ایک زبان اردو بھی ہے جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔

1.6.3 جدید ہند آریائی اور اردو

جدید ہند آریائی دور کا آغاز 1000ء سے ہوتا ہے جب اپ بھرنشوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کی جگہ پورے شمالی ہندوستان میں بھانت بھانت کی بولیاں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ دراصل یہ زمانہ صرف لسانی تبدیلیوں کا ہی نہیں تھا بلکہ ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر بھی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں کا یہاں کی بولیوں پر بھی اثر پڑنا لازمی تھا۔ 1000ء کے آس پاس کا ایک اہم واقعہ مسلمانوں کی شمالی ہندوستان میں آمد ہے، جن میں ترک، افغان اور ایرانی شامل تھے۔ ان لوگوں نے نہ صرف یہاں سکونت اختیار کی بلکہ ان میں کچھ لوگوں نے یہاں کی حکومت کی باگ ڈور بھی سنبھالی۔ پہلے ان کا تسلط پنجاب پر قائم ہوا۔ پھر یہ لوگ آگے بڑھتے ہوئے دہلی تک پہنچ گئے اور 1193ء میں دہلی کو فتح کر کے وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کر لی۔ جب دہلی پایۂ تخت بن گیا تو دھیرے دھیرے اس شہر کو اہمیت اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ اور یہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا تہذیبی، تمدنی اور سیاسی مرکز بن گیا۔ یہاں فوج بھی رہنے لگی اور دور دراز کے علاقوں سے بھی لوگ یہاں آنے اور بسنے لگے۔ فوج میں بھی جگہ جگہ کے لوگ بھرتی ہونے لگے۔

شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا ہوا۔ اس باہمی میل جول اور اختلاط کی وجہ سے یہاں ایک نئی تہذیب پروان چڑھنے لگی اور ایک نئی زبان کا خمیر تیار ہونے لگا۔ مسلمانوں کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ عربی ان کی مذہبی زبان تھی۔ جو مسلمان پنجاب سے آئے تھے ان کی زبان قدیم پنجابی تھی۔ ان تمام زبانوں کا شمالی ہند کی بولیوں پر گہرا اثر پڑا اور بہت تیزی کے ساتھ یہاں کی مقامی بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ داخل ہونے لگے۔ دوسری طرف 1000ء کے آس پاس اپ بھرنشوں

میں بھی فطری طور پر تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔شور سینی اپ بھرنش بھی تیزی کے ساتھ اپنا چولا بدل کر نئے روپ اختیار کرنے لگی۔اسی سے اردو کا خمیر تیار ہوا۔

1.6.4 اردو کا ہند آریائی پس منظر

اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے، جس کی داغ بیل ہندوستان کی دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح 1000 کے بعد پڑتی ہے اور مغربی ہندی کی ایک بولی ''کھڑی بولی'' اس کا ماخذ بنتی ہے۔مغربی ہندی شور سینی اپ بھرنش کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور شور سینی اپ بھرنش شور سینی پراکرت سے نکلی تھی اور دیگر پراکرتوں کی طرح شور سینی پراکرت کی پیدائش بھی سنسکرت سے ہوئی تھی۔اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو کا لسانی خاندانی سلسلہ سنسکرت سے جا کر مل جاتا ہے۔کیوں کہ جدید ہند آریائی جس میں اردو بھی شامل ہے قدیم ہندوستان کی اس زبان کا تسلسل ہے جسے سنسکرت کہتے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کی ایک مربوط لسانی تاریخ ہے اور اس کا ہند آریائی پس منظر ساڑھے تین ہزار سال کے عرصے پر محیط ہے۔

1.6.5 اردو کی لسانی ساخت، ڈھانچے اور کینڈے پر ہند آریائی عناصر کے نقوش

اردو کی لسانی ساخت، ڈھانچے اور کینڈے پر ہند آریائی عناصر کے نقوش بالکل صاف نظر آتے ہیں۔یہ عناصر ہمیں اس ہند آریائی تہذیب کی یاد دلاتے ہیں جو آریوں کے داخلۂ ہند کے بعد سے یہاں پنپنا شروع ہوئی۔یہ اسی تہذیب کا نتیجہ ہے کہ اردو کی بیشتر لسانیاتی خصوصیات کا سلسلہ اپ بھرنش اور پراکرت سے ہوتا ہوا سنسکرت سے جا کر مل جاتا ہے۔

1۔ صوتی ڈھانچہ: اردو میں 48 صوتیے (Phonemes) پائے جاتے ہیں۔صوتیے کسی زبان کی وہ ممیّز آوازیں (Distinctive Sound Units) ہوتی ہیں جن کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً پانی اور بانی۔ان میں ''پ'' اور ''ب'' کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔لہٰذا یہ دونوں ''پ'' اور ''ب'' دو صوتیے یعنی دو ممیّز آوازیں قرار دی جائیں گی۔

اردو مصمتے (Consonants) ہیں۔مصمتوں کی ایک بڑی تعداد سنسکرت اور پراکرت سے اردو میں داخل ہوئی۔ 15 ہائیہ آوازیں (Aspirates) ہند آریائی ماخذ مثلاً سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش سے اردو میں آئی ہیں۔یہ ہائیہ آوازیں ہیں پھ، بھ، تھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ، ڑھ، مھ، نھ، لھ، رھ۔خالص عربی و فارسی مصمتے اردو میں چھ ہیں یعنی ق، ف، ز، ژ، خ اور غ۔

اردو مصوتے (Vowels) دس ہیں۔ان دس مصوتوں میں دو دوہرے مصوتے (Diphthongs) بھی شامل ہیں۔اردو کے تمام مصوتے پراکرت اور اس کے توسط سے سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔

2۔ اردو کا ذخیرۂ الفاظ: اصوات کے علاوہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا ایک بڑا حصہ بھی ہند آریائی ماخذ پر مشتمل ہے جن میں سب سے زیادہ تعداد تدبھو الفاظ کی ہے۔سنسکرت کے الفاظ جب اپنی بدلی ہوئی حالت میں استعمال ہوتے ہیں تو ''تدبھو'' کہلاتے ہیں۔تدبھو الفاظ کی بنیاد اگرچہ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی پر قائم ہے لیکن وسطی ہند آریائی یعنی پراکرت میں پہنچ کر ان کی شکل وصورت اور روپ میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔سنسکرت کے یہی بدلے ہوئے الفاظ تدبھو کہلاتے ہیں۔سنسکرت کے الفاظ جب بغیر کسی تبدیلی یا رد و بدل کے اپنی اصلی حالت میں استعمال ہوتے ہیں تو 'تت سم'' کہلاتے ہیں مثلاً لفظ دگدھ خالص سنسکرت لفظ ہے جو تتسم کہلاتا ہے۔لیکن پراکرت

کے لفظ دڈھ کو جو گدھ سے ماخوذ ہے اور اسی کی بدلی ہوئی شکل ہے، تد بھو کہیں گے۔ جدید ہند آریائی اردو میں یہی لفظ دودھ بن گیا جو تد بھو کی ایک دوسری شکل ہے۔ اردو میں تت سم الفاظ بہت ہی کم ہیں۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا بیشتر حصہ تد بھو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی یا ہند آریائی الفاظ اردو کے لیے ناگزیر ہیں۔ اردو کا کوئی بھی جملہ ہند آریائی الفاظ کے بغیر تشکیل نہیں دیا جا سکتا ہے جب کہ ایسے بے شمار اردو جملے ترتیب دیے جا سکتے ہیں جن میں کوئی بھی عربی یا فارسی لفظ نہ آیا ہو۔ مثلاً ذیل کے جملے خالص ہند آریائی الفاظ پر مشتمل ہیں:

(1) وہ ایک اچھا لڑکا ہے (2) میں کل اپنے گھر جاؤں گا (3) آج تم سے ملنے یہاں کون آیا تھا؟

''رانی کیتکی کی کہانی'' (انشاء اللہ خاں انشا) اور ''سریلی بانسری'' (آرزو لکھنوی) اردو نثر و نظم کی دو ایسی کتابیں ہیں جن میں ایک بھی عربی یا فارسی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ ہند آریائی ہے۔ اس کے علاوہ قرابت داری کے الفاظ، اعداد، فعلی مادّے، ضمائر، حرف جار بھی ہند آریائی ماخذ سے ہی اردو میں داخل ہوئے ہیں جن کی حیثیت بھی بنیادی ذخیرۂ الفاظ کی ہے۔ مثالیں پیش ہیں۔

قرابت داری کے الفاظ: ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی، نانا، نانی، دادا، دادی، چچا، تایا وغیرہ۔

اعداد: مثلاً ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، بیس، سو وغیرہ۔

فعلی مادے: مثلاً آ، جا، کھا، پی، چل، سن، دیکھ وغیرہ۔

ضمائر: مثلاً وہ، تم، ہم، تو، آپ وغیرہ۔

حرف جار: مثلاً کو، پر، تک، سے، میں وغیرہ۔

ان کے علاوہ اردو کے کئی مفرد الفاظ، مرکب الفاظ، مرکب افعال، محاورے، ضرب الامثال، روزمرہ ایسے ہیں جن کی بنیاد ہند آریائی ہے۔

1.7 اکتسابی نتائج

☆ ہندوستان اپنے قدرتی مناظر، زرخیزی اور تہذیب کی وجہ سے باہر کے لوگوں کی آماجگاہ بنتا رہا ہے۔ دنیا کے دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں آ کر بستے رہے ہیں۔

☆ ہندوستان کے قدیم باشندوں میں کئی قبائل کے نام ملتے ہیں جن میں پہلا قبیلہ نگریٹو تھا جو آفریقہ سے آ کر ہندوستان میں بس گیا تھا۔ اس کے کچھ نشانات جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔

☆ آریاؤں کا اصل وطن وسط ایشیا کا ایک خشک پہاڑی علاقہ تھا۔ انھیں زرخیز زمین اور اپنے جانوروں کے لیے گھاس کے میدانوں کی تلاش میں اپنے وطن کو چھوڑنا پڑا۔ 1500ء قبل مسیح میں آریا ہندوستان آئے۔ آریا پہلے سندھ میں داخل ہوئے اور وہاں سے پنجاب میں پھیل گئے پھر مشرقی ہندوستان میں آباد ہونا شروع ہوئے۔

☆ ہند آریائی کے تین ادوار ہیں۔ قدیم آریائی دور 1500 ق م تا 500 ق م تک رہا۔ اس میں ویدک سنسکرت کا دور 1500 ق م تا 1000 ق م اور کلاسیکل سنسکرت 1000 کا دور ق م تا 500 ق م تک ہے۔ وسطی ہند آریائی دور 500 ق م تا 1000ء پر محیط ہے جس

میں پالی کا دور 500 ق م تا مولود مسیح تک، پراکرت کا دور مولود مسیح تا 500ء اور اپ بھرنش کا دور 500ء تا 1000ء تک ہے۔ جدید ہند آریائی دور 1000 عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔

☆ سنسکرت میں صوتی اور صرفی تغیرات پیدا ہوئے۔ اس کے تلفظ، قواعد اور نحوی ڈھانچے میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سنسکرت کی یہی بدلی ہوئی شکل پراکرت کہلائی۔ پراکرت دراصل ایسی زبان تھی جو سنسکرت میں تبدیلی کے نتیجے میں فطری طور پر ظہور پذیر ہوئی تھی۔

☆ ادبی پراکرتوں کے بعد اپ بھرنشوں کا ارتقاعمل میں آتا ہے۔ یہ پراکرت کے ارتقا کی تیسری اور آخری شکلیں ہیں اس لیے انہیں تیسری پراکرت بھی کہتے ہیں۔ اپ بھرنشوں کا دور 500ء تا 1000ء اور بعضوں کے مطابق اس کا زمانہ 600ء تا 1000ء ہے۔

☆ جدید ہند آریائی دور کی ابتداء 1000ء سے ہوتی ہے۔ اپ بھرنش میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ 1000ء کے بعد بھی جاری رہا۔ بول چال کی زبان کی حیثیت سے اس کا ارتقاء 1000ء تک پہنچتے پہنچتے رک گیا۔ رفتہ رفتہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر محدود ہوگئی۔

☆ اردو کی داغ بیل ہندوستان کی دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح 1000ء کے بعد پڑتی ہے اور مغربی ہندی کی ایک بولی ''کھڑی بولی'' اس کا ماخذ بنتی ہے۔ مغربی ہندی، شورسینی اپ بھرنش کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور شورسینی اپ بھرنش، شورسینی پراکرت سے نکلی تھی اور دیگر پراکرتوں کی طرح شورسینی پراکرت کی پیدائش بھی سنسکرت سے ہوئی تھی۔ اس طرح اردو کا لسانی سلسلہ سنسکرت سے جا کر ملتا ہے۔ اردو زبان کی ایک مربوط لسانی تاریخ ہے اور اس کا ہند آریائی پس منظر ساڑھے تین ہزار سال کے عرصے پر محیط ہے۔

1.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شستہ	صاف، معیاری	خاندان السنہ	زبانوں کا خاندان
مصفاّ	صاف ستھرا	لاٹ	ستون، کھمبا
جمود	ٹھہراؤ	فائق	فوقیت کی حامل
تقدس	بزرگی، احترام، عزت	پروان چڑھنا	ترقی کرنا
منبع	ماخذ	مزاحمت	رکاوٹ
نقل مکانی	ہجرت	قلم بند کرنا	لکھنا
مسخ کرنا	بگاڑنا	اوراد	روزانہ پڑھنے کے وظیفے
بانی	آواز	اپدیش	تعلیمات
مورخین	تاریخ لکھنے والے	تقویم	کیلنڈر (Calendar)
بارآور ہونا	پھلنا پھولنا، ترقی کرنا	اختلاط	میل جول

1.9 نمونہ امتحانی سوالات

1.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ آریہ اصلاً کہاں کے رہنے والے تھے؟

2۔ ہندوستان کے قدیم باشندے کون تھے؟

3۔ قیاساً دنیا میں مشہور زبانوں کی تعداد کتنی ہے؟

4۔ دنیا کی تمام زبانوں کو کتنے لسانی گروہ میں تقسیم کیا گیا ہے؟

5۔ ہند ایرانی خاندان کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

6۔ ہند آریائی کے ارتقا کو عام طور پر کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟

7۔ سنسکرت کی قدیم شکل کیا ہے؟

8۔ وسطی ہند آریائی کے کتنے ادوار ہیں؟

9۔ گوتم بدھ کی مذہبی تعلیمات کس زبان میں پیش کی گئیں؟

10۔ اردو کا لسانی خاندانی سلسلہ کس سے جاملتا ہے؟

1.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ گریرسن کے مطابق جدید ہند آریائی زبانیں کتنی ہیں؟ ان کے نام بتائیں۔

2۔ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اور اس کے بعد کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ اپ بھرنش کسے کہتے ہیں؟ اپ بھرنش کے اقسام بیان کیجیے۔

4۔ اردو کی لسانی ساخت' ڈھانچے اور کینڈے پر اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

5۔ پراکرت اور ان کی اقسام پر نوٹ لکھیے۔

1.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ قدیم ہند آریائی دور کی زبان ویدک اور کلاسیکل سنسکرت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

3۔ اردو کے ہند آریائی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

1.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	ہند آریائی اور ہندی	سینتی کمار چٹرجی مترجم عتیق احمد صدیقی
3۔	لسانی مطالعہ	پروفیسر گیان چند جین
4۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اکائی 2: مغربی ہندی اور اس کی بولیاں

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید
2.1 مقاصد
2.2 مغربی ہندی کا ارتقا
2.2.1 مغربی ہندی کا تعارف
2.2.2 مغربی ہندی کا علاقہ
2.2.3 مغربی ہندی کی بولیوں کی ساخت
2.3 مغربی ہندی کی بولیاں اور ان کی خصوصیات
2.3.1 کھڑی بولی
2.3.2 ہریانوی
2.3.3 برج بھاشا
2.3.4 قنوجی
2.3.5 بندیلی
2.4 اکتسابی نتائج
2.5 کلیدی الفاظ
2.6 نمونہ امتحانی سوالات
2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
2.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے ہند آریائی کے ارتقا کا مطالعہ کیا تھا۔ ماہرینِ لسانیات نے ہندوستان کی زبانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ہند

آریائی زبانوں کے تین اہم ادوار کی نشان دہی کی ہے ۔ یہ ادوار ہیں قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی۔ جدید ہند آریائی دور کی زبانوں کا آغاز کب ہوا یہ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے ۔ ماہرین لسانیات کا اندازہ ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کا آغاز کا زمانہ 1000ء ہے۔ یہ ترکوں کی پنجاب آمد کا زمانہ ہے، جب شورسینی اپ بھرنش ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔شورسینی اپ بھرنش کی بول چال کو ماہر لسانیات گریرسن نے 'مغربی ہندی' کا نام دیا۔مغربی ہندی ہند آریائی زبانوں میں ایک اہم پڑاؤ ہے۔

اس اکائی میں آپ ہند آریائی زبانوں کے اسی لسانی پڑاؤ مغربی ہندی کے بارے میں پڑھیں گے۔ وسطی ہند آریائی کے تیسرے دور یعنی اپ بھرنش اور جدید ہند آریائی دور کی زبانوں کے درمیانی اور عبوری دور میں مدھیہ دیش کی زبان کو مغربی ہندی کا نام دیا گیا ہے۔اس طرح مغربی ہندی کا تعلق ایک طرف شورسینی اپ بھرنش سے اور دوسری طرف جدید ہند آریائی زبانوں سے ہے۔مغربی ہندی کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ دہلی اور اس کے اطراف کی پانچ بولیوں کا اجتماعی نام ہے۔مغربی ہندی کی ان پانچ بولیوں میں سے تین بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا نے جدید ہند آریائی زبان اردو کے آغاز وارتقا میں سب سے اہم کردار کیا ہے۔

اس اکائی میں آپ مغربی ہندی کے ارتقا، اس کے علاقے اور اس کی بولیوں کی ساخت کے بارے میں پڑھیں گے۔ساتھ ہی مغربی ہندی کی بولیوں کی خصوصیات کا بھی تفصیلی مطالعہ کریں گے۔اکائی کے آخری حصے میں اکتسابی نتائج اور مشکل الفاظ کے معنی دیے جا رہے ہیں، جس سے آپ اس اکائی کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔اس کے علاوہ امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں، جن میں معروضی جوابات کے حامل سوالات، مختصر جوابات کے حامل اور طویل جوابات کے حامل سوالات شامل ہیں۔ان کی مدد سے آپ اپنے امتحان کی بہتر تیاری کر سکتے ہیں۔اس موضوع پر کئی کتابوں میں اہم مواد موجود ہے۔ یہ کتابیں کتب خانوں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، ان میں سے چند کتابیں مزید مطالعے کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔امید ہے کہ یہ کتابیں اس موضوع کی بہتر تفہیم کے لیے آپ کی معاون ہوں گی۔

2.1 مقاصد

اس اکائی میں آپ مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کا مطالعہ کریں گے۔اس مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ لسانیات کی روشنی میں مغربی ہندی کی وضاحت کر سکیں۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں کے علاقے اور ساخت سے واقف ہو سکیں۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں کی خصوصیات بیان کر سکیں۔

2.2 مغربی ہندی کا ارتقا

2.2.1 مغربی ہندی کا تعارف؛

مغربی ہندی ایک لسانی اصطلاح ہے جس کا استعمال سب سے پہلے مشہور ماہر لسانیات جارج ابراہیم گریرسن (م 1941ء) نے کیا تھا۔ گریرسن انیسویں صدی کا ایک یوروپی عالم تھا۔اس کی پیدائش آئر لینڈ میں ہوئی جہاں تعلیم حاصل کی۔گریرسن نے سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں میں بھی سند لی تھی۔اس نے ہندوستان میں صوبۂ بہار کے جوائنٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ ہندوستانی زبانوں سے اس کی غیر معمولی دلچسپی تھی۔اس نے ہندوستانی زبانوں کی ابتدا اور ارتقا کا مطالعہ سائنسی اور تحقیقی انداز میں کیا۔گریرسن نے مستشرقین کی علمی کانفرنس

میں ہندوستانی زبانوں کی فہرست بنانے کی تجویز پیش کی جسے حکومت نے منظور کر لیا۔اس نے لسانیات کی روشنی میں تقریباً تیس سال تک ہندوستان کی زبانوں کا جائزہ لیا اور اپنی مشہور تصنیف ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' (Lingustic Survey Of India) پیش کی۔ وہ 1896 میں پٹنہ کا ایڈیشنل کمشنر مقرر ہوا۔ ملازمت کے دوران ہی اس نے ہندوستانی زبانوں کی فہرست بنانے کا کام شروع کیا جو تیس برسوں کے بعد لسانیاتی جائزۂ ہند کی شکل میں 1928 میں مکمل ہوا۔ یہ تصنیف 18 جلدوں پر مشتمل ہے جس میں 179 زبانوں اور 544 بولیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے لیے گریرسن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے لکھا ہے کہ

''ہند آریائی لسانیات میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ گریرسن کا عظیم الشان ''لسانیاتی جائزہ ہند'' ہے۔ گریرسن نے سب سے پہلے بالتفصیل ان قیاس آرائیوں کا ازالہ کیا ہے جو ہماری زبان کے کینڈے کے متعلق بغیر سوچے سمجھے کی گئی تھیں۔ اس نے ہند آریائی زبان کے تاریخی تسلسل کی نشان دہی کی اور جدید آریائی زبانوں کے باہمی رشتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اسی نے سب سے پہلے کھڑی بولی کو ایک مستقل بولی کی حیثیت بھی بخشی۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص2)

گریرسن نے ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور انھیں ہند آریائی خاندان میں شمار کیا ہے۔ لسانیاتی جائزۂ ہند کی نویں جلد 1916 میں شائع ہوئی جس میں گریرسن نے مغربی ہندی کی لسانی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ یہ اپ بھرنش شورسینی پراکرت کے علاقے میں بولی جانے والی اپ بھرنش ہے۔ شورسینی اپ بھرنش اس عہد کی بولیوں میں ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی اور اس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا۔ مسعود حسین خان ہندوستان کی تمام زبانوں میں سنسکرت کے بعد شورسینی کو اہمیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کا مرکز شورسین دیس (دوآبہ کا وسطی حصہ: متھرا) تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقہ میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو وہ یہی تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی اس چھٹ پٹ جھلک ملتی ہے۔ دراصل متھرا (دوآبہ گنگ وجمن) ہی وہ علاقہ ہے جہاں سنسکرت اور شورسینی پراکرت دونوں پروان چڑھتی ہیں۔ اس لیے دونوں میں نہایت قریب کا رشتہ نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے ہی اس نے مسلّم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص22)

مغربی ہندی اسی شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہے۔ مغربی ہندی دراصل کسی مخصوص زبان کا نام نہیں بلکہ یہ شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی پانچ بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ بولیاں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔ یہ پانچ بولیاں ہیں: (1) کھڑی بولی، (2) ہریانی (جاٹو یا بانگڑو)، (3) برج بھاشا، (4) قنوجی اور (5) بندیلی۔ ان سبھی بولیوں کو گریرسن نے مغربی ہندی کا اجتماعی نام دیا ہے کیونکہ یہ لسانیاتی اعتبار سے باہم مماثلت رکھتی ہیں۔ ان بولیوں کی اپنی صوتی اور صرفی ونحوی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس لسانی گروہ کو ایک علاحدہ اور ممتاز حیثیت دی گئی ہے۔ انھیں مغربی ہندی اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ مشرقی ہندی کے علاقے کے مغرب میں بولی جانے والی بولیاں ہیں۔ ''مشرقی ہندی'' کی لسانی اصطلاح بھی گریرسن نے استعمال کی ہے۔ مشرقی ہندی تین بولیوں کا ایک اجتماعی نام ہے جس میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی شامل ہیں اور یہ مغربی ہندی کے علاقے کے مشرق میں بولی جاتی ہیں۔

اپ بھرنشوں کے عہد کا خاتمہ دسویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اسی دور میں شورسینی اپ بھرنش کا بھی خاتمہ ہوا اور 1000 سن عیسوی تک

اس سے شمالی ہندوستان کی کئی زبانوں اور بولیوں نے جنم لیا۔ ان بولیوں میں ایک طرف پنجابی (مشرقی)، گجراتی اور راجستھانی ہیں تو دوسری طرف ان سے مختلف دہلی اور اس کے آس پاس کی بولیاں شامل ہیں۔ لسانی اختلاف کے باوجود ان سبھی کا ارتقا شورسینی اپ بھرنش سے ہی ہوا ہے۔ دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں کی نشاندہی سب سے پہلے امیر خسرو (1253-1325) نے اپنی مشہور مثنوی ''نہ سپہر'' (1318) کے تیسرے سپہر میں کی ہے۔ امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں اپنے عہد کے ہندوستان کی بارہ زبانوں کی فہرست دی ہے۔ مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب میں یہ فہرست اس طرح درج کی ہے

''(۱) سندھی، (۲) لاہوری (پنجابی)، (۳) کشمیری، (۴) کبر یا ڈگر؟، (۵) دھور سمندری (کنڑ۔ دور سمندر' کرناٹک کا ایک مشہور قدیم شہر تھا۔ موجودہ ہلے بید، (۶) تلنگی، (۷) گجر (گجراتی)، (۸) معبری (تمل، معبر) موجودہ اضلاع مدورا، رام ناداور تنے ویلی، (۹) گوری (مغربی بنگال کے گوڑیالکھنوتی کی زبان)، (۱۰) بنگال (اس سے مراد مشرقی بنگال کی زبان ہے)، (۱۱) اَود (اودھی)، (۱۲) ''دہلی و پیرامنش'' کی زبان یعنی زبانِ دہلوی اور اس کے نواح کی کھڑی بولی اور ہریانوی۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص ۷۸)

خسرو نے اپنے عہد کے ہندوستان کی گیارہ زبانوں کے علاوہ بارھویں زبان کا نام ''دہلی و پیرامنش''، یعنی دہلی اور اس کے نواح کی زبان بتائی ہے۔ خسرو ہندوستان کی سبھی بارہ زبانوں کو ہندوی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی زبان کو ہندوی کے علاوہ ''ہندی'' بھی کہا گیا ہے۔ یہ دونوں نام شورسینی اپ بھرنش سے 1000ء کے بعد وجود میں آنے والی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں کے لیے ہی استعمال کیے گیے ہیں۔ یہ بولیاں کھڑی بولی اور ہریانی (جاٹو یا بانگڑو) ہیں۔ ان میں کھڑی بولی دہلی کے شمال مشرق میں بولی جاتی ہے جب کہ ہریانوی دہلی کے مغرب میں۔ ان زبانوں کو ''دہلوی'' بھی کہا گیا ہے کیونکہ دہلی میں جمنا کے دونوں جانب یہی بولیاں ہیں جو ایک دوسرے سے ملتی بھی ہیں اور متاثر بھی کرتی ہیں۔ ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق مغربی ہندی کی ان دو بولیوں میں مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد عربی و فارسی الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دہلی و نواحِ دہلی کی اسی زبان کے تین نام دہلوی، ہندوی اور ہندی ہیں۔ شمالی ہند میں آنے والے مسلمان فاتحین نے ہندوستان کی مناسبت سے یہاں کی بولیوں کو 'ہندی' کے نام سے موسوم کیا۔ گریرسن نے شمالی ہند کی ان ہی بولیوں کو علاقائی بنیاد پر دو گروہ میں تقسیم کر کے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی کے نام دیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''گریرسن نے مسلمانوں کے دیے ہوئے اسی لفظ ''ہندی'' کو لے کر اس کا دائرہ بڑھا دیا اور اس کے تحت ہریانہ، دہلی، اتر پردیش، اترا کھنڈ، مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کے وسیع علاقے میں بولی جانے والی آٹھ بولیوں کو شامل کر لیا جن میں تین بولیاں: اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی 'مشرقی ہندی' کہلائیں اور بقیہ پانچ بولیوں: کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کو 'مغربی ہندی' کے نام سے موسوم کیا گیا۔''
>
> (اردو کی لسانی تشکیل، ص 155)

ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے دہلی اور نواح کی بولیوں میں مغربی ہندی کی تین بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا کو شامل کیا ہے اور قدیم اردو پر ان کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح گریرسن کے لسانی گروہ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سے تین اہم بولیوں کا تعلق خسرو کی اصطلاح ''دہلی اور پیرامنش'' سے ہے جسے ہندوی، ہندی اور دہلوی کا نام دیا گیا ہے۔ مغربی ہندی کی سب سے

بڑی اہمیت یہ ہے کہ سبھی ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا کا تعلق اسی مغربی ہندی کی بولیوں سے ہے۔اس طرح اردو کا تعلق مغربی ہندی کے توسط سے شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے استوار ہوتا ہے۔ اردو کے علاوہ شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کا آغاز بھی اسی مغربی ہندی سے ہوا ہے۔

2.2.2 مغربی ہندی کا علاقہ؛

گریرسن کے مطابق ہندوستان میں آریا الگ الگ گروہوں کی شکل میں آئے۔ان کا پہلا گروہ ہندوستان کے جس علاقے میں آباد ہوا وہ مدھیہ دیش یا وسطی علاقہ تھا۔اسی علاقے میں قدیم ہند آریائی دور(1500 سے 500 قبل مسیح) کی سنسکرت کی معیاری شکل کا ارتقا ہوا تھا۔وسطی ہند آریائی دور(500ق م سے 1000 سن عیسوی) میں شورسینی پراکرت اورشورسینی اپ بھرنش کا فروغ بھی اسی علاقے میں ہوا۔شور سینی اپ بھرنش سارے شمالی ہند کی لنگوا فرینکا کی حیثیت رکھتی تھی جو گجرات اور مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔ 1000ء کے بعدجدید ہند آریائی دور میں شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی متعدد بولیوں کا تعلق بھی مدھیہ دیش کے علاقے سے ہے۔ان جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں میں مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اورقنوجی کے علاوہ پنجابی (مشرقی)، گجراتی اور راجستھانی کا ارتقا ہوا۔اس طرح مغربی ہندی کا علاقہ لسانی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے اہم علاقہ مدھیہ دیش ہے ۔ یہ علاقہ موجودہ ہندوستان کی پانچ ریاستوں ہریانہ، دہلی، اتر پردیش، اترا کھنڈ اور مدھیہ پردیش پر مشتمل ہے۔اگر ہم دیگرجدید ہند آریائی زبانوں اورمغربی ہندی کے علاقے کو دیکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان بولی جاتی ہے اور جنوب مشرق میں مراٹھی اورمشرقی ہندی کی بولیاں ہیں۔شمال میں یہ پہاڑی بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔مسعود حسین خاں نے مدھیہ دیش کو ہی مغربی ہندی کا علاقہ قرار دیا ہے۔

''مغربی ہندی کے حدود تقریباً وہی ہیں جو مدھیہ دیش کے ہیں۔ یہ مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک، شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیاچل اور بندیلکھنڈ تک بولی جاتی ہے۔اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اور جنوب، جنوب مشرق میں مراٹھی اورمشرقی ہندی۔شمال میں یہ پہاڑی بولیوں (جونسری، گڑھوالی اور کمایونی) سے گھری ہوئی ہے۔اندرونی زبان کی شاخ میں صرف مغربی ہندی ایسی زبان ہے جسے ہم خالص اندرونی زبان کہہ سکتے ہیں بلکہ اگر پنجابی، راجستھانی اور گجراتی کی ملواں حیثیت پر نظر رکھیں تو اندرونی گروہ کی نمائندہ محض مغربی ہندی ہے۔مغربی ہندی کا یہ نام مدھیہ دیس کی زبان کو گریرسن نے دیا ہے، جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔مغربی ہندی مدھیہ دیش کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے، کیونکہ اسی علاقہ میں سنسکرت شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش پروان چڑھتی ہیں جن کی سچی جانشین اس علاقے کی جدید بولیاں کھڑی بولی (ہندوستانی)، برج بھاشا، ہریانی، بندیلی اور قنوجی ہیں جن کے مجموعے کو گریرسن مغربی ہندی کا جدید نام دیتا ہے۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو،ص ۵۶)

2.2.3 مغربی ہندی کی بولیوں کی ساخت؛

شورسینی اپ بھرنش اپنے آخری دور میں دو نمایاں شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔پہلی شکل میں افعال و اسما کا اختتام عام طور سے الف (ا) پر ہوتا ہے اور دوسری شکل میں واؤ (و) پر۔اس لیے مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اورقنوجی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ان میں پہلی قسم الف (ا) کی شکل رکھنے والی بولیاں ہیں جب کہ دوسری قسم واؤ (و) کو ترجیح دینے والی بولیاں ہیں۔ساخت

کی بنیاد پر مغربی ہندی کی بولیوں کی تقسیم درج ذیل ہے۔

1۔ الف یعنی طویل مصوتے پر ختم ہونے والی بولیاں:

مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ الف (ا) یعنی طویل مصوتوں پر ہوتا ہے ان میں ہریانی اور کھڑی بولی شامل ہیں۔ مثلاً بیٹا/ گھوڑا (اسم)، میرا/ تمہارا (ضمیر)، بڑا/ اچھا (صفت)، آیا/ گیا/ کہنا (فعل) وغیرہ۔

2۔ واؤ (و) مصوتے پر ختم ہونے والی بولیاں:

مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ واؤ (و) مصوتوں پر ہوتا ہے ان میں برج بھاشا' بندیلی اور قنوجی شامل ہیں۔ مثلاً

بیٹو (اسم)، میرو/ تمہارو (ضمیر)، آیو/ گیو/ کہیو (فعل) وغیرہ۔

مغربی ہندی کی بولیوں کا لسانی رشتہ براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے اس لیے شورسینی اپ بھرنش کے آخری دور کے ادبی نمونوں میں مغربی ہندی کی بولیوں کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں کچھ ایسی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات ہیں جس کی بنا پر یہ دوسری بولیوں سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ ان بولیوں کا رجحان تفصیلی یا تحلیلی (Analytical) ہے۔ یہ رجحان کھڑی بولی میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے کھڑی بولی کی معیاری اور ترقی یافتہ شکل اردو کی ساخت بھی ایک تحلیلی ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق اردو کے تحلیلی رجحان کی مثال یہ ہے کہ اس زبان میں اسم کی صرف ایک حالت ملتی ہے اور اسم کی دیگر حالتیں حروف کی مدد سے بنائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو میں فعل کے لیے صرف ایک زمانہ ہے لہٰذا فعل کی بقیہ تمام شکلیں امدادی افعال اور لاحقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ مغربی ہندی کی اصطلاح سب سے پہلے کس ماہر لسانیات نے استعمال کی؟

2۔ گریرسن کی مشہور تصنیف کا نام کیا ہے؟

2.3 مغربی ہندی کی بولیاں اور ان کی خصوصیات

2.3.1 کھڑی بولی؛

کھڑی بولی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں میں ایک اہم بولی ہے۔ یہ دہلی کے شمال مشرق کی بولی ہے جس کا علاقہ جمنا پار کرتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جمنا کے مشرق میں دریائے گنگا ہے اس لیے اس علاقے کو بالائی دوآبہ کہا جاتا ہے۔ گنگا کے مشرق اور مغرب میں کھڑی بولی کا خاص علاقہ ہے جو مغربی اتر پردیش کے کئی اضلاع پر مشتمل ہے۔ ان اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے اور ان کی تہذیب و ثقافت کے گہرے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ کھڑی بولی کی کئی شکلیں ہیں جن میں سے دو کی نشاندہی گریرسن نے کی ہے۔ اس کی ایک شکل گنگا کے مشرقی جانب مرادآباد، بجنور، رام پور اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ اس کی دوسری شکل گنگا کے مغرب میں میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کی بولی ہے۔ مظفر نگر میں تشدید کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور افعال کی صورت یہ ہے کہ ''میں مارتا ہوں'' کے ساتھ ''میں ماروں ہوں'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسما کی جمع (اں) سے بنائی جاتی ہے مثلاً عورتاں، قلماں، مکاناں وغیرہ۔ ضمیر میں تیرا کی جگہ تجھ مجھ کا استعمال بھی ملتا ہے۔

کھڑی بولی شمال میں دہرہ دون اور اترا کھنڈ کے میدانی علاقے میں بھی بولی جاتی ہے۔اس کے علاوہ ضلع انبالہ کی تحصیل انبالہ اور ضلع بلند شہر کے شمالی حصے میں یہ رائج ہے۔کھڑی بولی کے شمال میں پہاڑی بولیوں کا علاقہ ہے۔اس کے شمال مغرب میں ہریانوی، جنوب میں برج بھاشا اور جنوب مشرق میں قنوجی بولی جاتی ہے۔اس طرح کھڑی بولی کے علاقے کے تین جانب مغربی ہندی کی بولیوں کا علاقہ ہے۔مسعود حسین خاں نے مغربی روہیل کھنڈ کے اضلاع بجنور، مراد آباد اور رام پور کی کھڑی بولی کو معیاری اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے۔وہ اس بولی کے نام 'کھڑی' کے بارے میں لکھتے ہیں:

>''اس کا کھڑی نام بہت پرانا نہیں۔ پریم ساگر کے مصنف للّو لال کوی نے 1803ء میں برج بھاشا سے امتیاز کرنے کے لیے اسے استعمال کیا تھا۔گریرسن نے ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' (جلد نہم حصہ اول) میں اسی بولی کو ''ورناکلر ہندستانی'' کے نام سے یاد کیا جس کی دو ادبی شکلیں ہیں: اردو اور ہندی۔''
>
>(مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص 247)

کھڑی بولی دوسری بولیوں کے مقابلے میں قدیم ترین ہے۔یہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی میرٹھ اور اس کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔اس بولی کی جھلک اپ بھرنش کی قدیم ترین تصنیفات میں ملتی ہے۔اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ یہ اپنے علاقے سے آگے بڑھ کر پنجابی کو بھی متاثر کرتی رہی ہے۔لیکن پندرہویں صدی سے قبل اس بولی کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہے۔دکن میں اس کا پہلا مستند نمونہ ملتا ہے جو فخر دین نظامی بیدری کی تصنیف ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' (1421 سے 1445 کے درمیان) کی شکل میں موجود ہے۔شمالی ہند میں امیر خسرو کے غیر مستند ہندوی کلام کے علاوہ صوفیا کرام کے چند فقرے ہی ملتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند جین نے اس کا نام ''کھڑی'' ہونے کی وجوہات اپنی تصنیف ''عام لسانیات'' میں درج ذیل بتائی ہیں:

1۔ برج کے مقابلے میں کھڑی کا لہجہ (ا) کا ہے اس لیے اسے کھڑی کہا گیا ہے۔اس کے مقابلے میں برج کو جس کا لہجہ (او) کا ہے ''پڑی'' سمجھا گیا۔

2۔ برج کے مقابلے میں کھڑی میں تشدید کا رجحان زیادہ ہے اور معکوسی مصمتے ڈ، ڑ کا استعمال بھی زیادہ ہے۔برج میں کھڑی کا ڈ کئی موقعوں پر ڑ یا ر ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے برج میں شیرینی آ گئی ہے۔

3۔ تیسری توجیہہ کے مطابق کھڑی دراصل کھری ہے۔کھری بولی یعنی صاف ستھری فصیح۔

کھڑی بولی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اردو جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے' براہ راست کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کھڑی بولی کا ہی نکھرا ہوا روپ ہے اور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔پروفیسر گیان چند جین اپنے ایک مقالے ''اردو کے آغاز کے نظریے'' میں اسی بات پر شدت کے ساتھ زور دیتے ہیں کہ ''اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔'' اردو کی اصل و اساس کھڑی بولی ہے اور اس کا ڈھانچہ اور کینڈا سب کچھ کھڑی بولی کا ہے۔اردو کے ماخذ کے سلسلہ میں اکثر عالموں کا کھڑی بولی پر اتفاق ہے جو دوآبے کے علاقے کی شور سینی اپ بھرنش کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔اردو میں اگرچہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کھڑی بولی سے پیدا ہوئی۔ جس زمانے میں شمالی ہندوستان میں سیاسی طور پر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں' اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں بعض ایسی بولیاں سر اٹھا رہی تھیں

جن کے بہت سے لفظوں کا ڈھانچا کھڑا تھا یعنی جن کے بیشتر الفاظ ''الف'' یا ' آ'' کی آواز پر ختم ہوتے تھے۔ کھڑی بولی ان میں سے ایک ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے بھی اردو کو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

''اردو کا ارتقا کھڑی بولی سے ہی ہوا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کھڑی بولی نے ہی اردو کا روپ اختیار کر لیا اور دھیرے دھیرے معیاری اور ترقی یافتہ بنتی گئی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو کھڑی بولی اور اردو دونوں ایک ہی ہیں۔ ہر چند کہ قدیم اردو بالخصوص دکنی اردو پر ہریانوی کے بھی اثرات ہیں، لیکن اردو کا بنیادی ڈھانچہ اور کینڈا کھڑی بولی ہی کا ہے۔ زمانۂ حال کی ہندی بھی جو ناگری یا دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے، کھڑی بولی سے ہی پیدا ہوئی ہے لیکن اس کا ادبی ارتقا اردو کے ادبی ارتقا کے بعد ہوا ہے۔'' (اردو کی لسانی تشکیل، ص ۱۵۸)

2.3.2 ہریانوی؛

مغربی ہندی کی ایک اور بولی ہریانوی ہے جو دہلی کے شمال مغرب میں واقع ہریانہ صوبہ میں بولی جاتی ہے۔ ہریانہ کے اضلاع رہتک، حصار اور کرنال خالص ہریانوی کے علاقے ہیں۔ ہریانوی کے شمال میں پنجابی، شمال مشرق میں کھڑی بولی اور جنوب مغرب میں راجستھانی بولی جاتی ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے ہریانوی بولی کے دوسرے نام بھی بتائے ہیں:

''ہریانوی کا دوسرا نام 'بانگڑو' ہے۔ اسے 'جاٹو' بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس کے بولنے والوں میں جاٹوں کی اکثریت ہے۔ یہ موجودہ صوبۂ ہریانہ کی بولی ہے جو دہلی کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں بھی جاٹوں کی کثیر آبادی ہے جو ہریانوی ہی بولتی ہے، لیکن اسے یہاں جاٹو ہی کہتے ہیں۔'' (اردو کی لسانی تشکیل، ص ۱۵۹)

ہریانوی سب سے زیادہ پنجابی سے متاثر ہے۔ جیسے جیسے معیاری اردو کا ارتقا ہوا اُس میں ہریانوی کے اثرات کم ہوتے چلے گئے۔ ہریانوی مغربی ہندی کی دوسری اہم بولی ہے جس نے اردو کی ابتدا اور ارتقا میں بنیاد کا کام کیا ہے۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی جن بولیوں سے اردو سب سے زیادہ متاثر ہوئی ان میں ہریانوی بھی ہے۔ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے قدیم اردو پر ہریانوی کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑے ہیں۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص241)

2.3.3 برج بھاشا؛

برج بھاشا کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی مانا جاتا ہے۔ یوں تو مغربی ہندی کی سبھی بولیوں کا رشتہ شورسینی اپ بھرنش سے ہے لیکن ان میں برج بھاشا کو فوقیت حاصل ہے اور یہ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کہی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برج بھاشا مغربی ہندی کی دیگر چار بولیوں کے مقابلے میں شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کی مجموعی خصوصیات کی زیادہ حامل رہی ہے۔ لفظ برج کی نسبت گائے سے ہے جو شورسین علاقے میں مقدس مانی جاتی ہے۔ شورسین متھرا کے علاقے کا قدیم نام ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ علاقہ مذہبی لحاظ سے بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے متھرا ہندو مذہب اور تہذیب کا قدیم مرکز رہا ہے۔ ہندو مذہب کے فروغ کے لیے استعمال ہونے والی زبان سنسکرت کا بھی علاقہ متھرا ہی رہا ہے۔ اسی لیے برج بھاشا پر سنسکرت کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ برج بھاشا کو شورسینی کی سچی جانشین کہنے کی تین

اہم وجوہات ہیں:

1۔ برج بھاشا ادبی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش میں تخلیق ہونے والے ادب کے بعد ہندوستان کی جس بولی میں سب سے زیادہ ادب تخلیق ہوا وہ برج بھاشا ہے۔ دوسری بولیوں میں ادب کی تخلیق بہت بعد میں ہوئی۔

2۔ برج بھاشا کا تعلق بھگتی تحریک سے رہا ہے۔ جس طرح پالی کی اہمیت بدھ مت کی تبلیغ کے لیے استعمال ہونے کی وجہ سے تھی اسی طرح برج بھاشا بھی بھگتی کی تحریک سے وابستہ ہوکر دور دور تک پھیل گئی۔ اس تحریک کے مبلغین نے برج بھاشا میں ہی اپنی تعلیمات کو عام کیا۔ شورسینی اپ بھرنش کی طرح اس کی سچی جانشین برج کے اثرات بھی ملک گیر تھے۔ یہ بھگتی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی جس کا مرکز متھرا تھا۔ متھرا کا تعلق کرشن سے ہے اور یہ تحریک بنیادی طور پر کرشن بھگتی کی تحریک تھی۔ کرشن بھگتی کا پورا ادبی سرمایہ برج بھاشا میں ہی محفوظ ہے۔ سورداس جیسے مشہور کرشن بھکت شاعر نے اسی زبان میں شاعری کی۔ برج بھاشا کے اس شاعر کو آج کے ہندی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

3۔ برج بھاشا اپنے عروج پر تب پہنچی جب مغل بادشاہ اکبر نے دارالسلطنت دہلی سے آگرہ منتقل کیا۔ اکبر کے بعد شاہجہاں نے اپنی راجدھانی دوبارہ دہلی منتقل کر لی۔ لیکن اکبر اور شاہجہاں کے دور حکومت کے بڑے حصے میں آگرہ دارالحکومت رہا۔ اس وقت برج بھاشا کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور برج کے مشہور شاعر عبدالرحیم خانخاناں اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ بادشاہ اکبر برج بھاشا کو پسند کرتا تھا اور اس نے اس زبان میں دوہے بھی کہے ہیں۔ اکبر کی اس سرپرستی کی وجہ سے اس دور میں برج بھاشا شمالی ہند کی اعلیٰ ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

برج بھاشا کا علاقہ مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ یہ جن اضلاع کی خاص بولی ہے ان میں بلندشہر، متھرا اور آگرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ متھرا کے جنوب میں یہ فیروز آباد، بھرت پور، دھول پور، گوالیار اور جے پور کے مشرقی حصوں میں بولی جاتی ہے۔ متھرا کے شمال مشرق میں ایٹہ، علی گڑھ، مین پوری، بدایوں اور بریلی وغیرہ اضلاع بھی برج بھاشا کے علاقے میں شامل ہیں۔ گڑگاؤں کے مشرقی حصے میں بھی یہ رائج ہے اور راجستھانی کی ایک بولی میواتی سے متاثر ہے۔ اسی طرح بلندشہر کی برج بھاشا کھڑی بولی سے گھلی ملی ہے۔ برج بھاشا مغربی ہندی کی بولیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتی ہے جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ واؤ (و) پر ہوتا ہے۔ مثلاً بیٹو (اسم)، میرو (ضمیر)، کہیو (فعل) وغیرہ۔ ساخت کے لحاظ سے اردو اور برج بھاشا بالکل مختلف زبانیں ہیں لیکن اردو کے ارتقا میں برج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ برج بھاشا کا لسانیاتی رشتہ نہ صرف قدیم اردو سے رہا ہے بلکہ بقول مسعود حسین خاں جدید اردو کے معیاری لہجے پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔ گریرسن نے برج بھاشا کے بارے میں لکھا ہے کہ

''دراصل ضلع متھرا کی زبان ہے جہاں سے نکل کر اس نے بہت وسعت اختیار کر لی ہے۔ یعنی جنوب میں تمام ضلع آگرہ، اکثر علاقہ ریاست بھرتپور، دھولپور اور قرولی، مغربی علاقہ ریاست گوالیر اور مشرقی ریاست جے پور میں پھیلی ہوئی ہے۔ شمالاً گڑگانوہ کے مشرقی حصہ میں۔ شمال مشرق میں دوآبہ، بلندشہر، علی گڑھ، ایٹہ، مین پوری میں اور گنگا پار، بدایوں، بریلی اور ترائی پرگنہ نینی تال میں بولی جاتی ہے اور مختلف مقامات پر مختلف نام رکھ دیے گئے ہیں۔ مثلاً مشرقی علاقہ میں جہاں قنوجی زبان سے اس کا اتصال ہوتا ہے، انتر بیدی کہا جاتا ہے۔ گوالیار کے

شمال مشرقی گوشہ میں جودھپور کے متوازی ہے اور جہاں سیکرواڑ راجپوت آباد ہیں۔ سیکرواڑی، قرولی کے میدانی علاقہ اور بعض علاقہ گوالیار میں چمبل پار جادوبانی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس علاقہ میں اس نام کی راجپوت قوم آباد ہے۔ بھرت پور کے جنوبی علاقہ قرولی خاص اور مشرقی علاقہ جے پور جوڈانگ کے نام سے موسوم ہے ڈانگی کہتے ہیں۔ اور پھر اس کی مقامی تین تقسیمیں ہیں یعنی ڈونگرواڑا، کالی مال اور ڈہانگ۔ علاقہ نینی تال میں اس کا نام بھکسا ہے۔ قدیم زمانہ سے برج بھاشہ نے شاعری کی گود میں پرورش پائی ہے اور ہندستان کے بعض مشہور شاعر اسی زبان میں لکھتے رہے ہیں۔ وٹھلناتھ، سورداس، نابھداس، دیودت اور بہاری لال بے حد مشہور ہیں۔'' (بحوالہ پنجاب میں اردو، ص ۱۰۸)

2.3.4 قنوجی؛

مغربی ہندی کی اس بولی کا نام قنوج شہر کی مناسبت سے قنوجی رکھا گیا ہے۔ قنوج ایک تاریخی شہر ہے جس کا ذکر رامائن جیسی قدیم کہانی میں ملتا ہے۔ یہ شہر یو پی کے فرخ آباد ضلع میں واقع ہے۔ محمد غوری کے ہاتھوں راٹھور خاندان کے آخری راجا جے چند کی شکست کے بعد یہ تاریخی شہر اجڑ گیا۔ قنوجی آج بھی ایٹہ، فرخ آباد اور شاہجہاں پور میں بولی جاتی ہے۔ اس کا علاقہ اٹاوہ، کانپور، ہردوئی اور شاہجہاں پور کے شمال میں پیلی بھیت تک پھیلا ہے۔ قنوجی کے شمال، شمال مغرب اور مغرب میں برج بھاشا کا علاقہ ہے۔ مشرق اور شمال مشرق میں اودھی اور جنوب میں بندیلی رائج ہے۔

قنوجی پر برج بھاشا کے اثرات اس قدر غالب رہے ہیں کہ یہ کبھی اپنی الگ پہچان نہیں بنا سکی۔ برج اور قنوجی کی قواعد میں کئی مماثلیں ہیں اور ان دونوں میں گہرا لسانی رشتہ بھی ہے۔ برج اور قنوجی دونوں کے مصمتوں کے آخر میں (وا) بڑھا دیا جاتا ہے مثلاً کھڑی کا لفظ ’گھر‘ برج اور قنوجی میں ’گھروا‘ ہو جاتا ہے۔

2.3.5 بندیلی؛

مغربی ہندی کی بولی بندیلی کا تعلق بندیل کھنڈ سے ہے۔ یو پی کے اضلاع باندا، ہمیر پور، جالون، جھانسی اور مدھیہ پردیش کے چند شمالی اضلاع بندیل کھنڈ کے علاقے میں شامل ہیں۔ یہ شمال میں آگرہ، مین پوری اور ایٹہ تک رائج ہے جب کہ شمال مغرب میں قنوجی اور برج بھاشا سے اس کی سرحد ملتی ہے۔ اس کے مشرق میں بگھیلی، جنوب میں مراٹھی اور جنوب مغرب میں راجستھانی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بندیل کھنڈ کے باہر بھی بندیلی بولی جاتی ہے۔ اس بولی میں ادب بالخصوص عوامی ادب کا وسیع سرمایہ موجود ہے۔ عوامی ادب میں آلھا اودل کے منظوم رزمیہ قصے بہت مشہور اور مقبول ہیں جنہیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے علاقوں میں آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔ بندیلی کی لسانیاتی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معکوسی ’ڑ‘ کے بجائے سادہ ’ر‘ کا استعمال رائج ہے جیسے کپڑا کو کپرا بولتے ہیں۔ لفظ ’بہت‘ کا تلفظ بندیلی میں ’بھوت‘ کیا جاتا ہے۔

مغربی ہندی کی یہ سبھی پانچ بولیاں جدید ہند آریائی دور کی اہم بولیاں ہیں جنہوں نے شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کی ابتدا اور ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو زبان کے لسانیاتی مطالعے کے لیے ان بولیوں کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ ان کا تعلق نہ صرف اردو زبان کی ابتدا سے ہے بلکہ یہ اردو کے ارتقائی سفر پر بھی اثر انداز رہی ہیں۔ اردو زبان کے ارتقا میں مغربی ہندی کی بولیوں کی بہت اہمیت رہی ہے۔ یہ آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ ان بولیوں کے علاقے میں اردو آج بھی رابطے کی اہم زبان ہے۔ اس طرح اردو اور مغربی ہندی کی ان بولیوں کا رشتہ قائم ودائم ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ مغربی ہندی کی بولیاں کون سی ہیں؟

2۔ کس علاقے کو بالائی دوآبہ کہا جاتا ہے؟

3۔ کھڑی بولی کی کتنی شکلیں ہیں؟

4۔ مغربی ہندی کی قدیم ترین بولی کون سی ہے؟

5۔ کھڑی بولی کا تعلق کس جدید زبان سے براہ راست ہے؟

6۔ ہریانوی کے دو اور نام کیا ہیں؟

7۔ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کس بولی کو کہا جاتا ہے؟

8۔ قنوجی ہندوستان کے کس علاقے کی بولی ہے؟

9۔ آلھا اودل قصے کا تعلق مغربی ہندی کی کس بولی سے ہے؟

2.4 اکتسابی نتائج

☆ مغربی ہندی ایک لسانی اصطلاح ہے جس کا استعمال سب سے پہلے مشہور ماہر لسانیات جارج ابراہم گریرسن نے کیا تھا۔

☆ گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف لسانیاتی جائزۂ ہند میں مغربی ہندی کی بولیوں کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔

☆ لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔

☆ شورسینی اپ بھرنش، شورسینی پراکرت کے علاقے میں بولی جانے والی اپ بھرنش ہے۔

☆ مغربی ہندی دراصل کسی مخصوص زبان کا نام نہیں بلکہ یہ شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی پانچ بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔

☆ مغربی ہندی کی بولیاں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

☆ مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں: (1) کھڑی بولی، (2) ہریانی (جاٹو یا بانگڑو)، (3) برج بھاشا، (4) قنوجی اور (5) بندیلی۔

☆ مغربی ہندی کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اکثر ماہرین لسانیات کے مطابق اردو کی ابتدا کا تعلق مغربی ہندی کی بولیوں سے ہے۔

☆ مغربی ہندی کا علاقہ وہی ہے جو آریوں کی آمد کے بعد معیاری سنسکرت، شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کا علاقہ رہا ہے۔

☆ مغربی ہندی کا علاقہ لسانی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے اہم علاقہ مدھیہ دیش ہے۔

☆ مغربی ہندی کا علاقہ موجودہ ہندوستان کی پانچ ریاستوں ہریانہ، دہلی، اترپردیش، اتراکھنڈ اور مدھیہ پردیش پر مشتمل ہے۔

☆ شورسینی اپ بھرنش اپنے آخری دور میں دو نمایاں شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی شکل میں افعال و اسما کا اختتام عام طور سے الف (ا) پر ہوتا ہے اور دوسری شکل میں واؤ (و) پر۔

☆ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ الف (ا) پر ہوتا ہے ان میں ہریانی اور کھڑی بولی شامل ہیں۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ واؤ (و) پر ہوتا ہے ان میں برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی شامل ہیں۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں میں کچھ ایسی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات ہیں جس کی بنا پر یہ دوسری بولیوں سے مختلف اور ممتاز ہیں۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں کا رجحان تفصیلی یا تحلیلی ہے۔

☆ تفصیلی یا تحلیلی رجحان کھڑی بولی میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

☆ مغربی ہندی کی ایک اہم بولی کھڑی ہے۔ کھڑی بولی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں میں ایک اہم بولی ہے۔

☆ گریرسن نے کھڑی بولی کی دو شکلوں کی نشاندہی کی ہے۔

☆ کھڑی بولی کی ایک شکل گنگا کے مشرقی جانب مرادآباد، بجنور، رام پور اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

☆ کھڑی بولی کی دوسری شکل گنگا کے مغرب میں میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کی بولی ہے۔

☆ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے مغربی روہیل کھنڈ کے اضلاع بجنور، مرادآباد اور رام پور کی کھڑی بولی کو معیاری اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے۔

☆ کھڑی بولی کی سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اردو جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے، براہ راست کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے۔

☆ مغربی ہندی کی ایک بولی ہریانوی ہے جو دہلی کے شمال مغرب میں واقع ہریانہ صوبہ میں بولی جاتی ہے۔

☆ ہریانوی مغربی ہندی کی دوسری اہم بولی ہے جس نے اردو کی ابتدا اور ارتقا میں بنیاد کا کام کیا ہے۔

☆ برج بھاشا کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی مانا جاتا ہے۔

☆ برج بھاشا شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کہی جاتی ہے۔

☆ برج بھاشا کا مرکز متھرا ہے جو ہندو مذہب اور تہذیب کا قدیم مرکز رہا ہے۔

☆ برج بھاشا ادبی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔

☆ برج بھاشا کا تعلق بھگتی تحریک سے رہا ہے۔

☆ شورسینی اپ بھرنش کی طرح اس کی سچی جانشین برج کے اثرات بھی ملک گیر تھے۔

☆ برج بھاشا کا علاقہ مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ یہ بلند شہر، متھرا اور آگرہ اضلاع کی خاص بولی ہے۔

☆ اردو کے ارتقا میں برج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

☆ مغربی ہندی کی ایک اور بولی قنوجی ہے۔ اس بولی کا نام قنوج شہر کی مناسبت سے قنوجی رکھا گیا ہے۔

☆ قنوج ایک تاریخی شہر ہے جس کا ذکر راماین جیسی قدیم کہانی میں ملتا ہے۔ یہ شہر یو پی کے فرخ آباد ضلع میں واقع ہے۔
☆ قنوجی آج بھی ایٹہ، فرخ آباد اور شاہجہاں پور میں بولی جاتی ہے۔
☆ برج اور قنوجی کی قواعد میں کئی مماثلیں ہیں اور ان دونوں میں گہرا لسانیاتی رشتہ بھی ہے۔
☆ مغربی ہندی کی بولی بندیلی کا تعلق بندیل کھنڈ سے ہے۔ یو پی کے باندا، ہمیر پور، جالون، جھانسی اضلاع اور مدھیہ پردیش کے چند شمالی اضلاع اس کے علاقے میں شامل ہیں۔
☆ بندیلی میں عوامی ادب کا وسیع سرمایہ موجود ہے۔
☆ بندیلی کے عوامی ادب میں آلھا اودل کے منظوم رزمیہ قصے بہت مشہور اور مقبول ہیں جنہیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے علاقوں آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔
☆ مغربی ہندی کی سبھی پانچ بولیوں نے شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے۔
☆ مغربی ہندی کی سبھی بولیاں آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

2.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
ساخت	بناوٹ
مماثلت	یکسانیت، مشابہت، مانند ہونا
باہم	آپس میں
صوتی	آواز سے متعلق، علم صوت سے متعلق
صرفی	صرف سے متعلق (علم صرف میں حروف وحرکات کے تغیر وتبدل، کلمات کے بنانے کے قاعدے، اسم اور فعل کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے)
نحوی	علم نحو سے متعلق (جس میں کلمات کو ترتیب دینے اور ان کو جدا جدا کرنے کے طور طریق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک کلمے کا دوسرے کلمے سے ربط وتعلق کیا ہے)
پیرامنش	گرد، اطراف
ہندوی	ہندوستان سے تعلق رکھنے والی زبان
جنم	پیدائش
مصوتے	Vowels، حروف علت جیسے الف، و، ی
مصمتے	Consonent، حروف صحیح جیسے ب، ج، د، ر، ک وغیرہ
لنگوافرینکا	کسی ملک کے مختلف علاقوں میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان، کسی ملک کے وسیع علاقے میں

	رابطے کی زبان، بین الاقوامی زبان
مدھیہ دیش	وسطی علاقہ، ملک کا مرکزی خطہ
تحلیلی	تجزیاتی
رائج	جس کا رواج ہو، جس کا چلن ہو
لاحقہ	لفظ کے آخر میں اضافہ کرنا، کسی لفظ کے آخر میں چند حروف شامل کر کے نیا لفظ بنانا جیسے قلم کے ساتھ دان کا لاحقہ لگا کر قلمدان
ورناکلر	مقامی زبان
فصیح	خوش کلامی، خوش بیانی
جانشین	قائم مقام، کسی کی جگہ پر بیٹھنے والا
مشابہ	مانند، مثل، نظیر، ہم شکل، یکساں
ضمائر	ضمیر کی جمع مختصر اسم
دوآبہ	دو دریاؤں کا درمیانی علاقہ، گنگا اور جمنا کے بیچ کا علاقہ
معکوسی مصمتے	دراوڑی زبان کی آوازیں جیسے ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ
رزمیہ	رزم سے متعلق، جنگ کا قصہ
فوقیت	برتری، غلبہ
گروہ	زمرہ، درجہ، گروپ
مقدس	محترم، عزت اور بزرگی کا حامل
خاندان السنہ	زبانوں کا خاندان

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مغربی ہندی کی اصطلاح سب سے پہلے کس ماہر لسانیات نے استعمال کی؟

2۔ گریرسن کی مشہور تصنیف کا نام کیا ہے؟

3۔ مغربی ہندی میں کتنی بولیاں شامل ہیں؟

4۔ مغربی ہندی کا تعلق ہندوستان کے کس علاقے سے ہے؟

5۔ آلھا اودل کا منظوم رزمیہ کا تعلق مغربی ہندی کی کس بولی سے ہے؟

6۔ ہریانوی کے دو اور نام کیا ہیں؟

7۔ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کس بولی کو کہا جاتا ہے؟

8۔ قنوجی ہندوستان کے کس علاقے کی بولی ہے؟

9۔ مغربی ہندی کی کس بولی کا تعلق بندیل کھنڈ سے ہے؟

10۔ مغربی ہندی کی بولیوں کو کتنے گروہ میں تقسیم کیا گیا ہے؟

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ مغربی ہندی کا مفصل تعارف پیش کیجیے۔

2۔ مغربی ہندی کی ساخت اوراس کے علاقے پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مغربی ہندی کی تین بولیوں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

4۔ برج بھاشا کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی کیوں کہا جاتا ہے، لکھیے۔

5۔ ہندوستانی زبانوں کے لیے گریرسن کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ مغربی ہندی کی بولیوں کا اردو سے کیا تعلق ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔

2۔ مغربی ہندی اورشورسینی اپ بھرنش کے رشتے پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ کھڑی بولی کی خصوصیات اوراس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

2.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ اردو کی لسانی تشکیل — مرزا خلیل احمد بیگ

2۔ اردو زبان کی تاریخ — مرزا خلیل احمد بیگ

3۔ مقدمۂ تاریخ زبان اردو (آٹھواں ایڈیشن) — مسعود حسین خاں

4۔ ہندوستانی لسانیات — ڈاکٹر محی الدین قادری زور

5۔ اردو زبان: تاریخ، تقدیر، تشکیل — مسعود حسین خاں

6۔ مضامین مسعود — مسعود حسین خاں

7۔ ہند آریائی اور ہندی — سنیتی کمار چٹر جی مترجم عتیق احمد صدیقی

8۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ — احتشام حسین

9۔ اردو لسانیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری

10۔ اردو زبان کا ارتقا — ڈاکٹر شوکت سبزواری

دوسرا بلاک : اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے نظریات

اکائی 3: اردو کی ابتدا سے متعلق غیر ماہر لسانیات کے نظریات

(سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی کے نظریات)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 اُردو زبان کا آغاز وارتقا : مختلف نظریات

3.2.1 سید سلیمان ندوی کا نظریہ

3.2.2 حافظ محمود شیرانی کا نظریہ

3.2.3 نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ

3.3 اکتسابی نتائج

3.4 کلیدی الفاظ

3.5 نمونۂ امتحانی سوالات

3.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.0 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے زبانوں کے مختلف خاندانوں کے بارے میں پڑھا۔ آپ نے یہ بھی پڑھا کہ اردو زبان کا تعلق ہند یوروپی خاندان کی ایک شاخ ہند آریائی سے ہے۔ ہند آریائی کی ایک زبان شورسینی اپ بھرنش سے اردو زبان کا براہ راست تعلق ہے۔اس اکائی میں آپ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مختلف نظریات کے بارے میں پڑھیں گے۔

اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ بارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی فتح دہلی (1193ء) کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اردو

زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اردو کے عالموں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ان علما نے بڑے خلوص سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی ۔ تیرہویں صدی سے بیسویں صدی تک اردو کے کئی شاعروں اور ادیبوں نے اردو کی ابتدا کے بارے میں الگ الگ رائیں پیش کی ہیں۔ان میں میرامن، سرسید احمد خاں، امام بخش صہبائی، شمس اللہ قادری، سید احمد دہلوی، محمد حسین آزاداور ڈپٹی نذیر احمد کے نام اہم ہیں۔اردو کے آغاز کے بارے میں ان کے خیالات کو ماہرین لسانیات نے قیاس آرائی قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نظریات کی کوئی لسانی اور تحقیقی بنیاد نہیں ہے۔ یہ سبھی علما اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ بیسویں صدی میں علم زبان یعنی لسانیات کا فروغ ہوا۔ ماہرین لسانیات نے لسانیات کی روشنی میں اردو کے آغاز وارتقا کے مسئلے پر خالص علمی انداز میں اپنے نظریات پیش کیے۔ ماہرین لسانیات کے نظریات کے علاوہ کئی ایسے عالموں کے نظریات بھی مشہور ہوئے جولسانیات کے ماہر نہیں تھے۔ان میں سلیمان ندوی ،محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی کے نظریات مشہور اور اہم ہیں۔

اس اکائی میں آپ سلیمان ندوی ،محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی کے نظریات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔اکائی کے آخری حصے میں اکتسابی نتائج اور مشکل الفاظ کے معنی دیے جارہے ہیں، جس سے آپ اس اکائی کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں، جن میں معروضی جوابات کے حامل سوالات ،مختصر جوابات کے حامل اور طویل جوابات کے حامل سوالات شامل ہیں۔ان کی مدد سے آپ اپنے امتحان کی بہتر تیاری کرسکتے ہیں۔اس موضوع پر کئی کتابوں میں اہم مواد موجود ہے۔ یہ کتابیں کتب خانوں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، ان میں سے چند کتابیں مزید مطالعے کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتابیں اس موضوع کی بہتر تفہیم کے لیے آپ کی معاون ہوں گی۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مختلف نظریات سے متعارف کروانا ہے جو ماہرین لسانیات کے علاوہ اردو کے متعدد عالموں نے پیش کیے ہیں۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں اردو کے عالموں کے خیالات سے واقف ہوسکیں۔
- ☆ اردو زبان کی ابتدا کے علاقے اور عہد کے متعلق معلومات کا جائزہ لے سکیں۔
- ☆ اردو زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق سلیمان ندوی ،محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی کے نظریات سے واقف ہوسکیں۔

3.2 اُردو زبان کا آغاز وارتقا : مختلف نظریات

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اردو کے متعدد عالموں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ان کا سلسلہ حضرت امیر خسرو (1253ء۔1325ء) سے شروع ہوتا ہے۔مشہور ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا زبان شناس قرار دیا ہے۔امیر خسرو کی تحریروں میں اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں۔امیر خسرو نے فارسی کے علاوہ اردو/ہندی میں بھی شاعری کی ہے۔وہ عربی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور فارسی مثنوی 'نہ سپہر' (1318ء) میں ہندوستان کی بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ زبانیں خسرو کے عہد میں رائج تھیں۔مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کی اس مثنوی کو 'لسانی دستاویز' قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’کئی زبانوں کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ خسرو نے کئی مقامات کی سیاحت بھی کی تھی۔ دہلی میں قیام پذیر ہونے کے علاوہ انھوں نے ایک طویل عرصے تک ملتان، لاہور، اودھ اور بنگال میں بھی قیام کیا تھا۔ وہ جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی، ملک کافور اور محمد بن تغلق کی پیش قدمیوں سے بھی باخبر تھے۔‘‘

(بحوالہ اردو زبان کی تاریخ، ص34)

اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر باقاعدہ نظریات انیسویں اور بیسویں صدی میں سامنے آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں سب سے پہلے میر امّن دہلوی (1803-1732) نے اردو زبان کو ایک مخلوط زبان قرار دیا جو مختلف زبانوں کے میل جول سے بنی ہے۔ میر امن نے قصۂ چہار درویش کا آسان ترجمہ ’’باغ و بہار‘‘ کے نام سے کیا۔ یہ کتاب فورٹ ولیم کالج سے 1803 میں شائع ہوئی۔ میر امن نے باغ و بہار کے مقدمہ میں اردو زبان کے آغاز کو مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی معاشرتی اشتراک کا نتیجہ قرار دیا۔ میر امن نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

’’...... جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔‘‘

(باغ و بہار، ص8-7)

میر امن کے مطابق یہ زبان بولیوں کے بولنے والوں کے لیے رابطے کا کام کرتی تھی اور اس زمانے کی سماجی اور معاشی ضرورتوں کے تحت وجود میں آئی تھی۔ میر امن کا یہ نظریہ اتنا مقبول ہوا کہ مشہور ہوا اردو کے کئی بڑے ادیبوں اور عالموں نے بھی اردو کو ایک مخلوط زبان اور اس کے آغاز کا زمانہ عہد مغلیہ تسلیم کیا۔ میر امن کے نظریے سے متاثر ہو کر انشاء اللہ خاں انشا، سرسید احمد خاں، امام بخش صہبائی اور سید احمد دہلوی جیسے اردو کے علما نے اپنے نظریات پیش کیے۔

انیسویں صدی کے معروف شاعر انشاء اللہ خاں انشا (1752۔1817ء) نے اردو کو عربی، فارسی، ترکی اور برج بھاشا زبانوں کے میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ امام بخش صہبائی (1857-1802) کا خیال ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے جو تبدیل ہوتی ہوئی شاہ جہاں کے عہد میں اپنی اصل شکل حاصل کرتی ہے۔ سرسید احمد خاں (م1897) کا بھی یہی خیال ہے کہ اردو زبان کا مکمل روپ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں سامنے آیا۔ سید احمد دہلوی (م1918) نے اپنی مشہور تصنیف فرہنگ آصفیہ کے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو کی پیدائش شاہجہاں کے عہد میں ہوئی جس نے برج بھاشا سے بعد میں اردو کی شکل اختیار کی۔ ماہر لسانیات گیان چند جین میر امن کے نظریے کی مقبولیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

’’میر امن کا اختلاط کا نظریہ غیر معمولی حد تک مقبول ہوا اور بعد کے بیشتر لکھنے والے اس کو جوں کا توں یا قدرے ترمیم سے پیش کرتے رہے۔ امام بخش صہبائی نے رسالہ قواعد اردو میں لکھا کہ شاہ جہاں آباد میں فارسی اور ہندی کے خلا ملا سے جو بولی مروّج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔ میر امن سے متاثر ہونے والے صرف اہل اردو نہ تھے بلکہ بعض اہل مغرب بھی اس میں شامل ہیں۔‘‘

(بحوالہ اردو زبان کی تاریخ،ص34)

میر امن کے بعد محمد حسین آزاد (1910-1828) کا یہ نظریہ سب سے زیادہ مشہور ہوا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ آزاد نے اپنی شاہکار تصنیف ''آب حیات'' (1888) میں لکھا ہے:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔'' (آب حیات' ص۱۰)

محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ بہت مقبول ہوا۔ دراصل برج بھاشا دہلی سے قریب تاریخی شہر میں بولی جاتی تھی۔ جب مغلیہ سلطنت کے مضبوط ہوئی اور اس سلطنت کے سب سے طاقتور بادشاہ جلال الدین اکبر (1605۔1556ء) نے آگرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اکبر کے بعد مغلیہ سلطنت کے دوسرے بڑے بادشاہ جہانگیر کی راجدھانی آگرہ ہی رہی۔ شاہجہاں نے بھی اپنے عہد بادشاہت کا بڑا حصہ آگرہ میں گزارا۔ آگرہ کا قلعہ اور بین الاقوامی شہرت کی حامل عمارت تاج محل شاہجہاں کا آگرے تعلق کی گواہ ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے ان بادشاہوں نے ہندوستان کی مقامی زبانوں کی سرپرستی کی۔ ان زبانوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ بادشاہ اکبر برج سے واقف تھا اور اس نے برج میں اشعار بھی کہے ہیں۔ اکبر کے نورتنوں میں سے آٹھ رتنوں کا تعلق برج بھاشا کے علاقے سے تھا۔ شمالی ہند میں شاعری اور موسیقی کی زبان بیسویں صدی سے قبل تک برج بھاشا ہی تھی۔ سورداس اور تان سین جیسے ہندوستانی فنکاروں کا تعلق برج بھاشا سے تھا۔ برج کی اسی غیر معمولی اہمیت اور بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے محمد حسین آزاد نے یہ رائے قائم کی کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ آزاد سے قبل ماہر لسانیات روڈولف ہیورنلے نے بھی اردو کو برج بھاشا سے ماخوذ قرار دیا تھا۔ اردو کی ابتدا کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''اردو مقابلتہً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں جو مسلم اقتدار کا مرکز تھا اردو بارہویں صدی میں پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ برج، مارواڑی، پنجابی کے لیے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط اور ارتباط سے ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی جو صرفی ونحوی حد تک برج ہے، اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی وعربی۔'' (بحوالہ اردو زبان کی تاریخ،ص65)

حکیم شمس اللہ قادری نے بھی اپنی تصنیف ''اردوئے قدیم'' میں اردو کی ابتدا برج سے تسلیم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بہ روز بڑھتا گیا' اور ایک عرصے کے بعد اردو کی صورت اختیار کر لی۔''

(اردوئے قدیم' ص76)

محمد حسین آزاد کے نظریے کی تائید اور تردید میں کئی مصنفین نے اپنے نظریات پیش کیے اور اردو زبان کے آغاز وارتقا پر از سرِ نو غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آزاد کے نظریے نے یہ ثابت کیا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہونے کے باوجود ہندوستانی زبان ہے کیونکہ یہ

برج بھاشا سے نکلی ہے جو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس طرح اردو کی جائے پیدائش ہندوستان ہے۔اس نظریے کے بعد اردو کے محققین اردو زبان کے ماخذ کے سلسلے میں ہندستانی زبانوں کو اہمیت دینے لگے اور ایسے نظریات سامنے آئے جن میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے رشتے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔اس سلسلے میں سندھ، پنجاب، دکن، گجرات، مہاراشٹر اور بہار میں اردو کی جائے پیدائش کے نظریات سامنے آئے۔سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں لکھا ہے:

''یہ مخلوط زبان (اردو) سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔'' (نقوش سلیمانی' ص25)

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے سلسلے میں مذکورہ تمام نظریات میں جزوی صداقت موجود ہے۔لسانیات کی روشنی میں ان کی حیثیت تاریخی زیادہ ہے، تحقیقی اور علمی کم ہے۔مسعود حسین خاں نے اردو زبان کی ابتدا سے متعلق لسانیات سے ناواقف عالموں کی مذکورہ تمام خیال آرائیوں کو محض قیاس آرائی قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''علم اللسان سے ناواقف لوگوں کے نزدیک یہ ایک کھچڑی زبان تھی جو عربی' فارسی' ترکی اور ہندی کے میل سے پیدا ہوئی تھی جسے کبھی شاہ جہانی لشکر سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی اکبر کے سنہرے عہد سے۔اردو کی ابتدا کا یہ نظریہ بہت زیادہ تشفی بخش نہ تھا۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو،ص1)

مسعود حسین خاں کی بات لسانیات کی رو سے درست ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام نظریات اردو زبان کے آغاز وارتقا کی تلاش کے تاریخی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان ہی قیاس آرائیوں کی بنیاد پر لسانیات کی روشنی میں اردو کے آغاز وارتقا کے نئے نظریات سامنے آئے۔ان نظریات میں محمود شیرانی کا نظریہ بھی شامل ہے جن کے تحقیقی کاموں سے اردو کی ابتدا کے بارے میں صحیح نظریے تک پہنچنے میں مدد ملی۔محمود شیرانی کے اس تحقیق کا مسعود حسین خاں نے بھی اعتراف کیا ہے۔

اس اکائی میں آگے ہم اردو زبان کے آغاز وارتقا کے تین اہم نظریات کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔یہ نظریات سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی نے پیش کیے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے''، یہ کس کا قول ہے؟

2۔ انشاءاللہ خاں انشا نے اردو کو کن زبانوں کے میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے؟

3۔ اردو کی پیدائش کے بارے میں میر امّن کا نظریہ کیا ہے؟

3.2.1 سید سلیمان ندوی کا نظریہ

سید سلیمان ندوی (1884-1954) اردو کے بڑے عالم اور مؤرخ تھے۔اسلامی تاریخ ان کی تحقیق اور تصنیف کا خاص میدان تھا۔ انھوں نے تاریخ اور سیرت پر کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ان میں عرب و ہند کے تعلقات، سیرۃ النبی، رحمت عالم، سیرۃ عائشہ اور بہادر خواتینِ اسلام وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔ان کے خطبات، مقالات اور مقدمات کا مجموعہ ''نقوش سلیمانی'' 1939ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع

ہوا۔''نقوش سلیمانی'' میں وہ خطبات اور مقالات بھی شامل ہیں جن سے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل پر سلیمان ندوی کے خیالات و نظریات سے واقفیت ہوتی ہے۔سلیمان ندوی نے اس کے مقدمے میں کتاب کی اہمیت کی وجہ خود بیان کی ہے۔

''یہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو کے مولد کے تعین و تشخیص کے باب میں سندھ اور ملتان کی نشان دہی کی گئی، اور یہ اشارات سب سے پہلے 1915ء کے اجلاس اردو کے خطبۂ صدارت میں کیے گئے، پھر بعد کے خطبوں اور مقالوں میں ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی۔'' (نقوش سلیمانی' ص 7)

سلیمان ندوی نے 1915 کا یہ خطبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ ترقیِ اردو کے اجلاس (پونا) میں دیا تھا۔اس خطبے میں انھوں نے اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیا جو باہمی میل جول کا نتیجہ تھی۔

''ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے۔'' (ایضاً' ص 5)

اس وقت تک عام خیال یہ تھا کہ اردو کی پیدائش دہلی اور دوآبۂ گنگ وجمن کے علاقے میں ہوئی۔اس کے علاوہ اردو کی ابتدا کا زمانہ عہد مغلیہ کو مانا جاتا تھا۔سلیمان ندوی ان خیالات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'' مسلمان عربی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے۔اس پر دو سو برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہاں پیدا ہو گئی۔اردو شاہ جہاں کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔'' (ایضاً' ص 6)

اردو زبان کی ابتدا کے زیادہ تر نظریات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب مسلمان ہندوستان آئے تو ان کا مقامی ہندوؤں سے میل جول بڑھا جس کے نتیجے میں اردو پیدا ہوئی۔سلیمان ندوی نے اسی عام خیال کو ذہن میں رکھ کر یہ قیاس آرائی کی کہ اردو سندھ میں پیدا ہوئی۔

''مسلمان سب سے پہلے سندھ پہنچتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادئ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'' (ایضاً' ص 31)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان حکمران کی شکل میں سب سے پہلے سندھ میں آئے۔محمد بن قاسم نے 712ء میں سندھ کو فتح کر کے اسے اسلامی مملکت کا ایک صوبہ بنایا۔مسلمان بڑی تعداد میں تجارت اور مذہبی تبلیغ کی غرض سے یہاں آئے اور آباد ہو گئے۔یہ مسلمان تقریباً تین سو سال تک یہاں قیام پذیر رہے۔اس طویل عرصے میں مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے معاشرتی تعلقات قائم ہوئے اور انھیں مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔اسی تاریخی عمل کو ذہن میں رکھ کر سلیمان ندوی نے یہ قیاس آرائی کی کہ یہ مشترک زبان اردو ہوسکتی ہے۔ انھوں نے کئی عرب سیاحوں کے سفرناموں سے شہادتیں فراہم کی ہیں اور ان کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ عربی فارسی کا میل جول ہندوستان کے جس حصے میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، اس لیے سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی۔سلیمان ندوی نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں کئی ایسے بیانات بھی دیے ہیں جن سے ان کے ہی نظریے کی تردید ہوتی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبان سے مل کر ہر صوبہ میں الگ

الگ پیدا ہوئی۔'' (ایضاً' ص56)

لسانیات کی روشنی میں اگر سلیمان ندوی اس نظریے کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ سندھ میں سب سے پہلے پہنچنے والے مسلمان عرب تھے اور عربی ان کی زبان تھی۔ عربی کا تعلق زبانوں کے سامی خاندان سے ہے۔ جبکہ سندھی اور اردو ہند آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اس لیے سامی اور آریائی خاندان کے میل سے کسی آریائی زبان کی پیدائش ممکن نہیں ہے۔ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے سلیمان ندوی کے اس نظریے کی تردید کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

'' سید سلیمان ندوی نے اردو کے پہلے ہیولے کے سندھ میں بننے کا ذکر کیا ہے وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس لیے عربی، فارسی الفاظ کا ہندوستان کی کسی زبان میں داخلہ اردو زبان کی تشکیل کی ضمانت نہیں کرتا۔ سندھی، ہند آریائی ہوتے ہوئے بھی اردو یا ہندی سے مختلف ہے۔ قدیم سندھی میں عربی الفاظ کے داخلے سے جدید سندھی وجود میں آئی نہ کہ اردو۔ اس جدید سندھی اور اردو کے درمیان اشتراک صرف عربی رسم الخط، اسما اور روایات شعر کا ہے۔''

(مضمون اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ، مشمولہ ''اردو زبان کی تاریخ'' مرتبہ مرزا خلیل بیگ ص 86-85)

کسی زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ماہر لسانیات کی رائے ہی قابل قبول ہوسکتی ہے اس لیے سلیمان ندوی کا یہ نظریہ کہ مسلمان سب سے پہلے ہندوستان کی سرزمین پر صوبۂ سندھ میں آئے اور وہاں کی مقامی زبان سے عربی کے میل جول کے نتیجے میں اردو کی پیدائش ہوئی، محض ایک قیاس ہے نہ کہ ایک لسانی نظریہ۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ مسلمان سندھ میں کب آباد ہوئے؟

2۔ سلیمان ندوی کے مطابق اردو کا پہلا ہیولیٰ کہاں بنا؟

3۔ مسعود حسین خاں نے سلیمان ندوی کے نظریے کی کس طرح تردید کی ہے؟

4۔ سید سلیمان ندوی کی تین اہم تصانیف کون سی ہیں؟

3.2.2 حافظ محمود شیرانی کا نظریہ

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ایک اہم نظریہ حافظ محمود شیرانی (1946-1880) کا ہے۔ یہ نظریہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''پنجاب میں اردو'' (1928) میں پیش کیا۔ اس کتاب میں محمود شیرانی اردو کی جائے پیدائش پنجاب قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے طویل عرصے کے لیے یہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ کتاب کے مقدمے میں اردو کی قدامت کے بارے میں محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''ہم اردو کے آغاز کو شاہ جہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود ان ہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے

مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔''(پنجاب میں اردو،مقدمہ)

محمود شیرانی نے جن تاریخی عوامل پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے وہ یہ ہیں کہ غزنی کے مسلم حکمراں محمود غزنوی نے 1027ء تک لگاتار سترہ حملوں کے بعد سرزمین پنجاب پر اپنی حکومت قائم کی۔اس فتح کے بعد مسلمان جن کی زبان فارسی تھی پنجاب میں آباد ہو گئے۔ پنجاب میں مسلمان تقریباً دوسو برسوں تک رہے اور محمد غوری کے حملوں (1192) کے بعد دہلی ہجرت کی۔ پنجاب میں مسلمانوں کے طویل قیام کی مدت میں مقامی باشندوں سے گہرے سماجی رشتے قائم ہونا فطری بات ہے۔سماجی تعلقات کے لیے مشترک زبان کی ضرورت پیش آئی اور ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جب مسلمانوں نے پنجاب سے دہلی ہجرت کی تو یہ نئی زبان بھی ان کے ساتھ آئی۔محمود شیرانی کا خیال ہے کہ پنجاب سے مسلمان جس زبان کو دہلی لائے وہ پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی ہوسکتی ہے۔یہی زبان دہلی کی فتح کے بعد اردو کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔''
>
> (پنجاب میں اردو،مقدمہ)

محمود شیرانی ان سیاسی اور تاریخی حالات سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی پیدائش سب سے پہلے پنجاب میں ہوئی اور اردو پنجابی کی قدیم شکل سے نکلی ہے۔اپنے نظریے کی تائید میں انھوں نے پنجابی اور قدیم اردو کی مشترک لسانی خصوصیات پر اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے۔دکن میں دکنی کے نام سے فروغ پانے والی زبان یہی قدیم اردو تھی۔ یہ زبان دہلی سے متعدد فوجی حملوں کے نتیجے میں دکن پہنچی تھی۔ فتح دہلی (1193) کے بعد علاء الدین خلجی (م1316) نے دکن میں دیوگری 1294 میں فتح کیا۔اس کے بعد علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن کے علاقوں پر کامیاب حملے کیے۔ 1351 میں محمد تغلق (م1351) نے اپنا پایۂ تخت دولت آباد (دیوگری) کو بنایا اور دہلی کی تمام آبادی کو دولت آباد منتقل ہونے کا حکم دیا۔علاء الدین خلجی، ملک کافور اور محمد تغلق کی فوجی مہمات اور دہلی کی آبادی کے دکن منتقل ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو دکن میں بہت ترقی ہوئی اور اس زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا۔محمود شیرانی نے اس قدیم اردو یعنی دکنی اردو اور پنجابی کے درمیان صوتی، صرفی اور نحوی اعتبار لسانی رشتے تلاش کیے ہیں۔ مثلاً پنجابی اور اردو میں علامت مصدر (نا) کا مشترک ہونا، الفاظ کے آخر میں نون غنّہ کا ہونا، فعل کا تذکیر و تانیث اور واحد جمع میں اپنے فاعل کے مطابق آنا وغیرہ۔ انھوں نے ان لسانی اشتراک کی مثالوں کو اپنے نظریے کی تائید میں بہ طور دلیل پیش کیا ہے۔ دکنی اور پنجابی کے صرف و نحو کے تقابلی مطالعے سے محمود شیرانی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''گذشتہ سطور کے مطالعے سے ہم پر یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تعریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔''(پنجاب میں اردو،ص99)

محمود شیرانی نے اردو زبان کے آغاز کے مسئلے پر جس تفصیل سے تجزیاتی اور مدلل بحث کی ہے وہ ان سے قبل کسی اور محقق نے نہیں کی

۔ان کا نظریہ بہت مشہور ہوا اور اس سے اردو زبان کے آغاز پر نئی بحث کا آغاز ہوا۔ ان کے نظریے نے اردو زبان کے کئی محققین کو متاثر کیا جن میں محی الدین قادری زور اور سنیتی کمار چٹرجی جیسے ماہرین لسانیات بھی شامل ہیں۔لیکن ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے لسانیات کی روشنی میں محمود شیرانی کے نظریے کی تردید کی ہے۔ان کے مطابق محمود شیرانی نے قدیم دور میں پنجابی کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ سب اس عہد کی ہریانی میں بھی موجود تھیں لیکن انھوں نے اسے نظر انداز کیا۔مسعود حسین خاں نے محمود شیرانی کی تحقیقی کاوشوں کی تعریف بھی کی ہے جو انھوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں کی ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ

> ''پروفیسر شیرانی کی تحقیقات سے ہریانوی زبان کے بعض قدیم مصنفین کے ادبی کارنامے ہمارے سامنے آ گئے ہیں جن کی زبان کا تجزیہ اور پنجابی کے قدیم ترین نمونوں سے تقابلی مطالعہ اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیتا ہے کہ ہریانوی زبان پرانی اردو کی باقی ماندہ شکل نہیں بلکہ ایک علیحدہ اور مستقل زبان کی حیثیت سے عرصے سے مضافات دہلی میں رائج تھی۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، مقدمہ)

مسعود حسین خاں کے علاوہ گیان چند جین نے بھی محمود شیرانی کے نظریے کی تنقید کرتے ہوئے یہ نشاندہی کی ہے کہ ان کے بیان میں تضاد پایا جاتا ہے۔شیرانی کے ایک قول کے مطابق اردو دہلی اور میرٹھ میں بنتی ہے جب کہ دوسرے قول کے مطابق مسلمان اسے پنجاب سے لائے۔محمود شیرانی نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ اس سے قبل شیر علی سرخوش اپنے تذکرے ''اعجاز سخن'' (1923) میں ''اردو پنجاب سے نکلی'' کے موضوع پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔انھوں نے نہایت صاف گوئی سے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کے نظریے کے حق میں کوئی سند نہیں ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اس نظریے کے ثبوت میں گرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں۔لیکن سیاسی واقعات، اردو زبان کی ساخت، نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔''
>
> (پنجاب میں اردو، مقدمہ)

آپ جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش کا مطالعہ کر چکے ہیں۔جدید ہند آریائی کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پنجابی اور اردو دونوں ہی جدید ہند آریائی زبانیں ہیں۔سبھی جدید آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔اس صورت میں پنجابی سے اردو کا رشتہ ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا ہو سکتا ہے۔اس لیے لسانیات کے نقطۂ نظر سے محمود شیرانی کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ محمود شیرانی کے مطابق اردو کی پیدائش کہاں ہوئی؟
2۔ محمود شیرانی نے کن تاریخی عوامل پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے؟
3۔ مسعود حسین خاں نے محمود شیرانی کے نظریے کے رد میں کیا کہا؟

3.2.3 نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ

نصیر الدین ہاشمی (1895-1964) اردو کے مشہور محقق، مؤرخ اور ادیب تھے۔انھوں نے دکنی ادب پر بہت کام کیا ہے۔ دکنیات

کے حوالے سے انھوں نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان میں ''سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری'' (1922)، ''دکن میں اردو'' (1923)، ''مدراس میں اردو'' (1928)، ''دکنی ہندو اور اردو'' (1956) اہم ہیں۔ ''دکن میں اردو'' ان کی سب سے مشہور کتاب ہے جو چھ صدیوں پر محیط دکن کے ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کا موضوع دکن میں اردو ادب کی تاریخ ہے جس میں دکنی ادب کی خدمات کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں نصیر الدین ہاشمی نے اردو کی ابتدا کے بارے میں چار مختلف نظریات کا جائزہ لیا ہے۔ اس فہرست میں انھوں نے پنجاب، سندھ اور دوآبۂ گنگ وجمن کے علاوہ دکن میں اردو کی ابتدا کو بھی ایک نظریہ کے طور پر شامل کیا ہے۔ وہ سندھ اور دکن میں اردو کی ابتدا کے بارے لکھتے ہیں:

> ''یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا، کیوں کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی۔'' (دکن میں اردو، ایڈیشن 1985 ص 33)

لیکن بعد میں وہ اس نظریے کی تردید میں یہ کہتے ہیں کہ سندھ کے فاتحوں کی زبان عربی تھی، اس لیے وجود میں آنے والی زبان کو عربی اور شورسینی سے مشترک ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے۔ اس لیے یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی ہے کہ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔

نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو کی ابتدا کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عرب سے مسلمان تجارت اور دین کی تبلیغ کے لیے سندھ کے بعد مالابار اور کرناٹک کے ساحلوں پر آئے۔ ان مسلمانوں نے اپنی جدوجہد، ملنساری اور نیک مزاجی کی وجہ سے مقامی ہندوؤں کے دلوں میں جگہ بنائی۔ اس طرح وہ ملک اندر بس گئے اور اپنی حکومت قائم کی۔ نصیر الدین ہاشمی نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دکن مسلمانوں کے لیے وطن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اس لیے انھیں مقامی باشندوں سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اب یہ امر خاص طور سے غور طلب ہے کہ جب مسلمانوں نے مدتوں دکن میں بود و باش کی اور حکومت قائم کی، تجارت کی، مذہب کی اشاعت کی، تعلیم دی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا یہاں کے ملکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا۔ ہر وقت کام کاج خرید و فروخت میں ان سے سابقہ رہتا تھا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا، جو دونوں غیر قوموں کے لیے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوتی۔ اس لحاظ سے جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے، وہ بڑی حد تک صحیح ہوسکتا ہے۔ (ایضاً ص 35)

نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو کی ابتدا کے دعویٰ کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کی تائید میں کئی مثالیں بھی دیتے ہیں لیکن سندھ کی طرح دکن میں اردو کی ابتدا کی تردید بھی کرتے ہیں۔ جس لسانی حقیقت کے پیش نظر انھوں نے سندھ سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو رد کیا اسی کو بنیاد بنا کر دکن میں اردو کی ابتدا سے انکار کرتے ہیں۔ البتہ ان کے بیان سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ قطعی طور پر اس نظریے کو غلط نہیں سمجھتے بلکہ لسانی شواہد کے دستیاب نہ ہونے کے سبب فی الحال اس نظریے سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے میں مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں۔ اس لیے سرِ دست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔'' (ایضاً 36)

نصیر الدین ہاشمی نے سندھ سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو اس بنا پر رد کیا تھا کہ اردو زبان میں فارسی کا حصہ غالب ہے لہٰذا وہ عربی اور شورسینی کا مرکب نہیں ہوسکتی۔ دکن سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرنے میں بھی یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو عربی اور دکن کی زبانوں کے اشتراک سے بنی ہے تو اس میں فارسی زبان کا عنصر کیوں حاوی ہے۔ اس لیے دکن میں اردو کی ابتدا کا نظریہ لسانیات کی روشنی میں کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عربی اور دکن کی دراوڑی زبانیں دونوں ہی ہند آریائی خاندان سے تعلق نہیں رکھتیں۔ اس لیے اگر اردو میں عربی کا حصہ زیادہ ہوتا تب بھی دو مختلف لسانی خاندان کی زبانوں کے اشترک سے کسی تیسرے لسانی خاندان کی زبان اردو کا پیدا ہونا قرین قیاس نہیں۔

سندھ اور دکن کے نظریوں کے بعد نصیر الدین ہاشمی نے پنجاب سے اردو کی ابتدا کے نظریے کی تردید کی ہے۔ اس نظریے کی تردید انہوں نے خالص لسانیاتی پیمانے سے کی ہے۔ وہ اس نظریے کی تردید میں لکھتے ہیں:

''پنجاب میں اردو کے متعلق مؤلف ''پنجاب میں اردو'' مولانا محمود شیرانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، مگر جب تک مسعود سعد سلمان کا ہندی دیوان دستیاب نہ ہو ان کی تحقیقات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا اور جیسا کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی رائے ہے ''پنجابی زبان اردو کی ماں نہیں ہوسکتی بلکہ بہن ہوسکتی ہے۔'' (ایضاً 36)

اس طرح نصیر الدین ہاشمی سندھ اور دکن کے پنجاب سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو بھی خارج کرتے ہیں اور دوآبۂ گنگا جمنا میں اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس نظریے کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

''سندھ، دکن، پنجاب کے خارج ہوجانے کے بعد اب صرف دوآبۂ گنگا جمنا باقی رہتا ہے جو اردو کے مولد ہونے کا مدعی ہوسکتا ہے۔'' (ایضاً 36)

نصیر الدین ہاشمی نے کتاب میں اس نظریے کی حمایت میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ اس بات سے متفق ہیں کہ اردو زبان کا آغاز سب سے پہلے شمالی ہند میں ہوا اور اس کی ابتدا ہندوستانی اور بیرونی زبانوں کے اشتراک سے ہوئی۔ یعنی نصیر الدین ہاشمی بھی اردو کو ایک مخلوط زبان مانتے ہیں۔ کتاب کے ابتدائی صفحات ہی میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' گلستان ہند کے شمالی چمن میں مغربی دروازوں سے باغبانوں نے آ کر اردو کا بیج بویا، گنگا اور جمنا نے آبیاری کر کے چھوٹے پودے کو اگایا۔ اسی کے قریب قریب گلزار دکن میں بھی انھیں ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا۔ کرشنا اور گوداوری وموسیٰ درخت کے اگانے میں معاون ہوئیں۔ ہنوز شمالی چمن کا درخت بارآور نہ ہوا تھا کہ دکھنی پودا زمین کی عمدگی اور بر وقت آبیاری سے بہت جلد تروتازہ سرسبز اور شاداب ہوگیا۔ اسی اثناء میں ایک دکھنی باغبان نربدا کے اس پار جا پہنچتا ہے اور اپنے فن زراعت دانی سے شمالی چمن کے درختوں کی پرداخت کرتا ہے۔ پرانی شاخیں قطع و برید کر کے چمن کی آراستگی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پھر تھوڑی ہی مدت میں چمن سرسبز اور درخت بارآور ہو جاتے ہیں۔ چمن نئے نئے گل بوٹوں سے اپنی بہار دوبالا کر دیتا ہے۔'' (ایضاً 27)

نصیرالدین ہاشمی واضح طور پر اردو کی ابتدا اور ارتقا میں تاریخی عوامل کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ بات تاریخی اور لسانی دونوں اعتبار سے درست ہے کہ اردو کی ابتدا شمال میں اور اس کا ارتقا دکن میں ہوا۔ البتہ لسانیات کی روشنی میں ان کی یہ رائے قابل قبول نہیں کہ اردو کا بیج باہر سے آنے والے مسلم فاتحین نے لگایا۔ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کی نشو ونما شورسینی اپ بھرنش سے ہوئی ہے۔ مسلم فاتحوں کی زبان فارسی نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹر جی نے اپنی کتاب ہند آریائی اور ہندی میں واضح کیا ہے کہ مسلمان اگر ہندوستان میں نہ آتے تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آتیں لیکن زبانوں کے ادبی آغاز وارتقا میں دو ایک صدی کی تاخیر ضرور ہو جاتی۔ نصیرالدین ہاشمی نے اردو زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شمال میں اردو برج کے علاقے میں اپنی ابتدائی شکل میں تھی۔ علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کی کی دکن پر فوج کشی کی وجہ سے یہ دکن میں آئی۔

اردو کے اس ارتقائی دور پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ فاتح جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو ونما حاصل کرنے لگی کیوں کہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے، یہاں نہیں تھی۔ اس کے برخلاف شمال میں برج مروّج تھی جو وہاں کے دیسی باشندوں کی عام زبان تھی۔ اس طرح یہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی عام طور سے دیسی اور پردیسی دونوں نے استعمال کی۔ یہ بات واضح ہے کہ دوآبۂ گنگا و جمنا اور دکن کے علاقوں میں بہت فاصلہ حائل ہے۔ دکن میں جدید زبان جب بولی جانے لگی تو مسافت کی دوری کی وجہ سے اس پر برج کا صرف وہی اثر باقی رہا جو سرزمین برج سے نکلنے سے قبل اس میں قائم ہو چکا تھا۔ غرض کہ اس طرح اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور عام طور سے ہر شخص اسی کو بولنے لگا اور وہ کام کاج میں بھی آنے لگی۔'' (ایضاً 37)

یہاں نصیرالدین ہاشمی اردو زبان کے ارتقا کے بارے میں دکن کی اولیت اور اہمیت پر زور دے رہے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اردو زبان اپنی خام شکل میں شمال کے فاتحین کے ذریعے دکن پہنچتی ہے جہاں یہ ہر عام و خاص کی زبان بن جاتی ہے۔ دکن کی ریاستیں جب مرکز سے علاحدہ ہو کر خود مختار حکومت قائم کر لیتی ہیں تو اردو یہاں آزادانہ طور پر فروغ پاتی ہے۔ اس تاریخی عمل کے نتیجے میں دکن کی اردو شمال کی اردو سے مختلف صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی دکن کی اس اردو زبان اور ادب کے ارتقا کی تفصیلی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں وہ کوئی نیا نظریہ نہیں پیش کرتے ہیں بلکہ دوآبہ گنگ و جمن میں اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما اور اس زبان میں ادب کی ابتدا اور فروغ دکن میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو کہ تاریخی اور لسانی دونوں لحاظ سے صحیح ہے۔ بلا شبہ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' کے ذریعے اردو کی قدیم شکل ''دکنی اردو'' کے آغاز اور ارتقا کی جامع تاریخ پیش کی ہے۔ اردو زبان و ادب کے ارتقا کے ابتدائی دور کی اس تحقیق سے اردو زبان و ادب کی ابتدا اور ارتقا کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ اردو کے مشہور محقق محمود شیرانی اور ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرنے کے لیے قدیم اردو یعنی دکنی اردو کے ادب ہی سے مثالیں پیش کی ہیں۔ اس لیے نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ اردو کی پیدائش کے بارے میں نہیں بلکہ اردو کے ارتقا کے متعلق ہے اور ان کی کتاب ''دکن میں اردو'' دکن میں اردو کے ارتقا کی تاریخ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ اردو زبان کی ارتقا کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی کی رائے کیا ہے؟

2۔ نصیرالدین ہاشمی نے ہندوستان کے کس علاقے کی اردو خدمات کی تاریخ مرتب کی ہے؟

3۔ دکنیات کے حوالے سے نصیرالدین ہاشمی نے کن کتابوں کو مرتب کیا؟

4۔ 'دکن میں اردو' اردو کے ارتقا کے کس دور سے متعلق ہے؟

3.3 اکتسابی نتائج

☆ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا زبان شناس قرار دیا ہے۔

☆ امیر خسرو نے اپنے عہد کی رائج بارہ ہندوستانی زبانوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔

☆ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں باقاعدہ غور وفکر کا سلسلہ میر امّن دہلوی سے شروع ہوتا ہے۔

☆ انشاء اللہ خاں انشا نے اردو کو عربی، فارسی، ترکی اور برج بھاشا زبانوں کے میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

☆ سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی اور سید احمد دہلوی نے بھی اردو کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا۔

☆ محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ بہت مشہور ہوا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔

☆ محمد حسین آزاد کے نظریے سے یہ بات سامنے آئی کہ اردو کی جائے پیدائش ہندوستان ہے۔

☆ محمد حسین آزاد کے نظریے کی تائید اور تردید کے سبب اردو زبان کے آغاز وارتقا پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا، اور اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے رشتے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔

☆ سید سلیمان ندوی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی۔

☆ سید سلیمان ندوی کے نظریے کے مطابق مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے، ان مسلمانوں کے میل جول سے اردو پیدا ہوئی۔

☆ مسعود حسین خاں نے سلیمان ندوی کے اس نظریے کی لسانیات کی روشنی میں تردید کی ہے۔

☆ محمود شیرانی اردو کی جائے پیدائش پنجاب قرار دیتے ہیں کیونکہ مسلمان سب سے پہلے یہیں آئے اور دوصدیوں تک طویل قیام کیا۔

☆ محمود شیرانی کے نظریے کے مطابق جب مسلمانوں نے پنجاب سے دہلی ہجرت کی تو یہ نئی زبان بھی ان کے ساتھ آئی۔

☆ محمود شیرانی نے اپنے نظریے کی تائید میں قدیم اردو اور پنجابی کی مشترک خصوصیات کی مثالیں پیش کی ہیں۔

☆ ماہرین لسانیات مسعود حسین خاں اور گیان چند جین نے محمود شیرانی کے نظریے سے اختلاف کیا ہے۔

☆ محمود شیرانی کی تحقیقات سے ہریانوی زبان کے بعض قدیم مصنفین کے اہم ادبی کارنامے سامنے آئے ہیں۔

☆ نصیرالدین ہاشمی دوآبۂ گنگا جمنا میں اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں۔

☆ نصیرالدین ہاشمی سندھ، دکن اور پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کی تردید کرتے ہیں۔

☆ نصیرالدین ہاشمی کی رائے یہ ہے کہ اردو کی ابتدا شمال میں ہوئی جب کہ اس کا ارتقا دکن میں ہوا۔

☆ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو' کے ذریعے اردو کی قدیم شکل ''دکنی اردو' کے آغاز اور ارتقا کی جامع تاریخ پیش کی ہے۔

3.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	**معنی**
لسانیات	زبان کا علم
مخلوط	ملا جلا، ملا ہوا
اختلاط	میل جول
ارتقا	فروغ، ترقی
ہیولیٰ	ڈھانچہ، خاکہ
اخذ کرنا	لے لینا، اختیار کرنا
دلائل	دلیل کی جمع، ثبوت، شہادت
جائے پیدائش	پیدا ہونے جگہ
مؤرخ	تاریخ لکھنے والا
تردید کرنا	رد کرنا، اعتراض کرنا، نامنظور کرنا
مولد	پیدا ہونے کی جگہ، جائے ولادت، وطن
تعین	ٹھہرانا، مقرر کرنا، مخصوص کرنا
تشخیص	جاننا، پہچاننا، شناخت کرنا
دوآبہ	دو دریاؤں کے درمیان کا علاقہ
مشترک	شریک، ساجھا، شرکت کیا ہوا
محیط	گھیرنے والا
گہوارہ	مہد، پنگوڑا، ہنڈولا
نظریہ	اصول، تھیوری، وہ مسئلہ جس میں نظر وفکر سے کام لیا جائے

3.5 نمونہ امتحانی سوالات

3.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ مسعود حسین خاں کے مطابق اردو کا پہلا زبان شناس کون ہے؟'

2۔ 'نقوش سلیمانی' کس کی تصنیف ہے؟

3۔ ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے''، یہ کس کا قول ہے؟

4۔ سلیمان ندوی کے مطابق اردو کا پہلا ہیولیٰ کہاں بنا؟

5۔ ''پنجاب میں اردو'' کس نے لکھی ہے؟

6۔ محمود شیرانی کے مطابق اردو کی پیدائش کہاں ہوئی؟

7۔ نصیرالدین ہاشمی نے 'دکنی اردو' کے آغاز اور ارتقا کی جامع تاریخ کس کتاب میں پیش کی ہے؟

8۔ حکیم شمس اللہ قادری کے مطابق اردو کس زبان سے نکلی ہے؟

9۔ مسلمان سندھ میں کب آباد ہوئے؟

10۔ تذکرہ 'اعجازِ سخن' کس کی تصنیف ہے؟

3.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ سید سلیمان ندوی سندھ کو اردو کی جائے پیدائش کیوں قرار دیتے ہیں؟

2۔ محمود شیرانی نے پنجابی اور دکنی اردو کی کن مشترک خصوصیات کا ذکر کیا ہے؟

3۔ اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ کیا ہے؟

4۔ اردو کو کن عالموں نے مخلوط زبان قرار دیا؟

5۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں محمد حسین آزاد کی رائے کیا ہے؟

3.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اردو زبان کے آغاز کے بارے میں محمود شیرانی کا نظریہ کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

2۔ اردو زبان کی جائے پیدائش کے بارے میں سید سلیمان ندوی کے خیالات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

3۔ اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ کیا ہے؟

3.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	نقوشِ سلیمانی	سید سلیمان ندوی
2۔	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی
3۔	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
4۔	مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو (آٹھواں ایڈیشن)	مسعود حسین خاں
5۔	مضامینِ مسعود	مسعود حسین خاں
6۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ

اکائی 4: اردو کی ابتدا سے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات

(ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریات)

اکائی کے اجزا

4.0		تمہید
4.1		مقاصد
4.2		اردو کی ابتدا سے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات
	4.2.1	ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ
	4.2.2	پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ
4.3		اکتسابی نتائج
4.4		کلیدی الفاظ
4.5		نمونہ امتحانی سوالات
	4.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	4.5.1	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	4.5.1	طویل جوابات کے حامل سوالات
4.6		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اردو کے مختلف عالموں کے نظریات کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ نظریات ان لوگوں کے تھے جو لسانیات کے ماہر نہیں تھے۔اس لیے ان کے نظریات ماہرین لسانیات کی نظر میں قابل قبول نہیں ہیں۔ اردو کے عالموں کے علاوہ غیر ملکی اور دیگر عالموں نے بھی اردو زبان کے آغاز وارتقا پر اظہار خیال کیا۔ان میں ژول بلاک، گراہم بیلی، جان بیمز، جارج گریرسن، سنیتی کمار چٹرجی اور شری رام شرما جیسے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ بیسویں صدی میں زبانوں کے سائنسی مطالعہ کا علم یعنی لسانیات کا علم عام ہوا۔ اس کے بعد لسانیات کی روشنی میں زبانوں کے آغاز وارتقا کے بارے میں خالص علمی اور سائنسی طریقے سے تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہند آریائی زبانوں کا مطالعہ بھی لسانیات کے حوالے سے کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ٹی۔گراہم بیلی، جارج ابراہم گریرسن اور سنیتی کمار چٹرجی کی لسانی تحقیقات سامنے آئیں۔ ان لسانی تحقیقات سے دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں بھی نئی بحث شروع

ہوئی۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مسائل پر لسانیات کی روشنی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے محقق اور ماہرین لسانیات نے تحقیق کی اور نتائج اخذ کیے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں ایسے لسانی محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان کی پیدائش کا زمانہ، جائے پیدائش اور ارتقا کے مسائل پر خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور وفکر کیا۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق ان دونوں ماہر لسانیات کے نظریات مختلف ہیں، لیکن ان کی اس سنجیدہ اور عالمانہ لسانی تحقیق کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو کے آغاز کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے، اکثر ماہرین لسانیات اس سے کلی یا جزوی طور پر متفق نظر آتے ہیں اور اس نظریے کو سب سے قابل قبول نظریہ تسلیم کرتے ہیں۔

اس اکائی میں آپ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ماہرین لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ اکائی کے آخری حصے میں اکتسابی نتائج اور مشکل الفاظ کے معنی دیے جا رہے ہیں، جس سے آپ اس اکائی کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں، جن میں معروضی جوابات کے حامل سوالات، مختصر جوابات کے حامل اور طویل جوابات کے حامل سوالات شامل ہیں۔ ان کی مدد سے آپ اپنے امتحان کی بہتر تیاری کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر کئی کتابوں میں اہم مواد موجود ہے۔ یہ کتابیں کتب خانوں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، ان میں سے چند کتابیں مزید مطالعے کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتابیں اس موضوع کی بہتر تفہیم کے لیے آپ کی معاون ہوں گی۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو اردو زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق ماہرین لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریات سے واقف کروانا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ اردو کی ابتدا کے بارے میں ماہرین لسانیات کے نظریات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریات کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ لسانیات کی روشنی میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اظہار خیال کر سکیں۔

4.2 اردو کی ابتدا سے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات

لسانیات زبان کا سائنسی طریقے سے مطالعے کا علم ہے۔ بیسویں صدی میں لسانیات کا علم عام ہوا اور لسانیات کی روشنی میں زبانوں کے آغاز وارتقا کے بارے میں خالص علمی طریقے سے سنجیدہ تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں بھی لسانیاتی مطالعے کا آغاز ہوا جس کا سہرا ایک یوروپی عالم سر ولیم جونس کے سر جاتا ہے۔ ولیم جونس یونانی، لاطینی، عبرانی، عربی اور فارسی جیسی اہم عالمی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ کلکتہ سپریم کورٹ کا جج بننے کے بعد اس نے سنسکرت بھی سیکھی۔ اس کی ایما پر ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ولیم جونس نے ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسے میں ایک مقالہ پیش کیا جس میں اس نے سنسکرت اور دیگر یوروپی زبانوں کے درمیان حیرت انگیز اشتراک اور مماثلتوں کی نشان دہی کی۔ اس موضوع پر جب مزید تحقیق ہوئی تو زبانوں کے سب سے بڑے خاندان ''ہند یوروپی'' کی شناخت کی گئی جس کی ایک اہم شاخ ''ہند آریائی'' ہے۔ شمالی ہندوستان کی تمام زبانیں بشمول اردو اسی ہند آریائی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان میں لسانیات کے حوالے سے ہند آریائی زبانوں

کے مطالعے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہند آریائی کے جدید دور کی زبانوں کی ابتدا پر لسانیات کی روشنی میں کئی محققین نے کام کیا۔ اردو بھی ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کے آغاز وارتقا کے بارے میں خالص سائنسی بنیادوں پر تحقیق شروع ہوئی۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں جن لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان کا سلسلہ امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا زبان شناس قرار دیا ہے۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی 'نہ سپہر' میں بارہ ہندوستانی زبانوں کا ذکر کیا ہے جو اس عہد میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رائج تھیں۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں میر امّن دہلوی نے اپنی مشہور تصنیف 'باغ و بہار' میں اظہار خیال کیا۔ میر امن کے علاوہ انشاء اللہ خاں انشا، سرسید احمد خاں، امام بخش صہبائی، سید احمد دہلوی، محمد حسین آزاد، شمس اللہ قادری، ڈپٹی نذیر احمد، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنے نیم لسانی خیالات پیش کیے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے متعلق لسانیات سے ناواقف بیشتر عالموں کے ان خیالات کو مسعود حسین خاں نے محض قیاس آرائی قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جوں جوں اردو زبان کا ڈول اور کینڈا متعین ہوتا گیا اس کی ابتدا اور ارتقاء کے متعلق سوالات بھی ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ علم اللسان سے ناواقف لوگوں کے نزدیک یہ ایک کھچڑی زبان تھی جو عربی' فارسی' ترکی اور ہندی کے میل سے پیدا ہوئی تھی جسے کبھی شاہ جہانی لشکر سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی اکبر کے سنہرے عہد سے۔ اردو کی ابتدا کا یہ نظریہ بہت زیادہ تشفی بخش نہ تھا۔ ارتقا کا وہ تصور جس پر آج فکر انسانی کی بنیادیں قائم ہیں، لسانیاتی دنیا میں بھی کارفرما ہے، چنانچہ زبان جاننے والوں نے فوراً پہچان لیا کہ اس کھچڑی زبان کی تہ میں کون سی بولی ہے۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو)

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے متعلق اردو کے عالموں کے علاوہ یوروپی اور دیگر ماہرین لسانیات نے بھی اظہار خیال کیا۔ ان میں ژول بلاک، گراہم بیلی، جان بیمز، جارج گریرسن، سنیتی کمار چڑجی اور شری رام شرما جیسے عالموں کے نام شامل ہیں۔ جارج ابراہیم گریرسن (م 1941ء) انیسویں صدی کا ایک یوروپی عالم اور مشہور ماہر لسانیات تھا۔ اسے ہندوستانی زبانوں کی ابتدا اور ارتقا کے مطالعے میں بہت دلچسپی تھی۔ اس کی مشہور تصنیف ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' (Lingustic Survey Of India) 18 جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں اس نے لسانیات کی روشنی میں ہندوستان کی 179 زبانوں اور 544 بولیوں کا جائزہ لیا ہے۔ مسعود حسین خاں کے مطابق

> ''ہند آریائی لسانیات میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا کارنامہ گریرسن کا عظیم الشان ''لسانیاتی جائزہ ہند'' ہے۔
> گریرسن نے سب سے پہلے بالتفصیل ان قیاس آرائیوں کا ازالہ کیا ہے جو ہماری زبان کے کینڈے کے متعلق بغیر سوچے سمجھے کی گئی تھیں۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو)

بیسویں صدی میں ہی ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں سائنسی نقطۂ نظر سے اپنے لسانیاتی نظریات پیش کیے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریات پر اس اکائی میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو زبان سے متعلق اہم لسانیاتی نظریات اپنی مشہور کتابوں 'اردو زبان کا ارتقا' اور 'داستان زبان اردو' میں پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو اور کھڑی بولی کو ایک ہی تصور

کرتے ہیں اور اردو کے آغاز کا زمانہ بارہویں صدی قرار دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اردو جب بول چال کی زبان بن گئی تو اسے کھڑی بولی کے نام سے موسوم کیا گیا۔'داستان زبان اردو' میں اردو کی ابتدا کے بارے وہ اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی، دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔امیر خسرو،ابوالفضل، شیخ بہاء الدین باجن نے اسے دہلوی کہا۔ ہندو اہل علم عام طور سے برج،قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے جو اس وقت 'پڑی' کہلاتی تھیں، کھڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی، مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی، ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔زبان بنیادی طور سے وہی رہی جو آج ہے۔اس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے۔''('داستان زبان اردو'،ص94)

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں اپنی کئی کتابوں میں تفصیلی بحث کی ہے۔ان کتابوں میں 'اردو کی زبان'، 'اردو کا روپ' اور 'اردو کی کہانی' اہم ہیں۔ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر شوکت سبزواری کے ہم خیال ہیں اور وہ بھی اردو کو کھڑی بولی کا ایک روپ تسلیم کرتے ہیں۔لیکن وہ کھڑی بولی کا علاقہ اڑیسہ کے قریب واقع کسی 'کھڑ' نامی علاقے کو قرار دیتے ہیں جب کہ سبھی ماہرین لسانیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کھڑی بولی کا علاقہ نواح دہلی ہے۔ڈاکٹر سہیل بخاری نے ایک مضمون میں اردو زبان کے بارے میں یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اردو ہند آریائی زبان نہیں بلکہ ایک دراوڑی بولی ہے جو ہندوستان میں آریوں کی آمد سے قبل بھی رائج تھی۔ ظاہر ہے ڈاکٹر سہیل بخاری کی اس رائے کو لسانی تحقیق نہیں کہا جا سکتا۔اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''کھڑی بولی علاقۂ کھڑ، کی بولی ہے اور کھڑ غالباً اڑیسہ کے جنوب میں سمندر کے قریب واقع ایک کٹا پھٹا علاقہ ہے کیوں کہ کھڑ کے متبادل الفاظ کھنڈ اور کاٹ ہیں۔اسی علاقے میں جارج گیریسن کے قول کے مطابق کھڑیا اور کٹیائی نامی دو ملتی جلتی سی زبانیں بولی جا رہی ہیں جن کا ہلکا سا خاکہ اس نے ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' میں دیا ہے۔
میرے اندازے کے مطابق یہی اس کھڑی بولی کی جنم بھومی ہے جس کی فارسی لپی میں قلم بند کی ہوئی ایک شکل کو ہم ''اردو'' کہتے ہیں اور دیوناگری لپی میں قلم بند کی ہوئی دوسری شکل کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں۔اس بارۂ خاص میں کھڑی بولی یورپ کی سربو کروشین کے مشابہ ہے جو یوگوسلاویہ کی جنوبی سلاوی بولی ہے کہ جب وہ سرولک لپی (روسی رسم خط) میں لکھی جاتی ہے تو سربین کہلاتی ہے اور سربیا میں بولی جاتی ہے اور جب رومن لپی میں لکھی جاتی ہے تو کروشین کہلاتی ہے اور کروشیا میں بولی جاتی ہے۔ چناں چہ کھڑی بولی بھی سربو کروشین کی طرح دو مختلف لپیوں میں لکھے جانے کے باعث دو مختلف ناموں سے موسوم ہو گئی ہے۔'' (بحوالہ اردو زبان کی تاریخ،ص115)

ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کی طرح ڈاکٹر گیان چند جین بھی اردو اور کھڑی بولی کے مابین گہرے رشتے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اردو زبان کے لسانی مسائل پر انہوں نے کئی اہم کتابیں لکھی ہیں جن میں ''عام لسانیات''، 'لسانی مطالعے'، ''کھوج'' اور ''اردو کا اپنا عروض'' اہم ہیں۔اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ان کی سب سے اہم کتاب ''لسانی مطالعے'' ہے۔اپنے ایک مضمون ''اردو کے

آغاز کے نظریے‘‘ میں وہ اردو کو کھڑی بولی کا ہی ایک روپ قرار دیتے ہیں۔اس مضمون میں وہ اپنے نظریے پر اصرار کرتے ہیں کہ ’’اردو کی اصل کھڑی بولی اورصرف کھڑی بولی ہے۔‘‘ وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی کھڑی کا ایک روپ مانتے ہیں۔ان سے قبل ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی اردواور ہندی کوایک ہی زبان کے دوروپ قرار دیا تھا۔ڈاکٹر گیان چندجین اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

’’میں شوکت سبزواری اور سہیل بخاری سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو ہندی کھڑی بولی ایک ہیں۔اردو کھڑی بولی وہ روپ ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کسی قدر زیادہ اور تت سم سنسکرت الفاظ تقریباً نہیں کے برابر ہوتے ہیں لیکن اس خصوصیت کے باعث اردو کھڑی بولی سے علٰحدہ زبان نہیں ہو جاتی۔ کھڑی بولی مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔پہلے زمانے میں مغربی ہندی کی بولیوں میں برج بھاشا معیاری زبان کی حیثیت رکھتی اس لیے اس کے نام میں بھاشا کا لفظ لگا ہے۔اس کے ساتھ کھڑی بولی کو محض ایک بولی سمجھا جاتا تھا جیسا کہ اس کے نام میں مضمر ہے۔اب کھڑی بولی معیاری زبان ہے اور برج بھاشا ایک بولی۔ دونوں کے ناموں میں بھاشا اور بولی اپنے معنی کھو چکے ہیں۔‘‘ (بحوالہ اردو زبان کی تاریخ،ص51)

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں جس علمی تحقیق کی شروعات حافظ محمود شیرانی سے ہوتی ہے، اسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں،ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر گیان چندجین نے خالص لسانیات کی روشنی میں آگے بڑھایا۔ڈاکٹر محی الدین قادری زوراور پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق جو تحقیق کی ہے اور اپنے نظریات پیش کیے ہیں ان کا مطالعہ ہم آگے تفصیل کے ساتھ کریں گے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ لسانیات سے کیا مراد ہے؟

2۔ لسانیات کا آغاز کب ہوا؟

3۔ اردو کا تعلق زبانوں کے کس خاندان سے ہے؟

4۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق اردو کا آغاز کیسے ہوا؟

5۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی رائے کھڑی بولی کے بارے میں کیا ہے؟

6۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ڈاکٹر گیان چندجین کی سب سے اہم کتاب کون سی ہے؟

4.2.1 ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ

ڈاکٹر محی الدین قادری زور(1905-1962) اردو کے معروف ماہر لسانیات اور محقق تھے۔انھوں نے لندن اور پیرس میں واقع لسانیات کی تعلیم کے عالمی مراکز میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔اس وقت تک لسانیات کی اہم شاخ علم صوتیات کا اردو میں کوئی واضح تصور نہ تھا۔ڈاکٹر زور نے لسانیات کے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی۔انھوں نے علم صوتیات کی روشنی میں شمالی،دکنی اور گجراتی اردو میں فرق تلاش کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے علم صوتیات کی مدد سے اردو زبان کی ابتدا کے مسئلے کا نئے سرے سے جائزہ لیا اور اردو زبان کے آغاز وارتقا کے

بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ ڈاکٹر زور نے لسانیات کے موضوع پر جو علمی تحقیقات کی تھیں انھیں کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان کی پہلی کتاب ''ہندوستانی صوتیات'' (Hindustani Phonetics) 1930 میں اور دوسری کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' 1932 میں شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں میں ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ خصوصاً ہندوستانی لسانیات کے حصہ دوم میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے انھوں نے نہایت مدلل اور مفصل طور پر بحث کی ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کے لسانی پہلوؤں پر تحقیق کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو زبان میں محمود شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر کتاب موجود نہیں ہے۔ ان کے مطابق ''پنجاب میں اردو'' اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں اردو سے متعلق جدید ترین لسانی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس سے قبل اردو زبان کے آغاز وارتقا کے موضوع پر ایسا تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔

ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' میں اردو کی ابتدا کے متعلق سبھی اہم نظریات کا لسانیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی رائے پیش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے دکن سے اردو کے آغاز کے نظریے سے بحث کرتے ہوئے اس کی تردید کی ہے۔ آپ نے پچھلی اکائی اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی کے نظریات کا مطالعہ کیا۔ نصیرالدین ہاشمی اور کئی دوسرے علما اردو کی ابتدا دکن سے ہونے کے بارے اپنے غیر واضح خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے مطابق اردو ایک آریائی زبان ہے۔ ہندوستان کے جنوبی ساحلوں پر عرب تاجر اسلام سے قبل بھی تجارت کی غرض سے آتے رہے ہیں۔ یہ عرب تجار ساحلوں کے قریب دکن میں مستقل قیام پذیر ہوگئے اور اپنی بستیاں بسا لیں۔ ان علاقوں میں دراوڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ مہاراشٹرا میں بھی مقیم ہوئے۔ کسی قسم کے میل جول سے اگر اردو پیدا ہوتی تو یہ عربی اور دراوڑی عناصر پر مبنی ہوتی۔ لیکن اردو عربی کے بجائے زیادہ تر فارسی سے متاثر ہوئی ہے، لہٰذا دکن میں اردو کی ابتدا کا نظریہ غلط ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے سندھ میں اردو کی ابتدا کے نظریے کی بھی اس طرح تردید کی ہے۔ دکن کے بعد سندھ دوسرا مقام ہے جہاں مسلمان سب سے پہلے آئے اور قریب چار صدیوں تک قیام کیا۔ لیکن سندھ میں جس زبان کا ارتقا ہوا وہ اردو نہیں بلکہ سندھی کی قدیم شکل تھی۔ کیونکہ دکن کی طرح سندھ میں آنے والے مسلمان فاتحین کی زبان بھی عربی تھی۔

پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کے بارے میں ڈاکٹر زور کی رائے یہ ہے کہ پنجاب کو جن مسلمانوں نے فتح کیا وہ محمود غزنوی کی فوج تھی۔ ان مسلمانوں کی زبان فارسی تھی اور یہ پنجاب میں قریب دوسو سال تک مقیم رہے۔ اس لیے محمود شیرانی نے لسانی دلائل کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو، برج کے مقابلے میں پنجابی سے زیادہ قریب اور مشترک زبان ہے۔ ڈاکٹر زور نے محمود شیرانی کے نظریے کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی حمایت کی ہے۔ ڈاکٹر زور کے مطابق محمود شیرانی نے اپنے دلائل کے لیے جو مواد پیش کیا ہے وہ اردو زبان کے آغاز وارتقا کو سمجھنے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے میں بہت مفید اور معاون ہے۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر زور اس نظریے کا بھی جائزہ لیتے ہیں جس کے مطابق اردو دہلی میں فارسی اور ہندوستانی کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ محمد غوری نے دہلی کو فتح کیا اور طویل مدت تک یہاں مسلمان حکمران رہے۔ محمد تغلق کی فوجیں جس زبان کو لے کر دکن جاتی ہیں وہ یہی زبان ہے۔ اس کا تعلق ان زبانوں سے تھا جو دہلی اور اس کے گرد و پیش میں بولی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر

زوراس نظریے کو عام اور نسبتاً مستند قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نظریہ مکمل طور پر صحیح نہیں ہے اور اس میں ترمیم کی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر زور نے مذکورہ تمام نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اردو کی پیدائش دہلی کی فتح سے قبل ہو چکی تھی۔جب مسلمانوں نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اردو نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔اردو اس زبان سے نکلی ہے جو ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے سے الہٰ آباد کے درمیانی حصے میں بولی جاتی تھی۔ڈاکٹر زور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔اس طرح وہ محمود شیرانی کے اس نظریے کی تائید کرتے ہیں کہ اردو کی ابتدا پنجاب میں اس وقت ہوئی جب وہاں غزنویوں کی حکومت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی ، جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنا لیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمالی مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہٰ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔''

(ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر زور،ص 97)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جہاں محمود شیرانی کے نظریے کی حمایت کی ہے وہیں اردو زبان کے آغاز اور ارتقا میں پنجابی کے ساتھ ساتھ کھڑی اور ہریانی کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اردو پنجابی یا کھڑی بولی سے نہیں نکلی بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جس سے یہ دونوں زبانیں نکلی ہیں۔اس لیے اردو کی پنجابی اور کھڑی بولی دونوں سے بہت مشابہت ہے۔لیکن اردو زبان پر کھڑی بولی کے اثرات پنجابی کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ پنجابی اور کھڑی بولی کے علاوہ اردو پر ہریانی کا بھی کافی اثر ہے کیونکہ یہ دہلی کے آس پاس کی زبان ہے۔ وہ پنجابی، کھڑی اور ہریانوی سے اردو کے لسانی رشتے کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔ یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف اس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اسی علاقہ کے رہنے والے بھیرو بنگاہ کے میل کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آ کر آباد ہوئے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح ومفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آ رہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا۔'' (ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر زور،ص 90)

ڈاکٹر زور نے آگرہ کو بھی کھڑی کا علاقہ قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے کیونکہ یہ خالص برج کا علاقہ ہے۔اس اقتباس میں انھوں نے

ہریانی اور اردو کے لسانی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہریانی زبان اردو کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے قدیم دکنی اردو اور ہریانی میں جو مماثلت ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اردو ہریانی سے نکلی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس طرح انھوں نے یہ واضح کر دیا کہ اردو کا رشتہ پنجابی، کھڑی اور ہریانی سے ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔ لیکن اپنی اکثر تحریروں میں ڈاکٹر زور نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں پنجابی کو بہت اہمیت دی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان پر پنجابی کا اثر دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ مانتے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اپنا نظریہ لسانیات کے اصولوں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون ''اردو کی ابتدا'' (1962) میں بھی اپنے نظریے کی مزید وضاحت کی ہے۔ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے ڈاکٹر زور کے نظریے سے علمی اختلاف کرتے ہوئے ان کی لسانی تحقیق سے استفادہ بھی کیا ہے۔ مسعود حسین خاں اردو کی ابتدا کے سلسلے میں ہریانی زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اردو پر ہریانی کے اثرات کی جانب سب سے پہلے ڈاکٹر زور نے ہی اشارہ کیا ہے۔ اس طرح ماہر لسانیات ڈاکٹر زور کا نظریہ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق تمام نظریات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی دو اہم کتابوں کے نام لکھیے؟

2۔ ڈاکٹر زور نے دکن سے اردو کے آغاز کے نظریے کے متعلق کیا کہا ہے؟

3۔ سندھ میں اردو کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر زور کی رائے کیا ہے؟

4۔ ڈاکٹر زور کے مطابق اردو کس زبان پر مبنی ہے؟

5۔ اردو کے لسانی رشتے کن زبانوں سے ہیں؟

4.2.2 پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ

پروفیسر مسعود حسین خاں (پ 1919) اردو کے نامور ماہر لسانیات اور لسانی محقق ہیں۔ انھوں نے لسانیات کے کئی نئے پہلوؤں مثلاً صوتیات، تشکیلیات اور اسلوبیات وغیرہ موضوعات کو اپنی تحقیق کا مرکز بنایا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد وہ دوسرے بڑے محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل پر خالص سائنسی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کی طرح مسعود حسین خاں نے بھی نے لندن اور پیرس میں واقع لسانیات کی تعلیم کے عالمی مراکز میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ 1953 میں انھیں پیرس یونیورسٹی نے لسانیات میں اعلیٰ تحقیق کے لیے ڈی۔ لٹ کی ڈگری سے نوازا۔ اس سے قبل 1945 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مسعود حسین خاں کو ان کے تحقیقی مقالے ''مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل ہو چکی تھی۔ یہ تحقیقی مقالہ 1948 میں دہلی سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے ساتویں ایڈیشن میں انھوں نے نئی تحقیق کی روشنی میں مزید اضافے کیے ہیں۔ انھوں نے اس تحقیقی کتاب میں اردو کی ابتدا کے تمام موجود نظریات پر سوال کھڑے کیے اور اس مسئلے پر نئے سرے سے بحث کا آغاز کیا۔ مسعود حسین خاں کی اس کتاب نے انھیں ایک عہد ساز ماہر لسانیات کی شہرت عطا کی ہے۔ یہ کتاب اردو کے آغاز سے تعلق رکھنے والی زبانوں اور بولیوں کا توضیحی، تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔

اردو کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی جیسے اہم سوالوں کا جواب مسعود حسین خاں نے اسی جدید لسانیاتی مطالعے کی مدد سے تلاش کیا ہے۔اس طرح وہ اردو زبان کے آغاز کا سب سے قابل قبول نظریہ پیش کرتے ہیں۔

مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبانِ اردو میں اپنا نظریہ پیش کرنے سے قبل اردو کی ابتدا سے متعلق معروف لسانیاتی نظریوں کا جائزہ لیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے برج بھاشا اور پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریات پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کے علاوہ میر امّن، ماسٹر رام چندر اور سر سید احمد خاں نے بھی اردو کو برج بھاشا سے منسوب کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ برج بھاشا نے قدیم اردو کو جدید اردو میں تبدیل کرنے میں مدد کی ہے اور اردو کے ارتقا میں برج کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔لیکن چند لسانی مماثلتوں کے ساتھ ہی اردو کی بنیادی بولی' کھڑی اور برج میں لسانی اختلافات بھی ہیں۔اس لیے اردو اور برج بھاشا کے بیچ ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔

برج سے اردو کی پیدائش کی تردید کے بعد مسعود حسین خاں نے پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریے کی سخت تنقید کی ہے۔ یہ نظریہ محمود شیرانی کا ہے جس کی ڈاکٹر گراہم بیلی، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے تائید کی ہے۔مسعود حسین خاں نے اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ اس نظریے پر یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ جب اردو کا ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا اس وقت پنجابی خود اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔اس صورت میں ایک زبان سے دوسری زبان کی پیدائش کیسے ممکن ہے۔انھوں نے پنجابی اور جدید و قدیم اردو میں اہم اور بنیادی اختلافات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ان کا یہ بھی اعتراض ہے کہ محمود شیرانی نے قدیم دور میں جو خصوصیات پنجابی کی بتائی ہیں وہ سب اس عہد میں ہریانی میں بھی موجود تھیں جنہیں محمود شیرانی نے سرے سے نظر انداز کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر شیرانی نے دہلی کی قدیم زبان کے متعلق محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے اور ہریانوی زبان کو اردو کی قدیم شکل کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ سلاطینِ دہلی کے لشکر میں اور شہر کے بازاروں میں ہریانہ علاقہ کی آبادی کا عنصر ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔لہٰذا اردو کی ابتدا پر کام کرنے والوں کی توجہ نواحِ دہلی کی بولیوں پر مرکوز ہونی چاہیے۔''
>
> (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو)

مسعود حسین خاں نے نواحِ دہلی کی بولیوں ہریانوی، کھڑی اور میواتی سے قدیم دکنی کے لسانی رشتے تلاش کرتے ہوئے نواحِ دہلی کی سبھی بولیوں کے لسانی اختلافات پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی اور ہریانوی بولیوں کا تقابلی مطالعہ نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔انہوں نے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں پنجابی کے بجائے ہریانوی پر زور دیا ہے۔ وہ اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے نظریے کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانوی اور پنجابی میں خطِ فاصل قایم کرنا دشوار تھا۔قدیم اردو اور دکنی کا ''پنجابی پن'' اس کا ''ہریانی پن'' بھی ہے۔البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی کے مقابلے میں ہریانوی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔'' (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو)

اردو زبان پر ہریانوی کے اثرات کا ذکر گرئرسن، ژول بلاک اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی کیا ہے۔ مسعود حسین خاں نے قدیم دکنی اور ہریانوی میں صوتی مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ وہ دکنی میں غنّہ کے کثرت سے استعمال کی وجہ پنجابی کے بجائے ہریانوی سے رشتے کو بتاتے ہیں۔ انھوں نے کئی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ دکنی ضمائر پنجابی کی بہ نسبت ہریانوی سے زیادہ قریب ہیں اور دکنی اور ہریانوی میں جمع بنانے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔ مسعود حسین خاں پہلے اردو اور ہریانوی کے لسانی رشتے کی تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قدیم اردو ہریانی سے بنی تھی جس پر بعد میں کھڑی بولی کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن بعد میں انھوں نے ہریانوی کے ساتھ کھڑی بولی کو بھی اہمیت دی ہے اور اردو کی پیدائش میں دونوں بولیوں کو برابر کا حصہ دار بتایا ہے۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو کی ساتویں اشاعت (1987) میں یہ وضاحت کی کہ اردو زبان کے ماخذ کے بارے میں انھوں نے نظریاتی ترمیم کی ہے۔ اب وہ اردو کے آغاز کے سلسلے میں ہریانوی کے بجائے کھڑی کو اولیت دیتے ہیں۔ کھڑی بولی اور ہریانوی کے ساتھ ساتھ وہ دہلی اور نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں کا بھی تقابلی مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اردو زبان کے آغاز میں دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کی اہمیت کا اندازہ انھیں امیر خسرو (1253-1325) کے ایک فقرے ''دہلی و پیرامنش'' سے ہوا۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''نُہ سپہر'' میں بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست دی ہے۔ ہندوستان کی جن بارہ زبانوں کی فہرست امیر خسرو نے دی ہے وہ زبانیں خسرو کے عہد میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رائج تھیں۔ ان زبانوں میں ایک زبان ''زبانِ دہلی و پیرامنش'' بھی ہے جس سے مراد دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں ہیں۔ مسعود حسین خاں نے ان ہی بولیوں کو اپنی لسانی تحقیق کا مرکز بنایا اور اپنے نظریے کی بنیاد بھی ان ہی بولیوں پر رکھی۔ ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ ''زبانِ دہلی و پیرامنش اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے۔ اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد و منشا۔'' (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص 262)۔ مسعود حسین خاں نے دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ دہلی اور اس کے اطراف کی لسانی اہمیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''شہر دہلی تین بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا پار مغرب میں ہریانوی رائج ہے۔ شمال مشرق میں کھڑی اور جنوب میں برج کا علاقہ ہے۔ اردو کے ارتقا میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔'' (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ایڈیشن 1987، ص 235)

مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے آغاز کی تاریخ بھی اسی بنیاد پر طے کی ہے۔ ان کے مطابق جب مسلمانوں نے 1193 میں دہلی فتح کی تب دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں عربی و فارسی کے لسانی اثرات داخل ہونے شروع ہوئے۔ اس لیے اردو کا آغاز دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی سے قبل سندھ اور پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں عربی و فارسی کے الفاظ داخل ہو رہے تھے۔ لیکن مسعود حسین خاں مقامی بولیوں میں عربی و فارسی الفاظ کے داخل ہونے کو اردو کی پیدائش کی وجہ نہیں تسلیم کرتے۔ ان کے نظریے کے مطابق اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ محمد غوری کی فتح دہلی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا، بلکہ جب یہ لسانی اثرات زبانِ 'دہلی و پیرامنش' میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا پہلا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے، اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتح دہلی (1193) کے بعد۔'' (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص 235)

مسعود حسین خاں نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی فارسی کے لسانی اثرات کا نفوذ سب سے پہلے دہلی کے اطراف میں رائج کھڑی بولی میں ہوا۔ ان لسانی اثرات کے نفوذ کا عمل محمد غوری کے دہلی فتح کرنے کے بعد ہوا۔ کھڑی بولی کے مستند نمونے سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں۔ ان مستند نمونوں کی مثالیں بھی انہوں نے اپنی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' میں تفصیل کے ساتھ دی ہیں۔ مسعود حسین خاں دکنی اردو کو اردو کی ہی قدیم شکل مانتے ہیں اور اسے قدیم اردو کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے اس قدیم اردو کے دستیاب لسانی مواد کی صوتی خصوصیات، اسما، افعال اور حروف کا مطالعہ کر کے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح انھوں نے قدیم اردو اور کھڑی کے علاوہ نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں سے قدیم اردو کے باہمی رشتوں اور مماثلتوں کو تلاش کیا ہے۔ اس مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کا ابتدائی ڈھانچہ کھڑی اور ہریانوی سے تیار ہوا ہے جس پر رفتہ رفتہ علاقائی اثرات پڑنے لگے۔

مسعود حسین خاں اردو کے ارتقا میں برج بھاشا کے گہرے اثرات پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قدیم اردو کی تشکیل براہ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ اور جب سولہویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول زبان ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعہ درست ہوتی ہے۔'' (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ص 236)

مسعود حسین خاں کے مطابق قدیم دکنی یا مراہٹی کے بعض لسانی اثرات کے علاوہ اکثر نامانوس الفاظ کی توجیہ نواحِ دہلی کی مذکورہ تین بولیوں یعنی کھڑی بولی، ہریانی اور برج بھاشا سے کی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں زبانوں کے ارتقا کی رفتار بدلتے سیاسی حالات کے سبب تیز تر رہی ہے جب کہ جنوبی ہند میں دراوڑی زبانوں کے اجنبی ماحول میں لسانی ارتقا کی رفتار نہایت سست رہی۔ اس لیے دکنی اردو میں آج الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں چھ صدی قبل رائج تھیں۔

مسعود حسین خاں پہلے ماہر لسانیات ہیں جنھوں نے قدیم دکنی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کا لسانیاتی تجزیہ کر کے اردو زبان کے آغاز و ارتقا میں ان زبانوں کی اہمیت ثابت کی ہے۔ انھوں نے اپنا نظریہ نہایت مستند لسانی مواد سے مثالیں دے کر اور دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے آج بھی مسعود حسین خاں کا یہ نظریہ لسانیات کے لحاظ سے قابل قبول ہے کہ اردو کی جائے پیدائش دہلی اور نواحِ دہلی ہے۔ اردو کے آغاز و ارتقا کے متعلق یہ سب سے قابل قبول نظریہ ہے جس کی تردید اب تک کسی ماہر لسانیات نے نہیں کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ مسعود حسین خاں کا تحقیقی مقالہ کس نام سے شائع ہوا ہے؟

2۔ برج بھاشا کے متعلق مسعود حسین خاں کی رائے کیا ہے؟

3۔ مسعود حسین خاں کی نظر میں قدیم دکنی کا اردو سے کیا رشتہ ہے؟

4۔ ''زبانِ دہلی و پیرامنش'' سے کیا مراد ہے؟

5۔ مسعود حسین خاں کے مطابق اردو کی پیدائش کب ہوئی؟

6۔ اردو کے آغاز میں کھڑی بولی کی اہمیت کیا ہے؟

7۔ ہریانوی کا اردو سے کیا رشتہ ہے؟

4.4 اکتسابی نتائج

☆ بیسویں صدی میں جب لسانیات کا علم عام ہوا تو اس کی روشنی میں زبانوں کے آغاز وارتقا کے بارے میں خالص علمی اور سائنسی طریقے سے تحقیق کا آغاز ہوا۔

☆ ہندوستان میں لسانی تحقیق کا آغاز سر ولیم جونس نے کیا۔ ان کی قائم کردہ ایشیا ٹک سوسائٹی، کلکتہ نے ہندوستان میں لسانی تحقیق کو فروغ دیا۔

☆ بیسویں صدی میں ہند آریائی کے جدید دور کی زبانوں کی ابتدا پر لسانیات کی روشنی میں کئی ہندوستانی اور غیر ملکی محققین نے تحقیق کی۔

☆ جدید لسانی تحقیقات کے آغاز سے دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں بھی نئی بحث شروع ہوئی۔

☆ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مسائل پر لسانیات کی روشنی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مسعود حسین خاں جیسے محقق اور ماہرین لسانیات نے اہم تحقیق کی اور نتائج اخذ کیے۔

☆ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو کی ابتدا کے متعلق سبھی اہم نظریات کا لسانیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی رائے پیش کی ہے۔

☆ ڈاکٹر زور نے دکن اور سندھ میں اردو کی ابتدا کے نظریات کی تردید کی ہے لیکن محمود شیرانی کے پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کی حمایت کی ہے۔

☆ ڈاکٹر زور نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں پنجابی کو بہت اہمیت دی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان پر پنجابی کا اثر دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ مانتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے آغاز اور ارتقا میں پنجابی کے ساتھ ساتھ کھڑی اور ہریانی کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔

☆ اردو پنجابی یا کھڑی بولی سے نہیں نکلی بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جس سے یہ دونوں زبانیں نکلی ہیں۔

☆ اردو کی پنجابی اور کھڑی بولی دونوں سے مشابہت بہت ہے۔ لیکن اردو زبان پر کھڑی بولی کے اثرات پنجابی کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔

☆ پنجابی اور کھڑی بولی کے علاوہ اردو پر ہریانی کا بھی کافی اثر ہے کیونکہ یہ دہلی کے آس پاس کی زبان ہے۔

☆ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ یہ ہے کہ اردو کی پیدائش دہلی کی فتح سے قبل ہو چکی تھی۔

☆ جب مسلمانوں نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اردو نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔

☆ اردو اس زبان سے نکلی ہے جو ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے سے الہٰ آباد کے درمیانی حصے میں بولی جاتی تھی۔

☆ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔

☆ ڈاکٹر زور کا نظریہ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق تمام نظریات میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

☆ نامور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد وہ دوسرے بڑے لسانی محقق ہیں جنہوں نے اردو

زبان کے آغاز وارتقا کے مسائل پر خالص سائنسی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔

☆ 'مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو' پروفیسر مسعود حسین خاں کی مشہور کتاب ہے جو اردو کے آغاز سے تعلق رکھنے والی زبانوں اور بولیوں کا توضیحی، تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔

☆ مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا سے متعلق معروف لسانیاتی نظریوں کا جائزہ لیا ہے۔

☆ مسعود حسین خاں نے برج بھاشا اور پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریات کی پرزور تردید کی ہے۔

☆ مسعود حسین خاں نے اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے پر بحث کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا کہ محمود شیرانی نے قدیم دور میں پنجابی کی جو خصوصیات بتائی ہیں وہ سب اس عہد میں ہریانی میں بھی موجود تھیں جنھیں محقق نے سرے سے نظر انداز کر دیا۔

☆ دکنی ضمائر پنجابی کی بہ نسبت ہریانوی سے زیادہ قریب ہیں اور دکنی اور ہریانوی میں جمع بنانے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔

☆ مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے متعلق اپنا نظریہ نہایت مستند لسانی مواد کی مثالوں اور دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

☆ اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ محمد غوری کی فتح دہلی ہے۔

☆ دہلی اور اس کے آس پاس کا علاقہ اردو کی جائے پیدائش ہے۔

☆ اردو کی قدیم شکل دکنی اردو ہے جس میں قدیم اردو کا مستند ادبی سرمایہ موجود ہے۔

☆ مسعود حسین خاں نے قدیم اردو کے دستیاب لسانی مواد کی صوتی خصوصیات، اسما، افعال اور حروف کا مطالعہ کر کے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

☆ قدیم اردو اور کھڑی بولی کے علاوہ نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں سے قدیم اردو کے باہمی رشتوں اور مماثلتوں کو تلاش کیا ہے۔

☆ اردو کا ابتدائی ڈھانچہ کھڑی بولی اور ہریانوی سے تیار ہوا ہے جس پر رفتہ رفتہ علاقائی اثرات پڑنے لگے۔

☆ اردو کے ارتقا میں برج بھاشا کے اثرات بھی ہیں۔

☆ مسعود حسین خاں پہلے ماہر لسانیات ہیں جنھوں نے قدیم دکنی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کا لسانیاتی تجزیہ کر کے اردو زبان کے آغاز وارتقا میں ان زبانوں کی اہمیت ثابت کی ہے۔

☆ مسعود حسین خاں کا نظریہ اردو کے آغاز کا سب سے زیادہ قابل قبول نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

4.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
بھیرو بنگاہ	فوج کے شاگرد پیشہ اور خیمہ وخرگاہ
لسانیات	زبان کا علم
مبنی	بنیاد رکھا ہوا
مشتق	ایک لفظ سے دوسرا لفظ بنایا ہوا

ہیولیٰ	ڈھانچہ، خاکہ
تردید کرنا	رد کرنا، اعتراض کرنا، نامنظور کرنا
نامانوس الفاظ	قدیم الفاظ، غیر رائج الفاظ، ایسے الفاظ جو اب چلن میں نہ ہوں
صوتیات	آواز سے تعلق رکھنے والا علم
مدلّل	دلیل سے ثابت کیا ہوا، معقول، ٹھیک، درست
مفصّل	تفصیل سے بیان کیا گیا، صاف، واضح، کھول کر بیان کیا گیا
تجزیہ	الگ الگ کرنا، کسی بات کے ہر پہلو کو واضح کرنا
دلائل	دلیل کی جمع، کئی ثبوت
تائید کرنا	حمایت کرنا، ساتھ دینا
سرچشمہ	نکلنے کی جگہ، سوتا، منبع
مشترک	شریک، ساجھا، شرکت کیا ہوا
تشکیلیات	تشکیل کی جمع، زبان کی ساخت اور بناوٹ کا علم
اسلوبیات	زبان کے طرز، انداز اور روش کا علم
تقابل کرنا	مقابلہ کرنا، موازنہ کرنا
توضیح کرنا	واضح کرنا، تشریح کرنا، وضاحت کرنا
مماثلت	یکسانیت، مشابہت، مانند ہونا
مشابہ	مانند، مثل، نظیر، ہم شکل، یکساں
ضمائر	ضمیر کی جمع، مختصر اسم
منبع	ماخذ، نکلنے کی جگہ
ارتقا	فروغ، ترقی

4.5 نمونہ امتحانی سوالات

4.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ مسعود حسین خاں کا تحقیقی مقالہ کس نام سے شائع ہوا ہے؟

2۔ برج بھاشا کے متعلق مسعود حسین خاں کی رائے کیا ہے؟

3۔ مسعود حسین خاں کی نظر میں قدیم دکنی کا اردو سے کیا رشتہ ہے؟

4۔ مسعود حسین خاں کے مطابق اردو کی پیدائش کب ہوئی؟

5۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی دو اہم کتابوں کے نام لکھیے؟

6۔ ڈاکٹر زور نے دکن سے اردو کے آغاز کے نظریے کے متعلق کیا کہا ہے؟

7۔ سندھ میں اردو کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر زور کی رائے کیا ہے؟

8۔ ڈاکٹر زور کے مطابق اردو کس زبان پر مبنی ہے؟

9۔ اردو کے لسانی رشتے کن زبانوں سے ہیں؟

10۔ 'دہلی و پیرامنش' سے کیا مراد ہے؟

4.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اردو زبان کے آغاز کے متعلق ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ بیان کیجیے۔

2۔ مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا اور ارتقا میں کن زبانوں کو اہم مانا ہے اور کیوں؟

3۔ اردو زبان کے آغاز کے بارے میں مسعود حسین خاں کے نظریے کا خلاصہ پیش کیجیے۔

4۔ مسعود حسین خاں کے مطابق اردو زبان کب اور کہاں پیدا ہوئی، لکھیے۔

5۔ اردو کے آغاز میں دہلی اور نواحِ دہلی کی کن بولیوں کی اہمیت ہے؟

4.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کے بارے میں ڈاکٹر زور کی رائے کا جائزہ لیجیے۔

2۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو پر کن زبانوں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے، بیان کیجیے۔

3۔ ہریانوی اور اردو کے لسانی رشتے پر مسعود حسین خاں کے خیالات بیان کیجیے۔

4.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
2۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو (آٹھواں ایڈیشن)	پروفیسر مسعود حسین خاں
3۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ
4۔	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی
5۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی مترجم عتیق احمد صدیقی
6۔	اردو زبان کا ارتقا	شوکت سبزواری
7۔	اردو کا روپ	سہیل بخاری
8۔	لسانی مطالعے	گیان چند جین

بلاکIII: اردو ادب کے آغاز کا سماجی و تہذیبی پس منظر

اکائی 5: ہند عرب اور ہند ایران تعلقات

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 ہند عرب تعلقات

5.2.1 مذہبی روایات

5.2.2 تاریخی شہادات

5.3 تعلقات کے اسباب

5.4 تجارتی تعلقات

5.5 تجارتی راستے

5.5.1 ہندوستانی برآمدات

5.5.2 عربی برآمدات

5.6 دینی تعلقات

5.7 علمی وتمدنی تعلقات

5.7.1 لسانی تبادلہ

5.7.2 علمی وتمدنی تعلقات ظہور اسلام کے بعد

5.8 ہند ایران تعلقات

5.9 اکتسابی نتائج

5.10 کلیدی الفاظ

5.11 نمونہ امتحانی سوالات

5.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.0 تمہید

انسان ایک سماجی جاندار ہے، اسے زندگی گزارنے کے لیے ایک سماج اور سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اپنی تمام ضرورتوں کو از خود پورا نہیں کرسکتا ہے، ان کی تکمیل کے لیے اسے دوسرے انسانوں کی حاجت ہوتی ہے۔ اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے دوسروں سے ربط وتعلق کی ضرورت پڑتی ہے، جس کے نتیجے میں خاندان، قبیلے اور قومیں وجود میں آتی ہیں۔ انسانوں کے درمیان تعلقات افراد کی سطح پر بھی ہوتے ہیں اور قبیلوں وقوموں کی سطح پر بھی ہوتے ہیں۔ اس کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں لہذا اس کے تعلقات کی نوعیتیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں، کچھ تعلقات مادی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہوتے ہیں تو کچھ روحانی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور کچھ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے اہم ہوتے ہیں، جیسے تجارتی تعلقات کھانے پینے، لباس ومکان، آرائش وزینت اور آرام وراحت کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، مذہبی تعلقات روحانی تقاضوں کو اور علمی تعلقات تہذیبی اور تمدنی حاجتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے مابین قائم ہونے والے جملہ تعلقات ان ہی اہم عنوانات کے تحت آتے ہیں جیسے تجارتی، مذہبی اور علمی تعلقات۔ ہندعرب اور ہند ایران تعلقات نوع بشر کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ ذیل میں ہم ان تعلقات کا جائزہ لیں گے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد طلبہ ہندوستان اور عرب اور ہندوستان اور ایران کے درمیان زمانۂ قدیم سے قائم تعلقات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ان اسباب کو بھی جان لیں جنھوں نے ان تعلقات کو بنانے اور انھیں مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس اکائی کے ذریعے وہ اس تاریخی پس منظر سے بھی آگاہ ہوسکیں گے جس میں یہ تعلقات پروان چڑھے۔ یہ اکائی ان تعلقات کی مختلف نوعیت پر بھی روشنی ڈالتی ہے، جیسے تجارتی تعلقات، مذہبی اور علمی تعلقات وغیرہ۔

5.2 ہندعرب تعلقات

5.2.1 مذہبی روایات؛

ہندعرب تعلقات کی تاریخ بے حد قدیم ہے جو ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اگر مذہبی روایات کی مانیں تو ان تعلقات کا آغاز روئے زمین پر پہلے انسان کے ظہور سے ہی ہوگیا تھا، اور وہ پہلے انسان ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں، جنہیں برصغیر میں اتارا گیا تھا، اور جنہوں نے حضرت حوا کی تلاش میں برصغیر سے جزیرہ نما عرب کا سفر کیا، جہاں جدہ میں حضرت حوا کو اتارا گیا تھا۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: ''اللہ تعالی نے حضرت آدم کو ہندوستان میں اتارا، اور حضرت حوا کو جدہ میں، حضرت آدم ان کی تلاش میں نکلے اور مزدلفہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔'' ایک دوسری روایت ہے کہ: ''اللہ تعالی نے حضرت آدم کو سرزمین ہند میں اتارا''، ایک اور روایت میں جنوب ہندستان میں اتارنے کا ذکر بھی آیا ہے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی 1785 نے اپنی مشہور زمانہ کتاب (سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان) میں ان روایتوں کے لیے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

5.2.2 تاریخی شہادات؛

یہ مذکورہ تعلقات تو ماقبل تاریخ کے تھے اور وہ بھی بشرط صحت روایات، لیکن ہندوعرب کے ثابت شدہ تعلقات بھی تاریخ انسانی کی صبح

صادق سے ملتے ہیں جب کہ کرۂ ارض پر صرف تین تہذیبیں پائی جاتی تھیں۔ جن میں سے پہلی مصر میں دریائے نیل کے کنارے پھیلی ہوئی تھی، دوسری دجلہ وفرات کے ساحلوں کے اطراف واکناف میں قائم تھی اور تیسری تہذیب سندھ ندی کے کناروں پر پروان چڑھی تھی۔ان تہذیبوں کے محل وقوع اور معاصرت کے پیش نظر ان کے درمیان تعلقات کا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں لکھا ہے کہ چار قومیں بڑی ہیں: عرب، عجم، روم، ہند اور ان میں سے ہند وعرب ہم فکر وہم مشرب ہیں۔

ان تہذیبوں کی تدوین شدہ تاریخ کا تعلق چوتھے سے تیسرے الفیے (ملینیم) ماقبل مسیح کے درمیانی عرصے سے ہے۔ان تہذیبوں کے آثار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بے حد ترقی یافتہ اور باہم ایک دوسرے کے ربط میں تھیں۔1924ء میں جان مارشل اور آر۔ڈی۔ بنرجی نے سندھ میں واقع موہنجوداڑو تہذیب کا انکشاف کیا اور اس کے بعد کے سالوں میں پے درپے سندھ، پنجاب بلوچستان اور راجستھان وغیرہ میں زمین کی کوکھ سے متعدد شہر دریافت کیے گئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تہذیب ایک بڑے زمینی خطے میں پھیلی ہوئی تھیں۔بعض ماہرین کے خیال میں اس کا سلسلہ دریائے گنگا کے میدانوں تک دراز تھا۔دریائے سندھ کی تہذیب کے نام سے معروف یہ عظیم الشان تہذیب بے حد ترقی یافتہ تھی جو مصری اور بابلی تہذیب پر فوقیت رکھتی تھی اور سومری تہذیب کے ہم پلہ تھی۔بابلی اور سومری تہذیب کا تعلق عراق کی سرزمین سے تھا۔

موہنجوداڑو سے دریافت ہونے والے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اس تہذیب کے عراق کی سومری تہذیب سے بڑے مستحکم تعلقات تھے۔ان دونوں کے مابین تعلقات کو مضبوط بنانے میں ان ہندوستانی نژاد جماعتوں کا بڑا ہاتھ تھا جو پورے جزیرہ نما عرب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اتنی کثیر تعداد میں ہندوستانیوں کی موجودگی نے عربوں کی زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کیا تھا، اور ان کی فکری، سماجی اور لسانی تانے بانے پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہاں تک کہ عربی زبان کے علما کو یہ قاعدہ بنانا پڑا کہ عمان اور بحرین اور یمن کی عربی زبان کو معیاری نہیں مانا جائے گا کیونکہ وہاں کثیر تعداد میں ہندوستانی اور ایرانی اور حبشی رہتے تھے، جس سے ان علاقوں کے عربوں کی زبان خراب ہوگئی ہے۔

یمن میں ہندوستانیوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ جب اہل حبشہ نے یمن پر قبضہ کرلیا تو وہاں کا ایرانی صوبے دار سیف بن ذی یزن کسریٰ کے پاس بھاگ کر آیا اور اس سے مدد کا طالب ہوا اور کہا کہ: اے شہنشاہ! ہمارے ملک پر اجنبیوں نے قبضہ کرلیا ہے، تو کسریٰ نے اس سے پوچھا کہ کن اجنبیوں نے؟ اہل حبشہ نے یا ہندوستانیوں نے؟۔ کسریٰ کا سوال بتاتا ہے کہ ماقبل اسلام یمن میں ہندوستانی اتنی بڑی تعداد میں تھے اور ایسی قوت کے مالک تھے کہ ان کی جانب سے ملک پر قبضہ کرلینے کا احتمال اور امکان موجود تھا۔

عہد رسالت میں ہندوستانی کمیونٹی عربوں میں معروف ومشہور تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ہندوستان اور ہندوستانیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ جب نجران کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وفات کے چند ماہ قبل ملنے کے لیے آیا تو آپ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ یہ لوگ کس قوم سے ہیں جو ہندوستانیوں کی طرح لگ رہے ہیں۔عرب میں رہنے والے ان ہندوستانیوں کے کئی گروہ تھے جیسے 1۔الزط، 2۔الاساورۃ، 3۔السیابجہ، 4۔البیاسرہ اور 5۔التکاترہ۔ان جماعتوں کا تذکرہ عربی زبان کی ادبی اور تاریخی کتابوں میں کثرت سے آیا ہے۔جاہلی شاعری میں بھی ان ہندوستانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ہند وعرب کے تعلقات کثیر جہتی اور بے حد متنوع تھے، یہ تعلقات دینی بھی تھے اور تجارتی بھی، علمی بھی تھے اور تہذیبی بھی۔

5.3 تعلقات کے اسباب

ہند وعرب کے تعلقات بے حد قدیم ہیں۔ یہ تعلقات صرف سندھی وعراقی تہذیبوں تک محدود نہیں تھے بلکہ جزیرۂ نما عرب کے تمام

خطوں سے اور برصغیر کے مختلف علاقوں سے یہ تعلقات قائم تھے۔ ہند وعرب روابط کے قیام واستحکام کے پس پشت کئی عوامل کارفرما تھے جن میں سرفہرست تین تھے۔

جغرافیائی محل وقوع: جزیرنما عرب تین جانب سے سمندر سے گھرا ہوا تھا، بحرعرب کے مغربی ساحل پر واقع تھا اور ہندوستان کے روبرو تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان سمندر کے علاوہ کوئی چیز فاصل نہ تھی، اور ایک طرح سے یہ دونوں پڑوسی ملکوں کی طرح تھے۔

جزیرۂ نما عرب کے قدرتی احوال: عرب کے قدرتی احوال بے حد دشوار گزار تھے۔ اس کی بیشتر زمین بنجر اور غیر اپجاؤ تھی، لہذا وہاں کے رہنے والوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ تجارت کا سہارا لیں اور ضرورت کی اشیا غیر ملک سے برآمد کریں اور تجارت کے ذریعے حالات کا مقابلہ کریں۔

ہندوستان کی شادابی: ہندوستان اپنی سرسبزی وشادابی کے لیے ہر دور میں مشہور رہا ہے۔ ہندوستانی پیداوار کی کثرت اور اس کا تنوع بھی ہر دور میں دنیا والوں کے لیے جاذب نظر اور پرکشش رہا ہے۔ ہندوستان کی اس شہرت نے عرب تجار اور جہاز رانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، متعدد عرب ملاحوں اور تاجروں نے اپنے سفر ناموں اور کتابوں میں ہندوستان کی معدنیات، جواہر، خوشبویات اور ادویات وغیرہ کا دلفریب ذکر کیا ہے۔

5.4 تجارتی تعلقات

ہندوستانی پیداوار، اس کی خوبی وتنوع کی یہی شہرت تھی جس نے انسانی تہذیب کے اس مظہر کو جنم دیا جو 'مشرقی تجارت' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور جس تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے دنیا کی مختلف قوموں نے طویل جدوجہد کی ہے۔ عربوں کے ساتھ ساتھ رومیوں، فارسیوں، یونانیوں اور یوروپ کی دوسری قوموں نے اس تجارت پر قبضہ کرنے اور اس پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تاریخ کے بیشتر ادوار میں اس مشرقی تجارت پر عربوں کی بالا دستی رہی ہے۔ اور ہم تاریخ کی ابتدا سے دیکھتے ہیں کہ عربی سفینے ہندوستان کی مختلف بندرگاہوں سے مال تجارت لے کر بحرین، حضرموت، عمان اور مسقط وغیرہ کی بندرگاہوں تک پہنچتے ہیں اور وہاں سے اونٹوں کے ذریعے وہ مال تجارت حجاز ہوتے ہوئے شام اور مصر پہنچتا ہے، اور پھر انطاکیہ اور اسکندریہ کی بندرگاہوں سے وہی سامان یوروپ روانہ ہو جاتا ہے۔

توریت میں ان تجارتی قافلوں کا ذکر ملتا ہے جو جزیرہ، شام اور مصر کے درمیان چکر لگاتے ہیں۔ ان ہی قافلوں میں سے وہ قافلہ بھی تھا جس نے حضرت یوسف کو کنویں سے نکال کر مصر پہنچایا تھا۔ عہد نامہ قدیم میں ابھیرا کی بندرگاہ اور وہاں سے درآمد شدہ سامانوں کا ذکر ملتا ہے۔ مورخ کرسٹن لاسان (Christian Lassan) کے مطابق ابھیرا کیرالا کی قدیم بندرگاہ تھی جو اب بے پور (Bey pur) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس بندرگاہ سے حضرت سلیمان سونا، چاندی اور ہاتھی دانت وغیرہ منگوایا کرتے تھے۔

مورخ گورڈن چائلڈ (Gorden Childe) اپنی کتاب 'تاریخ میں کیا پیش آیا' (What happend in the History) میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''سندھی شہروں کی مصنوعات دجلہ وفرات کے کنارے بسے ہوئے (سومری تہذیب کے) شہروں تک پہنچتی تھیں، اور اس کے مقابلے میں وادی سندھ میں اسطوانی انگوٹھی سمیت سجاوٹ اور زینت کے کئی سامان دریافت ہوئے ہیں جو سومری شہروں میں تیار کیے گئے تھے''۔

دائرہ معارف برطانیہ نے بھی عراق کی موسو پوٹامین تہذیبوں اور ہندوستان میں موہنجو داڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں کے درمیان تجارتی

تعلقات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

عرب ہند تجارتی تعلقات ان تہذیبوں کے خاتمے کے بعد بھی قائم رہے۔ جب ہندوستان میں آرین عہد شروع ہوا تو جزیرہ عرب میں کنعانیوں کو عروج ملا، یونانی کتابوں میں انھیں فینیشی یا فینیقی کہا گیا ہے۔ ہندوعرب تجارتی تعلقات کو مضبوط و مستحکم کرنے میں ان فینیشیوں کا اہم کردار رہا ہے۔ یہی فینیشی قوم تھی جس نے انسانی تاریخ میں سب سے پہلے بحری تجارت کو فروغ دیا اور اسے بڑے پیانے پر اختیار کیا۔

جنوب جزیرہ میں حکومت سبا کے قیام کے بعد عرب ہند تعلقات اپنی بلندیوں پر پہنچ گئے تھے۔اس عہد میں یمن اور جنوب جزیرہ نما عرب کی جس ترقی، خوشحالی اور رونق کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے اس کا سبب یہی تجارت تھی۔ چنانچہ گوسٹاؤلی بان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں یونانی مورخین ہیروڈٹس، ارتھیمیڈ ور اور اسٹرابون وغیرہ کے حوالے سے یمن کی مادی ترقی اور تمدنی خوشحالی کا زبردست تذکرہ کیا۔قرآن کریم میں بھی 'سبا' کے نام کی ایک سورت ہے جس میں یمن کی شادابی و خوشحالی اور وہاں کے باغات کا ذکر ہے۔

5.5 تجارتی راستے

مشرقی تجارت کے تین اہم راستے تھے ان کا استعمال ہر دور میں رہا ہے۔ تاہم ان کی اہمیت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے:

پہلا تجارتی راستہ: ہندوستان کے شمال مغرب سے بلخ اور صحرائے کرمان ہوتے ہوئے ایران و عراق کے ذریعے انطاکیہ، اور بحیرہ روم کی دوسری بندرگاہوں تک کا راستہ۔

دوسرا تجارتی راستہ: ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے خلیج فارس ہوتے ہوئے ابلہ (موجودہ بصرہ) تک، اور وہاں سے دریائے فرات کے ذریعہ انطاکیہ اور دوسری بندرگاہوں تک کا راستہ۔ ابلہ کی اس بندرگاہ کا ہندوستان سے اس قدر مضبوط تجارتی رشتہ تھا کہ عرب اس کو 'ارض ہند' یعنی ہندوستان کی زمین کہتے تھے۔

تیسرا تجارتی راستہ: تیسرا راستہ سمندر کے ذریعے ہندوستان سے عمان اور یمن کی بندرگاہوں تک جاتا تھا، جہاں سے یہ راستہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا تھا۔

بحری راستہ: یہ راستہ بحر قلزم (Red Sea) سے ہوتا ہوا ایلہ پہنچتا تھا، جہاں آج اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ واقع ہے اور وہاں سے شام ومصر کی بندرگاہوں تک پہنچتا تھا۔

بری راستہ: یہ وہ راستہ تھا جس پر عرب قافلے یمن اور شام کے درمیان سفر کرتے تھے۔ یہ راستہ عربوں کی تجارتی زندگی میں شریان کی طرح تھا۔قرآن کریم نے اس راستے کو روشن شاہراہ کا نام دیا ہے۔ یہ بری راستہ نہ صرف مشرقی تجارت میں غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا، بلکہ ہندوعرب تجارتی تعلقات کو فروغ دینے میں بھی اس کا ایک اہم کردار تھا۔

مکہ مکرمہ اس بری راستے کے تقریبا درمیان میں واقع تھا، اس امتیازی محل وقوع نے مکہ کو اہم تجارتی مرکز بنا دیا تھا، عرب بالخصوص قریشی تجارتی قافلے سردیوں میں یمن کا سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام کا سفر کرتے تھے قریش کے ان اسفار کا ذکر قران کریم میں بھی ہوا ہے: ''لِایلاف قریش اِیلافهم رحلة الشتاء والصیف'' (قریش کو مانوس کرنے کے لیے، انھیں سردیوں اور گرمیوں کے (تجارتی) سفر سے رغبت دلایا)۔ عرب تاجروں نے مالابار (کیرالا) کے ساحلوں پر اپنی کوٹھیاں بنا رکھی تھیں جہاں وہ طویل عرصے قیام بھی کیا کرتے تھے۔ بعض عربوں

نے مقامی عورتوں سے شادیاں بھی کر لی تھیں۔

5.5.1 ہندوستانی برآمدات؛

ہندوستان سے جو اشیا عرب ملکوں اور وہاں سے یوروپین ممالک کو بھیجی جاتی تھیں ان کی ایک طویل فہرست ہے جن میں معدنی، نباتی اور حیوانی پیداوار وغیرہ شامل تھیں۔اہم اشیا حسب ذیل تھیں۔

1۔ بیش قیمت پتھر اور جواہرات 2۔ مسالہ جات اور خوشبویات 3۔ دوائیں اور جڑی بوٹیاں
4۔ مختلف قسم کی لکڑیاں 5۔ مختلف انواع کے رنگ اور رنگائی میں کام آنے والی چیزیں
6۔ روئی اور مختلف قسم کے کپڑے 7۔ پھل اور معدنی اشیا 8۔ جانور اور پرندے
9۔ تلوار، بھالے اور کمان 10۔ گینڈے کی سینگ اور کھمبات کی چپلیں

ان ہندوستانی برآمدات کے ذکر سے عربی ادب اور عربی شاعری بھری پڑی ہے، بالخصوص ہندوستانی تلوار یا ہندوستانی فولاد سے بنی ہوئی تلوار کا عربی ادب میں خوب ذکر ملتا ہے۔اور ان تلواروں کے کئی نام عربی ادب وشاعری کا جزو لاینفک بن گئے ہیں، جیسے ہندوانی، ہندی اور مہند وغیرہ۔

5.5.2 عربی برآمدات؛

عرب بھی بہت ساری چیزیں ہندوستان بھیجتے تھے، ان میں سے کچھ مقامی مصنوعات ہوتی تھیں اور کچھ مصروشام اور افریقہ کی درآمدات بھی شامل ہوتی تھیں۔ان عربی برآمدات میں سرفہرست عربی گھوڑے، شراب، مرجان، کپڑے، چاندی، زعفران اور کھجور وغیرہ شامل تھے۔

5.6 دینی تعلقات

ہندوستان میں موہنجوداڑو اور ہڑپا اور موسوپوٹامین (ما بین النہرین) تہذیبوں کے زیر زمین ملنے والے آثار سے اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ ماضی قدیم کی ان تہذیبوں کے درمیان صرف تجارتی اور فنی تعلقات ہی نہیں تھے بلکہ دینی اور فکری روابط بھی ان تہذیبوں کو باہم جوڑتے تھے۔

عرب اور ہندوستانیوں کے درمیان بہت سے دینی عقائد اور رسوم مشترک تھے چنانچہ شرک، بت پرستی، سیاروں اور ستاروں کی تعظیم اور ان کی عبادت وغیرہ دونوں کے درمیان مشترک دینی اقدار تھے۔ دنیا کے کئی بڑے بتکدے بھی دونوں کے نزدیک اہم زیارت گاہ تھے۔شہرستانی متوفی 1153ء نے مذاہب عالم کے تذکرے پر مشتمل اپنی کتاب الملل والنحل میں عرب و ہند کے سات عدد مشترک بتکدوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے اصفہان، ملتان، بلخ، فرغانہ اور یمن کے بتکدوں کے ساتھ ساتھ مکہ میں کعبہ اور ہندوستان میں واقع سدوسان نامی شہر کا بتکدہ بھی شامل تھا۔شہرستانی نے ایک ہندوستانی فرقے کا ذکر کیا ہے جو کہ ملت ابراہیمی پر تھا۔عرب تاجر ہندوستان سے صرف تجارتی سامان ہی نہیں لے گئے بلکہ بہت سے افکار وعقائد بھی لے گئے تھے، جن میں تناسخ اور لاثنویت (ادویت واد) وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوستانی کعبہ کی تعظیم کرتے تھے، اور وہاں نذر وتحائف بھیجتے تھے۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے زمزم کے کنویں کو از سرنو کھدوایا تو اس میں سے سات ہندوستانی تلواریں برآمد ہوئیں ممکن ہے کہ یہ تلواریں ہندوستانی تحفوں میں شامل رہی ہوں۔

ہندعرب دینی تعلقات اور بدھ مذہب: ہندعرب کے دینی تعلقات کو استوار کرنے میں بدھ مذہب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

عرب ملکوں میں بدھ ازم سمنیہ یا شمنیہ کے نام سے معروف تھا۔عربی کتب تاریخ اور سفر ناموں میں کوئی بھی قابل ذکر کتاب بدھ ازم (سمنیہ) کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔شہرستانی نے بھی اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے ندیم متوفی 945ء نے اپنی کتاب الفہرست میں بدھ کے مجسمے کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے بدھ کے ایک مجسمے کو بغداد میں دیکھا بھی ہے۔

5.7 علمی وتمدنی تعلقات

ہند وعرب علمی تعلقات کا ایک قدیم ترین مظہر ہندوستان میں فینیشی رسم الخط کا وجود ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے مستشرق بوہلر(Buhler) کے حوالے سے لکھا ہے کہ قدیم ہندوستانی رسم الخط جس میں موریہ(Mouryan) اور آندھرا(Andhara) حکومتوں کے نقوش دریافت ہوئے ہیں وہ سامی الاصل ہیں، یعنی جزیرہ نما عرب میں نشونما پانے والے رسم الخط میں سے کوئی خط اس کی اصل ہے بلکہ وہ فینیشی حروف سے مشابہت رکھتے ہیں جو فینیشی تاجروں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے ہوں گے۔علاوہ ازیں شہنشاہ اشوک نے 203 سے 201 ق م کے درمیان بدھ ازم کی تعلیمات کی نشر واشاعت کے لیے جو کتبات تیار کروائے تھے ان سب کی تحریر داہنے سے بائیں جانب لکھی گئی ہے، جو عربی اور سامی رسم الخط کی خاصیت ہے جبکہ سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانیں بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہیں۔

مدرسہ اسکندریہ کے خاتمے کے بعد ایرانی حکمران نوشیرواں (531-579ء) نے ایرانی شہر جندیسا پور (Gundeshapur) میں واقع علمی درسگاہ کو ایک عظیم الشان علمی مرکز میں تبدیل کردیا۔اس درسگاہ یا علمی اکادمی کی بنیاد شاپور اول نے ڈالی تھی جہاں ہندی، فارسی، عربی اور یونانی علوم وفلسفہ باہم شیر وشکر تھے۔یہ علمی ادارہ اسلامی فتوحات کے بعد بھی کافی عرصے تک برسر کار رہا۔

سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب عرب ہند کے تعلقات میں سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش کے حوالے سے لکھا ہے کہ مہابھارت کی جنگ کے دوران جب کوروں نے پانڈو کو موم سے بنے ہوئے گھر میں جلا کر مارنے کی سازش کی تو ان دونوں کے مشترکہ استاد درونا چاریہ نے یدھشٹر کو اس سازش کے بارے میں عربی زبان میں اطلاع دی اور یدھشٹر نے بھی اسی زبان میں ان کو جواب دیا۔اگر یہ حکایت درست ہے تو اس بات کی غماز ہے کہ ہند وعرب کے علمی تعلقات کتنے قوی اور قدیم ہیں۔

بلاد عرب میں ہندوستان کی دوائیں اور جڑی بوٹیاں بہت مقبول ومشہور تھیں جن میں عود ہندی، اطریفل (تری پھلا) ہلیلج (ہریں) بلیلج (بہیرا) قسط ہندی، بلاذر اور ذریرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس تمدنی لین دین میں ہندوستان سے عرب پہنچنے والی چیزوں میں دو مشہور کھیل چوسر اور شطرنج بھی شامل ہیں۔یہ دونوں محض کھیل نہیں ہیں بلکہ زندگی کے دو فلسفوں کی نمائندگی کرتے ہیں، چوسر فلسفہ جبر کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ پیغام دیتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں مجبور محض ہے اور اس کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے جبکہ شطرنج کا کھیل اپنے لامحدود امکانات کے ساتھ چوسر اور اس سے نکلنے والے فلسفے کی ضد ہے۔

5.7.1 لسانی تبادلہ؛

اگر لسانی لین دین اور الفاظ کا تبادلہ علمی تعلقات کا مظہر اور اس کی دلیل ہے تو عربی اور ہندوستانی دونوں زبانیں ان تعلقات کی قوت و قدامت کی گواہ ہیں۔ہم ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو زبان پر عربی کے اثرات سے بخوبی واقف ہے اور ہزاروں عربی الفاظ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔لیکن یہاں ہم عربی زبان میں ہندوستانی زبانوں کے چند الفاظ کا ذکر کریں گے کیونکہ یہ ہند وعرب کے علمی و

تمدنی تعلقات کی مضبوط اور عمدہ دلیل ہیں۔

زیادہ تر ہندوستانی الفاظ جو عربی زبان میں داخل ہوئے ان کا تعلق انھیں اشیا سے ہے جنھیں عرب ہندوستان سے منگواتے تھے۔ ان میں خوشبویات، مسالہ جات اور جواہرات وغیرہ شامل تھے۔ ان سے متعلق زیادہ تر عربی الفاظ ہندوستانی الاصل ہیں اور یہ بات عربی لسانیات کے مسلمات میں سے ہے۔ ان میں سے چند الفاظ حسب ذیل ہیں:

مسک(Mushka) قرنفل(Kanakphal) صندل(Chndan) کافور(Karpura) ہیل (الائچی Eil) جائفل(Jaephal) فلبل (سیاہ مرچ Pipalli) زنجبیل (ادرک۔ Zanjabira) ساج(Sag) ساسم(Sheesham) نارجیل(Narkila) انج(Amba) موز(Mocha) لیمون(Limu) اطریفل(Triphala) ہلیلج(Harra) بلیلج(Bahera) فوطہ(Pat) قرفس(Kerpas) شیت (کیڑے کی قسم۔ Cheet)

ان میں سے کم از کم تین الفاظ قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں اور وہ ہیں: مسک (مشک) کافور اور زنجبیل (ادرک)۔

5.7.2 علمی وتمدنی تعلقات ظہور اسلام کے بعد؛

ان علمی وتمدنی روابط کا تسلسل ظہور اسلام کے بعد بھی قائم رہا، اسلامی فتوحات کے بعد ہندوستانی لوگ امن اور رزق کی تلاش میں فوج درفوج عرب شہروں اور تہذیبی مراکز کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان ہندوستانیوں نے اموی اور عباسی حکومتوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

ابو حارثہ ہندی نامی شخص عباسی خلیفہ مہدی کے عہد میں بیت المال کا نگراں تھا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ ابو سالم زوطی نامی ایک شخص حضرت علی کی خلافت میں بصرہ کے بیت المال کا ذمہ دار تھا۔ حساب وکتاب میں اپنی مہارت کی وجہ سے مالیاتی امور میں ہندوستانیوں کو خصوصی ترجیح دی جاتی تھی۔ ان میں ابو رواح سندھی کا نام بے حد مشہور ہے۔ جاحظ نے خصوصیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ: دواؤں کی ہر دکان پر کوئی نہ کوئی سندھی ضرور ہوتا تھا۔ بے شمار ہندوستانی خواتین مختلف حیثیتوں سے عرب خاندانوں میں داخل ہوئیں امام حسین کی ایک اہلیہ بھی سندھ سے تھیں جن کا نام سلافہ تھا۔ علاوہ ازیں حضرت علی بن حسین زین العابدین کی اہلیہ اور زید شہید کی والدہ حیدان بھی ہندوستانی نژاد تھیں۔ خلیفہ یزید بن عبدالملک کی ایک منھ بولی بیٹی تھی جس کا نام حبابہ تھا۔ خلیفہ نے اس کی شادی عراق کے اپنے گورنر کے ساتھ کرائی تھی۔ نغمہ سراؤں میں بھی ہندوستانی مرد وخواتین کی اچھی تعداد تھی، جن میں سرفہرست نام خمار قندھاریہ کا تھا جن کے نغموں کو ابراھیم موصلی جیسے ماہر فن نے موسیقی دی تھی۔

جن ہندوستانی خاندانوں کو عباسی عہد میں غیر معمولی عروج حاصل ہوا ان میں سندھی بن شاہق کا خاندان بھی تھا۔ اس کے دو بیٹوں ابراھیم اور نصر کا جاحظ نے بہت تذکرہ کیا ہے اور دونوں کے علم وفن کو اپنی کتاب البیان والتبیین میں جا بجا سراہا ہے۔

ہندوعرب کے مابین علمی اور ثقافتی تعلقات کا ایک اور اشاریہ عرب کے مختلف شہروں اور خلفا وامرا کے درباروں میں ہندی نژاد علما اور فنانین کی کثرت بھی ہے، جنھوں نے عربی تہذیب اور اسلامی تمدن کے محل کی تعمیر میں خصوصی کردار ادا کیا۔ انھیں علما کے ذریعے ہندوستانی علوم وفنون عربی زبان میں منتقل ہوئے۔ خلفائے بنی عباس اور ان کے وزرا بالخصوص برامکہ اہل علم کا غیر معمولی اکرام کرتے تھے۔

ہندوستانی اطبا خلفا کے درباروں اور امرا کی مجلسوں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ مشہور طبیبوں میں منکہ ہندی سرفہرست تھے جنھیں یحیٰ برمکی نے ہندوستان سے بلوایا تھا۔ بہلہ ہندی نامی طبیب بھی خاص مقام رکھتا تھا۔ ان کا بیٹا صالح بھی نامور طبیب تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی

کتاب 'عیون الانباء فی طبقات الاطباء' میں بارہواں باب ہندوستانی اطبا کے ذکر کے لیے مخصوص کیا ہے۔

ہندوستانی اصل علما نے مختلف علوم وفنون میں بھر پور حصہ لیا، جیسے حدیث، فقہ، تاریخ، ادب اور شعر وغیرہ۔ان مشاہیر علما میں ابومعشر نجیح بن عبدالرحمان سندھی متوفی 786ھ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ان کی کتاب 'المغازی' اسلامی عربی میراث میں اہم مقام رکھتی ہے،ان کے علاوہ ہندوستانی نژاد محدثین کی ایک طویل فہرست ہے جن کا ذکر اسماء رجال کی کتابوں میں ملتا ہے۔فقہا میں امام مکحول متوفی 735ء، امام عبدالرحمان اورزاعی متوفی 774ء اور ابوسعید مالکی وغیرہ وہ مشاہیر ہیں جن کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ہندوستانی نژاد تھے۔خود امام اعظم ابوحنیفہ متوفی 767ء کے بارے میں بعض محققین کی رائے ہے کہ ان کے آبا واجداد ہندوستانی تھے۔

شعر وادب کے حوالے سے ابوعطا سندھی متوفی 796ء، ابوالہندی متوفی 796ء، کشاجم بن سندھی بن شاہک متوفی 961ء اور ابوصلع سندھی وغیرہ وہ نام ہیں جو عربی ادب کے آسمان پر ہمیشہ ستاروں کی مانند روشن رہیں گے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوعرب تعلقات خواہ اسلام سے پہلے ہو یا اسلام کے بعد میں، ہر دور میں بے حد مضبوط اور مستحکم رہے ہیں۔اور دونوں ملکوں کے باشندوں نے ان تعلقات سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا ہے۔ بلا شک وشبہ یہ تعلقات انسانی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔

5.8 ہند ایران تعلقات

ہندوستان اور ایران کے باہمی سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور لسانی تعلقات کی تاریخ، ازمنہ قدیم میں آریائی قبائل کی نقل مکانی اور توسیعی تحریکات کی تاریخ سے جاملتی ہے۔یہ آریائی قبائل حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال سے بھی پہلے اپنے اصلی وطن سے ہجرت کر کے ایک طرف تو یوروپ کے مختلف مقامات کو پہنچتے ہیں تو دوسری طرف ایشیائے کوچک سے ہوتے ہوئے ایران اور پھر ہندوستان کے زرخیز علاقوں میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔اور مآخذ کی روشنی میں 2000 قبل مسیح میں آریائی قبیلے کی شمال مغربی ایران میں موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔جب کہ 1500 قبل مسیح میں یہ قبائل ایران کے مشرقی علاقوں تک پھیل چکے ہیں اور سرزمین ہندوستان کی جانب کوچ کرتے جاتے ہیں۔اس طرح ہندوستان میں آریائی قبائل کے داخلہ کی تاریخ 1500 قبل مسیح طے پاتی ہے۔آریائی تہذیب یا ہند آریائی ثقافت، اپنے آپ میں ایک کثیر الجہات خصوصیات کی حامل واقع ہوئی ہے۔جس کے ہر پہلو کے تجزیاتی مطالعے صدیوں سے اہل علم و دانش حضرات کی خاص توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ان میں ماہرین عمرانیات اور ماہرین لسانیات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

زبانوں کے ارتقائی منازل کے مطالعہ اور لسانیاتی تجزیات سے حاصل ہونے والے نتائج کی رو سے انسانی تمدن کی تاریخ مرتب کرنے کی کوششیں بھی بڑی اہم ہیں۔جس کی روشنی میں، موجودہ متمدن دنیا کی مشہور زبانیں جو ارتقائی منزل میں اعلیٰ سطح پر ہیں، ان کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک گروہ ہند آریائی یا آریائی کہلاتا ہے اور دوسرا گروہ سامی۔

ہند آریائی زبان، آریائی اقوام میں مشترکہ طور پر رائج رہی، جو موجودہ عہد کے ہندوستان کی اکثر ہند یوروپی زبانوں کی اساس ہے۔اس لحاظ سے ایرانی اور ہندی گروہ کی زبانیں ایک ہی مشترکہ اصل کی شاخیں ہے۔ ہند آریائی یا آریائی گروہ ثقافتی اور سماجی اہمیت کے علاوہ لسانیاتی نقطۂ نظر کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا اور اہم ترین لسانی خانوادہ تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کا دائرہ اثر بہت ہی وسیع ہے۔شمالی اور جنوبی یوروپ، روس، ایشیائے کوچک، ڈنمارک کی اسکینڈ ینیویائی، لاطینی، البانی، اطالوی، یونانی، فرانسیسی، ٹیوٹانوی زبانیں، سرزمین ایران کی تمام

ہند ایرانی زبانیں، لہجے اور بولیاں ، جیسے قدیم پارسی، اوستائی، پہلو انیک ، پارسیک ، پہلوی، جدید فارسی ،طبری، تاجیکی ، گیلیکی ، پشتو، دری ، افغانی، بلوچی وغیرہ ، اورسرزمین ہند کی تمام ہند آریائی زبانیں، لہجے یا بولیاں جیسے قدیم سنسکرت ، پراکرت ، برج بھاشا، پنجابی ، ہریانوی،قنوجی ، کھڑی بولی، اودھی، بنگالی، مراٹھی، ہندوی ، اپ بھرنش زبانیں تمام ایک ہی لسانی خانوادہ ہندآریائی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کہ سامی زبانوں کی اصل جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی خطہ سے تعلق رکھتی ہے۔سامی گروہ کی مشہور زبانوں میں بابلی، سریانی ،عبرانی ، ارامی ،فینقی ،حبشی اورعربی زبانیں شامل ہیں۔

ہندوستان اور ایران کی زبانوں کا ایک ہی اساس سے تعلق رکھنا ہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ قدیم پارسی زبان اور قدیم سنسکرت زبان ایک دوسرے سے لسانی اعتبار سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہیں۔اوران کا تقابلی مطالعہ ماہرین لسانیات کے لیے ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہمیں دسویں صدی عیسوی کے عہد میں دستیاب ہوتی ہے۔1000ء میں جب ہندوستان کی وسیع سرزمین پر جدید آریائی زبانوں اورلہجوں کا فروغ ہورہا تھا اوراپ بھرنش بولیوں میں ادبی ارتقا عروج پر تھا تو سارے شمالی ہندوستان میں گنگا جمنا کے میدانی علاقوں میں پنپنے والی شورسینی اپ بھرنش ادبی زبان کی شکل اختیار کر رہی تھی۔اس صورت حال میں جب مغربی خطوں میں جدید فارسی زبان سے اس کا پہلے تصادم ہوتا ہے پھر اختلاط، جس کے نتیجہ میں ایک نیا لہجہ ایک نئی بولی ہندوی (اردو) کی تشکیل عمل میں آتی ہے جو کہ نئی اصوات ، نئے الفاظ کے ذخیرے اور نئے ثقافتی ورثہ کی بنا پر اپنی قدیم مقامی خصوصیات کے ساتھ ساتھ جدت طرازیوں کے ڈھانچوں میں ڈھالی جاتی ہے اور ایک نئے امتزاجی مزاج کے ساتھ سرزمین ہند میں پروان چڑھتی ہے۔ایک ہی لسانی خانوادہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہ اثر پذیری اور اثر اندازی بڑی ہی تیز رفتار رہی اور برصغیر ہند کی سرزمین میں برج بھاشا،کھڑی بولی اور دیگر ہندوستانی بولیاں ، فارسی زبان کے اثر وتاثیر کے تحت اس ہندوی لہجہ، یا مستقبل کی اردوزبان کی تکوین میں مشغول نظر آتی ہیں۔لسانی جہت کے علاوہ ہندوستان اور ایران کے عہد قدیم سے ہی سیاسی،تجارتی اور سفارتی تعلقات کے حوالے بھی تاریخ میں درج ہیں۔

قدیم ایران کے ہنجامنشی دور کے عظیم فاتح کوروش کبیر اور داریوش اعظم کی فتوحات ہندوستان کی سرحدیں عبور کر چکی تھیں۔اس کے علاوہ ایران اور ہندوستان کے حکمران، شہنشاہوں اور مہاراجاؤں کی سرپرستی میں بحیرہ عرب اور خلیج فارس کے درمیان تجاری اغراض سے بحری بیڑے رواں دواں رہتے تھے۔سکندر رومی کے ہاتھوں ہنجامنشی سلطنت کے خاتمہ کے بعدسکندر کے نائب سلوکس کی حکمرانی ، ایرانی اور ہندوستانی مفتوحہ علاقوں پر یکساں رہی۔رومی حکمرانی کے اس دور میں بھی شمال مغربی ہند کے بیشتر علاقے ایرانی تہذیبی وثقافتی عناصر کے اثرات قبول کر رہے تھے۔

ساسانی خاندان کی وسیع اور مستحکم سلطنت کے تحت ایران نے اپنی شان وشوکت اور جاہ وجلال کا لوہا پھر سے منوالیااور خاص طور پر شہنشاہ عادل کےخسرونوشیروان کے عہد میں ہندوایران تعلقات کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔انوشیروان ادبیات کےفروغ کے لیے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔اس کے عہد میں کئی علمی ،فلسفیانہ اوراصول اخلاق پرمبنی اہم کتابیں یونانی اور سنسکرت زبانوں سے پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئی تھیں جس میں سنسکرت کی مشہوراصول اخلاق کی کتاب پنچ تنتر بھی شامل ہے۔یہ کتاب ہندوستانی اخلاقی ادب کی مایہ ناز تالیف سمجھی جاتی ہے۔اس میں جانوروں کی زبان میں حکایتوں کے ذریعہ اصول اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔حکیم برزویہ یا بزرجمہر نے جو کہ ایرانی بادشاہ نوشیروان کے دربار کا

طبیب تھا' وہ ہندوستان سے یہ کتاب لے آیا اور'' کلیلک دمنک'' کے نام سے اس کا پہلوی میں ترجمہ کیا۔اس کتاب کا اگلے ادوار میں بھی پہلے پہلوی سے عربی میں کلیلہ و دمنہ' نام سے ،عربی سے جدید فارسی میں کلیلہ و دمنہ ،انوارِ سہیلی اور پھر اکبر بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان میں عیار دانش کے نام سے بار بار ترجمہ اور ترمیمات کی جاتی رہیں جو اس کتاب اور اس میں شامل اصول اخلاق کی اہمیت کے مظہر ہیں۔

ساسانی خاندان کی حکومت ،عرب افواج کے ہاتھوں شکست کھا جاتی ہے اور ایران کی سرزمین عرب حکمرانوں کے زیرنگین ہو جاتی ہے۔ایک جانب تو عربی فاتح قوم کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ اس مذہب کی نمائندہ زبان تھی جسے تقریباً پورے ایران نے قبول کر لیا تھا۔اس کے علاوہ اس وقت ایران میں متعدد بولیاں رائج تھیں۔ پہلوانیک ، پارسیک، پہلوی اور وہ درباری فارسی ، جسے دری کہتے تھے مرکزیت کی حامل تھی لیکن اس کا رسم الخط انتہائی پیچیدہ تھا۔جب ایرانیوں نے عربی رسم الخط پر اپنی زبان کا رسم الخط اختیار کیا تو فارسی پر عربی اثرات بہت تیز رفتاری سے رونما ہونے لگے۔الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ جدید پارسی یا فارسی زبان میں در آیا۔

سیاسی برتری ، مذہبی تقدس اور لسانی اعتبار سے ایک طاقتور زبان کی حیثیت سے عربی زبان تمام مفتوحہ علاقوں پر اپنی چھاپ چھوڑ رہی تھی ۔اس کے اثرات اتنے دوررس تھے کہ اس کے سیلاب سے کوئی زبان محفوظ نہ رہ سکی۔ یہاں تک کہ ایرانی زبان جو کہ لسانی اعتبار سے مختلف خانوادہ سے تعلق رکھتی تھی ، اس کو بھی کافی حد تک متاثر کیا۔اس اثر و نفوذ کے اسباب میں سیاسی ، مذہبی اور ثقافتی کے علاوہ لسانی اسباب بھی شامل رہے۔لیکن ایک امر مسلمہ یہ بھی ہے کہ ایران میں تقریباً تین صدیوں تک علمی و ادبی حلقوں پر اپنا تسلط بنائے رکھنے کے باوجود مقامی ایرانی زبانوں یا ایرانی لہجوں کی جگہ لینے میں کامیاب نہ ہوسکی۔عربی زبان چونکہ سامی الاصل ہے اس بنا پر بھی ہند ایرانی یا ہند آریائی زبانوں کے علاقے میں عوام میں اپنا کوئی مقام نہ بنا سکی۔گو کہ درباروں میں اور علما اس کی مذہبی اور علمی برتری کی بنیاد پر سرپرستی کرتے رہے۔عربی رسم الخط کے اختیار کرنے کی بنا پر بھی اگرچہ فارسی زبان نے بڑی تیزی اور آسانی سے بے شمار عربی الفاظ مستعار لیے اور اپنے دامن کو کشادہ اور مالا مال کیا،لیکن لسانی خانوادہ کے جداگانہ ہونے کی بنا پر فارسی زبان نے اس سامی الاصل الفاظ کو ہند ایرانی مزاج کے مطابق ڈھال کر اپنایا اور مفرس عربی الفاظ کی ایک کثیر تعداد فارسی زبان میں دخیل الفاظ کی حیثیت سے مستعمل ہوتی رہی۔عربی الفاظ کو مفرس کرنے کے اس عمل کی بدولت ایرانی فارسی زبان کی اپنی ذاتی حیثیت اور انفرادی شناخت باقی رہ سکی اور عربی اثرات صرف ذخیرہ الفاظ کی تشکیل تک محدود رہ گئے۔ ان عربی اثرات کی بنا پر جدید پارسی زبان ، فارسی جدید یا اسلامی فارسی بھی کہلائی جانے لگی ۔مستعار عربی الفاظ سے اپنے ذخیرہ الفاظ کو جہاں فارسی زبان نے رونق بخشی وہیں ،عربی زبان دیگر لسانی جہات پر اثر اندازی میں پیش رفت کے لیے رکاوٹ کا سبب بنی اور ایک علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی زبان ،ترقی کے منازل طے کرتی رہی۔

سامانی دربار میں فارسی زبان و ادب کی سرپرستی بڑے پرشکوہ پیمانے پر ہونے لگی ۔رودکی اور دیگر شعرا کے نغموں کی گونج ، فارسی کی شیرینی کو علما اور امرا میں مقبول کر رہی تھی۔غزنوی ، سلجوقی ، تیموری حکمران گو کہ ایران پر حکومت کرنے والے ترک نژاد فاتح تھے لیکن ان کے درباروں میں فارسی کی حکمرانی عروج پر تھی ۔فردوسی ،عنصری ، انوری، خیام ، عطار، سنائی، رومی ، حافظ' سعدی وہ نام ہیں جنھوں نے اپنی عظیم تخلیقات کے ذریعے فارسی زبان و ادبیات کو آسمان کی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔

مسلمانوں کی فتح سندھ کے نتیجہ میں سلطنت اسلامی کی سرحدیں جو کہ مشرقی ایران تک محدود تھیں، توسیع پا کر صوبہ سندھ تک پھیل

گئیں۔ دوسو سال بعد جب صفاریوں کے تحت ایک خودمختار ایرانی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو مشرقی ایران وخراسان کا بیشتر علاقہ بشمول سندھ اور ہندوستانی وافغانی سرحدوں کے صوبہ جات، ایرانی حکومت کے تحت آ گئے اور ایرانی تہذیب وثقافت کے راست اثرات نمایاں ہونے لگے۔ مزید برآں، محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد لاہور اسلامی بلکہ ایرانی تمدن کا گہوارہ بن گیا۔ محمود غزنوی کی قیادت میں سرانجام پانے والی مہمات میں شامل ترک افواج فارسی تمدن وثقافت کے اثرات کو سرزمین ہند کے شمال مغربی علاقوں میں تقویت بخش رہی تھیں۔ ایک بڑی مقامی آبادی ان سے باہمی رابطہ بنا رہی تھی۔ دوسری جانب فارسی زبان کے قادر الکلام شعرا ابوالفرج رونی، حسن غزنوی اور مسعود سعد سلمان اپنے کلام کی جولانیوں سے لاہور کے دربار کو روشن کیے ہوئے تھے اور امیر خسرو نے دہلی کے درباروں کا ذمہ اپنے مستحکم کاندھوں پر لے رکھا تھا۔ سماج میں علمی اور ادبی حیثیت فارسی دانی کے معیار سے مقرر کی جانے لگی۔ مقامی ہندو، برہمن اور دیگر راجپوت اقوام فارسی سیکھنے میں مشغول نظر آنے لگے۔ ہر کوئی فارسی زبان میں اظہار خیال کرتا۔ فارسی کو اشرافیہ کی زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

ہندوستان میں عہد غزنی سے سلطنت مملوکیہ، خلجی عہد پھر تغلق خاندان کی حکومت تک دربار کی زبان فارسی تھی۔ یہ حکمران اور امرا ترک نژاد تھے یا افغان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان ترکی یا پھر پشتو ہوتی لیکن ادبی اور ثقافتی زبان کی حیثیت صرف فارسی کو حاصل تھی۔ گوکہ عربی زبان کی علمی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے ان جدید مفتوحہ علاقوں پر برتری باقی رہی لیکن ہند آریائی لہجوں پر وہ اپنی گرفت نہ بنا سکی اور اس ہند آریائی لسانی خطے میں مقامی بولیوں پر براہ راست اثر انداز نہ ہو سکی۔

سولہویں صدی عیسوی سے مغلیہ دور کا ثقافتی وتہذیبی اعتبار سے بہت ہی پرشکوہ نقش ابھر کر آتا ہے۔ فارسی ادبیات کا ایک نیا اسلوب سبک ہندی کے نام سے معروف اور مقبول ہوتا ہے۔ شعروسخن کی زبردست سرپرستی کی جاتی ہے۔ درباری فارسی مفرس عربی الفاظ کے ذخیرہ کے ساتھ اپنے عروج کا کامیاب سفر طے کرتی جارہی تھی اور عوام میں فارسی زبان کے اثرات مرتسم ہوتے جارہے تھے۔ برج بھاشا ایک بولی سے ادبی ارتقا کے منازل طے کر رہی تھی۔ یہاں تک عہد عالمگیری میں ''ریختہ'' اپنی ایک پشت کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن محمد شاہ کا زمانہ ہی وہ زمانہ ہے جب اردو اس تشکیلی وتکوینی دور کی تکمیل کر لیتی ہے اور اسے کبھی ریختہ، کبھی دہلوی، ہندوی، یا پھر ہندی یا ہندوستانی کہا جاتا رہا۔ فارسی زبان کی آب وتاب کے ساتھ اردو قلعہ شاہی کی شاہی زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

زبان فارسی کے رنگ وروغن میں وہ نیا صوتیاتی نظام بھی شامل تھا جس کی بنا پر کئی نئی اصوات اور صوتیے مفرس عربی یا فارسی الفاظ کے ساتھ ہندوستانی لہجوں میں جگہ پا گئے۔ اردو کی تصرفات کی بنا پر اردو میں یہ عربی یا فارسی الفاظ جوں کے توں نہیں بلکہ مقامی لسانی مزاج کے مطابق ڈھالے جانے کے بعد ہی قبولیت کے درجہ کو پہنچے۔ ہند آریائی خانوادہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فارسی الفاظ کو ہندوی قالب میں ڈھالنے کا عمل بالکل فطری رہا۔ وہ عربی الفاظ جو فارسی کے ذریعہ ہم تک پہنچے ان کی قبولیت آسان ہوئی جب کہ عربی کے وہ الفاظ جو راست ہندوستانی لہجوں سے اختلاط کے عمل سے دوچار ہوئے ان کو اردو لہجے میں قبولیت پانا مشکل رہا۔ عربی کی طرح ترکی، مغول اور افغانی الفاظ کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ایسا ہے جو فارسی کے راستے اردو میں جگہ پاتا گیا اور اسی زبان کا حصہ بن گیا ہے۔ اس طرح اس نئے صوتیاتی نظام کو قلم بند کرنے کے لیے جو رسم الخط اپنایا گیا وہ عربی خط سے ماخوذ فارسی رسم الخط تھا جس پر مقامی اصوات کے اضافہ کے ساتھ اردو کے لیے ایک مکمل رسم الخط وضع کیا گیا۔ جس میں نہ صرف مقامی اصوات، ٹ، ڈ، ڑ کے علاوہ ہاکاری صوتیوں کی ترجمانی کی قابلیت تھی بلکہ فارسی اور عربی الفاظ کی ادائیگی کا

پورا ملکہ تھا۔فارسی رسم الخط، نستعلیق کو اردو کے لیے مخصوص قرار دیا گیا۔اردو کی تشکیل میں اس کے خط کے سبب بھی ایک کثیر تعداد مفرس عربی اور فارسی الفاظ کی شامل ہوتی گئی۔اردو ایک منفرد لسانی خصوصیات کی حامل ہندوستانی زبان کی حیثیت سے ہندوستان کے مشترکہ ثقافتی و تہذیبی ورثہ کی ترجمان تسلیم کی جاتی ہے۔

فارسی کے تمام تر اصناف،علامات،رمزیات،تلمیحات،محاورات،تصورات،تشبیہات اور استعارات، اپنی تہذیبی و تخلیقی روح کے سبب اردو زبان کو ادبی حیثیت سے ایک سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں دکن سے لے کر دہلی دربار تک، پورا ہندوستان عشق کے نغمہ سرائیوں کی سحر آفرینی سے مسحور نظر آتا ہے۔سینکڑوں شاعروں کی برسوں تک کی گئی ان تھک کاوشیں ان کے خون جگر سے اس ادبی روایت کی آبیاری کرتی رہیں جس کی بدولت اردو زبان و ادب کی روایات کو ایسی بہار اور شادابی حاصل ہوئی ہے کہ اردو زبان نے ہر بدلتے دور کے تقاضوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ اور ہر قسم کے جدید تصورات و رجحانات کو اپنے دامن میں سمیٹے کا سلیقہ حاصل کرلیا اور آج یہ ایک مشترکہ تہذیبی و ثقافتی روایات سے ہم آہنگ روح عصر کی ترجمان زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

5.9 اکتسابی نتائج

☆ ہندعرب تعلقات کی تاریخ بے حد قدیم ہے جو ہزاروں سال پر محیط ہے۔اگر مذہبی روایات کی مانیں تو ان تعلقات کا آغاز روئے زمین پر پہلے انسان کے ظہور سے ہی ہوگیا تھا۔لیکن ہندعرب کے ثابت شدہ تعلقات بھی تاریخ انسانی کی صبح صادق سے ملتے ہیں۔

☆ ان تعلقات کے قیام کے پس پشت کئی عوامل کارفرما تھے جن میں سرفہرست ہندوعرب کا جغرافیائی محل وقوع تھا جو انھیں دو پڑوسی ملکوں کی طرح بنا دیتا ہے، کیوں کہ دونوں کے درمیان سمندر کے سوا کوئی شئے نہیں ہے۔اس کے علاوہ عربوں کے سخت جغرافیائی حالات اور ہندوستان کی سرسبزی و شادابی بھی ایک اہم عامل ہے۔یہ تعلقات قدیم بھی تھے اور مضبوط بھی تھے،تجارتی بھی تھے اور علمی و ثقافتی بھی تھے۔دراصل مشرقی تجارت نے بھی ہندوعرب کے تعلقات کو مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

☆ عرب ایک بے آب و گیاہ صحرا تھا وہاں رہنے والوں کو اپنی تمام ضرورتوں کے لیے باہری درآمدات پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔عرب اپنی اکثر ضرورت کی چیزیں ہندوستان سے منگایا کرتے تھے۔تجارت کے علاوہ فکر و عقیدے کی قربت و مشابہت بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتی تھی۔شرک و بت پرستی دونوں میں مشترک تھے۔دنیا کے کئی بتکدے بھی دونوں کے نزدیک متبرک تھے۔ہند عرب کے علمی تعلقات بھی ہر دور میں بے حد مستحکم رہے ہیں۔قبل اسلام ہندوستان کی دوائیں عرب میں بے حد مقبول تھیں۔اسلام کی آمد کے بعد بھی ہندوستانی علما و فضلا نے عرب اسلامی تہذیب کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا۔عرب ہند تعلقات انسانی ربط و تعلق کی تاریخ کا ایک قابل ذکر باب ہے۔

☆ ہندوستان اور ایران کے باہمی سیاسی،تمدنی،ثقافتی اور لسانی تعلقات کی تاریخ کا آغاز،ازمنہ قدیم میں آریائی قبائل کی مشرق کی جانب نقل مکانی کی تاریخ سے ہی ہوتا ہے۔آریائی قبائل دو ہزار سال قبل مسیح سے پہلے ہی ایرانی اور پھر ہندوستان کے علاقوں میں موجود تھے۔اور مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ 1500 قبل مسیح کے بعد یہ آریائی قبائل ہندوستان کی سرزمین میں اپنی آبادیاں قائم کر چکے تھے۔

☆ آریائی تہذیب یا ہندآریائی ثقافت ایران اور ہندوستان کے لیے کئی طرح سے مماثلت اور یکسانیت رکھتی ہے۔مشترکہ لسانی اساس

تمام مشترکہ بنیادوں میں سب سے زیادہ مستحکم تسلیم کی گئی ہے۔

☆ ہندآریائی زبان، آریائی اقوام کی مشترکہ زبان تھی اور اسی بنیاد پر ایرانی اور ہندوی گروہ کی زبانیں ایک ہی مشترکہ اصل کی شاخیں ہیں۔ یہی وہ سبب ہے کہ قدیم پارسی زبان اور قدیم سنسکرت زبان ایک دوسرے سے لسانی اعتبار سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہیں۔عہد وسطیٰ میں جب سرزمین ہندوستان میں آریائی لہجے اور اپ بھرنش بولیاں فروغ پا رہی تھیں، اسی عہد میں ایرانی تہذیب کی ترجمان کی حیثیت سے فارسی زبان کا ان کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک نیا مخلوط لہجہ ہندوی یا اردو تشکیل پاتا ہے۔

☆ کثیر تعداد میں مفرس عربی الفاظ اور فارسی کے محاوروں کے ترجموں کی موجودگی اس لہجہ کو انفرادیت بخشتی ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے ایک مستقل لہجہ ہی نہیں بلکہ ایک معتبر رسم الخط کی حامل معاصر تہذیبی و ثقافتی اقدار کی نقیب اور روح عصر کی ترجمان ادبی زبان کی حیثیت حاصل کرلیتی ہے۔جس کو ریختہ، ہندوستانی، ہندوی یا پھر اردو کے نام سے موسوم کیا گیا۔اس تکوینی و تشکیلی مراحل میں مغل سلاطین کی سرپرستی کو بھی دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ بڑی اہمیت حاصل ہے۔

5.10 کلیدی الفاظ

برمائی	زمینی وسمندری	محل وقوع	واقع ہونے کی جگہ
معاصرت	ہم زمانہ ہونا	ہم مشرب	ایک مزاج یا ایک طریقے کا
تدوین	ترتیب، تحقیق	باہم	آپس میں
نژاد	اصل،نسب	نجران	جنوب مغربی سعودی عرب کا ایک شہر
عوامل	اسباب	معدنیات	زمین سے برآمد ہونے والی قیمتی شئے
مظہر	علامت، دلیل	رقمطراز ہیں	لکھتے ہیں
امتیازی	نمایاں، دوسروں سے الگ	استوار کرنا	ہموار کرنا
کتبات	تحریریں	غماز	اشارہ کرنے والا
تسلسل	پیہم ،لگاتار	شناخت	پہچان
تشکیل	تعمیر	مشاہیر	مشہور لوگ
معتزلہ	مسلمانوں کا ایک فرقہ	بے آب وگیاہ	بے پانی وگھاس،چٹیل
درآمدات	باہر سے منگوائی گئی اشیا	نقل مکانی	ہجرت
توسیعی تحریکات	پھیلنے کی کوشش کرنا	ازمنہ	زمانے
پارسی	فارسی کی قدیم صورت	اوستائی	کتاب اوستا کی زبان
کوروش	قدیم ایرانی بادشاہ	ہنجامنشی	قدیم ایرانی شاہی خاندان
زیرنگیں	حکومت کے تحت	درآنا	داخل ہونا

مستعار لینا	اپنا لینا، ادھار لینا	دخیل الفاظ	داخل ہونے والے الفاظ

5.11 نمونۂ امتحانی سوالات

5.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی کس کتاب میں ہندوستان سے متعلق اسلامی روایات کا ذکر کیا ہے؟

2۔ شہرستانی نے اپنی کتاب میں دنیا کی کن چار بڑی قوموں کا تذکرہ کیا ہے؟

3۔ مصری تہذیب کس دریا کے کنارے قائم تھی؟

4۔ قران کی کس سورت میں قریش کے تجارتی سفر کا ذکر ہوا ہے؟

5۔ حضرت سلیمان ہندوستان کی کس بندرگاہ سے سامان منگواتے تھے؟

5.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ عرب ہند کے تجارتی تعلقات پر ایک مقالہ لکھیے۔

2۔ عرب ہند کے دینی اور علمی روابط کا جائزہ لیجیے۔

3۔ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات مرتب ہونے کے اسباب کو بیان کیجیے۔

4۔ اردو ادب میں فارسی روایت کے آغاز پر روشنی ڈالیے۔

5.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ عرب اسلامی تہذیب کی نشو ونما میں ہندوستانی علما وفضلا کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

2۔ ہندوعرب کے درمیان ہونے والی تجارت کے راستوں پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

3۔ ہندوستان سے عرب برآمد کی جانے والی اشیا اور عرب سے درآمد کی جانے اشیا پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

5.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ عرب و ہند کے تعلقات — سید سلیمان ندوی

2۔ تفسیر وحدیث میں ہندوستان کا تذکرہ — سید علیم اشرف، (اردو ترجمہ شمامۃ العنبر ،غلام علی آزاد بلگرامی)

3۔ عرب وہند عہد رسالت میں — قاضی اطہر مبارکپوری

4۔ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات — ڈاکٹر عصمت جاوید

اکائی 6: شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 سماجی وتہذیبی پس منظر
6.2.1 شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر
6.2.2 دہلی کا سماجی وتہذیبی منظر نامہ
6.2.3 لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی منظر نامہ
6.3 شمالی ہند میں اردو ادب کا پس منظر
6.3.1 دبستانِ دہلی
6.3.2 دبستانِ لکھنؤ
6.4 دہلی ولکھنؤ کی معاشرت کا ایک سرسری جائزہ
6.5 شعروادب پر ماحول کے اثرات
6.6 اکتسابی نتائج
6.7 کلیدی الفاظ
6.8 نمونہ امتحانی سوالات
6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.0 تمہید

شمالی ہند میں اردو کے سماجی وتہذیبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی، سماجی، لسانی اور تہذیبی عوامل کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا، جس میں اردو کا ڈول تیار ہوا اور اس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کی۔ عہد وسطیٰ میں دہلی کی مرکزیت سے بہت سی چیزیں پروان چڑھیں، جس میں اردو بھی ایک ہے۔ اردو ادب کے فروغ میں درباروں، خانقاہوں، بازاروں اور میلوں ٹھیلوں کا بھی اہم کردار ہے۔ عوام الناس اشیا کے لین دین کے لیے بازاروں میں جب یکجا ہوتے تھے تو سامان کے ساتھ زبان کا بھی تبادلہ کیا کرتے تھے۔ مقامی اور خارجی لوگوں کا یہ میل جول ایک

زبان کے پیدا ہونے کا سبب بنا اور اس میل جول سے جو زبان تیار ہوئی اس کا سلسلہ ریختہ، اردوئے معلیٰ، شاہجہانی اردو اور ہندوی سے ہوتے ہوئے اردو تک پہنچا جس کا شمار آج دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس اکائی میں انھیں باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ عہد وسطیٰ میں دہلی اور لکھنؤ میں اردو ادب کے فروغ کو سمجھا جا سکے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو شمالی ہند میں اردو ادب کے سماجی اور تہذیبی پس منظر سے واقف کرانا ہے تاکہ آپ اردو ادب کے شمالی ہند میں فروغ، سماجی و تہذیبی پس منظر سے آگاہ ہو سکیں۔ ساتھ ہی اس اکائی کے مطالعے سے آپ اس قابل ہو جائیں کہ اردو ادب کے شمالی ہند میں ہوئے ارتقا اور لسانی پس منظر سے متعلق پوچھے گئے سوالات کا جواب بھی دے سکیں۔

- ☆ اردو کے سماجی و تہذیبی پس منظر پر اظہارِ خیال کر سکیں۔
- ☆ اردو کے فروغ میں خانقاہ و صوفیائے کرام کے کردار کی نشاندہی کر سکیں۔
- ☆ دہلی اور آس پاس کی سماجی و تہذیبی صورت حال پر اپنی ایک رائے قائم کر سکیں۔
- ☆ شمالی ہند میں اردو کے آغاز و ارتقا کا سماجی و تہذیبی حال بیان کر سکیں۔

6.2 سماجی و تہذیبی پس منظر

سماج ایک ایسے گروہ کو کہتے ہیں جو کسی ایک جغرافیائی حدود میں رہتا، کھیتی کرتا، خوشی، غم اور زندگی کے مختلف مراحل میں ایک جیسے عمل کرتا ہو اور سماج کے ذریعے بنایا گیا قانون ہر کسی پر یکساں لاگو ہوتا ہو۔ ساتھ ہی پورے سماج کا نفع اور نقصان بھی مشترک ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیدائش سے مرنے تک کی جو رسوم ہیں وہ ایک جیسی ہوں۔ زمانۂ قدیم میں پورے سماج میں ایک ہی جیسی رسمیں ہوا کرتی تھیں مگر آج دولت مند لوگوں نے اپنے لیے ممتاز طرح کی رسوم بنا لی ہیں اور متوسط طبقہ و غریبوں کے لیے الگ طرح کی رسمیں برسہابرس سے چلی آ رہی ہیں۔ کسی سماج کے زندگی گزارنے کے جو طور طریقے ہوتے ہیں، پیدائش سے وفات تک کی جو رسمیں ہوتی ہیں، ان تمام کے میل جول سے تہذیب بنتی ہے۔ آئندہ چند عناوین کے تحت ہم شمالی ہند بالخصوص دہلی اور لکھنؤ کی سماجی و تہذیبی پس منظر کا مطالعہ کریں گے۔

6.2.1 شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر؛

اردو ادب کے سماجی و تہذیبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے عہد وسطیٰ میں زبانوں کی گروہ بندی کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا تاکہ زبانوں کی خصوصیت کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے۔ جب زبانوں کے نام ان کے علاقوں کے نام سے منسوب کیے گئے تو اردو کا کوئی خاص علاقہ نہیں تھا۔ جیسے کہ مراٹھی، گجراتی، شورسینی (متھرا) اردھ ماگدھی، ماگدھی اور بنگالی، وغیرہ کا تھا۔ انھیں میں شورسینی اپ بھرنش سے کھڑی بولی پروان چڑھی، جس سے دو زبانیں وجود میں آئیں، جن کا نام اردو اور ہندی ہے۔ اردو کا کوئی خاص علاقہ نہیں تھا، اس کے باوجود آج پورے برِ صغیر میں اردو رابطے کی زبان ہے۔

عہد وسطیٰ میں دہلی لشکروں کی آماج گاہ تھی، جہاں فوجی مقامی لوگوں سے ضروری اشیا خریدتے تھے۔ بازار میں اسی دوران تاجر اور گاہک کے درمیان سامانوں کے ساتھ ساتھ زبانوں کا بھی تبادلہ ہوا کرتا تھا۔ ان فوجیوں میں باہر سے آئے ہوئے فوجی عرب، ایرانی و افغانی ہوا

کرتے تھے،انہیں کے میل جول سے ایک ملی جلی زبان پروان چڑھی۔

اسی طرح اس عہد میں خانقاہوں، درگاہوں اور صوفیا کے مساکین عوام الناس کے لیے ایک روحانی سکون کا مرکز تھے، جہاں ہر کوئی بلا تفریق مذہب وملت جایا کرتا تھا۔ان مقامات پر صوفیائے کرام عوام کی زبان میں خطاب کرنے کی کوشش کرتے تھے،جس میں ان کی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کے الفاظ بھی شامل ہوتے تھے۔صوفیا کے یہ دربار عوام کی ایک بڑی آماجگاہ تھے، جہاں مخلوط زبان کو خاطر خواہ پذیرائی اور فروغ ملا۔تاریخی اعتبار سے دہلی کی مرکزیت ہر اعتبار سے اہم تھی ۔ بیرونی ممالک سے آنے والے حملہ آور لشکر کے ساتھ جب دہلی کو لوٹنے کی غرض سے آتے تھے تو سبھی واپس نہیں جاتے تھے بلکہ ان میں سے کچھ یہیں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ایسے لوگ بھی ایک نئی زبان یا مخلوط زبان کے استعمال پر مجبور ہوتے تھے۔ان باتوں کے شواہد بابر نامہ، تزک جہانگیری اور دیگر تاریخی کتابوں میں مل جاتے ہیں ۔مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے باعث دہلی پر بار بار ہو رہے حملوں سے پریشان ہو کر ادبا اور شعرا نزدیکی ریاست اودھ (فیض آباد ،لکھنؤ) کا رخ کرنے لگے جو اس وقت ایک خوش حال ریاست ہوا کرتی تھی۔دہلی پر بار بار ہو رہے حملوں سے دہلی حکومت کی حیثیت کاغذی رہ گئی تھی ، جب کہ اس کے مقابلے اودھ میں خوش حالی اور ادبا و شعرا کی خاطر خواہ پذیرائی ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی سے کئی ایک شعرا لکھنؤ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔دہلی کے بار بار لٹنے اور ویران ہونے کے سبب دہلی میں ہونے والی شاعری پر اس کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں رومان پروری نظر آتی ہے۔

6.2.2 دہلی کا سماجی وتہذیبی منظر نامہ؛

دہلی کے سماجی منظر نامے پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو مغل دربار،صوفیا کے مساکین، جمنا کے گھاٹ،اردو بازار وغیرہ کے عوامل پر غور کرنا ہوگا۔اسی کے ساتھ ساتھ دلی کی تہذیبی زندگی کو سمجھنے کے لیے دہلی کی سیاسی زندگی لوٹ مار قتل و غارت اور یلغار کو بھی سمجھنا ہوگا، کیوں کہ سیاسی عدم استحکام سماج کی امیدوں کو معدوم کر دیتا ہے۔ایسے حالات میں عوام مذہبی اور روحانی سکون کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ایسے وقت میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے اس میں زیادہ تر رنج والم، افسردگی، زمانے کی ناہمواری اور تصوف کو مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے۔ایسا ہی کچھ دہلی میں تخلیق ہونے والے ادب کا بھی ہوا۔چوں کہ مغلیہ سلطنت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد بے حد کمزور ہوگئی تھی لہٰذا دہلی کی حکومت آس پاس کی حکومتوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کا مقابلہ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ایسی حالت میں شعرا رومان پرور خیالات ،امید افزا تصورات کو قلم بند کرنے سے گریز کرنے لگے ۔اسی لیے دبستان دہلی کی شاعری میں غم، حرماں نصیبی، تڑپ اور کسک کے ساتھ ساتھ تصوف نے اہمیت حاصل کر لی ۔ یہی وجہ ہے کہ دبستان دہلی کی شاعری کو آہ کی شاعری کا دبستان کہا گیا۔ایسا صرف دبستان لکھنؤ کی شاعری کو دیکھ کر اور دونوں دبستانوں کی انفرادیت کو قائم کرنے کے لیے کہا گیا۔

دہلی کی سماجی زندگی میں ہندو مسلمان مذہب ومسلک کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ دربار سے لے کر صوفیا کے مساکن اور میلوں ٹھیلوں میں سبھی بلا لحاظ مذہب وملت شریک ہوتے تھے ۔اسی لیے اردو ادب کے سرمائے پر مشترکہ تہذیب کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جسے عرف عام میں آج کل گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔چوں کہ اردو کا پورا خمیر شروع سے اسی نظریے کا حامی رہا یعنی ملی جلی تہذیب کو بہتر طریقے سے پیش کیا گیا اور مذہبی دکھاوے کو ہمیشہ طنز کا نشانہ بنایا گیا۔خانقاہوں کے دروازے عوام الناس کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور ہر کسی کے ساتھ ایک جیسا ہی

سلوک، رہنمائی اور روحانی تربیت کو اہمیت دی جاتی تھی۔اسی لیے ابتدائی اردو ادب کے فروغ میں صوفیا کے ملفوظات کا اہم کردار ہے۔حالاں کہ بنیادی اعتبار سے ان کے ملفوظات مذہبی تبلیغ کے لیے ہوتے تھے لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی جو کسی کو ناگوار محسوس ہو۔یہیں سے اردو کے کردار میں مشترکہ تہذیب شامل ہوئی اور رفتہ رفتہ مزید قوی ہوتی چلی گئی۔اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ہر چند کہ ان کا مقصد اپنے خیالات اور تصورات کا پھیلاؤ تھا لیکن مقامی زبان کے استعمال نے اردو کے فروغ کی راہیں ہموار کیں۔

6.2.3 لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی منظر نامہ:

دہلی کے مقابلے لکھنؤ کی آب و ہوا پرسکون تھی اور سیاسی طور سے بھی یہ ایک مستحکم وخوش حال ریاست تھی۔دہلی پر بار بار ہورہے حملوں سے پریشان ہوکر شعرا وادبا لکھنو کا رخ کر رہے تھے۔اودھ کے نوابین نہ صرف یہ کہ ادب پرور تھے بلکہ ان کے یہاں سیاسی استحکام کی وجہ سے کچھ خاص چیزیں فروغ پارہی تھیں۔یہی سبب تھا کہ میرؔ جیسا بڑا شاعر، جس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام دہلی میں گزارے، وہ بھی لکھنؤ کا رخ کرنے پر مجبور ہوگیا۔اس وقت ریاست اودھ کی حیثیت پورے ہندوستان میں دوطرح سے اہم تھی۔اول خوش حالی اور دوم ادب پروری۔اسی کے ساتھ ساتھ امن کا ہونا بھی ایک اہم خوبی تھی۔دہلی پر بار بار ہورہے حملوں سے دہلی کی بساط اجڑ چکی تھی مگر دہلی کے مقابلے لکھنؤ پرامن تھا۔ دہلی کے عدم استحکام کے مقابلے لکھنؤ کے سیاسی استحکام نے وہاں کی فضا میں مستقبل کے خواب پرو دیے تھے؛ جس کے سبب لکھنؤ کی زندگی امید افزا، پرسکون اور رومان پروری سے مزین تھی۔اسی خوش حالی، امید افزا ماحول اور فارغ البالی نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں رومان پروری، مستی اور عیش کوشی جیسے موضوعات کو ادب میں جگہ دی۔اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ لکھنؤ دہلی کی ماتحتی سے الگ ہوا تھا، اس لیے ممکن ہے کہ دہلی سے اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے اہلِ لکھنؤ نے کچھ الگ چیزوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہوتا کہ اس کی انفرادیت دہلی سے جداگانہ قائم ہوسکے۔یہی وجوہ رہیں جس کے سبب علی جواد زیدی نے اپنی کتاب دوادبی اسکول میں دہلی کو ''آہ'' اور لکھنؤ کو ''واہ'' کا دبستان کہا۔

ہر ادب اپنے عہد کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔اس نظریے سے دکنی، دہلوی اور لکھنؤ کے سماجی وتہذیبی پس منظر کو اگر دیکھا جائے تو ان دبستانوں نے اس نظریے کو سچ ثابت کیا ہے۔دکنی اردو کے سماجی پس منظر نے اسے وہ کیفیات عطا کیں جو اس کے تمدن میں شامل تھیں۔اسی طرح دہلی کی تہذیبی فضا نے بھی اسے ایک خاص رنگ عطا کیا، جس میں تصوف، دلی واردات، کیفیات اور حرماں نصیبی کا ایک خاص رنگ شامل ہے لیکن لکھنؤ کی فضا دہلی سے مختلف تھی لہٰذا اس کی شاعری کا رنگ دکن اور دہلی دونوں سے الگ قائم ہوا۔دبستان لکھنؤ سے مراد شعر وادب کا وہ ایک خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے ابتدائی دور کے شعرا نے اختیار کیا اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ رنگ، دکنی اردو اور دہلوی شاعری کے رنگ و آہنگ سے جدا اپنی ایک شناخت رکھتا ہے یعنی دہلی کی داخلیت کے برعکس لکھنؤ نے خارجیت اختیار کی۔یہ رنگ و آہنگ لکھنؤ کو اس کی تہذیبی فضا نے عطا کیے، جس سے اس کی ایک خاص حیثیت اردو ادب میں قائم ہوئی۔جب دہلی تباہ و برباد ہوئی اور لکھنؤ اہل دانش وحکمت کا مرکز ومحور بنا تو اس سے قبل علم وادب کے دو بڑے مراکز یعنی دکن اور دہلی کی حیثیت مسلم ہوچکی تھی۔مغلیہ سلطنت کے زوال اور آئے دن کے حملوں سے جب دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو دہلی کے شعرا، حکما اور ارباب علم و دانش نے دہلی کو خیرآباد کرکے لکھنؤ کا رخ کیا؛ جس کے باعث فیض آباد اور لکھنؤ میں ادب کی محفلوں کو کافی فروغ ملا۔اورنگ زیب کے جانشین تخت کے لیے آپس میں لڑنے مرنے لگے جس کے سبب دہلی کی مرکزی سلطنت کمزور سے کمزورتر ہوتی گئی۔اس کے بعد رہی سہی کسر مرہٹوں، جاٹوں، نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کردی۔1722ء میں دہلی نے سعادت علی خان کو اودھ کا

صوبیدار مقرر کیا۔ دہلی کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعادت علی خان نے بہت جلد اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اودھ کی حکومت کو مستحکم کرنے کی بے مثال کوششیں کیں۔حکومت کی خوش حالی، امن وامان اور سلطنت کے استحکام کے باعث اودھ کے حکمران عیش ونشاط کے دلدادہ ہوگئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ طوائفیں ہر گلی کوچے میں نظر آنے لگیں۔معاملہ یہاں تک پہنچا کہ طوائفوں کے کوٹھے اعلیٰ تہذیب کے مراکز قرار دیے گئے جہاں بچوں کو آدابِ محفل سکھانے کے لیے بھیجا جانے لگا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ دہلی میں اردو کے سماجی وتہذیبی منظرنامے پر ایک اجمالی مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ لکھنؤ کے سیاسی استحکام نے کس طرح ادب کی راہیں ہموار کیں؟

6.3 شمالی ہند میں اردو ادب کا پس منظر

شمالی ہند میں اردو کا سماجی تانا بانا 2000 ق م سے آریوں کی آمد سے بننا شروع ہوتا ہے۔آمد کا یہ سلسلہ متواتر سینکڑوں سال تک قائم رہتا ہے۔شمالی ہند میں باہر سے آنے والوں اور مقامی حضرات کے میل جول سے ایک ایسے سماج کی بنیاد پڑی جس میں ہر طرح کے لوگوں کی یکساں اہمیت تھی۔اسی کو دیکھتے ہوئے فراقؔ گورکھپوری نے کہا ہے:

سر زمین ہند پر اقوام عالم کے فراقؔ
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

اسی ملی جلی تہذیب نے ایک ایسی زبان کے لیے راہیں ہموار کیں، جس میں کسی مذہب کی کوئی خاص گنجائش نہیں تھی۔اس زبان کا مزاج سماجی دکھاوا، ریاکاری اور مذہب کی جکڑ بندیوں کے خلاف اور رندی وسرمستی کی حمایت میں رہا۔دہلی کو صدیوں سے مرکزیت حاصل ہے، اسی وجہ سے یہ بار بار اجڑتی اور بستی رہی لیکن اس کی مرکزیت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب دہلی تمام عالم کے لیے باعث رشک ہوگئی تھی۔اسی کو دیکھتے ہوئے میرؔ نے کہا تھا:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

شمالی ہند میں اردو کے پس منظر پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں امیر خسرو (متوفی1325) کے علاوہ اور کوئی ادیب نظر نہیں آتا۔ساتھ ہی ایسا ممکن بھی نہیں لگتا کہ چودھویں، پندرھویں اور سولھویں صدی میں کوئی تخلیق کار شمالی ہند میں پیدا ہی نہ ہوا ہو۔انہیں صدیوں کے اوقات کے درمیان محمد بن تغلق اور مغلیہ افواج کے ساتھ اردو دکن پہنچتی ہے اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے قابل قدر تصانیف منظر عام پر پیش کرتی ہے۔اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔اول یہ کہ شمالی ہند میں دربار کی زبان فارسی تھی لیکن بول چال یعنی رابطے کی زبان کی حیثیت سے اردو کا استعمال عوام الناس میں ہو رہا تھا۔درباری زبان چوں کہ فارسی تھی اس لیے اردو میں تصنیف وتالیف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ جب کہ اسی دوران دکن میں اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہوگیا۔اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ دکن میں بہمنی سلطنت اور بعد میں بہمنی سلطنت کے ٹوٹنے پر پانچ آزاد ریاستوں کا بننا کافی اہمیت رکھتا ہے۔ان ہی پانچ ریاستوں میں سے دو ریاستوں نے یعنی گولکنڈہ اور بیجاپور نے اردو کو خاص

طور سے فروغ دیا۔ چوں کہ یہ ریاستیں شمالی ہند سے دشمنی کے سبب قائم ہوئی تھیں؛ اسی لیے انہوں نے فارسی کے بجائے مقامی زبان اور مقامی تہذیب کو فروغ دیا جو آگے چل کر اردو کے لیے بے حد اہم ثابت ہوا۔ زیر بحث تقریباً چار صدیوں کے دوران شمالی ہند میں جو بھی ادبی و لسانی سرمایہ ابھی تک دستیاب ہوا ہے، ان میں صوفیائے کرام کے ملفوظات خاصی اہمیت کے حامل ہیں جو مختلف تذکروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں ان تمام ملفوظات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مغلیہ دربار کی زبان فارسی ہونے کے باعث ادبا و شعرا فارسی ہی میں اپنی تخلیقات کو پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کی رسائی دربار تک ہو سکے اور کچھ مراعات حاصل ہو سکیں۔ ولی دکنی اسی دوران جب دہلی تشریف لاتے ہیں اور اپنی مقامی زبان میں شعر سناتے ہیں تو دہلی والوں پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ یہیں سے دہلی میں بھی اردو کی نشو ونما کی راہیں ہموار ہونے لگتی ہیں اور دہلوی شعرا بھی اس زبان میں طبع آزمائی کرنے لگتے ہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کا امتیاز دراصل دو حکومتوں اور اجڑتی اور آباد ہوتی ریاستوں کی کہانی بھی ہے۔ ان باتوں کا بھی ایک قاری کی حیثیت سے ہمیں خیال رکھنا چاہیے. چند لوگوں کے ایک جگہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یہاں دلی کے نامور شعرا کے ساتھ ساتھ نورالحسن ہاشمی نے مصحفی کے تذکرہ کے حوالے سے 42 شعرا کے نام درج کیے ہیں (جنہیں انہوں نے اوسط درجے کا شاعر کہا ہے) جو دہلی سے صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کا مزاج دہلی میں پختہ ہو چکا تھا لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ ایسے شعرا نے جب خوش حالی، فارغ البالی اور رومان پروری دیکھی تو انہوں نے لکھنؤ کا وہی رنگ اختیار کر لیا جس میں مضمون کے بجائے ظاہری چیزوں کو اہمیت حاصل تھی۔

6.3.1 دبستانِ دہلی:

ہندستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں زمانۂ قدیم ہی سے اقوام عالم کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے یہاں ایک مخلوط تہذیب پروان چڑھی۔ باہر سے دہلی وارد ہونے والی مختلف اقوام کے میل جول سے یہاں ایک ہمہ رنگ تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں دہلی قدیم جنگی حکمت عملی (strategy) کے اعتبار سے بہت اہم مقام پر قائم ہے، اسی لیے اسے اس زمانے میں اہمیت دی گئی تھی۔ دہلی میں حکومت ہونے کے باعث اس کو ہندستان کا دل کہا جاتا رہا ہے، اسی سبب سے اس کی مرکزی اہمیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ سکندر لودھی نے سلطنت کو آگرہ منتقل کیا اور مغل حکمرانوں میں بابرؔ، ہمایوں اور اکبر نے آگرہ ہی سے ہندوستان پر اپنی حکمرانی بنائے رکھی۔ شاہ جہاں نے حکومت کو آگرہ سے دہلی منتقل کیا اور شاہ جہان آباد کو دارالسلطنت بنایا اور اس طرح آباد کیا کہ آج بھی دہلی کو ہندوستان کا دل ہونے کا افتخار حاصل ہے۔

دہلی میں مغلیہ حکومت کے قیام نے اردو کی راہ ہموار کر دی۔ کیوں کہ فارسی سے اردو نے بہت کچھ حاصل کیا ہے، جن میں فارسی کی چار مخصوص آوازیں یعنی ''پ، چ، ژ اور گ''۔ زبان کے سماجی و تہذیبی ڈھانچے اور ارتقا سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح اردو نے دربار میں رسائی حاصل کی اور حاکم و محکوم کی زبان ایک ہو گئی۔ شاہی لشکر میں ہر علاقے اور ہر طبقے کے لوگ ہوا کرتے تھے، انہیں ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو سب کی سمجھ میں آتی ہو، یہیں سے اردو کا کینوس تیار ہوا اور رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے

آج یہ ایک بڑی عالمی زبان کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔

مغلیہ حکمراں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت اور فارسی کا زوال اور اردو کی ارتقا وعروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔اس عہد میں مغلیہ حکومت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ

سلطنتِ شاہ عالم　　　　از دلی تا پالم

یعنی وہ حکومت جس کی سرحدیں افغانستان سے برما تک تھیں، اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ دربار کی ویرانی کے ساتھ ہی فارسی کی بساط الٹ جاتی ہے اور اردو اس کی جگہ لے لیتی ہے۔اب مشاعروں میں اردو کا شاعر اپنے کلام کو پیش کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں سوچتا کہ وہ فارسی نہیں بلکہ اردو میں شعر کہہ رہا ہے۔اس طرح اردو زبان نے فارسی کا مقام حاصل کر لیا اور دھیرے دھیرے اس میں با قاعدہ ادب بھی تخلیق ہونے لگا۔ابھی یہ صورتِ حال چل ہی رہی تھی کہ ولؔی دکنی کا دلی (1700ء) میں ورود ہوتا ہے۔ ولؔی کے کلام کو سن کر دہلی کے شعرا کو حوصلہ ملتا ہے کہ وہ بھی اس زبان میں شاعری کریں۔ ولی کے کلام کی دہلی میں بڑی ستائش ہوئی۔اس سے دہلی کے شعرا کو کافی تقویت ملی اور یہیں سے اردو ادب کے ایک باب کا آغاز ہوتا ہے۔سب سے پہلے شاعر غالباً جعفرزٹل زٹلؔی کو مانا جاتا ہے، جنہیں ان کے ایک سکۂ شعر پر تہِ تیغ کیا جاتا ہے۔

سکّہ　زد　بر　گندم　و　موٹھ　و　مٹر
بادشاہ　دانہ　کش　فرخ　سیر

چوں کہ اس میں بادشاہِ وقت کو نشانہ بنایا گیا تھا، اس لیے ان کو اس کی سزا دی گئی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے دہلی کی بدحالی بیان کی تھی۔مغلیہ حکمران مسلم ضرور تھے لیکن وہ ہندستانی معاشرے میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ سب کے لیے انصاف اور برابری کو قائم رکھنا ان کے لیے اولین فریضہ تھا۔وہ یہاں کے سماج میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ انہوں نے راجپوتوں سے رشتے قائم کیے اور جمہوری قدروں کو پروان چڑھایا۔اکبر نے دینِ الٰہی نام سے ایک مذہب چلایا، جس میں سبھی مذاہب کے لوگ شامل تھے۔آگے چل کر مغلیہ حکمرانوں کے دربار تک اردو کی رسائی ہوئی۔آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر خود ایک بہترین شاعر تھے۔یہ وہ سماجی وتہذیبی پس منظر ہے جس میں اردو کی داغ بیل پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا خمیر ابتدا ہی سے غیر مسلکی، غیر مذہبی، رواداری، اخوت کو فروغ اور مذہبی ریاکاری پر طنز کے تیر چلانا اس کے مزاج میں آیا۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے اردو ادب میں ایک نئے دور کی شروعات ہوتی ہے کیوں کہ اس وقت تک ولؔی کی دہلی آمد ہو چکی تھی اور دہلی کے بہت سے شعرا اردو میں تخلیق کا کام کرنے لگے تھے۔اِدھر دہلی میں یہ صورتِ حال تھی، اُدھر کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں اردو کے ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا تھا۔اسی کے ساتھ ساتھ زبان کو سنوارنے کا کام بھی دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ قلم نے کیا، جس سے اردو نکھر گئی اور لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے لگی۔اردو کی ایک شعری صنف غزل ہے جس کا تمام شعری اصناف پر غلبہ ہے اور اس نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ان حکمرانوں نے اس طرح کی سماجی وتہذیبی فضا قائم کی کہ عید اور تعزیہ داری میں ہندو شامل ہونے لگے اور ہولی و دیوالی میں مسلمان شریک ہو کر انہیں مبارکباد دینے لگے۔اس ماحول نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا اور ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جسے گنگا جمنی

تہذیب کہتے ہیں۔

6.3.2 دبستانِ لکھنؤ:

ہندستانی تہذیب کی اپنی کچھ خاص خوبیاں ہیں، جس میں برسہابرس سے چلی آ رہی ہماری کہانیاں، داستانیں اور روایتیں موجود ہیں۔ لکھنؤ کی داغ بیل نواب آصف الدولہ نے ڈالی تھی۔ ان کا ارادہ شاہ جہان آباد سے بہتر شہر آباد کرنے اور بہتر ریاست قائم کرنے کا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس ریاست میں الگ الگ خطوں سے لوگ آ کر آباد ہو رہے تھے، جن میں خاص طور سے دہلی کے لوگ تھے۔ لکھنؤ واقعتاً کثیر الجہت ترقی کی راہوں پر آگے بڑھا اور ایک ایسی سماجی فضا تیار کی کہ جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان ہونے کے باوجود اودھ کے حکمرانوں نے السلام علیکم کی جگہ آداب، تسلیم، کورنش اور مجرا عرض ہے جیسے نئے آداب و اطوار وضع کیے۔ لکھنوی تہذیب ہر چند کہ مٹ چکی ہے پھر بھی ابھی اس کی بو باس کہیں نہ کہیں نظر آ جاتی ہے۔ لکھنؤ والوں نے جس تہذیب کو گلے لگایا اور پروان چڑھایا اسے آج لکھنوی تہذیب کہتے ہیں۔ اس تہذیب میں مذہبی رواداری' ہمدردی' ایمانداری' قوت برداشت' خودداری' نفاست' خوش طبعی' شریف النفسی' وضع قطع' لباس غرض زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی جس کا ہر کوئی گرویدہ ہو گیا۔ 1856ء یعنی واجد علی شاہ کی گرفتاری تک لکھنؤ کی تہذیب' اس کے گلی کوچے' اس کی محفلیں' آرائش و زیبائش کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی دور میں اردو ادب بھی خوب پھولا پھلا۔ اردو زبان کی اس ریاست میں وہ ترقی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ مثنوی میں سحرالبیان' گلزارِ نسیم اور زہرِ عشق جیسی بے نظیر تخلیقات سامنے آئیں تو مرثیے میں میر انیس اور مرزا دبیر جیسے بہترین مرثیہ گو بھی لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے، جن کا اردو ادب میں کوئی بدل نہیں۔ انہیں اساتذہ کے ساتھ ان کے شاگرد چلا کرتے تھے۔ مشاعرے میں انیسیے اور دبیریے ایک دوسرے کی گرفت کیا کرتے تھے جس سے زبان صاف و شستہ ہوتی چلی گئی۔ اسی خوش حالی اور رومان پرور فضا میں اردو بھی خوب سے خوب تر ہوتی چلی گئی۔ ریاست میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں تھیں لیکن حکمرانوں کی کاوشوں سے وہ اس طرح شیر و شکر ہو گئیں کہ دونوں نے ایک دوسرے کے کلچر کو اپنانے سے گریز نہیں کیا۔ اس سے ایک نئے معاشرے کی داغ بیل پڑی' جسے مشترکہ کلچر کہنے لگے یعنی ہندو تعزیہ داری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تو مسلمان ہولی اور دیوالی جیسے تہواروں میں شریک ہونے لگے۔ ہر طرف خوشحالی کے شادیانے بجتے تھے، راگ و رنگ کی محفلیں سجتی تھیں' مشاعروں کا بڑے پیمانے پر انعقاد ہوتا تھا۔ شعرا کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ اس بخشش کے لیے رعایا کی کوئی تخصیص نہیں کی جاتی تھی۔ دہلی کی حیثیت شعر و ادب میں مسلم ہو چکی تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں بھی وہ باکمال پیدا ہوئے کہ اس کی اپنی ایک ممتاز ساکھ قائم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کا تخلیقی ادب بھی ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا، جس کی تمام عالم میں اپنی ایک منفرد حیثیت قائم ہے۔ آج اردو ادب میں دو دبستانوں کا ذکر عموماً ملتا ہے اور وہ ہے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ۔

اودھ کی ریاست نے تقریباً سوا سو سال میں اردو ادب پر وہ اثرات ثبت کیے کہ یہ ریاست اپنی اعلیٰ تہذیب و ثقافت کے لیے پوری دنیا میں مشہور و مقبول ہو گئی۔ یہاں کے حاکم و نوابین نے وہ سماجی و تہذیبی روایات قائم کیں کہ وہ اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بے حد مشہور ہوئے اور آج تک لوگ اس تہذیب کو پہلے آپ پہلے آپ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کرنا، القاب و آداب کا خیال رکھنا، بڑوں اور چھوٹوں سے تخاطب میں امتیاز رکھنا آج بھی ہم اہلِ لکھنؤ سے سیکھ سکتے ہیں۔ محفل، مجلس اور طعام وغیرہ کے ایسے اطوار طے کیے کہ آج بھی زمانہ

ان کو یاد کرتا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے عمارتوں میں آصفی امام باڑہ، رومی گیٹ اور باغات کا اس طرح اہتمام کیا کہ لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جانے لگا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ دہلی اور اودھ کے حکمراں مسلمان تھے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بجا ہے کہ انہوں نے پہلے حکومت کے انتظام و انصرام کو اولیت دی اور تمام باشندگانِ ریاست کو ایک نگاہ سے دیکھا۔ سماج میں انصاف قائم کرنے کو اہمیت دی اور اسی کو اپنا نصب العین سمجھا۔ انہیں اصولوں کے پیش نظر لکھنؤ آج دنیا میں اپنی منفرد شناخت و مرتبہ کا نمائندہ شہر سمجھا جاتا ہے اور اپنی تہذیبی وراثت کے سبب اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ ان چیزوں کے پیچھے اودھ کے نوابوں کا اعلیٰ ظرف اور ان کی دور اندیشی کارفرما ہے، جنہوں نے اسے اپنی محنت ولگن سے سنوارا اور حکمت و دانائی سے اس کی آبیاری کی۔

لکھنؤ کی تہذیب جسے اودھ کے نوابوں نے پروان چڑھایا وہ حقیقت میں ایرانی تہذیب تھی لیکن اس میں انہوں نے مقامی سماج اور شہریوں کو دیکھتے ہوئے ہندو اور مسلم تہذیب کے عناصر کو اس طرح پرو یا کہ وہ حسین ترین تہذیب و تمدن کا نمونہ بن گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ یہ تھا کہ اس کا کوئی توڑ انگریزوں کے پاس بھی نہ تھا۔ انگریز جب ہندو مسلم اتحاد سے پریشان ہو گئے تو انہوں نے اس کو توڑنے کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔ جب دو بڑی قومیں آپس میں اس طرح شیر وشکر ہو جائیں کہ دونوں ایک دوسرے کی شادی بیاہ، خوشی وغم، میلے ٹھیلے اور تیج تہواروں میں شامل ہونے لگیں تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک نئے کلچر کو فروغ ملے۔ یہی اسباب تھے، جن کے باعث مشترکہ تہذیب پروان چڑھی اور دنیا کے سامنے ایک نئی تہذیب گنگا جمنی تہذیب کے نام سے متعارف ہوئی۔ اسی مشترکہ تہذیب کی بدولت اردو ادب میں یہی گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھی، جہاں مذہب کے بجائے رندی و سرمستی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

دبستان لکھنؤ کے شعرانے اپنی تمام تر توجہ ظاہری حسن، کشش، جاذبیت اور خوبصورتی پر صرف کی۔ داخلیت، دلی کیفیات، وارداتِ قلبی اور جذبات نگاری پر توجہ دینے کے بجائے تکلف اور تصنع کو لکھنوی تہذیب و معاشرت نے اہمیت دی۔ ناسخ لکھنوی نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی۔ جس کے سبب انہوں نے دیسی اور سنسکرت کے الفاظ کو متروک کر کے فارسی اور عربی کے لفظوں کو جگہ دی۔ دہلی کے شاعروں نے ہندی اور دوسری زبانوں سے بھی فیض حاصل کیا لیکن لکھنوی شعرانے زبان کی اصلاح کے نام پر عربی اور فارسی کو فوقیت بخشی۔ شعرائے لکھنؤ کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے لغت پر زیادہ توجہ دی اور زبان کی ادائیگی کے معاملے میں اس پر زور دیا جب کہ دہلی کے شعرانے مروجہ زبان کو اہمیت دی۔ دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں زبان کے استعمال میں خاص فرق ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دبستانِ دہلی کی شاعری داخلی شاعری ہے اور دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں محبوب کا سراپا اور ظاہری شکل وصورت کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس بحث کا منجملہ ماحصل یہ ہے کہ دونوں دبستانوں کی اپنی اپنی انفرادیت ہے، جس سے دونوں دبستانوں کا امتیاز قائم ہے۔ یہ وہ چند باتیں یا خصوصیات ہیں جن کا سماجی وتہذیبی پس منظر کے ضمن میں ذکر کرنا ضروری تھا۔

6.4 دہلی ولکھنؤ کی معاشرت کا ایک سرسری جائزہ

سیاسی استحکام اور انتظامی امور کو اگر مدنظر رکھیں تو دہلی کی حالت، لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت سے ایک حد تک بالکل جداگانہ تھی۔ دلی کی اقتصادی صورتِ حال ابتر ہوتی جا رہی تھی، جب کہ اردو فروغ پا رہی تھی۔ دہلی آئے دن طرح طرح کے حملوں یا سازشوں کا نشانہ بن رہی تھی، جس سے شہری پریشان ہو کر آس پاس کی ریاستوں کا رخ کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ایسے دور میں جب کہ راجا سے پرجا تک سبھی معاشی بدحالی

کا شکار ہوں' آئے دن نئے فتنے اٹھ رہے ہوں تو ایسے میں شہریوں میں مایوسی' ناکامی اور مستقبل کی ناامیدی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔اس کے برخلاف لکھنؤ میں آسودگی' خوش حالی اور انتظامی امور مستحکم تھا جس کے سبب وہاں کے لوگوں میں رومان پروری' سرمستی' عیش وعشرت، مرغ بازی اور پتنگ بازی جیسے کھیل کھیلے جارہے تھے۔ادھر دہلی کے لوگوں کا حال مایوس کن تھا تو لکھنؤ کے لوگوں کا حال امید افزا۔ اسی سے دونوں دبستانوں کے ادبا کا نظریہ زندگی سے متعلق جدا جدا ہوگیا تھا۔اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دہلی تباہی کے دہانے پر تھی تو لکھنؤ تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن تھا۔اسی ماحول کے سبب دہلی کا دبستان ''آہ'' کا دبستان بنا تو لکھنؤ کا دبستان ''واہ'' کا۔یعنی دہلی کی شاعری میں داخلی جذبات و کیفیات، افسوس و مایوسی، تصوف اور روحانیت کی ترجمانی کی گئی تو لکھنؤ میں خارجی حسن، واردات اور حرکات وسکنات کی منظرکشی کو ترجیح دی گئی۔ دہلی کی شاعری میں نازک مزاجی، دلگدازی اور حقیقت حال کا ہونا ضروری سمجھا گیا جب کہ اس کے مقابلے لکھنؤ میں سراپا نگاری، معاملہ بندی وغیرہ کی پیش کش پر سارا زور صرف کیا گیا۔حقیقت حال یہ ہے کہ لکھنویت اور دہلویت ایک ہی سکے کے دو الگ الگ رخ ہیں۔ دہلوی شاعری اور لکھنوی شاعری کے فرق کی شناخت سب سے پہلے شیخ امام بخش ناسخ نے کی تھی۔انہوں نے جن خصوصیات کی نشاندہی کی تھی، ان خصوصیات کا خود اپنی شاعری میں لحاظ رکھا۔شاید اسی سبب سے ناسخ کو دبستان لکھنؤ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

6.5 شعروادب پر ماحول کے اثرات

یہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے کہ جس طرح کی سیاست، سماج اور ماحول ہوگا، اسی طرح کا ادب تخلیق ہوگا۔شاید اسی لیے ساحؔر لدھیانوی نے کہا ہے۔

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

یہی سبب ہے کہ ہر ادب کو اپنے عہد کی عکاسی وترجمانی کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔اس سلسلے میں نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔شاعری اپنے عہد کے طرز تمدن، طریقۂ تفکر کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ دہلی میں جو تمدن عہد مغلیہ میں جاری تھا اور جس کا اثر تھوڑا بہت 1947ء تک باقی رہا۔اسلام کا وہ تمدن تھا جو اس کے زوال کے زمانے میں پیدا اور تمام ممالک اسلامی کی طرح ہندوستان میں بھی مقامی خصوصیت سے متاثر ہوا اس عہد زوال کے تمدن میں خوبیاں کم تھیں اور برائیاں زیادہ۔ برائیوں میں تصنع رواج پرستی قدامت پرستی، شخصی ودیگر اخلاقی خرابیاں جو غلط تعلیم اور افلاس کے باعث پیدا ہوجاتی ہیں۔مثلاً خودغرضی، حرص، جھوٹ، نفاق، حسد وغیرہ وغیرہ عام ہوگئی تھیں۔طریقۂ فکر اور طرز تمدن کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نتیجے کو تہذیب کہا جاتا ہے۔

(دلّی کا دبستانِ شاعری، ص89)

اس نظریے سے جب ہم دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے تہذیبی وسیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے ادب میں اتنا امتیاز کیوں ہے؟ سیاسی عدم استحکام سے سماج مایوسی کا شکار ہوتا ہے، ایسے ماحول میں رومان پرور خیالات کی شاعری شاعر نہیں کر سکتا اور اگر شاعر کر بھی لے تو قاری پڑھنا پسند نہیں کرسکتا۔کیوں کہ رومانی خیالات اسی وقت اچھے لگتے ہیں، جب انسان کے پیٹ میں اناج ہو

اور وہ آسودہ حال ہو۔ دہلی کا جو ماحول تھا، ویسے ماحول میں جو ادب تخلیق ہوا، اس نے اپنے عہد اور سماج کی بھرپور عکاسی کی اور اسی طرح لکھنؤ کے ادب نے لکھنؤ کے امن وامان، شان وشوکت اور عیش پرستی کی عکاسی کی۔ ایسے پرسکون ماحول میں فنون لطیفہ، رقص وسرور کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری کو بھی بہت فروغ ملا۔ دہلی کی بدامنی اور انتشار نے اہل علم کو اودھ اور خاص کر لکھنؤ میں اکٹھا ہونے پر مجبور کیا۔ اس طرح ایک ایسا وقت بھی آیا جب شاعری کا مرکز دہلی کے بجائے لکھنؤ میں قائم ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ امرا و رؤسا کی سرپرستی نے شاعری کا ایک ماحول بنایا ،جس کے سبب شعر وشاعری کا چرچا بہت عام ہوا۔ ابتدا میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان پر ان کا اثر نمایاں رہا لیکن رفتہ رفتہ اس میں کمی آنے لگی۔ میرؔ جب لکھنؤ پہنچے تھے تو انہوں نے اپنا تعارف کچھ اس طرح پیش کیا تھا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ وہ اشعار ہیں جنہیں میرؔ نے اپنے تعارف کے طور پر لکھنؤ میں پیش کیا تھا۔ میر کی زندگی کے زیادہ تر ایام دہلی میں گزرے لہذا ان پر لکھنوی رنگ کا اثر بالکل نہیں ہوا۔ اس کے بعد مصحفی اور انشا تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری کہیں نہ کہیں برقرار رہی اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی خارجیت اور رعایت لفظی بھی کہیں نہ کہیں قائم رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے لکھنؤ کی خاص زبان ، تہذیب اور رکھ رکھاؤ نمایاں ہوتا گیا۔ اس طرح اردو ادب میں ایک نئے دبستان کی بنا پڑی، جس نے آگے چل کر اردو ادب میں دبستان لکھنؤ کے نام سے اپنا ایک منفرد مرتبہ حاصل کیا۔ دہلی کے داخلی رنگ کی ایک مثال میرؔ کے کلام سے ملاحظہ ہو۔

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں کچھ ، اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

اس شعر میں خود کلامی کی کیفیت ہے یعنی شاعر کا تخاطب کسی اور سے نہیں بلکہ خود سے ہے۔ اسی طرح کا ایک اور شعر دیکھیں۔

ٹک دیر جو آ جانے میں جاناں نے لگائی
ساون کی جھڑی دیدۂ گریاں نے لگائی

درج بالا دونوں شعروں میں شاعر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے، جسے داخلی شاعری کی ایک کیفیت کہا جاتا ہے۔ اس کے بر عکس خارجی شاعری کا رنگ بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ مثلاً

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

انتہائے لاغری سے جب نہ میں آیا نظر
ہنس کے فرمانے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

یہ ایک معمولی سی مثال داخلی اور خارجی شاعری سے ہم نے پیش کی تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ دونوں دبستانوں میں بنیادی اعتبار سے کیا فرق ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ اردو کے پس منظر کے بارے میں اپنی معلومات سے واقف کروائیے۔

2۔ داخلیت اور خارجیت کی وضاحت کیجیے۔

6.6 اکتسابی نتائج

☆ ہندوستان میں باہر سے آنے والوں کی زبان کیا تھی؟ اس پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں لیکن یہاں کے مقامی لوگ اس زمانے میں کون سی زبان آپسی بول چال کے لیے استعمال کرتے تھے، اس پر کوئی کتاب نہیں ملتی۔ اس کے باوجود لسانیاتی نقطۂ نظر سے اتنا تو طے ہے کہ ہندوستان کے مقامی لوگ بھی کوئی نہ کوئی زبان ضرور بولتے رہے ہوں گے۔

☆ ہندوستان آنے والے قافلے ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے بھارت آئے تھے، اس لیے ان پر ایرانی تہذیب کے گہرے اثرات تھے۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں امیر خسرو نے ترکی اور ایرانی اثرات کو استعمال کر کے نئے تجربے کیے۔ عربی رسمِ خط نسخ کو ترقی دے کر ایرانیوں نے فارسی رسمِ خط نستعلیق ایجاد کیا اور آج یہی رسمِ خط اردو کا سب سے مقبول رسمِ خط بھی ہے۔

☆ ہندوستان کے بیشتر مسلم حکمرانوں پر ایرانی تہذیب وتمدن کا اتنا گہرا اثر تھا کہ فارسی ہی کو ہمیشہ مہذب، درباری اور تہذیبی زبان سمجھا گیا۔ بادشاہ اور نوابین جب عام لوگوں سے بات کرتے تو انہیں ہندی یا ہندوی (اردو) کے استعمال پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ باہر سے آنے والے نو وارد بازاروں میں مقامی لوگوں سے ملی جلی زبان میں بات کرتے تھے، جس سے ایک نئی زبان کے بننے کے اسباب پیدا ہوئے۔ اسی میل جول نے ہندوستان میں ایک نئی تہذیب کو پروان چڑھایا، جسے گنگا جمنی یا مشترکہ تہذیب کہتے ہیں۔

☆ ہندوستانی تہذیب میں مغلوں سے پہلے رات کی محفلیں، مجلسیں اور آرائش کا کہیں ذکر نہیں تھا، یہ خالص مغلیہ سلطنت کی دین ہے۔ ہندوستان میں سورج غروب ہونے کے بعد زندگی ختم اور سورج طلوع ہونے سے شروع ہوتی تھی۔ باہر سے آنے والوں میں فوجیں اور لشکر کے علاوہ اللہ کے ایسے نیک بندے بھی شامل ہیں جنہیں اپنے مذہب اور انسانیت کے پیغام سے سروکار تھا۔ یہ اللہ کے نیکوکار بندے جنہیں ہم آج صوفیائے کرام کہتے ہیں، اردو زبان کے فروغ میں ان کا اہم کردار ہے۔

☆ حالاں کہ ان کا زبان سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن انہیں اپنے پیغام عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ایک ملی جلی زبان کی ضرورت تھی اور وہ کام یہی ملی جلی نئی زبان جو اس زمانے میں پروان چڑھ رہی تھی، اس نے پورا کیا۔ اس سے اردو زبان کے فروغ میں مدد ملی۔ یہی سبب ہے کہ اردو زبان کے اولین نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات' خالق باری وغیرہ میں سب سے پہلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

☆ اردو نہ صرف عوام کی زبان تھی بلکہ اس کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے حاکمینِ وقت بھی آہستہ آہستہ اس کی جانب متوجہ ہونے

لگے تھے۔ظہیرالدین محمد بابر کے ترکی دیوان میں اردو کا ایک مصرع، اکبراعظم کا ایک اردو دوہا اور ''توزک جہانگیری'' میں تو اردو کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

☆ ہندوستانی فوجیں، جن میں تقریباً ہر خطے کے مضبوط قد کاٹھی کے لوگ شامل ہوتے تھے، ان کو بھی آپسی رابطے کے لیے ایسی ہی ایک مخلوط زبان کی ضرورت تھی، جس سے وہ آپس میں تبادلۂ خیال کرسکیں۔ ان کی اس ضرورت کی بھرپائی اسی زبان سے ہوئی، جس کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اونچا اور کوئی نیچا ہوتا تھا۔ اسی روزمرہ کی ضرورت نے اردو زبان کو فروغ دیا اور سب کا ہم نوا بنایا۔ لفظ 'اردو'، اردو زبان کے لیے بہت بعد میں استعمال کیا گیا۔

☆ اس سے پہلے اس زبان کی شناخت کے لیے ریختہ، ہندی، ہندوی، اردوئے معلّٰی جیسے لفظ استعمال کیے گئے۔ 'اردو' کے لفظی معنیٰ لشکر کے ہیں لیکن اس کا استعمال زبان کے معنوں میں غالباً 1775ء میں سب سے پہلے مصحفی نے کیا تھا، اس کے بعد سے لفظ اردو زبان کے لیے مستعمل ہوگیا۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے کہ ایک طرف مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور دوسری طرف اردو کا عروج ہو رہا تھا۔

☆ دہلی میں ذاتی طور پر ادبا وشعرا دیسی رمقامی زبان کے الفاظ اپنے کلام میں استعمال کرتے تھے لیکن اس کے خاطر خواہ استعمال کی نہ تو ان میں ہمت تھی اور نہ ہی ماحول اس کے لیے سازگار تھا۔ ایسے میں ولی دکنی کی 1700ء کے آس پاس دہلی میں آمد اور ان کے کلام کی سماعت سے ان میں یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی روزمرہ کی زبان میں ادب تخلیق کریں۔

☆ ولؔی کی آمد سے شمالی ہند کا منظر نامہ بالکل تبدیل ہوگیا۔ وہ زبان جس میں بات چیت تو کی جاسکتی تھی مگر ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا تھا، اب اس میں بھی ادب تخلیق ہونے کے امکانات روشن ہوئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دہلی میں تخلیق کاروں کی ایک پود تیار ہوگئی۔ شمالی ہند میں اگر غور کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں صحیح معنوں میں نثری تصانیف کا سلسلہ فضل علی فضلی کی کربل کتھا سے شروع ہوتا ہے۔

☆ اس کے بعد دوسری نثری تصنیف ہونے کا فخر قصہ مہر افروز ولبر کو حاصل ہے، جسے عیسوی خاں بہادر نے 1732ء اور 1759ء کے درمیان تخلیق کیا۔ دونوں تصانیف کی زبان کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ پہلی کی زبان میں فارسی غالب ہے جب کہ دوسری کی زبان پہلے کے مقابلے سادہ، صاف اور رواں ہے۔ اس کے بعد اردو میں بہت سی کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ تخلیق بھی کی گئیں مگر ان تخلیقات پر فارسی کا کافی اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

☆ شاعری میں نثر کے مقابلے پہلے مقامی زبان کا استعمال ہونے لگا تھا، جس میں اس عہد کی دہلی کے حالات اور ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ جعفر زٹلی، سوؔدا، میؔر اور دردؔ کی شاعری میں دہلی کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جعفر زٹلی نے سکۂ شعر کہا تو سوؔدا نے شہر آشوب کہے۔ میؔر نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا تھا، انہوں نے بھی جا بجا اپنی غزلوں میں دلّی کے حالات کی عکاسی کی ہے۔

☆ ایک طرف تو دہلی کے گلی کوچے اتنے حسین تھے کہ میؔر نے مذکورہ شعر کہا لیکن اسی کے ساتھ جو کچھ دہلی میں ہو رہا تھا یعنی دہلی کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ یہ سید برادران کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ لوگ جب جس کو چاہتے تخت نشین کرا دیتے اور جب جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے تھے۔ اس ابتری کی کہانی کو بھی انہوں نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔

☆ دہلی کے وہ بادشاہ جن کے قدموں کی دھول کبھی لوگ اپنی پیشانی پر ملتے تھے، ان بادشاہوں کی آنکھوں میں جلتی ہوئی سلائیں ڈال دی

گئیں۔ ایسے دور میں دہلی ایک طرح سے بربادی کے دہانے پر تھی تو اودھ ترقی کے نئے ابواب رقم کر رہا تھا۔اس ابتری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے حالات سے تنگ ہوکر شعرانے پرسکون ریاست اودھ کا رخ کیا۔لکھنؤ نے اردو ادب کو ایسے ستارے دیے، جس کی اردو ادب کو بہت ضرورت تھی۔اس سے پہلے دہلی نے غزل اور قصیدے میں خاطر خواہ ادب پیدا کر لیا تھا۔

☆ لکھنؤ کے ادبا نے مرثیے اور مثنوی کو وہ مقام عطا کیا کہ اس سے آگے اس کی پرواز نہ ہو سکی۔اسی طرح ناول اور ڈرامے میں امراؤ جان ادا اور انارکلی کی بھی حیثیت مسلم ہے۔اس کے علاوہ زبان میں نفاست،نزاکت، رکھ رکھاؤ، القاب وآداب کے وہ معیار دبستانِ لکھنؤ کے اساتذہ نے طے کیے کہ اردو صرف نکھری ہی نہیں بلکہ سنور بھی گئی۔

☆ دہلی میں مروج زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کی پیش کش کو ترجیح دی تو لکھنؤ میں لفظوں کے استعمال کو برتری ملی۔ اس طرح سے داخلیت اور خارجیت کے امتیاز کے ساتھ اردو زبان دونوں طرح کے خیالات وتصورات کو پیش کرنے کی اہل ہوگئی۔ یہی دونوں دبستانوں کے سماجی وسیاسی حالات کے پیشِ نظر ہوا۔

6.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
لسانی	زبان سے متعلق	ڈول	بنیاد قائم کرنا، ڈھانچہ تیار کرنا
ٹھاٹھیں مارنا	(محاورہ) پانی کا اونچی اونچی موجیں مارنا	عہدِ وسطیٰ	درمیانی عہد
خانقاہ	درویشوں کے رہنے کی جگہ، پیر کا مقبرہ	عناوین	عنوان کی جمع
برصغیر	چھوٹا براعظم، مجازاً بھارت اور پاکستان	آماج گاہ	نشانے کی جگہ
گاہک	خریدار	مخلوط	ملا جلا، گڈ مڈ
خاطر خواہ	حسب منشا، خواہش کے مطابق	پذیرائی	قبولیت، منظوری
مساکین	مسکین کی جمع، غریب	یلغار	دشمن کی فوج پر حملہ، دھاوا
تصورات	خیالات	تخصیص	خصوصیت
ملفوظات	ملفوظ کی جمع، منہ سے بولی ہوئی بات	مستحکم	مضبوط
عیش کوش	عیش وعشرت کرنے والا	جانشین	ولی عہد، وارث
داغ بیل	شروع کرنا، کسی کام کی بنیاد رکھنا	مسلک	راستہ، طریقہ
کثیر الجہت	ہمہ جہت	انصرام	انتظام کرنا، بدوبست کرنا
فوقیت	بڑائی، برتری، غلبہ	آسودہ حال	خوش حال ہونا
معاملہ بندی	بیتی ہوئی باتوں کو نظم کرنا	اقتصادی	معاشی
قدامت پرستی	بنیاد پرستی، پرانی باتوں کو پسند کرنے والا	داخلیت	اندرونی کیفیت، دلی کیفیت

6.8 نمونۂ امتحانی سوالات

6.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ دہلی کو' آہ' اور لکھنو کو' واہ' کا دبستان کس نے کہا ہے؟

2۔ کسی دو ادبی اسکولوں کے نام بتائیے۔

3۔ ولی دکنی کا کلام دہلی کس سن میں پہنچا؟

4۔ شمالی ہندی کا پہلا شاعر کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

5۔ مغل سلطنت کا آخری بادشاہ کون تھا؟

6.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ شمالی ہند میں اردو ادب کے تہذیبی و سماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دہلی کو آہ اور لکھنو کو واہ کا دبستان کیوں کہا گیا؟

3۔ دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیجیے۔

4۔ اردو کے پس منظر کے بارے میں اپنی معلومات سے واقف کروائیے۔

5۔ داخلیت اور خارجیت کی وضاحت کیجیے۔

6.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دہلی کے سیاسی منظر نامے پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ لکھنؤ میں رومانی شاعری کے فروغ کے اسباب بیان کیجیے۔

3۔ داخلی اور خارجی شاعری کی مثال کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

6.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ اردو ادب کی تحریکیں: ابتدا تا 1975ء — ڈاکٹر انور سدید

2۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں و رجحانوں کا حصہ — منظر اعظمی

3۔ اردو اور مشترکہ ہندستانی تہذیب — ڈاکٹر کامل قریشی

4۔ اودھ میں اردو ادب کا تہذیبی و فکری پس منظر — محمد حسن

5۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں — مرزا جعفر حسین

اکائی 7: جنوبی ہند میں اردو ادب کا سماجی اور تہذیبی پس منظر

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت
7.2.1 بہمنی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر
7.2.2 عادل شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر
7.2.3 قطب شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر
7.3 اکتسابی نتائج
7.4 کلیدی الفاظ
7.5 نمونہ امتحانی سوالات
7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.0 تمہید

اس اکائی میں جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کا جائزہ لیا جائے گا۔اس کے بعد بہمنی دور، عادل شاہی دور اور قطب شاہی دور کے سماجی و تہذیبی پس منظر پر علاحدہ علاحدہ روشنی ڈالتے ہوئے بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کے اردو دب کے ارتقا کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا جائے گا۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو جنوبی ہند میں اردو ادب کے سماجی اور تہذیبی پس منظر سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کا جائزہ لے سکیں۔

☆ بہمنی دور کے اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کرسکیں۔

☆ عادل شاہی دور کے اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کرسکیں۔

☆ قطب شاہی دور کے اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کرسکیں۔

7.2 جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت

جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی کے فتوحات سے بہت پہلے ایسے صوفیا اور علما کے نام ملتے ہیں جو جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ حاجی رومی، شاہ مومن، بابا سید مظہر عالم، شاہ جلال الدین گنج رواں، سید احمد کبیر حیات قلندر، بابا شرف الدین، بابا شہاب الدین وغیرہ وہ حضرات ہیں جو سرزمین جنوبی ہند پر تبلیغی وروحانی کام بھی کررہے تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں علاء الدین خلجی کی فوجیں شمالی ہند سے جنوبی ہند پہنچتی ہیں۔ اس میں فوج کے علاوہ اہل ہنر، تاجر، صوفی اور فقیر بھی شامل ہیں۔ پیر مقصود، پیر جمنا، شاہ منتخب الدین زرزری بخش، پیر بیٹھے، خواجہ بندہ نواز کے والد شاہ راجو قتال، شاہ برہان الدین غریب، امیر خسرو کے دوست امیر حسن سنجری شیخ فرید الدین وغیرہ اہل شمال نے جنوبی ہند کے الگ الگ علاقوں میں مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے زبان کے اظہار کی تمام مشکلیں دور ہوگئیں۔

چودہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں اردو زبان بول چال کی ایک رواں زبان کی حیثیت حاصل کرچکی تھی۔ دکن کے مختلف علاقے جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں، شمالی ہند کی عام استعمال کی بول چال کی اردو سے واقف ہوچکے تھے۔ 1327ء میں دوسرا اہم واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اردو جنوبی ہند میں بڑے وسیع پیمانے پر پھیلنے لگی۔ سلطان محمد تغلق کا یہ فیصلہ کہ ملک کا پایۂ تخت دہلی کی بجائے دیوگیری (دولت آباد) بنایا جائے، تاریخی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے لیکن زبان کے اعتبار سے بھی اردو کے حق میں یہ فیصلہ بہت ہی سود مند اور کارآمد ثابت ہوا۔ بادشاہ کے حکم پر کئی صوفیا، علما، شعرا، ادیب، سپاہی پیشہ اور دیگر فن کار دیوگیری پہنچے ان میں سے بہت سے یہاں بس گئے۔ ان کی علمی زبان تو فارسی تھی لیکن عام بول چال کی زبان اردو تھی۔ یہ زبان کھڑی بولی پر مبنی تھی اور اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی آمیزش تھی۔ چودہویں صدی کے ربع دوم میں جب تغلق حکمران دہلی میں زوال پذیر ہوگئے تو جنوبی ہند میں ان کی گرفت کمزور ہوگئی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

7.2.1 بہمنی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

خاندان تغلق کے زوال کے بعد، ہندوستان کے مختلف علاقے خود مختار ہوگئے چنانچہ 1347ء میں سرزمین دکن پر علاء الدین حسن بہمنی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ بہمنی خاندان میں کوئی اٹھارہ حکمران ہوئے جنھوں نے کم و بیش دو سو سال تک حکمرانی کی اور جنوبی ہند کو ایک نئے تہذب و تمدن سے آگاہ کیا۔ جس زمانے میں بہمنی سلاطین نے جنوبی ہند میں تہذیب و تمدن کی شمع جلائی یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کا تمدن دنیا کا اعلیٰ ترین تمدن سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح بہمنی خاندان کی جنوبی ہند حکمرانی سے مراد ایک انتہائی ترقی یافتہ قوم کی حکمرانی تھی جو جنوبی ہندوستان میں قیام پذیر تھی۔

جس خطے پر بہمنی خاندان نے حکومت کی' اس میں تین زبانیں بولنے والے لوگ آباد تھے یعنی یہ علاقہ تلنگانہ' کرناٹک اور مہاراشٹر ا کے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ان علاقوں پر متعدد چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی حکومتیں قائم تھیں، جو آپس میں برسر پیکار رہتی تھیں۔بہمنی سلاطین نے جنوبی ہند میں بسنے والی ان چھوٹی چھوٹی قوموں کو متحد کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ان میں قومی اتحاد اور یکجہتی کے تصور کو فروغ دیا اور علوم وفنون کی روشنی پھیلائی۔اس طرح بہمنی حکومت کا قیام جنوبی ہند کے لیے،ایک نئے شاہی خاندان کی حکومت کا آغاز ہی نہیں تھا بلکہ ایک اعلیٰ تہذیب وتمدن اور اعلیٰ نظریہ حیات کی روشنی سے مستفید ہونے کا ایک عظیم موقع بھی ثابت ہوا۔بہمنی سلاطین کے زمانے میں جنوبی ہند کا علاقہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عراق' ایران' ترکستان اور افغانستان کے عالموں اور باکمالوں کے لیے باعث کشش بن گیا۔آئے دن دور دراز ملکوں کے شاعر' علما اور فن کار قدر دانی کی توقع میں، جنوبی ہند میں وارد ہوا کرتے تھے۔بہمنی حکمرانوں نے ،جن میں اکثر علم وادب اور فنون لطیفہ کے غیر معمولی قدر داں گزرے ہیں، ہر خطے کے شاعروں، عالموں اور ہنرمندوں کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور صحیح معنوں میں ،جنوبی ہند میں ایک بین الاقوامی تمدن کی بنیاد ڈالی۔سلاطین دکن نے اپنی حکمرانی کے طویل عہد میں علم کی توسیع اور اس کی اشاعت کی جانب بڑی توجہ کی تھی۔بہمنی حکمرانوں میں محمد شاہ اور فیروز شاہ نے علم کی ترقی وترویج میں جو حصہ لیا وہ تابناک ہے۔ یہ دونوں بادشاہ خود صاحب علم اور علم دوست تھے۔

بہمنی خاندان کا آٹھواں حکمران فیروز شاہ بہمنی نہ صرف ایک بے مثال مدبر اور کامیاب بادشاہ تھا بلکہ بے حد ذہین اور دور اندیش بھی تھا۔اس فرماں روا کے دور حکومت میں ،جنوبی ہند کا علاقہ اپنے بین الاقوامی تمدن کے لیے غیر معمولی شہرت اختیار کر گیا۔فیروز شاہ بہمنی نے اپنی سلطنت میں بسنے والے تمام طبقات' جو مختلف رنگ ونسل سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے' کے مابین یکجہتی اور اتحاد پیدا کرنے کی تحریک چلائی۔اسی تحریک کے زیر اثر بعد کے زمانے میں اکبر اعظم نے دہلی میں' محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ میں اور ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بیجاپور میں اسی بین الاقوامی تمدن کو رائج کرنے میں کامیابی حاصل کی۔بہمنی دور کی اس عظیم الشان یونیورسٹی کے کھنڈر آج بھی آثار قدیمہ کی حیثیت سے باقی ہیں اور دیکھنے والوں کے لیے اپنی عظمت اور شان وشوکت کا مرثیہ سناتے ہیں جسے مدرسہ محمود گاواں کہا جاتا ہے بیدر کا مدرسہ محمود گاواں کئی سو سال تک تشنگان علم کا مرکز رہا۔

بہمنی دور اردو ادب کا قدیم ترین عہد ہے۔اس عہد کے اہم ادیبوں اور شاعروں میں خواجہ بندہ نواز' فخر دین نظامی' مشتاق' میراں جی شمس العشاق' اشرف بیابانی' محمود اور فیروز بیدری کے نام قابل ذکر ہیں۔دکنی کے سب سے پہلے شاعر اور نثر نگار خواجہ بندہ نواز فیروز شاہ بہمنی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اسی (80) سال کی عمر میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے تھے۔خواجہ بندہ نواز دہلی کے مشہور صوفی حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے سب سے اہم شاگرد اور خلیفہ تھے۔ان سے ایک تصنیف "معراج العاشقین" منسوب ہے، جسے سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے شائع کیا تھا۔لیکن یہ کتاب ان کی نہیں ہے بلکہ بعد کے دور کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی ہے۔اس کے علاوہ نظم ونثر کے چند اور چھوٹے چھوٹے رسالے جیسے شکار نامہ، تلاوت الوجود، چکی نامہ وغیرہ بھی خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہیں لیکن کسی بھی تصنیف کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خواجہ صاحب ہی نے تحریر کی ہے۔ان سے منسوب تمام رسائل دکنی اردو میں ہیں اور ان کا موضوع تصوف ہے۔

فخر دین نظامی بیدر کا متوطن اور بہمنی دور کا ایک اہم شاعر ہے۔ اس کی مثنوی" کدم راؤ پدم راؤ "اردو کی اولین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یہ مثنوی بہمنی خاندان کے مشہور حکمران سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں لکھی گئی۔ اس لیے اس کی زبان بھی آج کی زبان سے الگ اور مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مثنوی کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ نظامی ایک قادرالکلام اور پر گو شاعر تھا۔ زبان و بیان پر اسے بے پناہ قدرت حاصل تھی؛ اس نے اپنی مثنوی میں ضرب الامثال اور محاوروں کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مثنوی" کدم راؤ پدم راؤ" کو اردو زبان کی تاریخ میں، اس لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ یہ اردو کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔ اس سے پہلے کی جو تحریریں دستیاب ہوئی ہیں سب کی سب تصوف اور مذہب سے متعلق ہیں۔ صرف اس مثنوی میں ادبیت کی چاشنی نظر آتی ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے ایک بہت بڑے صوفی اور شاعر ہیں۔ خواجہ بندہ نواز کے سلسلہ صوفیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ شمس العشاق نے اپنے بزرگوں کی طرح درس و تدریس اور تصنیف کے لیے دکنی زبان کا استعمال کیا۔ ان کی تصانیف میں مغز مرغوب، شہادت الحقیق، خوش نامہ اور خوش نغز مشہور اور اہم ہیں۔ میراں جی شمس العشاق کی سبھی تصانیف کا موضوع تصوف ہے۔ انہوں نے اپنے مریدوں، معتقدوں اور عام لوگوں کی تلقین و ہدایت کے لیے بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔

بہمنی عہد کے اہم اور باکمال شعرا میں سید شاہ اشرف بیابانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی تصانیف میں نوسرہار، لازم المبتدی اور واحد باری ہیں۔ اشرف بیابانی کی سب سے اہم اور قابل ذکر مثنوی نوسرہار ہے۔ یہ مثنوی نو ابواب اور بیس فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس کا موضوع شہادت حضرت امام حسین اور واقعہ کربلا کا بیان ہے۔ اس مثنوی کے ہر باب کو گویا ایک انمول ہار کہا گیا ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام "نوسرہار" تجویز کیا گیا ہے۔ مثنوی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوسرہار مجلسوں میں سنانے کے لیے لکھی گئی تھی اسی لیے اس میں سلیس اور عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔

بہمنی دور کے آخری عہد میں فیروز بیدری نے ایک باکمال سخن ور کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ اس کی ایک مختصر سی مثنوی پرت نامہ کے علاوہ چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ لیکن گولکنڈہ کے بلند پایہ شاعروں مثلاً محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں جس انداز سے فیروز کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا کہ فیروز بیدری اپنے وقت کا ایک استاد سخن تھا۔ فیروز کا ہم عصر محمود تھا جس نے دکنی کے علاوہ پنجابی اور فارسی میں شاعری کی۔ اسے بھی استاد مانا گیا۔

بہمنی دور کے دیگر شعرا میں قریشی بیدری، مشتاق اور لطفی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ قریشی نے ایک مثنوی " بھوگ بل "اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ مشتاق اور لطفی کی چند غزلیں اور قصیدے دستیاب ہوئے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ بہمنی دور میں اردو ادب کے ارتقا کے موضوع پر ایک نوٹ لکھیے۔

7.2.2 عادل شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں جب بہمنی حکومت کو زوال ہوا تو جنوبی ہند میں پانچ نئی اور خود مختار سلطنتوں کا قیام عمل میں آیا۔ بیجاپور میں عادل شاہی، گولکنڈہ میں قطب شاہی احمد نگر میں نظام شاہی، برار میں عماد شاہی اور بیدر میں برید شاہی سلطنت قائم ہوئی۔ ان

ریاستوں میں بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی مملکت کو،اردو ادب کے ارتقا کے علاوہ سماج،تہذیب وثقافت کی ترقی کے سلسلہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

عادل شاہی سلاطین نے قطب شاہی حکمرانوں کی طرح نہ صرف دکنی شعرو ادب کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی بلکہ مقامی تہذیبی رجحانات اور اقدار کی ترویج واشاعت میں بھی اہم حصہ لیا۔اس خاندان کے تمام سلاطین صاحب سیف وقلم اور میدان کارزار کے سورما ہونے کے علاوہ علوم وفنون اور شعروسخن کے رسیا بھی تھے۔یوسف عادل شاہ سے سکندر عادل شاہ تک،عادل شاہی خاندان کے نو(9)فرمان رواؤں نے کم وبیش دوسو سال تک بیجاپور پرحکمرانی کی۔

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔بہمنی سلطنت جب کمزور ہوگئی تو اس نے1490ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔یوسف عادل شاہ کا زیادہ تروقت اگرچہ کہ سلطنت کے استحکام میں گزرا لیکن اس کے باوجود اس نے شاعروں،ادیبوں اور اہل فن کی سرپرستی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔یوسف عادل شاہ نہ صرف فنون لطیفہ کا اچھا ذوق رکھتا تھا بلکہ خود بھی فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔وہ طبلہ،ستار،طنبورہ اور عود خوب بجاتا تھا ساتھ ہی ساتھ اسے فن موسیقی،عروض وقافیہ میں بھی مہارت تھی۔علما،فضلا اور اہل ہنر کا بڑا قدر دان تھا۔اس نے کئی قلعے اور خوب صورت عمارتیں بنوا کر شہر بیجاپور کی زینت بڑھائی۔اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں فرخ محل اور آنند محل کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یوسف عادل شاہ کی وفات کے بعد،اس کا فرزند اسمٰعیل عادل شاہ 1518ء میں بیجاپور کے تخت کا وراث بنا۔اسمٰعیل بھی اپنے والد کی طرح ادب نواز اور رعایا پرور حکمران تھا۔اس کو بھی فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ تھا۔فارسی میں شعر کہتا تھا۔شاعری،موسیقی اور نقاشی میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔اسمٰعیل عادل شاہ کو فارسی اور ترکی سے غیر معمولی دلچسپی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے ایک شہر کا نام چنداپور اور ایک محل کا نام چمپا محل رکھا،جس سے اس کی مقامی تہذیب وتمدن سے اثر پذیری کا اندازہ ہوتا ہے۔اسمٰعیل عادل شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ مملکت بیجاپور کے تیسرے حکمران کی حیثیت سے1534ء میں تخت نشین ہوا۔اگرچہ ابراہیم خود شاعر نہیں تھا لیکن اپنے آباد اجداد کی طرح ذوق علم وادب سے بہرہ مند تھا۔شاعروں،عالموں اور اہل فن کار کا بڑا اقدر دان تھا۔

ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند اور عادل شاہی دور کا چوتھا حکمران علی عادل شاہ 1557ء میں تخت نشین ہوا۔اس حکمران کے دور میں علم وفن اور شعروسخن کو خوب ترقی ہوئی۔وہ بڑا اولوالعزم اور صاحب تدبیر بادشاہ تھا۔علی عادل شاہ شعرا اور اہل علم کی سرپرستی میں اپنے آباو اجداد سے بھی آگے تھا۔اس کے ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ وہ سفر میں بھی کتابوں کے صندوق اپنے ساتھ رکھتا تھا۔اس کے دور میں رفاہ عام کے بہت سے کام ہوئے۔اس نے کئی مسجدیں،قلعے اور محلات تعمیر کروائے۔اس کے دور میں صنعت وحرفت اور تجارت کو کافی فروغ ہوا۔شاہ پور جس کو خود بادشاہ نے بسایا تھا،بہت بڑی تجارتی منڈی بن گیا۔

علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور سلطنت بیجاپور کا پانچواں تاجدار ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں بیجاپور کے تخت کا وارث بنا۔وہ بھی نہ صرف صاحب علم وفضل تھا بلکہ مصوری،نقاشی،موسیقی،شاعری اور خطاطی میں بھی قدرت رکھتا تھا۔اسی وجہ سے اس کو" جگت گرو" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔کتاب''نورس''ابراہیم عادل شاہ ثانی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے اس کے

شاعرانہ کمال اورفن موسیقی سے غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کے با کمال دکنی شعرا میں عبدلؔ بیجاپوری اور مقیمؔی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد،اس کا فرزند محمد عادل شاہ 1226ء میں سریر آرائے سلطنت بنا۔اس نے اپنے والد کی قائم کردہ تمام روایات کو برقرار رکھا اور اہل علم وادب اور اہل فن کی قدر دانی میں اپنے آباو جداد سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔اس دور کے شاعروں میں رستمی، ملک خوشنود،ظہور ابن ظہوری،صنعتی،حسن شوقی وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مملکت بیجاپور کا ساتواں حکمران علی عادل شاہ ثانی شاہؔی 1656ء میں بیجاپور کے تخت پر رونق افروز ہوا،دیگر عادل شاہی سلاطین کی طرح شاہؔی بھی ایک علم دوست اور ادب نواز بادشاہ تھا،اس کو شاعری،موسیقی اور فن تعمیر سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔وہ دکنی اردو کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔وہ نورس' کی طرز کے راگ اور گیت لکھنے پر بھی مہارت رکھتا تھا۔شاہؔی کی بنائی ہوئی تاریخی عمارتوں میں حسینی محل، بادشاہ محل، جامع مسجد،حسینی مسجد،عرش محل اور علی دادمحل قابل ذکر ہیں۔اس کے دربار سے ملک الشعرا ملا نصرتی،امین الدین اعلیٰ، ہاشمی اور مرزا جیسے اردو کے سخن ور وابستہ تھے۔علی عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد سکندر عادل شاہ 1672ء میں مملکت کا وارث بنا۔اس حکمران کا دور اندرونی اور بیرونی خلفشار کی وجہ سے اضطراب اور بے چینی کا زمانہ تھا۔شیواجی اور اورنگ زیب کے حملوں کی وجہ سے مملکت بیجاپور کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور آخر کار 1656ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت کے ایک صوبے میں شامل کر لیا لیکن ایسے پر اضطراب عہد میں بھی علم وفن،تہذیب وتمدن اور شعروسخن کا چراغ برابر جلتا رہا۔سکندر عادل شاہ کے عہد کے شاعروں میں عبداللطیف،سیوا، مومن اور معظم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

عادل شاہی دور اردو ادب کے ارتقا کے سلسلہ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اردو کو مختلف ارتقائی منزلوں سے روشناس کیا اور مختلف اصناف شعر جیسے غزل،مثنوی،قصیدہ، رباعی کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی۔لیکن مجموعی حیثیت سے شاعری کا پلہ نثر نگاری کے مقابلے میں بھاری ہے۔عادل شاہی دور کے کم وبیش تمام حکمران علم وادب اور شعروسخن کے سرپرست اور دلدادہ تھے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو اور عادل شاہ ثانی شاہؔی کو اس خاندان کے دیگر فرمانرواؤں کے مقابلے میں اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ دونوں نے نہ صرف عالموں،شاعروں،ادیبوں اور اہل فن کاروں کی دل کھول کر سرپرستی کی بلکہ دونوں موسیقی اور فن کے قدر دان بھی تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی شعر کہتے تھے،خصوصاً علی عادل شاہ شاہؔی کو بہ حیثیت شاعر ایک اعلیٰ مقام ومرتبہ حاصل ہے۔شاہی کے علاوہ اس عہد کے دیگر اساتذہ سخن میں حسن شوقی، ملک الشعرا نصرتی اور ہاشمی بیجاپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔حسن شوقی قدیم دکنی کے دو یا تین اہم غزل گوشاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔غزلوں کے ایک دیوان کے علاوہ اس کی دو مثنویاں "فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ" ہیں۔

حسن شوقؔی ایک باکمال مثنوی نگار اور اعلیٰ پایہ غزل گو تھا۔"فتح نامہ نظام شاہ" (1564ء) دکنی اردو کی ایک قدیم ترین مثنوی ہے۔جس میں نظام شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے جنگ تالی کوٹ کی فتح کا سہرا اسی کے سر باندھا ہے حالاں کہ اس جنگ میں وجیانگر کے راجا رام کے خلاف چار بادشاہوں (ابراہیم قطب شاہ علی عادل شاہ اول،حسین نظام شاہ اور علی برید شاہ) نے فتح حاصل کی تھی۔

"میزبانی نامہ" میں محمد عادل شاہ کی اس شادی کو موضوع بنایا گیا ہے جو نواب مظفر خاں کی دختر سے ہوئی تھی۔اس مثنوی میں محمد عادل شاہ کی علم پروری اور اہل علم وہنر کی قدر دانی اور اس کی شجاعت وفیاضی کا بھی تذکرہ ملتا ہے حسن شوقؔی کو غزل گو کی حیثیت سے دکنی اردو کے

شاعروں میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اس کی غزلیں قدیم اردوشاعری میں ایک نئے رنگ وآہنگ کی ترجمانی کرتی ہیں۔سادگی، روانی، موسیقیت اور نغمگی حسن شوقیؔ کی غزل کا نمایاں وصف ہے۔

نصرتیؔ عادل شاہی عہد کے عظیم المرتبت شعرا میں شمار ہوتا ہے۔نصرتیؔ نے شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی اور ملک الشعرا کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔نصرتیؔ کی تین مثنویاں گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری کے علاوہ غزلوں، قصائد اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے۔

" گلشن عشق "ایک بزمیہ مثنوی ہے۔جس میں کنور منوہر اور مدمالتی کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔جب کہ ''علی نامہ'' رزمیہ شاعری کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔اس مثنوی میں سات بلند پایہ اور معرکتہ الآرا قصیدے بھی شامل ہیں۔نصرتیؔ ایک بے مثال قصیدہ گو، بلند پایہ مثنوی نگار اور باکمال غزل گو بھی تھا۔قصیدہ نگاری کے میدان میں دبستان دکن کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کا نہیں ہے۔اگر چہ اس کے قصائد کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن بلندی تخیل، شوکت لفظی اور گھن گرج کے نقطہ نظر سے نصرتیؔ کے قصائد نہ صرف دبستان دکن بلکہ قصیدہ نگاری کی تاریخ میں بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

بیجاپور سلطنت کا آٹھواں تاجدار سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ نہ صرف ایک عظیم الشان مملکت کا مطلق العنان حکمران تھا بلکہ قدیم دکنی زبان کا ایک صاحب دیوان شاعر اور سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔شاہیؔ نے کم وبیش تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔اس کے کلیات میں غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں کے علاوہ گیت، دوہرے گیت اور جھولنا بھی ملتے ہیں۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے شاہی عادل شاہی دور کے اہم متغزلین میں شمار ہوتا ہے۔اس کے قصیدے بھی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔شاہیؔ کے کلام میں مقامی تہذیبی روایات اور مقامی ماحول کی بھر پور ترجمانی ملتی ہے۔اس نے اپنے تجربات زندگی، مشاہدات اور احساسات کو سادگی اور روانی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہاشمی، عادل شاہی دور کے آخری دور کے شعرا میں ایک پر گو اور باکمال شاعر تھا وہ نابینا تھا۔اس نے اورنگ زیب عالم گیر کے صوبہ دار نواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ کی مدح میں قلعہ چینجی کی فتح (1698ء) کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا تھا۔ہاشمی نے ریختی میں ایک مکمل دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے، جو شائع ہوگیا ہے اس کی غیر مطبوعہ تصانیف میں مثنوی "یوسف زلیخا" (1687ء) معراج نامہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کی ایک مختصر ہجویہ مثنوی بھی شائع ہوئی ہے۔مثنوی "یوسف زلیخا" تقریبا پانچ ہزار ابیات پر مشتمل ایک ضخیم مثنوی ہے۔عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے دیگر شعرا نے بھی یوسف زلیخا کو موضوع بنا کر اور بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن اس موضوع پر سب سے بلند پایہ مثنوی ہاشمی بیجاپوری کی ہی ہے۔ہاشمی ایک بے مثال مثنوی نگار، بلند پایہ غزل گو اور باکمال قصیدہ نگار بھی تھا۔

عادل شاہی دور کے شاعروں نے اگر چہ غزل، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی کی صنف پر بھی باقاعدہ توجہ دی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی، مثنوی کی صنف ہی تمام اصناف سخن پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔اس دور کے دیگر قابل ذکر مثنویوں میں برہان الدین جانمؔ کی ارشاد نامہ، عبدلؔ کی ابراہیم نامہ، مقیمیؔ کی چندر بدن ومہیار، ملک خوشنودؔ کی جنت سنگار، رستمی کی خاور نامہ، علی رحمتی کی "پند دل بند" ایاغی کی نجات نامہ، صنعتیؔ کی قصۂ بے نظیر اور عاجزؔ کی لیلیٰ مجنوں کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

عادل شاہی دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی گئی لیکن جہاں تک عشقیہ موضوعات اور ادبیات کا

تعلق ہے،نثر نگاری کے مقابلے میں شاعری کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔اس دور کی کم وبیش تمام نثری تصانیف چوں کہ صوفیائے کرام کی تخلیقات ہیں اس لیے ان پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔عادل شاہی دور کی نثری تصانیف میں جانم کی کلمتہ الحقائق' امین الدین اعلیٰ کی کلمتہ الاسرار' معظم بیجاپوری کی شرح شکارنامہ اہمیت رکھتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

2۔ مثنوی گلشن عشق کس کی تصنیف ہے؟

3۔ گول گنبد کس نے تعمیر کروایا؟

7.2.3 قطب شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر

قطب شاہی مملکت کا بانی فرماں رواسلطان قلی تھا۔ اس کے آباواجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔اس خاندان کے بعض افراد،ترکستان سے ایران اور ہندوستان منتقل ہوگئے۔سلطان قلی بہمنی مملکت کے حکمران محمد شاہ بہمنی کے عہد میں بیدر آیا اور دربار شاہی میں ملازمت اختیار کرلی سلطان قلی نے اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت خوب ترقی کی۔1496ء میں اس کو تلنگانہ کا صوبیدار بنایا گیا۔اپنی صوبیداری کے دور میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے تلنگانہ کے عوام میں کافی شہرت حاصل کی۔جب بہمنی سلطنت زوال آمادہ ہوگئی تو 1518ء میں سلطان قلی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔سلطان قلی کو بڑھاپے میں اس کے بیٹے جمشید قلی نے قتل کروایا اور جمشید قطب شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔جمشید قلی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سبحان قلی کو سات سال کی عمر میں تخت نشین کیا گیا لیکن سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے اہل دربار کا ایک طبقہ اس کی حکومت کے خلاف ہوگیا اور سبحان قلی کی چند مہینوں کی بادشاہت کے بعد سلطان قلی کے سب سے چھوٹے بیٹے ابراہیم قطب شاہ کو 1550ء میں تخت نشین کیا گیا۔ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد گولکنڈہ کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ابراہیم قطب شاہ کے دور میں اس ریاست کو بڑا استحکام حاصل ہوا۔اس نے نظم ونسق میں مفید اصلاحیں کیں۔ابراہیم کی زندگی کا بڑا حصہ چوں کہ ایک تلگو ریاست وجیانگر میں بسر ہوا تھا۔اس لیے اس کے مزاج میں مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے تعلق سے مروت اور رواداری کے جذبات موجود تھے۔یہی وجہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں تلنگانہ میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مابین بڑی یکجہتی وہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی۔ابراہیم قطب شاہ کو فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ تلگو زبان سے بھی دلچسپی تھی تلگو شاعروں میں وہ بالعموم ''ملکی بھرام'' کے نام سے مقبول تھا۔اردو ادب کی تاریخ میں ابراہیم قطب شاہ کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس دور میں گولکنڈہ کی سرزمین پر پہلی بار شعروادب کی شمع روشن ہوئی۔قطب شاہی دور کے اولین شعرا فیروزؔ، محمودؔ اور ملا خیالیؔ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند سلطان محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں گولکنڈہ کے تخت پر رونق افروز ہوا۔اس کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقت ور سلطنت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی اور اس کا دور حکومت دو ایک معمولی لڑائیوں کو چھوڑ کر بڑی حد تک امن وامان میں گزرا۔محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک خوش نما شہر کا بانی،رعایا پرور حکمران اور دکنی تہذیب وتمدن کا معمار تھا بلکہ قدیم اردو کا ایک

خوش گو شاعر بھی تھا۔اس کے عہد میں ایران کے ایک مشہور عالم میر محمود مومن حیدر آباد آئے تھے،جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔مملکت کے بیشتر کاروبار کی عام نگرانی میر محمد مومن ہی کے سپرد تھی۔یہی سبب تھا کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی امور سے بڑی حد تک بے فکر اور آزاد رہ کر عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔وہ ایک طرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے تو دوسری طرف اپنے دور کا ایک باکمال خوش نویس بھی۔محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی متعدد عمارتوں میں ثلث،کوفی،نسخ،نستعلیق،طغرا وغیرہ نہج خط کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔جس تہذیب وتمدن کو "ہندالمانی کلچر" کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کے نمایاں خدوخال سلطان محمد قلی قطب شاہ،اکبر اعظم اور ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو کے عہد ہی میں نظر آتے ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کی انسان دوستی اور مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ غیر مسلموں اور خصوصاً ہندوؤں کی سرپرستی میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔اس کے بااعتماد مشیروں،مقربین اور عمائدین سلطنت میں بہت سے ہندو بھی شامل تھے۔اس کے عہد حکومت میں متعدد مسجدیں،خانقاہیں،عاشور خانے،محلات شاہی اور باغات بنوائے گئے۔اس کے عہد کا ایک یادگار کارنامہ شہر حیدر آباد کی تاسیس ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد،اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈہ کا بادشاہ بنا۔وہ بھی اپنے آباو اجداد کی طرح علوم وفنون کا بہت شوقین تھا لیکن اس کا مزاج وکردار محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں قدرے مختلف تھا۔محمد قلی قطب شاہ شعر وادب اور رقص وموسیقی کا دلدادہ تھا جب کہ محمد قطب شاہ کو فنون لطیفہ سے کہیں زیادہ مذہبی علوم،فلسفہ اور تاریخ سے کافی دلچسپی تھی۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں مکہ مسجد کی تاسیس اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔اگرچہ اس مسجد کی تعمیر پشتوں کے بعد مکمل ہوئی۔لیکن اس کا سنگ بنیاد خود محمد قطب شاہ ہی نے اپنے دست مبارک سے رکھا تھا۔سلطان محمد قطب شاہ کے بنوائے ہوئے دیگر محلات میں امان محل اپنی آرائش وزیبائش کے اعتبار سے بہت مقبول تھا۔

محمد قطب شاہ کی وفات کے بعد،عبداللہ قطب شاہ 1625ء میں سلطنت گولکنڈہ کے ساتویں حکمران کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح علم و ہنر،شعر وادب اور رقص وموسیقی کا قدرداں تھا۔وہ خود بھی ایک صاحب دیوان شاعر تھا اس نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی قائم کردہ تمام سماجی،تہذیبی اور ادبی روایات کو ازسرنو جلا بخشی۔سلطان عبداللہ کو محمد قلی قطب شاہ کی طرح مذہبی اور غیر مذہبی تقاریب اور تہواروں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ان تقاریب کے موقع پر زرکثیر خرچ کر کے جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔دیگر قطب شاہی سلاطین کی طرح اس نے متعدد باغ اور شاہی محلات تعمیر کروائے تھے۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا داماد اور مملکت گولکنڈہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ 1672ء میں تخت نشین ہوا۔اس کے دور حکومت میں مرہٹوں اور مغلوں کی یورش کی وجہ سے گولکنڈہ میں بے اطمینانی،اضطراب اور انتشار پیدا ہو گیا تھا۔جنوبی ہند کی سیاسی تاریخ کے ایسے نازک عہد میں شاہ ابوالحسن نے حکمت عملی اور تدبر کام لیتے ہوئے ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔یہاں تک کہ 1686ء میں مغل حکمراں اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

قطب شاہی دور کے اولین شعرا میں فیروزؔ،محمودؔ اور خیالیؔ کے نام ملتے ہیں یہ تینوں شعرا ابراہیم عادل شاہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔فیروزؔ دراصل بیدر کا باشندہ تھا اور بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں گولکنڈہ چلا آیا۔گولکنڈہ آنے سے قبل وہ بیدر کے باکمال شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔گولکنڈہ کے علمی وادبی حلقوں میں بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔فیروزؔ کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ ولیؔ کا سفر دہلی

،جس کے بعد شمالی ہند میں اردو کا چراغ روشن ہوا۔فیرؔوز کی مختصر سی مذہبی رنگ کی مثنوی ’’پرت نامہ‘‘ کے علاوہ چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ فیرؔوز کی طرح سید محمؔود اور خیاؔلی بھی قطب شاہی دور کے ابتدائی اہم شاعر تھے جنھیں دکنی کے بلند پایہ شعرا محمد قلی قطب شاہ٬وجہؔی اور ابن نشاطؔی نے استادِ سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔محمؔود اور خیاؔلی کی دو تین غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔

قطب شاہی دور کے نامور اور باکمال شاعروں اور ادیبوں میں ملک الشعرا اسداللہ وجہؔی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، ملک الشعرا غواصؔی اور ابن نشاطؔی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

اسداللہ وجہؔی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت کا ملک الشعرا اور قدیم اردو دکنی زبان کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور بلند پایہ ادیب بھی تھا۔وجہؔی کی اہم شعری تصنیف "قطب مشتری" (1609ء) ہے۔اس مثنوی میں محمد قلی اور بنگالہ کی شہزادی مشتری کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔عشقیہ شاعری میں ڈوبی ہوئی اس طبع زاد مثنوی میں وجہؔی نے سلطان وقت محمد قلی قطب شاہ کے مزاج و کردار، شجاعت، فیاضی اور جذبۂ محبت کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔اس مثنوی کے مطالعہ سے وجہؔی کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

وجہی کی دوسری اہم تصنیف ’’سب رس‘‘ ہے۔دکنی ادب کی یہ معرکتہ الارا تصنیف سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1635ء میں لکھی گئی یہ داستان ایک فارسی تصنیف "حسن ودل" کے قصہ پر مبنی ہوتے ہوئے بھی ایک تخلیقی شاہکار کہی جاسکتی ہے۔کیوں کہ وجہؔی نے پیچیدہ اور خشک فلسفیانہ مسائل کو ادبی حسن کے ساتھ دکنی اردو میں بیان کیا ہے۔’’سب رس‘‘ قدیم اردو کی ایک داستان ہی نہیں بلکہ اردو نثر کے دو یا تین منتخب پاروں میں شمار کی جاتی ہے۔یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں مختلف انسانی جذبات و احساسات یا انسانی صلاحیتوں اور قوتوں مثلاً عقل، دل، خیال، غصہ، حسد وغیرہ کو کرداروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔سب رس کا اسلوب مقفّیٰ ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار ہے۔بعض مقامات پر وجہی نے انشائیوں کی صورت میں، حقائق حیات کے متعلق فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات بیان کیے ہیں جس کی وجہ سے یہ داستان زندہ جاوید ہوگئی ہے۔قطب مشتری اور سب رس کے علاوہ وجہؔی نے چند اردو غزلیں اور ایک فارسی دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ایک اور نثری تصنیف "تاج الحقائق" بھی وجہؔی سے منسوب کی جاتی ہے۔

قطب شاہی سلطنت کا پانچواں حکمران، محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں غزل، قصیدہ، رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ جہاں تک غزلوں کی تعداد اور تنوع کا تعلق ہے، محمد قلی قطب شاہ دکنی اردو کا سب سے اہم شاعر قرار پاتا ہے۔اس کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت سادگیٔ بیان ہے۔اس نے اپنے جذبات، احساسات اور تجربات زندگی کو سادگی، روانی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔محمد قلی قطب شاہ کی شاعری گویا اس کی زندگی کا آئینہ ہے جس میں اس کے واقعات حیات کی متحرک تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں درد وغم اور ہجر وفراق کی کیفیات کی ترجمانی تقریباً نہیں ملتی۔اس لحاظ سے وہ اردو کا ایک منفرد شاعر ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی نجی سماجی اور سیاسی زندگی کے تجربات کو اپنے کلام میں بے کم وکاست بے نقاب کیا ہے۔اس نے عید میلاد، شب معراج، شب برات جیسے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں اور بسنت، دیوالی اور ہولی پر بھی۔لیکن یہ ساری تقاریب خواہ وہ مذہبی نوعیت کی ہوں یا موسمی تہواروں کی، محمد قلی قطب شاہ کے لیے عیش وعشرت کے ایک تازہ عنوان کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وجہی اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دبستان گولکنڈہ کے نامور شاعروں میں ملک الشعرا غواصیؔ کا نام قابل ذکر ہے۔غواصی دکنی زبان کا ایک قادرالکلام اور بلند پایہ شاعر ہے۔وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا،محمد قلی کے عہد میں اس نے شاعری کا آغاز کیا اور بہت جلد ایک پر گو شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔عبداللہ قطب شاہ کے دور میں ترقی کر کے وہ قطب شاہی سلطنت کا ملک الشعرا بن گیا۔تین مثنویوں میناست ونتی،سیف الملک وبدیع الجمال اور طوطی نامہ کے علاوہ غزلوں،قصیدوں،رباعیوں اور مرثیوں پر مشتمل غواصیؔ کا ایک دیوان بھی ہے۔غواصیؔ کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر اور ایک نئی طرز کا بانی کہتا ہے۔غواصیؔ کی یہ شاعرانہ تعلّی بے جا نہیں ہے۔غواصی کی تینوں مثنویوں کے قصے طبع زاد نہیں ہیں۔لیکن اس نے اپنے تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں بڑی حد تک طبع زاد مثنویوں کی حیثیت دے دی ہے۔زبان و بیان کی سادگی،تاثر کی فراوانی،ماحول کی ترجمانی اور حقیقت نگاری غواصیؔ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔غواصیؔ نے غزل،قصیدہ اور رباعی کے میدان میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔خصوصاً غزل گوئی کے میدان میں قدیم اردو کا کوئی شاعر اس کی برابری کو نہیں پہنچتا۔زبان و بیان کی سادگی،سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی غواصیؔ کے تغزل کا نمایاں وصف ہے۔

دبستان گولکنڈہ کے دیگر شاعروں میں احمؔد گجراتی،عبداللہ قطب شاہ،ابن نشاطیؔ،جنیدی،فائزؔ اور طبعیؔ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

احمد گجراتی نے اپنی دو مثنویاں ''یوسف زلیخا'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کی تھیں۔عبداللہ قطب شاہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہے لیکن اس کی غزلیں اس کے پیش روشعرا وجہیؔ،محمد قلی قطب شاہ اور غواصیؔ کے مرتبے کو نہیں پہنچتیں۔ابن نشاطیؔ قطب شاہی سلطنت کا ایک اہم مثنوی نگار ہے۔اس کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی ادب کی ایک شاہکار تصنیف ہے۔یہ تصنیف وجہیؔ اور غواصیؔ کی مثنویوں کے بعد دبستان گولکنڈہ کی سب سے اہم اور دلچسپ مثنوی ہے''پھول بن'' کے مطالعہ سے ابن نشاطیؔ کے کمال فن اور قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جنیدیؔ کی ''ماہ پیکر''، فائزؔ کی ''رضوان شاہ وروح افزا'' اور طبعیؔ کی ''بہرام وگل اندام'' دبستان گولکنڈہ کے عہد آخر کی منتخب اور نمائندہ مثنویاں ہیں۔اسی طرح وجہیؔ کے علاوہ قطب شاہی دور کے دیگر نثر نگاروں میں میراں یعقوب اور عابد شاہ حسینی کے نام مشہور ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ قطب شاہی خاندان کا بانی کون تھا؟

2۔ سب رس کس کی تصنیف ہے؟

3۔ مکہ مسجد کا سنگ بنیاد کس نے رکھا؟

7.3 اکتسابی نتائج

☆ جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی کے فتوحات سے بہت پہلے ایسے صوفیا اور علما کے نام ملتے ہیں جو جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے۔جیسے شاہ مومن' شاہ جلال الدین گنج رواں' سید احمد کبیر حیات قلندر' بابا شرف الدین، بابا شہاب الدین وغیرہ۔

☆ تیرہویں صدی عیسوی علاء الدین خلجی کی فوجیں شمالی ہند سے دکن پہنچتی ہیں۔اس میں فوج کے علاوہ اہل ہنر، تاجر، صوفی اور فقیر

بھی شامل ہیں۔علاء الدین خلجی سے فتح دکن کے بعد بعض اہم صوفیوں کے نام ملتے ہیں جیسے شاہ راجو قتال٬ شاہ برہان الدین غریب وغیرہ صوفیائے کرام جنوبی ہند کے مختلف خطوں میں مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے زبان کے اظہار کی تمام دشواریاں دور ہو گئیں۔

☆ سلطان محمد تغلق نے 1327ء میں پایہ تخت دہلی کے بجائے دیوگیری (دولت آباد) منتقل کیا،لیکن 1347ء میں علاء الدین حسن بہمن شاہ نے جنوبی ہند میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنی سلطنت کا پایہ تخت دولت آباد کے بجائے گلبرگہ کو منتقل کر دیا۔بہمنی خاندان نے دوسو سال تک سرزمین جنوبی ہند پر حکمرانی کی۔بہمنی سلاطین نے علوم وفنون کے رشتہ سے مہا راشٹرا٬ کرناٹک اور تلنگانہ کے علاقوں میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کی۔بہمنی سلاطین علم و ادب٬ شعر وسخن اور فنون لطیفہ کے غیر معمولی قدردان تھے۔انہوں نے عالموں٬ شاعروں اور باکمالوں کی سرپرستی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

☆ بہمنی دور کے شاعروں اور ادیبوں میں خواجہ بندہ نواز٬ نظامؔی بیدری٬ اشرفؔ بیابانی٬ میراں جی شمس العشاق اور فیروزؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔میراں جی شمس العشاق٬ فیروزؔ اور اشرفؔ کی مثنویاں مذہبی اور صوفیانہ موضوعات کی ترجمانی کرتی ہیں جب کہ فخر دین نظامؔی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔

☆ قدیم اردو ادب کے ارتقا کے سلسلہ میں بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔یوسف عادل شاہ (1490۔1518ء) سے سکندر عادل شاہ (1672ء1686-ء) تک جملہ (9) فرمانرواؤں نے تقریبا دوسو سال تک بیجاپور کی سلطنت پر حکمرانی کی۔عادل شاہی خاندان کے تمام حکمران نہ صرف میدان کا ازرار کے سورما اور اہل علم تھے بلکہ شاعروں،ادیبوں اور فن کاروں کے قدردان بھی تھے۔جس کے نتیجہ کے طور پر بیجاپور اہل علم و ہنر اور شعر وسخن کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔عادل شاہی دور کے شاعروں،ادیبوں اور اہل کمال میں فارسی اور عربی کے علما سے قطع نظر قدیم اردو کے اہم شاعروں اور ادیبوں میں برہان الدین جانمؔ،حسن شوقیؔ،مقیمیؔ،شاہیؔ،نصرتیؔ،ملک خوشنودؔ،رستمیؔ،ہاشمیؔ،صنعتیؔ،امین الدین اعلیٰ،شاہ معظم وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

☆ دبستان بیجاپور کے نمائندہ شاعر حسن شوقیؔ،شاہیؔ،نصرتیؔ اور ہاشمیؔ ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنی شعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔شاہی کے علاوہ دیگر شعرا نے مثنوی نگاری میں اپنے کمال فن کا لوہا منوایا ہے،لیکن شاہی کی فن کاری کا اندازہ غزل گوئی اور قصیدہ نگاری سے ہوتا ہے۔جب کہ حسن شوقی،نصرتی اور ہاشمی بلند پایہ مثنوی نگار بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ غزل گوئی کے میدان میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔حسن شوقیؔ کی مثنوی ''میزبانی نامہ'' اور ''علی نامہ''، ہاشمیؔ کی ''یوسف زلیخا'' عادل شاہی دور کی اہم مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔ملک الشعرا نصرتیؔ دبستان بیجاپور کا ایک قادر الکلام اور اعلیٰ مرتبہ کا شاعر ہے۔غزل گوئی اور مثنوی نگاری کے علاوہ اس نے قصیدہ گوئی کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی ہے۔اس کا شمار اردو کے نمائندہ قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

☆ قطب شاہی سلاطین نے کم وبیش ایک سوستر سال تک گولکنڈہ پر حکمرانی کی۔بیشتر قطب شاہی حکمران نہ صرف علوم وفنون کے قدردان تھے٬ بلکہ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی اور سرپرستی بھی کرتے تھے۔صاحب دیوان قطب شاہی سلاطین میں محمد قلی قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

☆ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔اس کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدے رباعیاں اور مختلف موضوعات پر نظمیں بھی ملتی ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کا دیوان دراصل اس کی زندگی اور شخصیت کا آئینہ ہے۔سادگی، روانی، برجستگی، سلاست اور حقیقت نگاری محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

☆ محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا اسداللہ وجہی اپنے زمانے کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی تھا۔اس کی طبع زاد مثنوی ''قطب مشتری'' نہ صرف قطب شاہی عہد کی ایک لاجواب تصنیف ہے بلکہ اردو مثنوی کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی مستحق ہے۔اس مثنوی کے مطالعے سے شاعر کے کمال فن اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔قطب مشتری کو وجہی نے صرف بارہ دن کے عرصہ میں مکمل کیا تھا۔وجہی ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھا اس کی تصنیف ''سب رس'' نہ صرف دکنی اردو نثر کی شاہکار تخلیق ہے بلکہ اردو نثر کے دو یا تین منتخب نثری شہ پاروں میں شمار ہوتی ہے۔اس داستان میں چھوٹے چھوٹے جملوں کو قافیہ ردیف سے آراستہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔جس سے اس میں بیک وقت شاعری اور نثر دونوں کا حسن نظر آتا ہے۔

☆ محمد قلی قطب شاہ اور وجہی کے بعد قطب شاہی دور کا سب سے بڑا شاعر غواصی ہے۔اس نے نہ صرف مثنوی نگاری کے میدان میں نمایاں جوہر دکھائے اور ''مینا ست ونتی''، ''سیف الملک وبدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' جیسی بلند پایہ مثنویاں تصنیف کیں بلکہ قصیدہ نگاری، غزل گوئی اور رباعی گوئی میں اہم مقام حاصل کیا۔محمد قلی قطب شاہ کے دور میں غواصی کو رسائی نصیب نہیں ہوسکی لیکن عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں شاعر کی حیثیت سے غواصی کی مقبولیت سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔اس لیے سلطان عبداللہ قطب شاہ نے غواصی کو اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا۔عبداللہ قطب شاہ کے دور میں اسے گولکنڈہ کے سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھی بھیجا گیا تھا جہاں اس کے شایان شان استقبال کیا گیا۔عادل شاہی عہد کے شاعروں نے غواصی کا ذکر بڑی عزت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔زبان وبیان کی سادگی، جذبات واحساسات کی موثر ترجمانی اور سوز وگداز غواصی کی شاعری کے اہم اوصاف ہیں۔

☆ غواصی کے بعد اس دور کے شعرا میں ابن نشاطی نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔اس کی صرف ایک ہی مثنوی" پھول بن" دستیاب ہوئی ہے۔لیکن شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے یہ اردو کی لازوال تصنیفات میں شمار کیے جانے کی مستحق ہے۔ابن نشاطی کے بعد اس دور کے دیگر شاعروں میں جنیدی، فائز اور طبعی اہم ہیں۔جب کہ نثر نگاروں کے میدان میں وجہی کے بعد میراں جی خدانما، عابد شاہ حسینی اور میراں یعقوب کے نام قابل ذکر ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بادشاہ بنا۔اس کو زیادہ تر مذہبی علوم اور فلسفہ وتاریخ سے دلچسپی تھی۔اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا۔وہ علم وہنر، شعر وسخن اور رقص وموسیقی کا دلدادہ تھا۔اس کے بعد سلطان ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا۔یہ اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔اسی کے عہد میں 1686ء میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو فتح کیا۔

7.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی

ہیولیٰ	ڈول، ڈھانچ، خاکہ، ماہیت
آمیزش	ملاوٹ، ملونی
خودمختار	بااختیار، آزاد
برسرپیکار	جنگ کے لیے آمادہ
شیرازہ	انتظام، تنظیم
ضرب المثل	وہ جملہ جو مثال کے طور پر کہا جائے، جمع ضرب الامثال
فنون لطیفہ	وہ فنون جو انسان کے ذوق آرائش جمال کی تسکین کے لیے وجود میں آتے ہیں
توقع	امید، آس
ترویج	رواج دینا، اشاعت کرنا
تصنیف وتالیف	کتابیں لکھنا، کتابیں مرتب کرنا
تلقین وہدایت	تعلیم وتربیت، نصیحت وہدایت
سیف	تلوار
استحکام	مضبوطی، پختگی
جگت گرو	استاد، عالم
خطاطی	خوش نویسی، کتابت
سریرآرا	تخت نشین
بزمیہ	بزم سے متعلق
رزمیہ	رزم سے متعلق
معرکتہ الآرا	زبردست، زورآور
مطلق العنان	بے لگام، خودمختار
مسلّم	تسلیم کیا گیا
معمار	تعمیرکار، عمارت بنانے والا
طبع زاد	اپنی ایجاد، طبیعت سے نکلا ہوا

7.5 نمونۂ امتحانی سوالات

7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

2۔ گول گنبد کس نے تعمیر کروایا؟

3۔ مثنوی گلشن عشق کس کی تصنیف ہے؟

4۔ قطب شاہی خاندان کا بانی کون تھا؟

5۔ سب رس کس کی تصنیف ہے؟

6۔ مکہ مسجد کا سنگ بنیاد کس نے رکھا؟

7۔ ''سیف الملک وبدیع الجمال'' کس کی مثنوی ہے؟

8۔ مثنوی ''قطب مشتری'' پہلی مرتبہ کب شائع ہوئی؟

9۔ مثنوی ''گلشن عشق'' کا موضوع کیا ہے؟

10۔ ''دکن میں اردو'' کس کی تصنیف ہے؟

7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ بہمنی دور کے سماجی اور تہذیبی پس منظر پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ بہمنی دور میں اردو ادب کے ارتقا کے موضوع پر ایک نوٹ لکھیے۔

4۔ عادل شاہی دور کے کسی ایک شاعر پر مختصر نوٹ لکھیے۔

5۔ قطب شاہی دور کی مثنویوں کا جائزہ لیجیے۔

7.5.2 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ عادل شاہی دور کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ قطب شاہی دور کے شعر و ادب پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ عادل شاہی دور کی مثنویوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

7.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	تاریخ ادب اردو (۱۷۰۰ء تک) پہلی چار جلد	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند
3۔	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
4۔	اردو زبان کی تاریخ	مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

اکائی 8: اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید
8.1 مقاصد
8.2 تصوف کی تعریف وتشریح اور صوفیا کی خصوصیات
8.3 اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ
8.4 تیرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ
8.4.1 خواجہ معین الدین چشتی
8.4.2 شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج یا گنج شکر
8.4.3 شیخ حمیدالدین ناگوری
8.5 چودہویں صدی کا مذہبی سرمایہ
8.5.1 امیر خسرو
8.5.2 شیخ عین الدین گنج العلم
8.5.3 شیخ شرف الدین یحیٰ منیری
8.6 پندرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ
8.6.1 حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز
8.6.2 میراں جی شمس العشاق
8.7 سولہویں صدی کا مذہبی سرمایہ
8.7.1 شیخ بہاء الدین باجن
8.7.2 شاہ علی محمد جیو گام دھنی
8.7.3 برہان الدین جانم
8.8 سترہویں صدی کا مذہبی سرمایہ
8.8.1 خوب محمد چشتی
8.8.2 میراں جی خدانما
8.8.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰ
8.9 اکتسابی نتائج
8.10 کلیدی الفاظ

8.11 نمونہ امتحانی سوالات
8.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.0 تمہید

پچھلی اکائیوں میں آپ نے شمالی اور جنوبی ہند میں اردو ادب کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔اب اس اکائی میں اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔ابتدا میں علم تصوف کی بنیادی باتیں اور صوفیائے کرام کی خصوصیات بیان کی جائیں گی تا کہ ہم ان کی خدمات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ علم تصوف پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ صوفیا کی خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں

☆ صوفیا کے کام اور اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیا کرام کی خدمات کا جائزہ لے سکیں۔

☆ تیرہویں صدی تا سترہویں صدی عیسوی کے چند نمائندہ صوفیائے کرام اور ان کی شعری ونثری کارناموں کا جائزہ لے سکیں۔

8.2 تصوف کی تعریف وتشریح اور صوفیا کی خصوصیات

شریعت کے احکام کو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجالانے اور اطاعت میں خدا کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے ہی کا نام تصوف ہے۔اس کا موضوع تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب (صفائی)، اخلاق وتعمیر ظاہر و باطن ہے۔اس کی غایت ومقصد سعادت ابدی کا حاصل کرنا ہے۔

تصوف کی ساری بنیاد اسی پر ہے کہ آداب شریعت کی پابندی رہے، حرام اور مشتبہ چیزوں سے دست کشی کی جائے، ناجائز اوہام اور خیالات سے حواس کو آلودہ نہ کیا جائے اور غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارا جائے۔

تصوف کے تمام سلسلے اور تمام شاخیں حق تعالیٰ سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتے ہیں۔صوفیا کے یہاں دوئی کی گنجائش نہیں ہے۔صوفیائے کرام کے نظریے دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔(1) وحدت الوجود (2) وحدت الشہود۔

تصوف کے مختلف سلسلے پیدا ہوئے۔چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، شطاریہ، مجددیہ، مداریہ، قلندریہ وغیرہ۔ہندوستان میں چشتی سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو مانا جاتا ہے۔قادری سلسلہ کے بانی حضرت عبدالقادر جیلانی تھے۔سہروردی سلسلہ کی ابتداء ضیاالدین

نجیب سہروردیؒ نے کی۔نقشبندی سلسلہ خواجہ بہاء الدین نقشبندی کے نام سے منسوب ہے۔شطاری سلسلہ حضرت شاہ عبداللہؒ نے شروع کیا۔

صوفی لفظ ''صوف'' سے بنا ہے جس کے معنی موٹا اون ہیں۔لباس صوف پہننے والے کوصوفی کہا گیا۔صوفی ظاہری اعمال کے ساتھ باطنی حسن واخلاق پر بھی نظر رکھتا ہے۔وہ زندگی کی اصل غرض داخلی اور روحانی اصلاح کوقرار دیتا ہے۔وہ خشیت الٰہی (اللہ کا خوف) سے لرزاں اور محبت الٰہی سے سرشار ہوتا ہے۔اس کی زندگی صاف' سادہ اور بے داغ ہوتی ہے۔اس میں دکھاوا بالکل نہیں ہوتا۔وہ سختیاں سہنے کا عادی ہوتا ہے۔اس کا مطمح نظر دنیا نہیں ہوتی ۔اس میں خدا کا عشق اور خدا کے بندوں کی محبت پائی جاتی ہے۔ایک سچا صوفی معیاری مسلمان ہوتا ہے۔صوفیا دین سے غفلت برتنے والے لوگوں کو مذہب کی باطنی قدروں کی طرف راغب کرتے ہیں۔ان کے تزکیۂ قلب اور پاکیزگیِ روح کا سامان کرتے ہیں۔عیش طلبی کو خیر باد کہتے اور سادہ زندگی کی طرف خلقت خدا کو مائل کرتے ہیں۔حقیقی مسلم صوفیوں نے کبھی بھی ترک دنیا کا وعظ نہیں دیا کیوں کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔صوفی وہ ہوتا ہے جس کا قلب صفا (صفائی) سے لبریز اور کدر (گندگی) سے خالی ہو۔صوفیا اپنے اپنے طور پر ضرورت اور حالات کے لحاظ سے تربیت اخلاق اور تزکیۂ روح کے مناسب نفسیاتی طریقے مقرر کرتے رہتے ۔عبادت وریاضت اور ورد وظائف کی تعلیم اسی غرض سے دیا کرتے ۔انہوں نے تربیت روح کے لیے مختلف منازل اور مقامات متعین کیے جیسے عالم حیرت' عالم جذب' عالم فنا' عالم بقا' فنافی الشیخ' فنافی الرسول' فنافی اللہ' باقی باللہ۔

صوفیائے کرام کی خانقاہیں مختلف مذاہب اور مختلف زبان بولنے والوں کی آماجگاہ بن گئیں۔اس طرح مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا آپسی لین دین ہوا۔ان کی خانقاہیں بنی نوع انسان کی ہم آہنگی کا ذریعہ بنیں۔لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے ۔ذات پات اور رنگ ونسل سے ہٹ کر صوفیا نے بنی نوع انسان کے لیے عزت ووقار چاہا۔عوام سے ہمدردی اور خدمت خلق کی وجہ سے حضرات صوفیا کا سماج میں ایک اہم مقام تھا۔صوفیا عوام میں اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ۔انہوں نے سلاطین کو اللہ کی مخلوق کی بلاتفریق مذہب وملت' حاجت براری اور عدل پروری پر زیادہ سے زیادہ زور دیا۔اچھا سماج اور اچھی معاشرت صلحاوصوفیا کی کوششوں سے بنتی رہی ۔لوگ پروانہ وار ان کے گرد جمع ہوتے اور وہ لوگوں کے اخلاق وسیرت کو اپنے اعلیٰ کردار کے عملی نمونوں سے سنوارنے کی کوشش کرتے ۔

صوفیائے کرام ہندوستانی سماج میں یکجہتی' میل جول' اور خیر سگالی چاہتے تھے۔وہ لوگ جھگڑے' عناد' تعصب' نفرت اور حسد سے پاک صاف ایک صحت مند سماج کے قیام کی کوشش کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔تمام صوفیائے کرام کا طرزِ فکر یہی تھا کہ سب انسان بنیادی طور سے ایک ہیں۔انہوں نے تمام لوگوں کے لیے خوشگوار سماجی ماحول پیدا کیا۔صوفیا چاہتے تھے کہ عوام میں اخلاقی قدریں بڑھیں اور سماجی واخلاقی اعتبار سے ایسا صحت مند ماحول پیدا ہو جو کہ بنی نوع انسان کی خوشی ومسرت کا سبب بنے۔

8.3 اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اردو زبان وادب کی تخلیق ونشو ونما صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔اردو زبان کی ترویج واشاعت میں ان کی خدمات مسلمہ ہیں۔ انھیں اپنی بات پہنچانا تھا۔ وہ ایسی زبان میں اپنی تعلیمات پیش کرنا چاہتے تھے جسے عوام سمجھ سکیں ۔انہوں نے اپنی تعلیمات کو نظم ونثر میں پیش کیا۔صوفیائے کرام کے فقرے اردو کے نقوش اولین اور ابتدائی نمونے ہیں۔ یہ فقرے اردو زبان کے ارتقا میں معاون ثابت ہوئے ۔صوفیائے کرام عوام سے ان کے اپنے روزمرہ میں گفتگو کرتے تھے ۔وہ مقامی بولیوں کو استعمال کرتے۔ ہندوستانی مقامی زبانوں اور بولیوں کو بادشاہوں

کے دربار میں اتنی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہیں ملی جتنی بزرگوں کی خانقاہوں سے حاصل ہوئی۔امرا اور بادشاہوں کو عوام سے میل جول کی وہ ضرورت نہیں تھی جو ان بزرگوں کو تھی اور ادنیٰ ترین سطح کے عوام سے سیدھے اور حقیقی رابطے کا ہی یہ ثمرہ تھا کہ زبان کا وہ عوامی کینڈا تیار ہو گیا جس پر آئندہ زمانے میں اردو زبان اور روزمرہ کی عمارت استوار ہوئی۔صوفی شعرا کو سادہ اور عام فہم زبان میں اپنی بات عوام تک پیش کرنا مقصود تھا۔چنانچہ ان کی شاعری میں الفاظ کو ضرورت شعری کے مطابق موڑ توڑ لیا جاتا تھا۔کہیں کسی حرف کو گرا کر پڑھنے سے وزن کا سرا مل جاتا اور کہیں سکتے کو دور کرنے کے لیے آواز کو کھینچ کر پڑھنا پڑتا ہے۔جیسے سر کو سیر اور فکر کو فکیر کہہ کر کام نکال لیتے۔قافیوں کے بھی کوئی خاص اصول کی پابندی ان کے ہاں اکثر مفقود ہے۔قافیے میں صرف آواز کا خیال رکھتے۔لفظ جیسا بولا جاتا ویسا ہی تحریر میں لے آتے جیسے شروع کو شرو اور صحیح کو سہی لکھ دیتے۔

دکن کے صوفیائے کرام نے تصوف کے رموز کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کے لیے گیت کے انداز میں سہیلے کہے تھے۔ان میں عارفانہ مطالب کو بڑی آسانی کے ساتھ سلیس زبان میں پیش کیا گیا تھا۔اس عہد میں عروضی اصولوں کی بھی سختی سے پابندی ممکن نہ تھی۔اس لیے ردیف وقوافی میں حسب ضرورت تغیر وتبدل کی مثالیں بھی موجود ہیں۔اکثر ردیفوں میں ''س'' اور ''ص''، 'ط' اور ''ت''، ''ع'' اور ''ا''، ''ک'' اور ''ق''، کو ایک ہی صوتیے Phoneme کے طور پر برتا گیا ہے۔ضرورت شعری کے لحاظ سے ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن بنا دیا گیا ہے اور اسی طرح سادہ الفاظ کو مشدد اور مشدد کو سادہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ادب کے اس ابتدائی دور میں نثر اور شعر کے اعلیٰ ترین نمونوں کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔یہ ادبی زبان کا عہد طفولیت تھا اس لیے اس میں منجھی ہوئی زبان اور نکھرے ہوئے اسلوب کی مثالیں نہیں ملتیں۔رچاؤ اور پختگی تشکیلی دورِ آغاز سے نہیں' زبان وادب کے عہد بلوغیت سے تعلق رکھتے ہیں۔اردو ہی نہیں ہر زبان میں ادبیت کا چٹخارہ اور صوری محاسن' تشکیلی دور کی نہیں' دور ترقی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف وشاعر کے ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے لیکن زبان یاوری نہیں کر رہی ہے اور اظہار کے راستے مسدود ہیں۔جملوں میں الفاظ کی وہ ترتیب ہیں جو قواعد کی رو سے ہونی چاہیے۔صوفیا کا مقصد تو اپنی بات اور اپنا پیغام عوام وخواص سب تک پہنچانا تھا۔فارسی اور دکنی نثر کا امتزاج اس زمانے کی تصانیف کی ایک عام خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔کہیں پورا جملہ فارسی میں ہے تو کہیں دکنی کے ساتھ ابتدا یا آخر میں فارسی الفاظ سے خیال کی ترسیل میں مدد لی گئی۔

بہمنی دور میں اردو چاروں طرف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی اور واحد مشترک زبان بن جاتی ہے اور اس عظیم سلطنت کے مختلف علاقوں میں ایک ایسا سازگار ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ آئندہ دور میں ادبی تخلیق کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔سوال اور جواب کی ہیئت میں نظمیں صوفیائے کرام کے ہاں ایک عام اور مقبول ہیئت رہی ہے۔سوال و جواب میں شریعت وطریقت کے بہت سے مسائل آ گئے ہیں۔

صوفیائے کرام نے اس زبان کو تصوف کی تعلیم کے لیے استعمال کیا۔نثری رسالے لکھے گئے۔قوالی' موسیقی' شاعری اور درس اخلاق کی یہی زبان ٹھیری۔صوفیا نے اسے ادبی سطح پر لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔اس دور میں جب کہ اردو ابھی نومولود زبان تھی اور اہل علم اس میں لکھنا باعث عار سمجھتے تھے' صوفیائے کرام نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کی تعلیم' تربیت اور تلقین کے لیے اسی زبان میں شعری اور نثری تخلیقات پیش کیں۔ان تخلیقات میں معرفت وسلوک' مذہب' علم وحکمت جیسے موضوعات شامل تھے۔اپنے پیغام کے لیے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا۔چنانچہ اردو زبان میں شاعری کے قدیم نمونوں میں تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔صوفیانہ ادب نے زبان کی نشو ونما اور ترویج میں

زبردست رول ادا کیا۔صوفیا ملک کے مختلف حصوں میں جاتے اور وہیں کے ہو رہتے۔انھیں مقامی لوگوں سے بات چیت کرنی پڑتی' اپنا پیغام پیش کرنا ہوتا۔انہوں نے بول چال اور اپنی تخلیقات کے لیےعوام کی زبان یعنی اردوزبان کو استعمال کیا۔یہ مختلف زبانوں اور بولیوں کے علاقوں کے درمیان رابطے کی زبان بنتی جارہی تھی۔یہ جہاں بھی جاتی وہاں کے مقامی اثرات قبول کرتی اور اپنے الفاظ کے ذخیرے کو مقامی بولیوں سے اکتساب کر کے مالا مال کرتی جاتی۔قومی یکجہتی کو استوار کرنے میں یہ ایک بڑا قدم تھا۔صوفیائے کرام ہندی' فارسی' عربی اور ہندوستان کی دوسری مقامی بولیوں سے الفاظ لینے میں قطعاً نہیں جھجھکتے تھے۔حمد ونعت میں بھی عربی کے خاص الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے مذہبی الفاظ بے ساختہ برتے جاتے۔وہ اپنی شاعری میں ہندو دیومالا کی تلمیحات اور استعارے بھی استعمال کرتے۔صوفی ادیبوں نے زبان کو کئی اصطلاحیں اور علامتیں بھی دیں مثلاً وہ بت کدہ' بت خانہ' شراب خانہ' خرابات کہتے تو اس سے عارف کامل کا باطن مراد لیتے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردوزبان وادب کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام نے بنیادی کام انجام دیا اور بجاطور پر مولوی عبدالحق نے انھیں اردو کا محسن قرار دیا ہے۔

8.4 تیرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.4.1 حضرت معین الدین چشتی سنجری اجمیری:

ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے صوفیا نے عوام سے اپنا رشتہ زیادہ گہرا کیا۔چشتی خانقاہیں شہروں سے نکل کر دیہات اور قصبات میں پھیل گئیں۔اس طرح چشتی صوفیا کو ہر سطح کے عوام کی زبان' کلچر' بولی سے قریب آنے کا موقع ملا۔خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کا کی سے منسوب کوئی ہندوی کا فقرہ نہیں ملتا۔خواجہ اجمیری کے دوسرے خلیفہ حضرت حمیدالدین ناگوری کے ملفوظات میں متعدد ہندوی الفاظ اور فقرے ملتے ہیں۔

حضرت گیسو دراز سے پہلے چشتی صوفیا نے کتابیں تو زیادہ تصنیف نہیں کیں لیکن انہوں نے مقامی زبانوں کی اہمیت اور اثر ونفوذ کو خوب سمجھ لیا تھا اور عوام کو ان ہی کے محاورے میں تصوف کے رموز وحقائق کی تعلیم دیتے تھے۔چشتی صوفیا نے اپنے خلفا کو دور دراز علاقوں میں بھیج کر رشد وہدایت کا فیضان عام کردیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری کے والد کا نام خواجہ غیاث الدین اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی ام الورع الموسوم بی بی ماہ نور وبی بی خاص الملکہ ہے۔آپ اصفہان میں پیدا ہوے اور پرورش اصفہان کے محلّہ سنجر میں ہوئی۔آپ کے والدین پیار میں آپ کو حسن کہہ کر پکارتے تھے۔بچپن میں بھی آپ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک نہیں ہوتے تھے۔نو سال کی عمر میں آپ نے قران شریف حفظ کیا۔بعد ازاں مکتب میں آپ نے تفسیر' حدیث' فقہ کی تعلیم پائی۔ابھی آپ کی عمر 15 سال بھی نہ ہوئی تھی کہ آپ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔والد کے ترکہ میں خواجہ غریب نواز کے حصہ میں ایک باغ اور ایک پن چکی آئی۔اسی کی آمدنی سے خواجہ غریب نواز اپنی گزر فرماتے تھے۔خواجہ غریب نواز کو شروع ہی سے فقیروں' صوفیوں اور درویشوں کی صحبت کا بہت شوق تھا۔آپ اولیاء اللہ کی صحبت سے بہت مسرور ہوتے تھے۔آپ ان کی بہت عزت وتعظیم کرتے۔اس زمانے میں سمرقند اور بخارا اسلامی علوم وفنون کے مرکز تھے۔آپ وہاں 1150ء تا 1155ء علوم ظاہری کی تکمیل میں مشغول رہے۔بغداد سے آپ 1156ء میں سفر حرمین شریف پر روانہ ہوئے۔پھر آپ ہارون پہنچے اور وہاں آپ نے خواجہ عثمانؒ سے بیعت

کی اور ڈھائی سال ان کی خدمت میں رہے۔خواجہ غریب نواز کی پہلی شادی بی بی اَمَۃ اللہ سے ہوئی۔آپ کے بطن سے خواجہ فخر الدین' خواجہ حسام الدین اور بی بی حافظ جمال پیدا ہوئیں۔دوسری شادی بی بی عصمت اللہ سے ہوئی۔آپ کے بطن سے شیخ ابوسعید پیدا ہوئے۔

حضرت خواجہ غریب نواز ریاضت' مجاہدہ' عبادت میں وقت گزارتے۔آپ تحمل و بردباری سے کام لیتے۔غریبوں اورمحتاجوں کی مدد فرماتے۔مظلوموں کو ظالم کے پھندے سے نکالتے۔زیردستوں کو زبردستوں کے چنگل سے رہائی دلاتے۔فارسی میں آپ کی تصانیف انیس الارواح' کشف الاسرار' گنج الاسرار ہیں۔آپ پرتھوی راج کے دورِحکومت میں ہندوستان تشرف لائے اور اجمیر شریف کو اپنا مسکن بنایا۔حضرت خواجہ غریب نواز نے بتایا کہ نماز دین کا رکن ہے اور رکن ستون ہوتا ہے۔آپ نے یہ بھی بتایا کہ اول راہ شریعت' دوم راہ طریقت' سوم راہ معرفت اور چہارم راہ حقیقت ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے اکابر خلفا میں خواجہ بختیار کاکی کی روحانی راجدھانی دہلی تھی اور حضرت حمیدالدین ناگوری نے (راجستھان) میں قیام کیا۔دیگر خلفا مثلاً شیخ وجیہہ الدین' خواجہ برہان الدین' شیخ صدرالدین نے مختلف مقامات پر جاکر عوامی اخلاق وسیرت کو سنوارا۔حضرت نصیرالدین نے دہلی میں رہ کر روحانیت کا چراغ روشن کیا۔جس کی روشنی اودھ' ہریانہ اور پنجاب تک پہنچی۔شیخ حسام الدین نے گجرات وسندھ میں اور خواجہ اخی سراج الدین نے بنگال بہار اور آسام میں روحانیت کا درس دیا۔حضرت نظام الدین نے اپنے دو مریدین خواجہ عزیزالدین اور شیخ زادہ کمال الدین کو دیوگیری اور مالوہ جانے کا حکم دیا۔برہان الدین غریب کو دکن اور مہاراشٹرا کے لیے منتخب کیا گیا۔حضرت خواجہ غریب نواز موت کو عزیز رکھتے تھے۔6 رجب 627ھ مطابق 21 مئی 1229ء دوشنبہ کو آپ کا وصال ہوا۔

8.4.2 شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج یا گنج شکر (664ھ۔569ھ مطابق 1265ء۔1173ء):

شیخ فریدالدین شکر گنج پنجاب میں ملتان کے قصبے کوٹھوال یا کتھی وال میں پیدا ہوئے۔دہلی جاکر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہوئے۔وہاں سے آکر پنجاب کے قصبے اجودھن میں بس گئے۔بعد میں اس قصبے کا نام پاک پٹن ہو گیا۔وہیں 664 ہجری مطابق 1265ء میں انتقال کیا۔ان کے اشعار واقوال مشہور ہیں۔ان کی زبان سے اردو کا ایک جملہ ''آنکھ آئی ہے'' استعمال ہوا ہے۔ان سے منسوب دو اشعار یہ ہیں:

وقت سحر وقت مناجات ہے   خیز در آں وقت کے برکات ہے

عشق کا رموز نیارا ہے   جز مدد پیر کے نہ چارا ہے

8.4.3 شیخ حمیدالدین ناگوری (673ھ۔590ھ مطابق 1274ء۔1193ء):

شیخ حمیدالدین ناگوری' حضرت شیخ معین الدین چشتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔آپ نے ناگور (اجمیر کے قریب) میں قیام کیا اور وہاں کی سرزمین کو اپنے روحانی جلوؤں سے معمور کیا۔آپ نے ساری زندگی تصوف کی ترویج کے لیے وقف کی۔اس سلسلہ میں آپ نے مشہور صوفی بزرگ حضرت بہاء الدین ذکریا جو سلسلۂ سہروردیہ کے بانیوں میں سے تھے اور ملتان میں قیام فرماتے تھے' خطوط کے ذریعے دہلی میں ملنے کا طے کیا اور دونوں حضرات دہلی میں ایک دوسرے سے ملے۔

شیخ حمیدالدین ناگوری نے حضرت بہاء الدین ذکریا سے مباحثہ کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ صوفی اور درویش کو دولت سے لگاؤ نہیں ہونا چاہیے۔شیخ ذکریا بہت دولت مند تھے لیکن شیخ حمیدالدین ناگوری نے دولت کو سانپ کی مانند بتایا۔حضرت دولت سے نفرت کرتے تھے۔سادہ

زندگی بسر کرتے تھے اور علم دوست تھے۔آپ کا قول تھا کہ شریعت اور طریقت کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا جسم اور روح کا۔شیخ حمیدالدین ناگوری کی زندگی فقر وافلاس میں گزری۔شیخ بہاء الدین باجن نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ حمیدالدین کے بیٹے فاقوں کی تاب نہ لاکران کے پاس گئے کہ کشائش رزق کے واسطے دعا کریں۔فاقوں کی نقاہت سے غش کھا کر گر پڑے۔شیخ حمیدالدین آنکھیں بند کیے یادِ حق میں مشغول تھے۔ان کے گرنے کی آواز سن کرانھیں دیکھا۔ان کا مافی الضمیر سمجھ گئے اور کہا'' ہاں بابا کچھ کچھ'' (یعنی مستقبل میں کچھ کچھ ملتا دکھائی دیتا ہے۔)

8.5 چودھویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.5.1 امیر خسرو (725ھ۔651ھ مطابق 1325ء۔1252ء)؛

امیر خسروؒ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔خسرو کا وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ تھا۔یہ مقام آگرہ کمشنری میں ہے۔بعد میں خسرو کی عمر کا زیادہ حصہ دلی میں گزرا۔خسرو اس وقت کی ہندی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ان کی فارسی تصانیف میں اردو کے کئی فقرے بلکہ جملے تک ملتے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے فارسی نظم ونثر میں متعدد اردو الفاظ استعمال کیے۔امیر خسرو نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت میں رہے۔وہ فارسی کے باکمال شاعر تھے۔موسیقی کے ایسے استاد تھے کہ ان کی ایجادات واختراعات آج تک علم موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

خسرو کے فارسی کلام میں کھڑی بولی کے الفاظ اور فقرے آگئے ہیں حالاں کہ خسرو اردو اور فارسی کو ملانا مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔خزائن الفتوح میں وہ ہندی فقرہ استعمال کرتے ہیں۔

'' واز دروں ہندواں مار مار فریادی کردند''

8.5.2 شیخ عین الدین گنج العلمؒ (795ھ 706ھ)؛

شیخ عین الدین گنج العلمؒ حکومت علاء الدین خلجی کے زمانے میں بمقام دہلی میں پیدا ہوئے۔آغاز شباب میں تحصیل علم کے لیے گجرات کا سفر کیا۔گجرات میں قیام کے بعد وہ دولت آباد گئے۔اس وقت محمد تغلق دولت آباد کو پایۂ تخت بنا چکے تھے۔وہاں شیخ عین الدین گنج العلمؒ نے دہلی سے آئے ہوئے ایک بزرگ سید خوند میر علاء الدین چشتی سے بیعت کی۔737ھ میں وہ عین آباد سا گر گئے اور 773ھ میں بیجا پور چلے گئے جہاں 27 جمادی الاول 795ھ (مطابق 1392ء) کو انتقال کیا۔شیخ عین الدین گنج العلمؒ نے دکنی میں چھوٹے چھوٹے 8 رسالے مسائل شرعیہ سے متعلق لکھے۔دکن میں اردو زبان کی یہ سب سے پہلی کتابیں ہیں لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں۔

8.5.3 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (782ھ۔662ھ مطابق 1380ء)؛

بہار کا قصبہ منیر آپ کا وطن ہے۔شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار سے حضرت نظام الدین اولیا سے بیعت ہونے کے ارادے سے روانہ ہوئے لیکن ان کے پہنچنے سے قبل حضرت نظام الدین اولیا کا انتقال ہو چکا تھا۔اس لیے وہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے بہت سے منتر اور نسخے لکھے ہیں۔جن میں سے بعض کو گنج مندرہ کہا گیا ہے۔ان کے گنج مندرے' دوہے' فالنامے اور ملفوظات مشہور ہیں۔شیخ نے ایک موقع پر کہا۔دیس بھلا پر دور۔ایک اور موقع پر کہا'' باٹ بھلی پر سانہ کر''۔فالنامے کے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔(1) جو من کا منسا سوئی ہووے۔(2) من جن ڈولاؤ' کرم لاگی ہے بات۔(3) ناہیں ابھی ناہیں۔(4) ناہیں ہے گا اور

کام کروہ۔(5)ابھی ناہیں ستاؤ جن اکتاؤ۔(6)دور مت جاؤ کام ہوستاؤ۔(7)اب لک دن برے گئے اب سکھ ہوئے۔(8)ابھی ناہیں ہوئے گا۔(9)تورے دن کے اب سکھ سوجتا ناہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ حضرت امیر خسرو، شیخ عین الدین گنج العلم اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

8.6 پندرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.6.1 خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو درازؒ (825ھ۔720ھ یا 721ھ مطابق 1422ء۔1321ء):

بندہ نواز گیسو دراز کی ولادت دہلی میں ہوئی۔آپ کا اسم گرامی سید محمد اور کنیت ابوالفتح تھی۔ اور القاب صدرالدین اور صادق۔ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی بارگاہ سے جو خواجہ بندہ نواز کے شیخ تھے'' گیسو دراز'' لقب عطا ہوا تھا۔خواجہ بندہ نواز سادات حسینی سے تھے۔ان کے جد اعلیٰ ابوالحسن جنیدی ہرات سے دہلی چلے آئے تھے۔حضرت خواجہ بندہ نواز کے والد سید یوسف حسینی تھے جو شاہ راجو قتال کے نام سے مشہور تھے۔جب آٹھویں صدی ہجری کے آغاز میں سلطان محمد تغلق نے دیوگیری کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے دولت آباد کے نام سے آباد کیا تو دہلی کے علما، عمائدین اور مشائخین کو بھی وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا۔شاہ راجو اسی جماعت کے ہمراہ 17 محرم 719ھ کو دولت آباد تشریف لے گئے۔ اس وقت خواجہ بندہ نواز کی عمر چار سال تھی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ دکن پہنچے تھے۔دولت آباد کے قیام کے زمانے میں سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز نے اپنے والد اور ان کی وفات کے بعد نانا سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ابتدائی تعلیم خلد آباد میں ہوئی اور شیخ بابو نامی ایک بزرگ نے انہیں اپنے مکتب میں پڑھایا تھا اور حدیث و فقہ کے ابتدائی درس دیے تھے۔خواجہ بندہ نواز نے چھ سال کی عمر سے کبھی نماز قضا نہیں کی اور روزے کے پابند ہوگئے تھے۔سات برس کی عمر میں قران مجید حفظ کر لیا اور سولہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کر لی۔طلب صادق، ریاضت، فطری مناسبت اور نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی خاص توجہ کے باعث بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کیں۔ شیخ چراغ دہلوی کی اجازت سے آپ علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ چراغ دہلوی نے انھیں خلافت سے سرفراز کیا۔ بندہ نواز نے بندگان خدا کی رہنمائی و ہدایت میں چوالیس برس گزار دیے اور تشنگان علم و معرفت کی پیاس بجھائی۔ وہ چاشت کے بعد یا نماز ظہر ادا کرنے کے بعد تفسیر، حدیث اور سلوک کے موضوع پر درس دیا کرتے تھے۔

سید محمد حسینی بندہ نواز کی عمر جب چالیس سال سے تجاوز کر گئی تو والدہ کے اصرار پر آپ نے بی بی رضا خاتون سے نکاح کیا۔ان کے بطن سے دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔آپ کے فرزند سید حسین عرف سید محمد اکبر حسینی عالم بہتر اور برگزیدہ سالک تھے، دوسرے صاحبزادے سید یوسف عرف سید محمد اصغر حسینی بھی عالم و فاضل اور اپنے والد کے خلیفہ تھے۔ وصیت کے مطابق والد کے انتقال کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے۔

سید محمد حسینی اجمیر، ناگور، احمد آباد، کاٹھیواڑ، گرناتھ پہاڑ، ٹھٹھہ، حیدر آباد، سندھ، بلوچستان، افغانستان، لاہور، پاک پٹن، ملتان، کشمیر، ہردوار اور لکھنو سے ہوتے ہوئے بالآخر دولت آباد پہنچے تھے۔اس وقت ان کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ سید محمد حسینی نے دولت آباد پہنچ کر اپنے والد شاہ راجو قتالؒ کے مزار کی زیارت کی۔ جب وہ گلبرگہ تشریف لائے تو ان کی عمر نوے سال سے زیادہ تھی۔گلبرگہ کی جامع مسجد کے

قریب اپنے کئی مریدوں کے ساتھ ایک خانقاہ میں فروکش ہوئے اور رشد و ہدایت تعلیم وتلقین میں مصروف رہے۔ وہ ایک عالم متبحر ہی نہیں' ایک خدا رسیدہ بزرگ اور صاحب کشف وکرامات صوفی تھے۔ وہ اپنے مخاطب کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق اس کو مناسب ہدایت دیا کرتے تھے ۔وہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بندگان خدا کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے ۔ سرکاری عہد یدار' بادشاہ اور امرا وغیرہ اگر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو انہیں عدل وانصاف کی ہدایت فرماتے اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر زور دیتے تھے۔ بندہ نواز گیسو درازؒ سماع کو پسند کرتے ۔ وہ کلام اللہ کی بہت تلاوت کرتے ۔انہوں نے سہیلا میں بھی طبع آزمائی کی جو محفل سماع میں گائے جاتے تھے۔ بندہ نواز اس تصور کے حامل تھے کہ سماع سے گداز قلب' رقت اور سپردگی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ان کے چکی نامے اور غزل بھی متعارف کیے گئے ہیں۔خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔

8.6.2 میراں جی شمس العشاقؒ (994ھ۔902ھ یا904ھ)؛

حضرت میراں جی شمس العشاقؒ کا نام امیرالدین' عرفیت میرا جی اور لقب شمس العشاق ہے۔آپ کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تھا۔ میراں جی مکہ شریف میں پیدا ہوئے' بائیس سال کی عمر میں مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ گئے اور وہاں بارہ سال تین ماہ اور پانچ روز قیام کیا۔ پھر ہندوستان آئے اور دکن کا رخ کیا۔حضرت شاہ کمال الدین بیابانی کے دست پر بیعت کی اور منازل سلوک طے کرنے کے بعد حضرت شاہ کمال الدین بیابانی نے آپ کو خلافت سے سرفراز کیا۔ دو واسطوں سے آپ کا سلسلۂ خلافت حضرت گیسو درازؒ سے ملتا ہے۔اپنے پیرومرشد کے حکم سے بھنگار (احمد نگر) جاکر شادی کی ۔آپ کے فرزند برہان الدین جانمؒ اور پوتے امین الدین علی اعلیٰ تھے۔

میراں جی شمس العشاقؒ اپنے پیرومرشد کے کہنے کے مطابق بیجا پور چلے گئے اور تاحیات مخلوق خدا کو اپنے علم وفضل سے بہرہ ور کرتے رہے۔آپ کا مزار بیجا پور ہی میں ہے۔میراں جی ولی کامل اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔آپ نے ساری زندگی عبادت' ریاضت' رشدوہدایت' درس وتدریس میں گزاردی۔آپ عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے۔

میراں جی شمس العشاقؒ سے کسی اردو نثری رسالے کا انتساب ثابت نہیں ہوتا۔ان سے منسوب جتنے بھی نثری رسالے ہیں' ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ یہ میراں جی شمس العشاق ہی کی تصنیف ہے۔ان کی تصانیف میں چھ مثنویاں شامل ہیں:(1) شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت (2) خوش نامہ (3) خوش نغر (4) شہادت نامہ (5) مغز مرغوب (6) وصیت النور۔

مثنوی وصیت النور کو ڈاکٹر صبیحہ نسرین نے نیشنل میوزیم کراچی پاکستان میں موجود ایک ضخیم بیاض سے یکم اکتوبر 1987ء کو دریافت کیا اور 1988ء میں ''وصیت النور' کے نام سے شائع کیا۔خوش نامہ میں ایک نوجوان اور نیک طینت لڑکی خوش یا خوشنودی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ عشق الٰہی سے سرشار ہے۔ وہ میراں جی کی مرید تھی۔خوش نامہ کا وہ حصہ جہاں خوشی کے وقت آخر اور اس کے انتقال کا حال نظم کیا گیا ہے' بہت زیادہ پر اثر ہے۔ یہاں میراں جی کا لب ولہجہ' جذباتی ہوگیا ہے۔اور ان کا طرز ادا سوز وگداز میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔میراں جی کی یہ نظم بہت سادہ ہے۔مثنوی شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت میں اخلاق وتصوف کے رموز وحقائق کا تذکرہ ہے۔اس مثنوی کی بحر چھوٹی لیکن رواں ہے۔

یہ سب عالم تیرا رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوئے نہ خالق دوجا ہوئے

نا دیکھت بورا لیکھو　　　لے　مغز　چاک　دیکھو
جے　مغز　میٹھا　لاگے　　　تو کیوں من اس تھے بھاگے
وہ　مغز　معنی　لیو　　　سب　چھال　جھاڑ　دیو

شہادت الحقیقت مکالمے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔اس میں سوال و جواب کے طرز میں تصوف کی عام باتیں بیان کی گئی ہیں۔مثنوی خوش نغز میں بھی میراں جی نے متصوفانہ خیالات پیش کیے ہیں۔اس میں بھی خوشی یا خوشنودی کا کردار ابھرتا ہے۔وہ اپنے پیر طریقت میراں جی سے مختلف سوالات کرتی جاتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے جاتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔　خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز کے سوانحی حالات پر ایک مضمون لکھیے۔

2۔　میراں جی شمس العشاق کی حیات اور شاعری پر روشنی ڈالیے۔

8.7　سولھویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.7.1　شیخ بہاء الدین باجن (912ھ ۔790ھ):

شیخ بہاء الدین باجن کے والد حاجی معزالدین دہلی سے آکر احمد آباد میں بس گئے جہاں 790ھ میں بہاء الدین کی ولادت ہوئی۔ ابھی باجن چار سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔باجن حضرت شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔شیخ رحمت اللہ حضرت نظام الدین اولیا کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔باجن حج کے لیے جانے کے بعد ان کے مرشد کا انتقال ہوگیا۔شیخ رحمت اللہ ہدایت کر گئے کہ باجن کی واپسی کے بعد انھیں خرقۂ ولایت اور تبرکات دے دیے جائیں۔سیاحت کرتے کرتے باجن برہان پور پہنچے اور وہیں مقیم ہوگئے۔ان کی عمر کے آخری چالیس یا اس سے زیادہ سال برہان پور میں گزرے۔912ھ میں انتقال کیا اور برہان پور میں مدفون ہوئے۔ان کے خلیفہ شیخ علی متقی ہیں۔ان کی دو تصانیف ملتی ہیں'(1) جنگ نامہ پشواز وساری: اردو کا یہ جنگ نامہ 219 شعروں کی مثنوی ہے۔(2) خزائن رحمت اللہ (فارسی): یہ کتاب فارسی نثر میں ہے لیکن باجن نے جا بجا اپنا اردو کلام بھی دیا ہے۔نو سو صفحات کی اس کتاب میں اہل طریقت کے افعال و حالات بیان کیے گئے ہیں۔باجن نے اپنے پورے کلام کو جکری قرار دیا ہے۔سلسلہ چشتیہ میں غنا اور سماع بہت مقبول رہا ہے۔جکری کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔جکری (ذکری کی گجری شکل) میں بنیادی طور پر ذکر خدا' ذکر رسول' ذکر پیر و مرشد' ذکر تجربات باطنی و واردات روحانی کو عام فہم انداز میں لکھا جاتا تھا کہ اسے گایا بھی جا سکے اور سازوں پر بجایا بھی جا سکے۔جکری کی حیثیت مختصر گیت یا راگ راگنیوں کے ان بولوں کی تھی جنھیں گا بجا کر لوگوں کے اندر عالم وجد و سرور پیدا کیا جا سکے۔اس میں عشق و محبت کے جذبات بھی ہوتے تھے اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہو سکے۔

8.7.2　شاہ علی محمد جیو گام دھنیؒ (973ھ ۔895 یا 896ھ):

آپ کی پیدائش احمد آباد میں ہوئی۔گاؤں دھنی آپ کا لقب تھا۔یعنی گاؤں کا مالک۔اسی کو قدیم تلفظ سے گام دھنی کہا گیا۔آپ کی پیدائش 895 یا 896ھ اور وفات 14 جمادی الاول 973ھ مطابق 1565ء کو ہوئی۔آپ کا مزار احمد آباد میں اندرون حصار دروازہ رائے

کھڑ میں ہے۔آپ کے دیوان کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' ہے۔شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا کلام وحدت الوجود (ہمہ اوست) کا ترجمان ہے۔سارا کلام واردات قلبی، عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے۔شعر کا ترنم اور عشق کا والہانہ پن ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

8.7.3 برہان الدین جانمؒ؛

برہان الدین جانمؒ حضرت میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اکبر اور خلیفہ تھے۔ میراں جی شمس العشاقؒ کے مرشد کمال الدین بیابانی نے پیشن گوئی کی تھی کہ انھیں ایک خدا پرست لڑکا تولد ہوگا جو قطب الاقطاب زمانہ ہوگا۔بعدازاں میراں جی شمس العشاقؒ کے ہاں لڑکا تولد ہوا جس کا نام برہان الدین جانم رکھا گیا۔برہان الدین جانم نے بڑے ہوکر علم ظاہری میں کمال حاصل کیا۔اس کے بعد علم باطنی کے حصول کا شوق ہوا۔انہوں نے اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے ہاتھ پر بیعت کی ۔اپنے والد سے تعلیم و تربیت پا کر جانم ایک جید عالم اور صوفی بن گئے۔حصول علم ودانش کے مقصد سے جانم نے ماں باپ کے گھر کو خیر باد کہا اور سفر پر روانہ ہوگئے ۔یہ مدت سفر تین سال تھی۔ جانم کا مزار بیجاپور میں ہے۔ان کی رفیقۂ حیات بی بی میمونہ عرف چاند صاحب بی کا مزار بھی پاس میں موجود ہے۔

جانم اپنے والد کی طرح رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔وہ اردو زبان میں تلقین کیا کرتے اور معرفت وسلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان میں اپنے معتقدین اور مریدوں کے ذہن نشین کروانا چاہتے تھے۔برہان الدین جانم چشتیہ سلسلے کے بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے خواص وعوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔جانم کثیر التصانیف صوفی تھے۔ان کی شعری و نثری تخلیقات حسب ذیل ہیں:

شعری تصانیف؛

1۔ ارشادنامہ 2۔ وصیت الہادی 3۔ سکھ سہیلا 4۔ منفعت الایمان 5۔ نسیم الکلام
6۔ محبت البقا 7۔ نکتہ واحد 8۔ بشارت الذکر 9۔ رموز الواصلے 10۔ توحید حقیقت
11۔ عبرت آدم 12۔ ''کفرنامہ'' اور'' مسافرت خاں میاں وبیان خلاصہ(یہ دومثنویاں ہیں)
13۔ جانم نے اپنے والد کی وفات پر ایک پر درد مرثیہ لکھا جو طویل بھی ہے۔

نثری تصانیف: 1۔ معرفت القلوب 2۔ کلمۃ الحقائق 3۔ مجموعہ الاشیا

8.8 سترہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.8.1 خوب محمد چشتی (وفات 1023ھ مطابق 1614ء)؛

خوب محمد چشتی کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ان کا مزار چوک احمد آباد میں خان دروازے اور فرحت الملک کی مسجد کے پاس ہے۔ وہ شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ان کی مثنوی خوب ترنگ 986ھ میں لکھی گئی ۔مرشد سے دن رات کچھ باتیں سن کر خوب محمد کو ترنگ آئی اس لیے مثنوی کا نام خوب ترنگ رکھا۔

مثنوی خوب ترنگ کا موضوع معرفت واخلاق ہے۔انہوں نے مسائل تصوف نظم کیے ہیں۔بیشتر مسائل کو حکایتوں کے تمثیلی پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔خوب ترنگ میں اپنے سے بیشتر کے مصنفوں کی نسبت عربی فارسی الفاظ استعمال کرنے کا رجحان زیادہ ہے لیکن بعض اوقات

یہ عربی فارسی الفاظ کو دکنی طریقے سے مسخ کر لیتے ہیں جیسے مصرے (مصرع) درس (درست)' دریے (دریا۔ندی)' کاگل (کاغذ) وغیرہ۔خوب محمد چشتی کی دوسری تصنیف ''بھاؤ بھید'' ہے۔یہ رسالہ صنائع بدائع کے بارے میں ہے۔ہر صنعت کی تشریح فارسی میں کی ہے لیکن اس کا مفہوم گجراتی اردو میں بھی ادا کیا ہے۔مثالیں گجراتی اردو میں ہیں۔ظاہر ہے کہ صنائع کی تفہیم کے لیے وضاحت اور تفصیل درکار تھی۔خوب محمد چشتی کی تیسری تصنیف ''چھند چھنداں'' ہے۔یہ منظوم رسالہ ہندوی و فارسی عروض سے متعلق ہے۔

8.8.2 میراں جی خدا نما (1074ھ۔1004ھ مطابق 1662ء)؛

میراں جی خدا نما' حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے سلسلۂ فیض کے شاعر و ادیب ہیں۔آپ سید تھے۔اپنے کلام میں انہوں نے میراں اور سید میراں تخلص استعمال کیا ہے۔آپ کے والد کا نام شاہ قاسم محمود تھا۔حضرات میراں جی خدا نما نے اپنے آپ کو رشد و ہدایت کے لیے وقف کر دیا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔چوں کہ آپ بندگان خدا کو حق پرستی اور معرفت خداوندی کا درس دیا کرتے' اس لیے انھیں ''خدا نما'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

سلسلۂ بندہ نوازؒ کے مشائخین کی طرح میراں جی خدا نما بھی تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور اپنی نگارشات سے خلق اللہ کی دینی اور علمی خدمت انجام دی۔انہوں نے کئی اردو رسالے اور نظمیں لکھیں۔رسالہ وجودیہ (موضوع: تصوف کے مسائل) شرح تمہیدات عین القضات اور شرح مرغوب القلوب اردو نثر میں ہیں۔میراں جی خدا نما نے بشارت الانوار کے علاوہ دو مثنویاں اور غزلیں بھی کہی تھیں۔شرح تمہیدات عین القضات' قاضی عین القضات ہمدانی کی تصنیف ہے۔تصوف سے متعلق اس فارسی تصنیف کی شرح حضرت خواجہ بندہ نواز نے فارسی ہی میں لکھی تھی۔میراں جی خدا نما نے اسی کو دکنی نثر میں منتقل کیا۔رسالہ وجودیہ میراں جی خدا نما کی نثری یادگار ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔''مرغوب القلوب' فارسی نظم ہے جو شمس تبریز سے منسوب کی جاتی ہے۔میراں جی خدا نما نے دکنی نثر میں اس کی شرح لکھی ہے جس کا نام ''شرح مرغوب القلوب'' ہے۔

میراں جی خدا نما کے رسالے' اردو کی ارتقائی منزل اور اس کے تشکیلی دور کی اچھی نمائندگی کرتے ہیں۔خدا نما کی نثر میں قواعد کا یہ رجحان نظر آتا ہے کہ اکثر جملوں میں فعل' فاعل اور مفعول اپنے مناسب مقام پر دکھائی دیتے ہیں لیکن عبارتوں میں ہر جگہ اس کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عبارتوں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں اور درمیان میں خلا کا بہت کم احساس ہوتا ہے۔اس سے بھی نثر کی ترقی اور نشو و نما میں میراں جی خدا نما کی تحریروں کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

8.8.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰؒ (پیدائش 22 رمضان 1007ھ' وفات 1085ھ)؛

امین الدین علی اعلیٰؒ دکن کے مشہور صوفی برہان الدین جانم کے فرزند اور میراں جی شمس العشاقؒ کے پوتے تھے۔ان کی تعلیمات کا فیض جنوبی ہند میں سالہا سال تک جاری رہا۔اس سرچشمہ سے کئی سالکان طریقت کے ذوق عرفان و آگہی کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔انہوں نے امین اور امین الدین تخلص اختیار کیا تھا۔ان کی والدہ کا نام بی بی میمونہ عرف چاند صاحب بی تھا۔برہان الدین جانم کا انتقال امین الدین اعلیٰ کی ولادت سے قبل ہو چکا تھا۔اس لیے وہ اپنے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم رہے اور علم ظاہری کا اکتساب سید علی گنج گوہر' محمود خوش دہاں سے کیا۔محمود خوش دہاں نے امین اعلیٰ کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ کی تھی اور انہیں چشتیہ کے علاوہ قادریہ سلسلے میں بھی بیعت عطا کی تھی۔امین الدین

علی اعلیٰ کامل اور ولیِ صادق تھے۔ان کی رفیقہ حیات کا نام خونزہ رانی (خونجا رانی) اورفرزند کا نام بابا شاہ حسینی تھا۔امین الدین علی اعلیٰ کے معتقدین کی تعداد ایک لاکھ تھی۔امین الدین علی اعلیٰ کی شعری تخلیقات ملاحظہ ہوں:

1۔ جواہرالاسرار 2۔ رموزالسالکین 3۔ رسالہ قربیہ 4۔ ناریزہ 5۔ وجودیہ

6۔ محبّ نامہ 7۔ مدح شاہ برہان الدین جانم 8۔ امین الدین علی اعلیٰ کی غزلیں بھی دستیاب ہیں۔

نثری تخلیقات: 1۔ گنج مخفی 2۔ وجودیہ 3۔ رسالہ گفتارشاہ امین 4۔ کلمتہ الاسرار 5۔ عشق نامہ

8.9 اکتسابی نتائج

☆ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب' تصفیۂ اخلاق اورتعمیر ظاہرو باطن ہے۔غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارا جائے تا کہ سعادت ابدی حاصل ہو سکے۔تصوف میں شریعت کی پابندی شامل ہے۔شریعت اپنے اندر طریقت کو بھی سموے ہوئے ہے۔

☆ تصوف کوطریقت ومعرفت بھی کہا جاتا ہے۔یہ علم باطن ہےاور باطن کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔اس کی بنیاد قلب پر ہے۔تصوف کے لیے محبت ضروری ہے۔تصوف نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر ہر پیکر سے خلوص ومحبت کی تعلیم دی۔صوفی لفظ صوف سے منسوب ہے۔لباس صوف (موٹا اون) پہننے والے کوصوفی کہا گیا۔

☆ ہندوستان میں تصوف کے ابتدائی نظریات کا پتہ گیارہویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔پہلے صوفی سیف الدین ملتان کے راستے ہندوستان آئے۔تصوف کی ترویج میں سب سے زیادہ حصہ سلسلۂ چشتیہ کا ہے۔

☆ اردوزبان وادب کی تخلیق ونشو ونما صوفیا کی مرہون منت ہے۔اردوزبان کی ترویج واشاعت میں ان کی خدمات مسلمہ ہیں۔ان کے تربیتی فقرے اردو کے نقوش اولین اورابتدائی نمونے ہیں۔یہ فقرے اردوزبان کے ارتقا میں معاون ثابت ہوئے۔

☆ حضرت معین الدین چشتی نے اس زمانے کے اسلامی علوم وفنون کے مراکز سمرقند اور بخارا میں علوم ظاہری کی تکمیل کی اجمیر میں غریبوں محتاجوں' مظلوموں کی مدد کرتے اورشریعت وطریقت' معرفت اورحقیقت کی راہیں بھی بتائیں۔

☆ شیخ حمیدالدین ناگوری حضرت غریب نواز کے مرید اور خلیفہ تھے۔آپ نے ناگور کی سرزمین کو اپنے روحانی جلوؤں سے معمور کیا اور ساری زندگی تصوف کی ترویج میں گزاردی۔آپ دولت سے نفرت کرتے تھے اس لیے انہوں نے اپنی زندگی کوفقروافلاس میں گزاردینا پسند فرمایا۔

☆ حضرت امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔آپ کا وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ تھا۔آپ نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں گزارا۔ان کی فارسی تصانیف میں اردو کے کئی فقرے ملتے ہیں۔وہ موسیقی کے استاد بھی تھے۔ان کی ایجادات علم موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

☆ خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز دہلی میں پیدا ہوئے۔اپنے والدین کے ساتھ چارسال کی عمر میں دکن پہنچے۔وہ حافظ قران تھے۔انہوں نے چھ سال کی عمر سے کبھی نماز قضا نہیں کی۔آپ کے پیرو مرشد نصیرالدین محمود چراغ دہلوی تھے جن کی خاص توجہ سے انہوں نے بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کیں۔

☆ شیخ بہاء الدین باجن شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔آپ کے دیوان کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' ہے۔سارا کلام واردات قلبی، عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے۔

☆ برہان الدین جانم حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔جانم کا مزار بیجاپور میں ہے۔جانم کثیر التصانیف صوفی تھے۔ شعری تصانیف میں ارشاد نامہ، منفعت الایمان، نسیم الکلام، حجت البقا، نکتۂ واحد، بشارت الذکر، رموز الواصلین، کفر نامہ، مسافرت خاں میاں و بیان خلاصہ، توحید حقیقت، عبرت آدم اور ایک مرثیہ شامل ہے جو انہوں نے اپنے والد کی وفات پر لکھا تھا۔نثری تصانیف میں معرفت القلوب، کلمتہ الحقائق، مجموعہ الاشیا شامل ہیں۔

☆ خوب محمد چشتی کا وطن احمد آباد ہے۔وہ شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ان کی مثنوی خوب ترنگ 986ھ میں لکھی گئی۔ دوسری تصنیف ''بھاؤ بھید'' ہے جو صنائع بدائع کے بارے میں ہے۔تیسری تصنیف ''چھند چھنداں'' (منظوم رسالہ) ہندوی و فارسی عروض سے متعلق ہے۔

☆ شاہ امین الدین علی اعلیٰ دکن کے مشہور صوفی برہان الدین جانم کے فرزند اور میراں جی شمس العشاق کے پوتے تھے۔ان کی تعلیمات کا فیض جنوبی ہند میں سالہا سال تک جاری رہا۔ان کی شعری تخلیقات میں جواہر الاسرار، مثنوی رموز السالکین، رسالہ قربیہ، مثنوی ناریزہ، وجودیہ، محبّ نامہ اور مدح شاہ برہان الدین جانم شامل ہیں۔نثری تخلیقات میں گنج مخفی، وجودیہ رسالہ گفتار شاہ امین، کلمتہ الاسرار اور عشق نامہ شامل ہیں۔

8.10 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
غایت	مقصد	دوئی	دو
سالک	راہ سلوک (تصوف میں قدم رکھنے والا)	مظہر	اظہار
صوف	موٹا اون	خشیت الٰہی	اللہ کا خوف
صفا	صفائی	کدر	گندگی
شیوہ	طریقہ	درگزر	معاف کرنا
تزکیۂ نفس	دماغ کی صفائی	تصفیۂ قلب	قلب کی صفائی
محاسبہ	حساب کتاب	ہمسفر	ساتھی
بلاتخصیص	بغیر کسی امتیاز و تفریق	باطن	اندرون
پروانہ وار	جوق در جوق	گرد	اطراف
ثمرہ	پھل، نتیجہ	مفقود	نہ پایا جانا
آشنا کرنا	بتانا	امتزاج	دو چیزوں کا ملنا

ادبی تخلیق	ادبی فن پارہ، کتاب	مسرور	خوش
تحمل	برداشت	یادحق	یاداللہ
قول	کہاوت، کہاہوا	نقاہت	کمزوری
تاب نہ لانا	برداشت نہ کرنا	مستحسن	عمدہ، اچھا
ناقص	جس میں نقص ہو، کمی	منسوب	جن کے نام کی گئی شئے

8.11 نمونۂ امتحانی سوالات

8.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ بندہ نواز گیسودراز کی پیدائش کہاں ہوئی؟

2۔ بندہ نواز گیسودراز کا اصل نام کیا تھا؟

3۔ میراں جی شمس العشاق کا اصل نام کیا تھا؟

4۔ ''شہادت التحقیق'' کس کی تصنیف ہے؟

5۔ ''رموز السالکین'' کا تعلق کس صنف ادب سے ہے؟

8.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ تصوف کی تعریف، تشریح اور صوفیا کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ میراں جی خدانما پر نوٹ لکھیے۔

4۔ برہان الدین جانم کی صوفیانہ خدمات کا جائزہ لیجیے۔

8.11.3 طویل جوابات کے حامل سولات؛

1۔ حضرت معین الدین چشتی سنجری اجمیری کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

2۔ حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز کے سوانحی حالات اور معمولات پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ میراں جی شمس العشاق کی سوانح اور ادبی کارناموں کو اجاگر کیجیے۔

8.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ	مولوی عبدالحق
2۔	تاریخ ادب اردو (پانچ جلدیں)	پروفیسر سیدہ جعفرو پروفیسر گیان چند جین (1700ء تک)
3۔	تاریخ ادب اردو (حصہ اول و دوم)	ڈاکٹر جمیل جالبی

بلاک IV: دکنی ادب کا آغاز وارتقا

اکائی 9: بہمنی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید
9.1 مقاصد
9.2 بہمنی دور میں اردو ادب
9.2.1 حضرت خواجہ بندہ نوازؒ
9.2.2 فخر دین نظامی
9.2.3 میراں جی شمس العشاق
9.2.4 سید شاہ اشرف بیابانی
9.2.5 قطب الدین قادری فیروز
9.2.6 سید عبداللہ حسینی
9.2.7 مشتاق
9.2.8 لطفی
9.3 اکتسابی نتائج
9.4 کلیدی الفاظ
9.5 نمونہ امتحانی سوالات
9.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.0 تمہید

اس اکائی میں بہمنی دور میں اردو ادب کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس عہد کے اہم شاعروں کے کلام کا مختصراً جائزہ لیا گیا

ہے اور ساتھ ہی بہمنی دور میں صوفیائے کرام کی تعلیمات وارشادات اور تصنیف و تالیف کے حوالے سے اردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ بہمنی دور کے اہم شاعروں اور مصنفین کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کرسکیں۔
- ☆ بہمنی دور کے شاعروں کا مختصر تعارف پیش کرسکیں۔
- ☆ بہمنی دور میں اردو زبان وادب کے فروغ میں صوفیائے کرام کی خدمات سے متعلق معلومات پر گفتگو کرسکیں۔

9.2 بہمنی دور میں اردو ادب

دکن میں اردو زبان کی نشوونما کے سلسلے میں کچھ سیاسی واقعات اور لسانی اختلاط نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ علا الدین خلجی نے 1310ء تک دکن کو فتح کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ 1327ء میں محمد شاہ تغلق نے اپنی سلطنت کے پائے تخت کو دولت آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ محمد شاہ تغلق کا یہ فیصلہ سیاسی لحاظ سے جو بھی حیثیت رکھتا ہو، اردو زبان کی نشوونما کے لیے کارآمد ثابت ہوا۔ اس کے حکم پر جب دہلی سے آبادی کا بہت بڑا حصہ دولت آباد منتقل ہوا وہ اپنے ساتھ اردو زبان لے کر آیا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جب بادشاہ نے دہلی واپس جانے کا ارادہ کیا تو سبھی لوگ واپس نہیں گئے، جو یہاں بس گئے وہ اردو زبان بولتے رہے۔ آہستہ آہستہ اس پر مقامی زبانوں کا بھی اثر ہونے لگا۔ اس تمام عرصے میں اردو زبان کا خمیر پورے طور پر تیار ہو چکا تھا اور اس میں اتنی توانائی اور سکت پیدا ہوگئی تھی کہ اسے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا جاسکے۔ محمد تغلق کے آخری دورِ حکومت میں ''امیران صدہ'' نے متحد ہوکر بغاوت کردی۔ 1347ء میں دکن میں تغلق کی بادشاہت ختم ہوگئی اور علا الدین حسن بہمنی نے اپنی خودمختاری کا اعلان کرتے ہوئے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

علاالدین حسن نے اپنی فتوحات سے سلطنت کو بہت وسعت دی تاکہ یہ قدرتی حدود تک پہنچ جائے۔ یہ علا الدین کی سیاسی دوراندیشی تھی اور بغیر اس کے سلطنت مستحکم نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے انتقال کے وقت بہمنی سلطنت کے حدود شمال میں مانڈو سے شروع ہوکر جنوب میں دریائے تنگ بھدرا تک اور مشرق میں بھونگر اور مغرب میں گودا تک پھیلے ہوئے تھے۔

علا الدین حسن ایک علم دوست حکمران تھا۔ اس کے دربار میں مولانا لطف اللہ، ملا اسحاق سرہندی، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیرالدین شیرازی، صدرالشریف سمرقندی اور رضی الدین جگاجوت جیسے نامی علماء جمع تھے۔ مولانا عصامی بھی بہمنی دربار کے علماء میں شامل تھے۔ مولانا عصامی دکن آئے تو علا الدین نے ان کی بڑی قدر کی۔ اس سرپرستی کے باعث مولانا نے ایک مبسوط تاریخ مثنوی کی ہیئت میں لکھی جو فتوح السلاطین کے نام سے موسوم کی گئی۔ یہ تاریخ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے شروع ہوکر علا الدین بہمنی شاہ پر ختم ہوتی ہے۔ بہمنی شاہ کا انتقال 1358ء میں ہوا۔

علا الدین حسن کا جانشین اس کا فرزند محمد شاہ ہوا، اس کا وزیر سیف الدین غوری تھا جو بادشاہ کا خسر بھی تھا۔ ان دونوں نے مل کر

سلطنت کے نظم ونسق کو بہت کچھ سنوارا اور انتظام ملک کے لیے کتاب ''نصائح الملوک'' لکھی۔

محمد شاہ کو سلطنت کے رعب وداب کا بہت خیال تھا، بڑے اہتمام سے دربار کو آراستہ کیا جاتا تھا۔ تخت فیروزہ اسی کے عہد میں تیار ہوا۔ بہمنی سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور تمام علاقے کو چوروں اور قزاقوں سے پاک کر دیا گیا۔ ملک میں امن و امان قائم تھا۔ اخلاقی اصلاح کے لیے شراب بند کر دی گئی تھی۔

محمد شاہ کے بعد اس کا فرزند مجاہد شاہ تخت نشین ہوا مگر اس کے چچا داود خاں نے اس کو قتل کرا دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا مگر چند ماہ کے بعد مارا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ ثانی حکمراں ہوا جو بانیٔ سلطنت حسن خاں کا پوتا تھا۔ مورخین نے اس کے عدل وانصاف کی بڑی تعریف کی ہے' محمد شاہ صاحب علم اور علم دوست بادشاہ تھا۔ علامہ فضل اللہ انجو جیسے صاحب علم جو دنیائے اسلام کے مشہور علامہ سعد اللہ بن تفتازانی کے شاگرد رشید تھے، گلبرگہ آئے بادشاہ نے ان کی بڑی قدر کی۔ محمد شاہ کے زمانہ میں کئی علماء ایران وعراق سے گلبرگہ تشریف لائے۔ حافظ شیرازی کو بھی اسی زمانے میں مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ نہ آسکے، بادشاہ کے عطیہ کے شکریہ میں ایک غزل ارسال کر دی۔

محمد شاہ کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر، دولت آباد، ایلچ پور وغیرہ میں مدرسے قائم ہوئے۔ جہاں قابل اساتذہ طلبا کو درس دیا کرتے، طلبا کو وظائف دیئے جاتے تھے۔

بہمنی سلطنت کا دوسرا علم دوست صاحب علم بادشاہ فیروز ہے جو 1397ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دور حکومت بہمنی سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانہ میں ایک طرف سیاسی تدبیر اور انتظام نظم ونسق کے لحاظ سے ترقی ہوئی اور دوسری طرف تہذیب وتمدن میں نکھار آتا چلا گیا۔ فیروز شاہ' علامہ فضل اللہ کا شاگرد تھا۔ اس نے ایک طرف علوم اسلامی' تفسیر' حدیث' فقہ' اُصول فقہ وغیرہ علوم میں کافی مہارت پیدا کی تھی تو دوسری طرف ریاضی' ہندسہ' ہیئت' فلسفہ وغیرہ علوم میں میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ خصوصاً ریاضی سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔

فیروز شاہ شاعر بھی تھا اور ادیب بھی، اس کا تخلص فیرؔوز اور عروجی تھا۔ اس کے علمی ذوق اور شوق کے باعث دربار شاہی میں علماء اور اصحابِ علم کا جمگھٹا ہوتا تھا اور جب بادشاہ سلطنت کے کاموں سے فارغ ہوتا تھا تو خود ہی علماء کی محفل میں شریک ہو جاتا تھا۔ بادشاہ کے ریاضی کے شوق کے باعث بالاگھاٹ پر رصدگاہ قائم ہونے والی تھی مگر حکیم حسن گیلانی کی بے وقت موت کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

فیروز شاہ ہفتہ میں تین دن خود طلباء کو درس دیا کرتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طلباء اس درس میں شریک ہوتے تھے۔ فیروز شاہ دنیا کی کئی زبانوں سے واقف تھا۔ اس نے دریائے بھیما کے کنارے ایک شہر فیروز آباد' آباد کر کے اس کو اپنا پائے تخت قرار دیا۔ یہاں دریا کے کنارے ایک خوبصورت محل اپنے لیے تعمیر کروایا تھا دریا سے ایک نہر بھی نکالی گئی تھی۔

فیروز شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی قلمرو کے تینوں حصوں یعنی تلگو، کنڑا اور مرہٹی زبان بولنے والوں کو ایک اسٹیج پر جمع کر دیا۔ نظم ونسق کے انصرام کے لیے ان تینوں علاقوں کے قابل اشخاص کو حکومت کے عہدے دیئے ہندو رانیوں سے شادیاں بھی کیں۔ مقامی رسم ورواج' رہن سہن کے طور طریقے اپنائے۔ ایک مخلوط دکنی کلچر کے بانی کی حیثیت سے فیروز شاہ کا نام تاریخ دکن میں نمایاں ہے۔

فیروز شاہ اپنے فرزند کو بادشاہ بنانے کا خواہش مند تھا' مگر اس کا بھائی احمد شاہ 1422ء میں تخت نشین ہوا اور دس روز کے بعد فیروز کا انتقال ہو گیا۔ احمد شاہ نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ احمد شاہ کے عہد میں شیخ آذری ملک الشعرا تھے اور انھوں نے ' بہمن

نامہ' کی تصنیف شروع کی تھی۔مشہور مورخ فرشتہ کے مطابق بہمن نامہ کا بڑا حصہ یعنی سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کے عہد تک آذری نے مکمل کردیا تھا۔اس کے بعد ملانظیری، سنامی اور دوسرے شعراء نے اس میں اضافہ کیا۔

احمد شاہ کے بعد اس کا فرزند علاالدین ثانی پھر ہمایوں شاہ اس کے بعد نظام شاہ اور اور نظام شاہ کے بعد محمد شاہ ثالث بہمنی تخت پر جلوہ گر ہوئے۔اگرچہ ہمایوں شاہ اپنے جوروستم کے باعث بدنام ہے' مگر اس کے زمانے میں علم کی ترقی بھی ہوئی' شاہ طاہرا ستر آبادی ملامحمد تقی اور نظیری اس کے درباری شعراء تھے۔

نظام شاہ کے مرنے کے بعد جب محمد شاہ بہمنی تاج اور تخت کا مالک بنا تو اس کی کم سنی کے باعث ملک التجار خواجہ محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک مشیر سلطنت بنے اور صدر جہاں شوستری جو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے' بادشاہ کی تعلیم وتربیت پر مامور کیے گئے۔بقول مورخ فرشتہ فیروز شاہ کے بعد بہمنی خاندان میں محمد شاہ ہی ذی علم اور علم دوست بادشاہ تھا۔

بادشاہ کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد جب خواجہ جہاں نے غداری شروع کی تو محمد شاہ کی والدہ مخدومہ جہاں نے اس فتنہ کو بڑھنے سے پہلے ختم کردینا چاہا' چنانچہ خواجہ جہاں قتل کروادیا گیا۔اب محمود گاواں ہی برسرِ اقتدار رہا۔بہمنی وزراء میں سیف الدین غوری جس طرح نیک نام اور زبردست وزیر اعظم ثابت ہوا تھا۔اسی طرح خواجہ محمود گاواں ثابت ہوا۔اس کی فراست اور عقلمندی سے ملک کے حدود میں ترقی ہوئی اور چار صوبوں کے بجائے آٹھ صوبے بنائے گئے' تعلیم کی ترقی کے لیے ایک مدرسہ بیدر میں تعمیر کیا گیا' جس کے عمارت آج بھی موجود ہے۔اس مدرسے میں عالمگیر کے عہد تک برابر تعلیم ہوتی رہی' محمد شاہ کے عہد میں بہمنی سلطنت کو انتہائی عروج ہوا اور اس کے بعد ہی زوال شروع ہوگیا۔دراصل محمود گاواں کے قتل کے بعد سلطنت کے زوال کا آغاز ہوا۔

محمد شاہ ثالث کے بعد اس کا لڑکا محمود شاہ اور اس کے بعد علاالدین سوم بادشاہ بنے ،لیکن ان کی حکومت برائے نام تھی۔علاالدین سوم کے بعد ولی اللہ اور کلیم اللہ بھی بہمنی سلسلہ میں منسلک ہیں بالآخر کلیم اللہ کے مرنے پر 1527ء بہمنی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

جس وقت بہمنی سلطنت قائم ہوئی اس وقت دکن میں دکنی زبان کا رواج ہوچلا تھا' عوام اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے جو شمالی ہند سے آئی تھی۔سلاطین بہمنیہ نے اس زبان کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی اور اس کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔اردو جو ایک بول چال کی زبان تھی اس دور میں اسے علمی اور تخلیقی زبان کا درجہ اس وقت ملا جب صوفیائے کرام نے عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے اس زبان کا انتخاب کیا اور دوسری جانب شعراء نے اپنے احساسات وجذبات، مشاہدات وتجربات، افکار وخیالات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے لیے اردو زبان کو منتخب کیا اسے اظہار ذات کا ذریعہ بنایا۔بہمنی دور کے تاریخی پس منظر کے بعد آئندہ سطروں میں ہم بہمنی دور میں اردوئے قدیم یعنی دکنی زبان کی صورت حال اور اس کے ادبی سرمایے سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

بہمنی دور کے ادب کو ہم اردو ادب کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔دکنی ادب میں شعر وادب کی تخلیق کا آغاز اسی عہد میں ہوا۔بہمنی دور چودھویں صدی کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اور سولھویں صدی کے اولین پچیس سال پر محیط ہے۔بہمنیوں کی ادب پروری کی طویل داستانیں ہیں جن کی ایک معمولی مثال وہ واقعہ ہے جو اکثر تاریخوں میں درج ہے کہ اس خاندان کے ایک بادشاہ سلطان محمد شاہ ثانی نے فارسی کے مشہور شاعر خواجہ حافظ شیرازی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور وہ دکن کے ارادے سے نکلے اور جہاز میں سوار ہوئے ،لیکن بادِ مخالف سے

گھبرا کر جہاز سے اتر گئے اور معذرت میں ایک غزل لکھ بھیجی جو بہت مشہور ہے۔

بہمنی دور میں دکنی زبان ادبی زبان کے طور پر ابھرنے لگی۔ایک جانب شاہی سرپرستی نے زبان و ادب کے فروغ میں نہایت اہم رول ادا کیا اور دوسری جانب صوفیائے کرام نے اس زبان کو اسلام کی اشاعت اور رشد و ہدایت کی زبان کے طور پر منتخب کیا جس سے اس کی جڑیں مستحکم ہوئیں۔دکنی زبان کے ابتدائی نمونوں میں صوفیائے کرام کے ملفوظات اور رسائل اردو نثر و نظم کی ہیئت میں موجود ہیں۔اس دور کے اہم شعرا اور مصنفین میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، فخر الدین نظامی، میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، قطب الدین قادری، فیروز، سید عبد اللہ حسینی، مشتاق اور لطفی وغیرہ شامل ہیں۔

9.2.1 حضرت خواجہ بندہ نوازؒ:

حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودرازؒ فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے۔اس وقت آپ کی عمر اسّی (80) برس تھی۔حضرت خواجہ بندہ نوازؒ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔دلی میں آپ کے معتقدین بڑی تعداد میں تھے۔آپ نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر دکن کا رخ کیا۔جب 1400ء میں آپ بہمنی سلطنت کے صدر مقام گلبرگہ تشریف لائے تو خود بادشاہِ وقت فیروز شاہ بہمنی نے آپ کا استقبال کیا اور قدر دانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔آپ ہمہ وقت عبادت اور درس و تدریس میں مصروف رہتے۔قلیل مدت میں آپ کے معتقدین کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا۔آپ کے ارشادات سے فیض حاصل کرنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔چونکہ عوام کی زبان دکنی تھی اس لیے ان کی سہولت کی خاطر آپ درس دکنی میں دیا کرتے تھے۔محققین نے آپ کی تصانیف کی تعداد 37 بتائی ہے، جن میں معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود، شکارنامہ، چکی نامہ وغیرہ شامل ہیں، لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت گیسو دراز کے نام سے دکنی زبان میں جو نثری رسائل ملتے ہیں وہ فی الحقیقت حضرت گیسو دراز کی نہیں ہیں۔البتہ دکنی زبان میں ان کے لکھے ہوئے کچھ صوفیانہ گیت ضرور ملتے ہیں۔ڈاکٹر حفیظ قتیل نے معراج العاشقین کو بیجاپور کے ایک بزرگ حضرت مخدوم شاہ حسینیؒ کی تصنیف قرار دیا ہے۔حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے چکی نامہ لکھا۔دکن میں اردو زبان و ادب کے ارتقا میں آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔خواجہ بندہ نواز کا تخلص شہباز تھا۔ان کی شاعری کے کچھ نمونے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
او میرے جیو کا برقع لیا ہے

او معشوق بے مثال ہے جے نور نبی نپایا
نورستی رسول کا او میرے جیو میں بھایا
آپ کوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا

اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا
ذات تجلی ہوے گی سیس سپورنہ کہرا
واحد اپنے آپ تھا آپیں آپ نجھایا
پر گٹ جلوہ کار نے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دیے کر کاف نون بسایا

چکی نامہ بارہ بندوں پر مشتمل نظم ہے۔

دیکھو واجب تن کی چکی پیسو چا تر ہو کے سکی
سوکن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی گے ما بسم اللہ ہو ہو اللہ
الف اللہ کا دستا میا نی محمدﷺ ہوکر بستا
سچے طالبوں کو دستا گے ما بسم اللہ ہوٗ ہو اللہ

حضرت خواجہ بندنواز نے خواتین کی تربیت اور انھیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے چکی نامہ اور گیت لکھے۔دکنی شاعری میں چکی نامہ ایک اہم نظم ہے، قدیم دکنی معاشرے میں چکی کے گیتوں کا رواج عام تھا۔عورتیں چکی پر پیس کر جوار، گیہوں، باجرہ وغیرہ سے روٹی بنانے کے لیے آٹا تیار کرتی تھیں اور کام کی تھکن کے احساس کو کم کرنے کے لیے گیت گاتی جاتی تھیں۔اولیائے کرام نے خواتین کے اس مشغلے کے پیش نظران کے لیے مذہبی احکامات اور تصوف کے موضوع پر گیت لکھے۔

9.2.2 فخر دین نظامی:

فخر دین نظامی بہمنی دور کے نہایت اہم شاعر ہیں۔ یہ سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں بیدر میں سکونت پذیر تھے۔فخر دین بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔''کدم راؤ پدم راؤ'' ان ہی کی لکھی ہوئی مثنوی ہے، جسے اردو کی پہلی مثنوی کہا جاتا ہے۔مثنوی کی داخلی شہادت اور اشعار کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی احمد شاہ کے دور حکومت میں لکھی گئی تھی۔

مثنوی کا دستیاب شدہ نسخہ ناقص الاول، ناقص الاوسط و ناقص الآخر ہے۔یعنی اس تصنیف کے ابتدائی، درمیانی اور آخر کے کچھ صفحات غائب ہیں،اس لیے مثنوی کے نام کا پتہ نہیں چلتا ہے۔اس مثنوی کے دو اہم کرداروں ''کدم راؤ'' اور ''پدم راؤ'' کے نام پر اس کا نام رکھا گیا ہے۔

مثنوی کی عام ہیئت کے مطابق ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا قصہ بھی حمد، نعت اور مدح سلطان کے بعد شروع ہوتا ہے۔قصہ کچھ اس طرح ہے کہ کدم راؤ راجا ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر جو ایک ناگ ہے اور کدم راؤ کی عنایت سے اس کے سر پر پدم بھی موجود ہے۔ایک دن کدم راؤ کسی واقعے سے غم اور غصے سے افسردہ وملول اپنے محل میں آتا ہے کسی سے بات نہیں کرتا، خاموشی سے لیٹ جاتا ہے۔راجا کو اس طرح اداس اور غمگین دیکھ کر رانی اس کے پاس پہنچ کر اس کی اداسی کی وجہ دریافت کرتی ہے۔رانی کے بہت اصرار کرنے پر راجا کہتا ہے کہ مجھے یقین ہو گیا

ہے کہ عورت اگر پری یا اپسرا بھی ہو تو اس کی وفاداری اور پاک بازی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے اسی بات کا غم کھائے جا رہا ہے۔ رانی کدم راؤ کو بہت سمجھاتی ہے کہ ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی ہے، اسی طرح جیسے پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ کوئی ایک گر بُرا کام کرے تو اسے صرف اور صرف اس کی ذات اور شخصیت کی خامی یا کمزوری سمجھنا چاہیے۔ اسے سب سے جوڑ کر دیکھنا غلط ہے۔ وہ مزید کہتی ہے کہ میں تو ہمیشہ تمھاری وفادار داسی رہوں گی، لیکن رانی کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پدم راؤ بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ کدم راؤ کہتا ہے کہ میں اس دنیا سے بددل ہو گیا ہوں۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔ راجا کے حکم پر باکمال جوگی اکھر ناتھ کو تلاش کر کے دربار میں پیش کیا جاتا ہے۔ اکھر ناتھ نے اپنے کمالات دکھائے اور لوہے کو سونا کر دکھایا۔ راجا اکھر ناتھ جوگی کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور اس سے یہ فن سکھانے کی فرمائش کرتا ہے۔ کدم راؤ اس سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اب اسے جوگی کے بغیر چین نہیں آتا۔ اکھر ناتھ کدم راؤ کو دھنور بید اور امر بید سکھاتا ہے۔

ایک دن منتر کو آزمانے کے لیے راجہ کدم راو اپنی روح ایک مردہ طوطی کے جسم میں داخل کرتا ہے۔ اکھر ناتھ کے دل میں لالچ پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی روح کدم راؤ کے جسم میں منتقل کر دیتا ہے کدم راؤ طوطی بن کر بھٹکنے لگتا ہے اور اکھر ناتھ راجا بن کر راج کرنے لگتا ہے۔ ایک دن وہ وزیر سے ''فرمائشِ نامعقول'' کرتا ہے۔ پدم راؤ اس فرمائش کو پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اکھر ناتھ غصے میں پدم راؤ پر بہت لعن طعن کرتا ہے۔ اُدھر اصل راجا کدم راؤ طوطی بن کر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ ایک دن اُڑتے اُڑتے اُسے اپنا محل نظر آتا ہے اور وہ محل میں پدم راؤ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کے قدموں میں سر رکھ کر اپنے کدم راؤ ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ پہلے پدم راؤ کو یقین نہیں آتا لیکن جب کدم راؤ اس سے راز کی وہ تمام باتیں بتاتا ہے، جو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھیں تو پدم راؤ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہی اصل کدم راؤ ہے۔ ایک رات جب اکھر ناتھ گہری نیند میں سو رہا ہوتا ہے تو پدم راؤ چپکے سے اس کے انگوٹھے کو ڈس لیتا ہے، جس سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کدم راؤ منتر پڑھ کر پھر سے اپنی اصل روپ میں واپس آ جاتا ہے۔ پہلے کی طرح حکومت سنبھال لیتا ہے اور ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے۔ اس طرح کہانی کا خوشگوار اختتام ہوتا ہے۔ اس کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں:

مجھے مارنا مار کے گھال دے
ولے آج اکھر مار نیکال دے

بلایا مدھر بدھ کوں راؤ پاس
کہیا راؤ ہوں پھول، توں پھول باس

نہوئے پھول پیارا کدھیں باس بن
نہ سر گھال لے کوئی باس آس بن

سبی ٹھانو جے سانپ کوڈھا چلے
اپس ٹھانو وہ بھی سو سیدھا چلے

مدھر بدھ توں ہے منجھے پیر ٹھانو

تجھے نانو پردھان منج راؤ نانو
بھلا بھی تہیں منجہ برا بھی نہیں
ترے پائے (ہوں) چھوڑ جاسوں کہیں

اس کہانی کے ذریعے فخر دین نظامی نے یہ پیغام دیا ہے کہ ذات پات، اونچ نیچ کی سوچ غلط ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اعلیٰ ذات والوں میں ہی تمام خوبیاں ہوں اور ادنیٰ ذات والے بدخصلت ہوں۔ اکھر ناتھ کا تعلق تو اعلیٰ ذات سے تھا، لیکن اس نے اپنی مکاری اور سازش سے راجا کا سارا راج پاٹ چھین لیا۔ اسی طرح طبقۂ نسواں سے بدگمان ہونا بھی غلط ہے۔ فرد کی کمزوریوں یا نااہلیوں کو اس کے پورے طبقے سے جوڑنا اور پورے طبقے کا نمائندہ قرار دینا زیادتی ہے۔ ان تصورات کی تردید وہ اکھر ناتھ کے کردار کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس طرح فخر دین نظامی اس مثنوی کے ذریعے اخلاقیات کی ایک ہمہ گیر تعلیم دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مثنوی سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور سماج کے لیے صحت مند تصور نہیں ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ قصے کے لحاظ سے ہندوی روایت سے اخذ کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے نظامی نے اس میں سنسکرت و پراکرت الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ محاورے اور ضرب الامثال کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، جس سے زبان میں دلکشی پیدا ہوئی ہے۔ قصے کے بیان میں روانی ہے۔ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو ادب کی اولین روایت کی نمائندہ ہے۔

9.2.3 میراں جی شمس العشاق:

میراں جی شمس العشاق، شاہ کمال الدین بیابانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ جوانی میں حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور بارہ سال تک مدینہ منورہ میں قیام کیا، اس کے بعد بیجاپور آئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی دوام الدین ہے۔ شمس العشاق، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے سلسلہ صوفیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ شمس العشاق بہمنی دور کے بہت بڑے صوفی شاعر تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے دکنی زبان کا انتخاب کیا۔ آپ کی تصانیف اس طرح سے ہیں؛ شہادت التحقیق، مغز مرغوب، خوش نامہ، خوش نغز اور شرح مرغوب القلوب وغیرہ۔

میراں جی کی شاعری کا موضوع تصوف ہے اور وہ شاعری کو عوام کی تلقین اور اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تین مثنویاں خوش نامہ، خوش نغز اور شہادت التحقیق اہمیت کی حامل ہیں۔

خوش نامہ: خوش نامہ کا موضوع تصوف ہے۔ یہ میراں جی کی سب سے مشہور تخلیق ہے۔ خوش نامہ کا مرکزی کردار خوش ایک نیک سیرت لڑکی ہے، جو چغتائی خاندان کا چشم و چراغ تھی۔ وہ بھولی بھالی، محبت کرنے والی، سب سے نرالی، سب کی پیاری، ہنس مکھ اور سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ نیک بھی ایسی کہ دن رات اللہ سے لگاؤ رکھتی۔ نہایت ذہین اور سمجھ دار تھی۔ محض سترہ سال ایک ماہ نو دن کی عمر میں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ میراں جی اسے اللہ کی مرضی سمجھتے ہیں، لیکن وہ خوش کی موت سے اخلاقی نتائج اور روحانی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آخری دو اشعار دیکھیے جس میں اس نظم کا نام بھی آیا ہے اور دعا بھی مانگی گئی ہے۔

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور

یہ خوش خوشیاں اللہ کیرا نور اعلیٰ نور
کھنڈا خوش خوش نامہ تمت ہوا تمام
خوش سب کوئی دایم قایم جینا خواص عوام

خوش نغز: خوش نغز میں بھی خوش نامہ والی دوشیزہ کا ذکر ہے۔اس مثنوی میں بہتّر اشعار اور نو ابواب ہیں۔ ہر باب کے اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ یہ مثنوی سوال و جواب کی ہیئت میں لکھی گئی ہے، جس میں میراں جی نے تصوف کے مختلف مسائل مثلاً عرفانِ روح، عرفانِ عالم، عرفانِ مراقبہ، عرفانِ ذوقِ نور، بحثِ عقل و عشق، بیانِ کرامات اور موحّد و ملحد وغیرہ کے متعلق خوش کے ہر ایک سوال کا جواب ایک نئے باب میں دیتے ہیں۔خوش نغز کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جو باب ہفتم ''بحث عقل و عشق'' سے لیے گئے ہیں۔

خوش کہی مج کہو میرانجی عشق بڑا یا بودہ
پیر کہیں میں آکھوں بیاں اسے دھرنا سودہ
من کے کان دے کرسن ری بچن نیک انیک
چنگی عشق بودہ کب سیتیں کیوں سلگائی دیکہ
بودہ پردھان کہے سن راجے تجکوں عشق خطاب
جے تو کہیا نہ سنی میرا کیسو رہی حساب

شہادت التحقیق: شہادت التحقیق کا ایک نام شہادت الحقیقت بھی ہے۔اس میں 1563 اشعار ہیں۔ یہ میراں جی کی سب سے طویل نظم ہے۔ یہ مثنوی چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہے۔اس کے اسلوب میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔شہادت التحقیق میں شریعت وطریقت کے مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بڑی سرعت کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

9.2.4 سید شاہ اشرف بیابانی؛

اشرف بیابانی کا شمار بہمنی دور کے نامور اور باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش 1459ء میں فقر آباد میں ہوئی اور وفات 1528ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید شاہ ضیا الدین بیابانی ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور حقائق و معارف کی طرف متوجہ ہوئے۔ 1489ء میں ان کے والد نے انھیں خلافت عطا کی۔اشرف بیابانی کی تین تصانیف ہیں اور تینوں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ ان کے نام لازم المبتدی، واحد باری اور نوسر ہار ہیں۔ان میں نوسر ہار سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔

لازم المبتدی: یہ مثنوی 198 اشعار پر مشتمل ہے۔اس مثنوی کو 36 مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ نظم مختلف مذہبی مسائل کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے جن کا تعلق روزمرہ کے معمولات زندگی سے ہے۔اس میں عام انسان کو شرعی احکامات سے روشناس کرایا گیا ہے تاکہ عام آدمی فرائضِ مذہبی کو صحیح طریقے سے انجام دے سکے۔اس میں غسل، وضو، نماز، سجدۂ سہو، روزہ، فطرہ وقربانی اور بیانِ غسل وکفنِ میّت وغیرہ

کو عام بول چال کی زبان میں سمجھایا گیا ہے۔

واحد باری: واحد باری امیر خسرو کی خالق باری کے طرز پر لکھی گئی مثنوی ہے۔ اس میں اردو کے فارسی و عربی مترادفات لکھنے کے ساتھ ساتھ موسیقی، عروض، ردیف و قافیہ اور مختلف اصنافِ سخن سے متعلق باتیں بیان کی گئی ہیں۔

نوسر ہار: نوسر ہار مثنوی کی ہیئت میں لکھا گیا مرثیہ ہے۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے، جس کے اشعار کی تعداد اٹھارہ سو ہے۔ یہ مثنوی نو (9) ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر ایک باب ایک انمول ہار کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کا نام نوسر ہار رکھا گیا ہے۔ اُس زمانے کے دستور کے مطابق ابواب کے عنوان فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس مثنوی کا موضوع واقعۂ کربلا ہے۔ اس میں واقعۂ کربلا کی برگزیدہ ہستیوں کے لباس، رسم و رواج، ان کے مزاج و کردار کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں میں جو ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا رنگ دکھائی دیتا ہے اس کا آغاز اشرف بیابانی کی نوسر ہار سے ہوتا ہے۔ نوسر ہار میں اشرف بیابانی نے واقعۂ کربلا اور شہادتِ امام حسین کو مروجہ واقعے سے قدرے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ نوسر ہار کا اندازِ بیان اور لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی مجلسوں میں سنائے جانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی زبان بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ اس میں روزمرہ و محاورے نے بیان کو زوداثر بنا دیا ہے۔ انھوں نے مثنوی میں جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ رزم کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور شہادت کے بیان میں غم کے جذبات کی شدت محسوس ہوتی ہے۔ اشرف نے اس مثنوی میں ''واحد باری'' اور ''لازم المبتدی'' کے برخلاف اس مثنوی کو خاص اہمیت دی ہے اس میں نہ صرف اپنی شاعری کی خوبیاں ظاہر کی ہیں بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ یہ مثنوی اس کا نام روشن رکھے گی:

سونے کی جیوں کھوٹنی گھڑ	ہیرے مانک موتی جڑ
ایک ایک بول مانک مول	سیم ترازوسیں تھیں تول
بِندھ پُرائی سونے تار	سوچیں ہووا ''نوسر ہار''
ہر ہر مصرعے باندے لڑ	رتن پدارت مانک جڑ
اے نو باباں نوسر ہار	قیمت اس کی لاکھ ہزار

اشرف کا کہنا ہے کہ ایک خوبصورت اور بیش قیمتی ہار جس طرح سے سونے چاندی کے استعمال سے بنایا جاتا ہے اور ہیرے جواہرات سے مزئین کیا جاتا ہے اسی طرح اس مثنوی کی تزئین کی گئی ہے، جس کے سبب یہ مثنوی فن کا ایک نادر نمونہ اور فنکار کی صلاحیتوں کا بہترین مظہر بن کر شاعر کے نام کو ادبی دنیا میں زندہ جاوید رکھے گی۔

9.2.5 قطب الدین قادری فیروز؛

بہمنی دور کے آخری زمانے میں فیروز کو ایک باکمال سخنور کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک مختصر سی مثنوی ''پرت نامہ'' اور کچھ غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ''پرت نامہ'' فیروز نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ محمد ابراہیم مخدوم جی کی مدح میں لکھی ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف

کے وقت مخدوم جی بقید حیات تھے۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد فیروز گولکنڈہ چلا آیا، جہاں اسے استادِ سخن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ گولکنڈہ کے شعرا، وجہی، محمد قلی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں فیروز کا ذکر نہایت عزت واحترام سے کیا ہے۔

ابراہیم مخدوم جی جیونا — مئے صرف وحدت صدا ہونا
بڑا پیر مخدوم جی جگ منے — منگیں نعمتاں معتقد اس کنے
کریں منجھ اپر پیارا ے پیو جگ — کہ تجھ پیار تھے ہوئی سندھیر جگ
پیا جیو تھے تو ہمن ساس ہے — تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے

9.2.6 سید عبداللہ حسینی؛

بہمنی دور کے ایک اہم مصنف سید عبداللہ حسینی ہیں۔ آپ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے پوتے ہیں۔ اپنے دادا کی طرح ارشاد و ہدایت ان کا مشغلہ تھا۔ احمد شاہ ثانی بہمنی کے دور میں موجود تھے۔ سید عبداللہ حسینی اپنے دادا کی طرح عوام میں مقبول تھے۔ انھوں نے اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف ''نشاط العشق'' کا قدیم اردو یعنی دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔

9.2.7 مشتاق؛

مشتاق بہمنی دور کا باکمال شاعر اور استادِ سخن تھا۔ یہ سلطان محمد شاہ بہمنی کے دور میں موجود تھا۔ مشتاق نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں دکنی زبان میں قصیدہ لکھا تھا جو دکنی کا پہلا قصیدہ ہے۔ ان کی غزلیات بھی دستیاب ہوئی ہیں، جن کے مطالعے سے ان کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام

تجھ دیکھتے دل تو گیا ہور جیو اُپر بے کل گھڑی
دیکھے تو ہے جیو کے اوپر نئیں دیکھے تو نئیں کل گھڑی
سورج کے گل میں چاند جیوں یوں تجھ گلے ہیکل دسے
قربان اس کے ہات پر جن اے تری ہیکل گھڑی

9.2.8 لطفی؛

لطفی مشتاق کا ہم عصر شاعر ہے۔ اس نے حضرت شاہ محمد کی مدح لکھی ہے۔ انھوں نے قصیدہ اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لطفی نے ایک قصیدہ، خواجہ کرمانی کے مشہور قصیدے کی زمین میں لکھا ہے۔ لطفی کی غزل کے چند شعر یہ ہیں:

سرگ تھے نکلیا چندر لال لہو کے بھیتر
سور چھپایا خنجر چندر دکھایا مکھن
سرگ کا طوطی ہریا مشک خطائی چڑیا
رات کا عنبر سریا صبح کی پھوٹی کرن

بہمنی دور کے شعرا میں آذری کا بھی ذکر ملتا ہے، جو ایران سے سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں دکن آیا تھا۔ کچھ برس یہاں رہا۔ بادشاہ نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ واپس ایران جا کر اس نے دکنی زبان میں ''بہمن نامہ'' لکھی، لیکن یہ تصنیف دستیاب نہ ہوسکی۔ تاریخِ فرشتہ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

بہمنی دور میں اردو چاروں طرف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی اور واحد مشترک زبان بن جاتی ہے اور اس عظیم سلطنت کے مختلف علاقوں میں ایک ایسا سازگار ماحول پیدا ہوجاتا ہے کہ آئندہ دور میں ادبی تخلیق کے لیے راستہ صاف ہوجاتا ہے۔ جو بیج اس دور میں پھوٹ کر پیڑ بنا اس کے پھل اس سلطنتوں نے کھائے جو بہمنی سلطنت کی جانشین تھیں خصوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتیں دکنی ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

بہمنی دور میں اردو زبان بول چال کی زبان سے آگے بڑھ کر علم و ادب کی زبان بن چکی تھی۔ اس میں مذہبی تصانیف لکھی گئیں۔ ابتدائی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا کا زیادہ تر رجحان تصوف کی طرف رہا۔ علاوہ ازیں ادبی تخلیقات میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں اور مرثیے لکھے گئے۔ اس دور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے، جو اردو کی پہلی مثنوی ہے۔ بہمنی دور میں سلاطین نے صوفیائے کرام کی قدردانی کی، شعرا و ادبا کی سرپرستی کی۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے اردو زبان و ادب ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ اردو کی پہلی مثنوی کونسی ہے؟

2۔ مثنوی نوسرہار کا موضوع کیا ہے؟

3۔ خوش نامہ اور خوش نغز کس کی تصانیف ہیں؟

4۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کس بادشاہ کے زمانے میں گلبرگہ تشریف لائے؟

5۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں راجا کو دھوکہ دینے والے جوگی کا نام کیا ہے؟

9.3 اکتسابی نتائج

☆ آپ نے اس اکائی میں بہمنی سلطنت کی تاریخ سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ بہمنی سلاطین علم دوست اور ادب نواز تھے۔ انھوں نے عوام میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض کے مدرسے قائم کیے خصوصاً بیدر کا مدرسہ محمود گاواں۔ اہل علم اور شعرا کی قدردانی کی جس کے سبب اہل ہنر بہمنی سلطنت میں دربار سے وابستہ ہوئے۔ اس علمی فضا میں زبان و ادب کو پنپنے کا بھرپور موقع ملا۔

☆ اس اکائی میں پڑھا کہ اردو زبان و ادب کے ارتقا کی تاریخ میں بہمنی دور نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی دور میں ہمیں اردو ادب کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ جیسے فخر دین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ جس میں ہندو اساطیر سے ماخوذ قصے کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

☆ اس دور کی ایک اور اہم تصنیف اشرف بیابانی کی مثنوی نوسرہار ہے۔ یہ مثنوی واقعہ کربلا کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اشرف نے اس مثنوی میں جہاں رزم گاہ کی بے مثال منظرکشی کی ہے وہیں انسانی جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے۔

☆ اس کے علاوہ اُس دور کے صوفیائے کرام نے بھی اردو زبان کی نشو و نما و فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے رشد و ہدایت کے

لیے دکنی اردو کو منتخب کیا اور عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے تصنیف و تالیف کا کام بھی قدیم اردو زبان میں کرنے لگے جس سے زبان کی بھی ترویج واشاعت ہوتی رہی۔

☆ بہمنی دور کے صوفیائے کرام میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ، میراں جی شمس العشاقؒ، سید شاہ اشرف بیابانیؒ، قطب الدین قادری فیروز، صدرالدینؒ، سید عبداللہ حسینیؒ شامل ہیں۔ الغرض بہمنی دور میں صوفیائے کرام نے درس و ارشادات اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اردو زبان وادب کے فروغ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

☆ مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ اس دور کے دیگر شعراء میں مشتاق، لطفی اور آذری وغیرہ کے بھی نام ملتے ہیں۔ گویا اس دور میں ادب کی بنیاد رکھی گئی، جس سے آنے والے دور کے ادبی ماحول کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

9.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
لسانی	زبان سے متعلق
اختلاط	میل جول
خمیر	سرشت، فطرت، مزاج
معتقد	اعتقاد رکھنے والا
وسیع	چوڑا، کشادہ
ناقص الاول	جس کتاب کے ابتدائی اوراق موجود نہ ہوں
ناقص الاوسط	جس کتاب کے درمیانی اوراق موجود نہ ہوں
ناقص الآخر	جس کتاب کے آخر کے اوراق موجود نہ ہوں
مزید	اضافہ، زیادتی
ملول	اداس، رنجیدہ
لعن طعن	لعنت ملامت، برا بھلا
خصلت	عادت، مزاج
برگزیدہ	منتخب، چنا ہوا
اصحاب	صاحب کی جمع، ہم نشیں، دوست
سکونت	مستقل قیام
شدت	زور، کثرت، سختی
مدح	تعریف
زود	جلد، فوراً

معارف	علم وفضل، علوم وفنون
سرعت	جلدی، تیزی
اسطور	اساطیر کی جمع، قصے کہانیاں
عالم	بہت پڑھا لکھا، مولوی
فاضل	عالم، دانا
تلقین	نصیحت، ہدایت
مراقبہ	دھیان گیان، سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کا دھیان کرنا
عرفان	پہچان، حق تعالیٰ کی معرفت، خداشناسی
ہیئت	وہ علم جس میں اجرامِ فلکی، زمین کی گردش اور کشش وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے، ساخت
موحد	خدا کو ایک ماننے والا، سچا مسلمان
ملحد	کافر، بے دین، راہ حق سے پھرا ہوا

9.5 نمونۂ امتحانی سوالات

9.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اردو کی پہلی مثنوی کونسی ہے؟

2۔ خوش نامہ اور خوش نغز کس کی تصانیف ہیں؟

3۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کس بادشاہ کے زمانے میں گلبرگہ تشریف لائے؟

4۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں راجا کو دھوکہ دینے والے جوگی کا نام کیا ہے؟

5۔ مثنوی نوسرہار کا موضوع کیا ہے؟

6۔ میراں جی شمس العشاق کس کے مرید اور خلیفہ تھے؟

7۔ مثنوی ''نوسرہار'' کس کی تصنیف ہے؟

8۔ ''شہادت التحقیق'' کا دوسرا نام کیا ہے؟

9۔ مثنوی ''پرت نامہ'' کا مصنف کون ہے؟

10۔ سید عبداللہ حسینی اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ میں کیا رشتہ تھا؟

9.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ بیان کیجیے۔

2۔ بہمنی دور کے ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ اشرف بیابانی کی مثنوی نوسر ہار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ میراں جی شمس العشاق کی تصانیف پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

9.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اردو زبان کے فروغ میں صوفیائے کرام کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ بہمنی دور میں اردو زبان وادب کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

3۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے کرداروں میں سب سے فعال کردار کونسا ہے؟

9.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	تاریخ اردو ادب (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	دکن میں اردو	ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی
4۔	تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد اول)	پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین
5۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
6۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	پروفیسر احتشام حسین
7۔	تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی
8۔	تاریخ ادب اردو کرناٹک	پروفیسر سیدہ جعفر

اکائی 10: عادل شاہی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 عادل شاہی عہد کا سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر
10.2.1 عادل شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا
10.2.2 ابراہیم عادل شاہ ثانی
10.2.3 عبدل
10.2.4 صنعتی
10.2.5 حسن شوقی
10.2.6 علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ
10.2.7 نصرتی
10.2.8 ہاشمی بیجاپوری
10.2.9 مرزا
10.3 اکتسابی نتائج
10.4 کلیدی الفاظ
10.5 نمونہ امتحانی سوالات
10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.5.4 طویل جوابات کے حامل سوالات
10.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید

دکنی شعر و ادب کے ارتقا میں عادل شاہی دور بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ عادل شاہی عہد کے تقریباً تمام سلاطین شعر و ادب کے

دلدادہ تھے۔ انہوں نے علما، فضلا، شعرا اور دیگر اہل ہنر کی قدر دانی اور سر پرستی کی۔ اس اکائی میں آپ عادل شاہی سلطنت کے قیام اور اس کے سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر اور شعر وادب کے ارتقا پر روشنی ڈالیں گے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو عادل شاہی دور کے شعر وادب سے واقف کروانا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ عادل شاہی عہد کے سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالیں۔

☆ عادل شاہی عہد کے شعر وادب کا جائزہ لیں۔

10.2 عادل شاہی عہد کا سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر

15 ویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں، جو پانچ نئی اور خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں، ان میں بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت کو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا، جو سلطنت بہمنیہ کے مشہور وزیر محمود گاواں کا تربیت یافتہ تھا۔ اس نے 1490ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ تقریباً دو سو سال تک نو بادشاہ یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔ اپنی خود مختاری کے بعد یوسف عادل شاہ جہاں اپنی سلطنت کو وسیع اور مستحکم کرنے میں مصروف رہا وہیں ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے بھی اپنی ریاست کی بنیادیں مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ یوسف عادل شاہ نہ صرف فنون لطیفہ کا اچھا مذاق رکھتا تھا بلکہ خود بھی فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔ فارسی اور ترکی پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس کے دور حکومت میں کئی قلعے اور خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ 1510ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے تقریباً پچیس سال تک حکمرانی کی۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح علم دوست، عالموں کا قدر دان اور شعر وسخن کا دلدادہ تھا۔ خود بھی شاعر تھا اور وفائی تخلص کرتا تھا۔ اس نے چندا پور کے نام سے ایک شہر اور چمپا محل کے نام سے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند ابراہیم عادل شاہ اول بیجا پور کے تیسرے بادشاہ کی حیثیت سے 1534 میں تخت نشین ہوا۔ اگر چہ ابراہیم خود شاعر نہیں تھا لیکن اپنے آبا واجداد کی طرح ذوق علم وادب سے بہرہ مند تھا۔ اس کے عہد کا ایک اہم کارنامہ فارسی کے بجائے دکنی کو دفتری زبان قرار دینا ہے۔ اس کے دور میں بیجا پور علم وادب، موسیقی اور صناعی کا مرکز بن گیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول 1558ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں علم وادب کی بڑی سر پرستی ہوئی۔ اس نے خاندانی روایات کی پاسداری کی اور فنون لطیفہ بالخصوص موسیقی کی قدر دانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ علی عادل شاہ اول کے عہد حکومت میں عراق، عرب، ایران اور دوسرے مقامات کے شعرا اور علما بیجا پور آکر بس گئے۔ خود بادشاہ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے محل میں ایک عمدہ کتب خانہ موجود تھا۔ علی عادل شاہ اول نہ صرف علم وفن کا شائق تھا بلکہ اس کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ دارالسلطنت بیجا پور میں کئی باغ لگوائے، نہریں نکالیں اور ایک عالی شان مسجد بنائی۔ اس کے عہد میں شاہ برہان الدین جانم نے کئی رسالے نظم اور نثر میں قلم بند کیے جن میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں اس کا جانشین ہوا۔ اس کا شمار جلیل القدر حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ وہ مغل شہنشاہ اکبر اور گولکنڈہ کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔ وہ نہ صرف علما اور شعرا کا سر پرست تھا بلکہ خود بھی ایک

بلند پایہ شاعر تھا۔اس کو ہندوستانی موسیقی میں کمال حاصل تھا۔موسیقی میں اپنی مہارت اور کمال کی وجہ سے جگت گرو کہلاتا تھا۔اس نے کتاب ’’نورس‘‘ اپنی یادگار چھوڑی ہے۔اس کے عہد میں جب گجرات اور احمد نگر کی سلطنتوں کو زوال ہوا تو اس نے وہاں کے علما اور اصحاب کمال کو بیجا پور آنے کی دعوت دی۔ملاظہوری (مصنف سہ نثر ظہوری)،حکیم ابو القاسم فرشتہ (مصنف تاریخ فرشتہ)اور ملا رفیع الدین شیرازی (مصنف تذکرۃ الملوک)اس کے دربار سے وابستہ تھے۔اس کو تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ایک نیا شہر آباد کر کے اس کو نورس پور سے موسوم کیا۔نورس کے نام سے قلعہ تعمیر کیا۔شاہی مہر پر لفظ نورس کندہ تھا۔درباری شاعر عبدالقادر کو نورسی کا لقب دیا۔اس کے عہد کے اردو شعرا میں عبدلؔ، مقیمیؔ ،صنعتیؔ وغیرہ مشہور ہیں۔ابراہیم عادل شاہ نے 1627ء میں وفات پائی۔اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد عادل شاہ بیجا پور کا حکمران ہوا۔یہ نہایت فیاض اور رحم دل بادشاہ تھا۔خود شاعر نہ تھا لیکن علم و ادب کا قدر دان اور شعرا کا سر پرست تھا۔محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان گولکنڈہ کے فرماں روا محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی۔ملکہ خدیجہ سلطان اور محمد عادل شاہ کی اردو نوازی کی وجہ سے اردو ادب کو فروغ حاصل ہوا۔تعلیم کی ترقی ہوئی۔تمام شہر میں مدارس کھولے گئے۔طلبہ کو وظائف دیے گئے اور صاحب علم کو فکر معاش سے بے پرواہ کیا گیا۔1656ء میں محمد عادل شاہ کا انتقال ہوا۔

محمد عادل شاہ کے بعد اس کے بیٹے علی عادل شاہ ثانی نے انیس سال کی عمر میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔اس کو زندگی بھر سرکش امراء کی بغاوتوں، مرہٹوں اور مغلوں کی یورشوں کا سامنا کرنا پڑااس کے باوجود دکنی زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔وہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا اور شاہیؔ تخلص کرتا تھا۔چوں کہ اس کی مادری زبان دکنی تھی اس لیے اسے دکنی سے خاص لگاؤ تھا۔علی عادل شاہ اپنے عہد کا بلند پایہ سخن ور تھا اس لیے’’استاد عالم‘‘ کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔اس کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں میں حسینی محل، علی محل، عرش محل اور حسینی مسجد وغیرہ اہم ہیں۔اس نے صرف پینتس سال کی عمر میں 1672ء میں انتقال کیا۔اس کے انتقال کے بعد اس کا کم سن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بیجا پور کا آخری حکمران تھا۔اس کے عہد میں امرا کی ناچاقیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں سکندر نے مرہٹوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔شیواجی نے بعض عادل شاہی قلعوں پر قبضہ کر لیا تو سکندر نے بہلول خاں کو اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔شیواجی کا لشکر حملے کی تاب نہ لا کر منتشر ہو گیا۔ آخر کار 1686ء میں اورنگ زیب نے بیجا پور کو فتح کر لیا اور سکندر عادل شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔اس طرح دو سو سالہ عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

عادل شاہی حکمرانوں کو رعایا کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال تھا انھوں نے اپنی سلطنت میں بے شمار سرائیں، خانقاہیں، پل اور کنویں بنوائے۔غربا اور مساکین کے لیے لنگر خانے قائم کیے۔مشائخ اور علماء کو وظائف اور انعامات دیے جاتے تھے۔عام لوگوں کو تیار غذا دی جاتی۔عیدین، شب برات اور سالگرہ کے موقع پر شہر آراستہ کیا جاتا اور جشن منائے جاتے۔غرض کہ عادل شاہی عہد میں ملک پر امن اور رعایا اتنی خوش حال تھی کہ اس دور میں موسیقی، مصوری، نقاشی، خطاطی، تعمیرات، صنعت و حرفت، شعر و ادب اور دیگر علوم و فنون کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔

10.2.1 عادل شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا:

عادل شاہی دور دکنی شعر و ادب کے ارتقا کے سلسلے میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔اس دور کے شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اردو کو مختلف ارتقائی منزلوں سے روشناس کیا۔اور مختلف اصناف شاعری جیسے غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مرثیہ کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی با قاعدہ توجہ کی۔لیکن شاعری کا پلہ نثر نگاری کے مقابلہ میں بھاری ہے۔عادل شاہی عہد کے کم وبیش تمام سلاطین علم و ادب اور شعر وسخن کے قدر

دان اور سرپرست تھے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی ''جگت گرو'' اور علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کو دیگر سلاطین کے مقابلہ میں اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ دونوں نے نہ صرف شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی دل کھول کر سرپرستی کی بلکہ دونوں موسیقی اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے اور ساتھ ہی خود بھی شعر کہتے تھے۔اس دور کے شعرا و ادبا میں شاہ برہان الدین جانمؔ، ابراہیم عادل شاہ ثانی، حسن شوقی، نصرتی، شاہی، حضرت امین الدین اعلیٰ اور ہاشمی بیجاپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

10.2.2 ابراہیم عادل شاہ ثانی؛

ابراہیم عادل شاہ ثانی، طہماسپ شاہ کا بیٹا اور علی عادل شاہ کا بھتیجا تھا۔علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کے انتقال کے بعد ابراہیم تخت نشین ہوا۔یہ عادل شاہی خاندان کا چھٹا حکمران تھا جس نے 1580ء سے 1627ء تک حکومت کی۔یہ گولکنڈہ کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔ابراہیم کو چوں کہ مستقبل میں تخت و تاج کا وارث بننا تھا اس لیے اس کے چچا علی عادل شاہ نے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی تھی۔وہ بچپن ہی سے علم و ادب کا شائق، متین، بردبار اور سنجیدہ شہزادہ تھا۔بساتین السلاطین اور تاریخ فرشتہ کے مورخین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ نوعمری میں وہ عام بچوں کی طرح کھیل کود میں مصروف رہنے کے بجائے تحصیل علم میں مگن رہتا تھا۔اور اس نے قران مجید کی تعلیم کے علاوہ خوش نویسی اور فنون سپاہ گری، خطاطی، مصوری اور نقاشی میں درک پیدا کیا تھا۔علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد دکن کی دانش مند ملکہ، احمد نگر کی مشہور شہزادی اور عادل شاہی حکمران علی عادل شاہ کی ملکہ چاند بی بی نے ابراہیم عادل شاہ کی تربیت کی ذمے داری قبول کی تھی۔ابراہیم کو فنون لطیفہ اور تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔اس نے علم موسیقی کی بھی سرپرستی کی۔اس کے دور میں اہل کمال کو حکومت کی جانب سے مالی امداد دی جاتی تھی۔اس کے دربار میں علما و فضلا کی بڑی توقیر ہوتی تھی۔اس کے عہد میں بیجاپور علم و ہنر کا مرکز بن گیا تھا۔اس کے علم و فضل کی وجہ سے لوگ اسے ''جگت گرو'' کہتے تھے۔اس نے بیجاپور کے مغرب میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام ''نورس پور'' تھا۔ابراہیم خود ایک اچھا شاعر تھا فارسی اور دکنی میں شاعری کرتا تھا۔دکنی میں گیتوں کا ایک مجموعہ ''کتاب نورس'' ملتا ہے۔اس میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق گیت لکھے گئے ہیں۔ہر گیت سے پہلے راگ کا نام دیا گیا ہے۔''کتاب نورس'' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زبان اس عہد کی مروجہ دکنی سے مختلف ہے۔اس میں سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے۔

ایک نار دیکھیا کھڑی سامنے　　　　پونم رات کی مکر چاندنی

چتاری چتر نہ سکے ہوئے مانی　　　　جیوں موج پر موج آوے پانی

برہ پھاٹی تو دیکھ چاٹاک دھاوے گا　　ابراہیم نسو جلگ ایسا پیو کہاں پاوے گا
سندھیاں کر سنگار اوب کنٹھ لاوے گا　　رات تھوڑی مدن بہوت اٹھ جاوے گا

10.2.3 عبدل؛

عبدل بھی اسی عہد کا شاعر ہے۔دکنی کے اکثر شعرا کی طرح دکن کی معاصر تاریخوں میں اس کے حالات زندگی نہیں ملتے۔عبدل

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے کا درباری شاعر تھا۔اس کی شعری یادگار ''ابراہیم نامہ'' ہے جو بقول پروفیسر سیدہ جعفر بیجا پور کا پہلا ادبی نقش ہے۔ابراہیم نامہ کی ابتدا میں شاعر کہتا ہے کہ بادشاہ نے اسے طلب کیا اور حکم دیا کہ ایک ایسی کتاب تیار کرو کہ جس سے شاعری میں ہمیشہ کے لیے تیرا نام رہ جائے۔بادشاہ کی یہ بات سن کر اس نے عرض کیا کہ میں عربی اور فارسی سے واقف نہیں ہوں صرف زبان ''ہندوی'' سے واقف ہوں۔بادشاہ نے جواب دیا کہ اسی زبان میں لکھی جائے۔اس حکم کی تعمیل میں اس نے مثنوی ''ابراہیم نامہ'' لکھی گئی۔ابراہیم نامہ کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ دکن کے اولین کارناموں میں سے ایک ہے۔اس کی اہمیت ادبی اور تاریخی ہے۔بیجا پور کے چھٹے فرماں روا ابراہیم عادل شاہ کا دور ''ابراہیم نامہ'' کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا ہے۔اس میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی مدح ہے۔اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔نفس مضمون کے بعض عنوانات حسب ذیل ہیں

تعریف سخاوت بادشاہ، شہر بیجا پور، دربار بادشاہ، نورس محل، مجلس بادشاہ، شکار، ہیبت لشکر، تعریف فیلان شاہی، تعریف اسپاں، تعریف باغ ، تعریف بہار، میزبانی، سالگرہ وغیرہ۔عبدل نے تشبیہات واستعارات اور تمثیلی انداز میں اپنا زورِ طبع دکھایا ہے۔

اڑی رات کوئل گگن بن اوپر   نکل دیس کا باز سیج صبح پر

پکڑ سورج چنگل سونکھ کرن رات   دسیا لال لوہو شفق گگن دھات

عبدل کی توضیحی شاعری سے اس کے زورِ بیان اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔''در تعریف نورس محل حضرت شاہ'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔اس خوب صورت اور پرشکوہ محل کی جگہ اب صرف اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں، لیکن اس کے حسن اور اس کی شان و شوکت کی پراثر تصویر ''ابراہیم نامہ'' میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی ہے۔

گگن سات سیڑھی ہومل جوڑ کر   نہ لگ محل نورس کے ایک کھن اوپر
ولے گگن آکر چھپے تس منجار   رہے طاق بندھیا ہو ہر ٹھارٹھار
جڑت نو رتن مل کندن زرنگار   سورج چاند مل کر جڑے نو سنار
گگن آرسا کر نو رس محل دھر   اپس روپ اس میں سو دیکھے نظر
سو جھاں سور ہو مکھ کلس درمیاں   بھرے ذات کی چھانھ ہو دیس جاں
زمیں سیس پر تھال لے کوٹ دھر   کنگورے برن آن موتی سو بھر
رکھیا جمک درمیاں نو رس محل جان   اجالا پریا دیس ہو جوت مان

10.2.4 صنعتی:

صنعتی کا نام سید حسن شاہ محی الدین تھا اور اس کے والد مرتضٰی قادری عرف شاہ حضرت تھے۔مرتضٰی قادری کے متعلق تذکرہ اولیائے دکن میں عبدالجبار ملکاپوری لکھتے ہیں کہ ''آپ حضرت شرف الدین صوفی القادری کے صاحب زادے ہیں'' ان کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ان کی طبیعت ابتدا ہی سے زہد وتقویٰ کی طرف مائل تھی ایک دن اتفاقاً ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی اور ان پر بھی جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔شاہ

وجیہہ الدین علوی کے خلف رشید شاہ عبداللہ گجراتی نے سلوک کی منزلوں میں ان کی دستگیری کی، جن کی وجہ سے ایک قلیل عرصہ میں وہ ''کامل'' ہوگئے۔انھوں نے گجرات سے بیجاپور کا سفر کیا اور جگت گرو ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور پہنچے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔صنعتی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہے۔قیاس کیا جاتا ہے کہ عادل شاہی دور کے اختتام سے پہلے اس کا انتقال ہو چکا تھا۔محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ کے دور میں اس کے موجود رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔اس کی دو مثنویاں منظر عام پر آئی ہیں۔''قصہ بےنظیر''اور دوسری مثنوی ''گلدستہ''۔نصیر الدین ہاشمی نے قصہ بےنظیر کا نام ''قصہ تمیم انصاری'' بھی بتایا ہے۔یہ مثنوی بارہ مقامات پر مشتمل ہے اور ہر مقام ایک نئی مہم کی داستان ہے اس مثنوی کا قصہ چوں کہ مذہبی نوعیت کا حامل ہے، جسے شاعر پاک قصہ کہتا ہے۔

یو قصہ عجب پاک ہے دل پذیر　　　جو پاکاں کیے ہیں جسے بےنظیر

اسی لیے دوسرے مثنوی نگاروں کی طرح مختلف عنوانات کے بجائے صنعتی نے انھیں مقام سے موسوم کیا ہے تا کہ صوفیانہ اصطلاح کا اثر مثنوی میں قائم رہے۔یہ ایک مہماتی طرز کا قصہ ہے۔اس میں صحابی رسول ﷺ تمیم انصاری کی سرگزشت بیان کی گئی ہے کہ کس طرح ایک رات ایک دیو انھیں اٹھا لے گیا۔کس طرح وہ دیوؤں، جنوں اور شیطانوں کے ملک میں پہنچے اور پھر کس طرح پرستان میں قیام کیا تھا۔اس کے بعد بھیانک صحراؤں، جنگلوں، پہاڑوں اور طلسماتی محلوں میں انھیں بڑے حیرت انگیز اور محیر العقل واقعات پیش آئے اور آخر کار تمام مہمات کو سر کرنے کے بعد حضرت تمیم انصاری حضرت خضر کی مدد سے مدینہ منورہ پہنچے اور جب اپنے واقعات بیان کیے تو اکثر لوگوں نے یقین نہیں کیا مگر حضرت علیؓ نے تصدیق فرمائی کہ آں حضرتؐ نے خبر دی تھی کہ تمیم انصاری دنیا کے عجائبات دیکھے گا۔صنعتی نے اپنے شاعرانہ تخیل کی بنیاد پر اس مسلسل داستان میں ندرت، تحیر اور انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔قصہ میں مذہبی تصورات کی کہیں نفی نہیں ہوئی ہے۔صنعتی نے قصہ کے درمیان مذہبی احکام اور عقائد کی توضیح کر کے انھیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

دوسری مثنوی ''گلدستہ'' ایک عشقیہ داستان ہے۔ملک مصر کا شہزادہ سیاحت کے لیے اپنے ملک سے روانہ ہوتا ہے۔سفر کے دوران مختلف حادثات پیش آتے ہیں۔بالآخر مصیبتیں اٹھا کر اور پریشانیوں سے دوچار ہو کر وطن کو کامیاب واپس آتا ہے۔صنعتی کی دونوں مثنویوں سے اقتباسات پیش ہیں۔

قصہ بےنظیر یا تمیم انصاری

حکایت کے راوی کر خوش قلم　　　چلاتا ہے یوں اس بیاں کا رقم
کہ حضرت علی یوں کیے حکم جب　　　تمیم انصاری کہے کھول سبب

جو ایسے میں یک دیو آ سخت تر | اوڑیاں داں نے لے مجھ ہوا کے اوپر
کیا میں جو اس کی طرف جب نگاہ | دسیا مجہ نین تل جہاں سب سیاہ
جسے تھا سینہ کھن نمن سخت تر | سگل تن پتھر دل و جڑنے بہتر
اتھے ہات اوس جھاڑ کینکر کے سار | ہن غار سا سیر تھا جوں پہاڑ

گلدستہ کا نمونہ یہ ہے

سنو اے سخن داں صاحب ہنر | ایتا اوبیاں کھول بولوں مگر
عجب یونزاکت بھریا یو بچن | کہ سن تازہ ترہوویں دل کے چمن
خوشی سوں چلیا شاہزادہ نکل | کہ اس کام آنے کا دل دھر شغل
وہ فعفور کے بارگاہ بیچ آ | کہا حاجباں کوں سلام ان نجھا
علیکی دیے اس جماعت تمام | پوچھے حال اس کا کیے انتظام
بیاں سو اپس کا کیا ان حضور | سنے بات سارے او حاجب ضرور
آ نگے او کہے اس کون آ بجا من | نصیحت کا سن تو ہمارا سخن

10.2.5 حسن شوقی؛

شیخ حسن نام اور تخلص شوقی تھا۔حسن شوقی کا شمار قدیم دکنی کے باکمال غزل گوشعرا میں ہوتا ہے۔اس کی غزلوں کے دیوان کے علاوہ دو مثنویاں ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''میزبانی نامہ'' ملتی ہیں۔حسن شوقی جنگ تالی کوٹ کی فتح کے موقع پر نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا۔اس سلطنت کے خاتمہ کے بعد وہ محمد عادل شاہ کے دور میں بیجاپور چلا آیا۔''میزبانی نامہ'' میں اس نے محمد عادل شاہ کی شادی کو موضوع بنایا ہے، جس سے اس کے درباری شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

حسن شوقی ایک مثنوی نگار اور بلند پایہ غزل گو تھا۔''فتح نامہ نظام شاہ'' دکنی اردو کی ایک قدیم مثنوی ہے جو چھ سو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔یہ اردو کی پہلی رزمیہ مثنوی ہے۔اس میں نظام شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے جنگ تالی کوٹ کی فتح کا سہرا اسی کے سر باندھا ہے۔اس مثنوی میں حسین نظام شاہ کے دربار، جنگی مناظر اور میدان کارزار کے ایسے مرقعے پیش کیے ہیں کہ واقعات آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتے ہیں۔

''میزبانی نامہ'' میں محمد عادل شاہ کی اس شادی کو موضوع بنایا ہے، جو نواب مظفر خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔اس مثنوی میں حسن شوقی نے جہاں محمد عادل شاہ کی دوسری خوبیاں بیان کی ہیں وہیں اس کی سخن فہمی اور سخن پروری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔''میزبانی نامہ'' میں حسن شوقی نے محمد عادل شاہ کے عہد کی بیجاپوری ثقافت کی اچھی مرقع کشی کی ہے۔اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں شادی بیاہ کی رسومات کس اہتمام اور توجہ کے ساتھ انجام دی جاتی تھیں۔محلات کی سجاوٹ، فرش کی صفائی، حوض، فوارے، عطریات، روشنی کے اہتمام، لباس و

زیورات اور سامان عیش وعشرت کی بڑی متحرک تصویریں اس مثنوی میں پیش کی گئی ہیں۔شادی کی رسومات' شہر گشت' کی تیاری اور پھر اس کی دھوم دھام' سواریوں کی آن بان' سپاہیوں کا دبدبا' جلوس کی رونق' بادشاہ اور مقربوں کے زرق برق لباس' آتش بازی کے پرنور نظارے' موسیقی کی دلفریبی' رقاصہ کی ہوش ربا ادائیں' کنیزوں کی خوش پوشاکی' زرو جواہر کی ریل پیل اور عادل شاہی محلات کے پورے ماحول کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔آخر میں دولہا کے لیے دعا پر میزبانی نامہ کو ختم کیا گیا ہے۔اپنے موضوع کے ساتھ حسن شوقی نے اس خوبی کے ساتھ انصاف کیا ہے کہ ان کا فن اس مثنوی میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔شادی کی تقریب پر لکھی ہوئی اس مثنوی کی پوری فضا پر ایک طربیہ اثر چھایا ہوا ہے۔شاعر کا پرجوش لب ولہجہ' مناسب وموزوں لفظیات' محاکات اور بدلتی ہوئی تصویروں نے میزبانی نامہ کو ایک بھرپور شادی نامہ بنادیا ہے۔ایک گزرے ہوئے زمانہ کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی آئینہ داری نے اس مثنوی کو اہم بنادیا ہے۔

حسن شوقی ایک باکمال مثنوی نگار کے علاوہ بلند پایہ غزل گو بھی تھا۔بہ حیثیت ایک غزل گو دکنی اردو کے شاعروں میں اسے سب سے زیادہ اہمیت وافضلیت حاصل ہے۔اس کی غزلیہ شاعری میں مٹھاس' شگفتگی اور پختگی ملتی ہے۔پروفیسر سیدہ جعفر ''تاریخ ادب اردو 1700ء تک'' (جلد دوم) میں رقم طراز ہیں کہ حسن شوقی کا تغزل دکنی غزل گوئی کی اس روایت کی ابتدا ہے جس کا کمال ولی کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ حسن شوقی کی غزلیں اپنے مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے اسی نقطہ عروج کا آغاز معلوم ہوتی ہیں۔حسن شوقی نے اپنی غزلوں کو دل نشیں استعاروں اور خوب صورت تشبیہوں سے سجایا ہے۔یہ تشبیہات اس ہندوستانی ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں جس میں شاعر کے شعور نے نشوونما پائی ہے''۔

غزل کے چند شعر پیش ہیں۔

جاناں تجے جو دیکھت جگ چھند بھری کتے ہیں — کوئی حور، پدمنی کوئی، کوئی شہپری کتے ہیں

میں تجہ فراق سیتی رو رو سمندر بھریاں ہوں — کوئی گنگ، کوئی جمنا، کوئی ساوری کتے ہیں

تجہ مکھ کنول کنولے بدل جگ میں سرنگ لالا ہوا — تجھ زلف تھے اُپجے بھنور درجے بھونگ کالا ہوا

10.2.6 علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ؛

مملکت بیجاپور کا آٹھواں فرماں روا سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا حکمران تھا بلکہ قدیم دکنی زبان کا ایک صاحب دیوان شاعر اور سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔اس کی ماں ایک معمولی عورت تھی،لیکن محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو نے جو محمد قطب شاہ کی دختر اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی اس کی پرورش اور تربیت اپنی اولاد کی طرح کی۔یہی وجہ ہے کہ شاہی کو بچپن ہی سے علم وادب اور شعروسخن کا ذوق تھا۔اس نے کم وبیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔اس کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ' قصیدوں اور مثنویوں کے علاوہ گیت' دوہرے اور جھولنا ملتے ہیں۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے شاہیؔ دبستان بیجاپور کے اہم متغزلین میں شمار ہوتا ہے۔علی عادل شاہ ثانی شاہی نے محمد قلی قطب شاہ کی طرح ایک سے زائد تخلص استعمال کیے ہیں۔گیت کی رنگین اور شگفتہ صنف میں اس نے موضوع اور

فضا کی مناسبت سے مدنؔ روپ تخلص سے بھی کام لیا ہے۔ مراثی اور غزل میں کہیں علی عادل شاہ اور مظفر علی شاہ تخلص بھی ملتا ہے۔ شاہی کے کلام میں قصائد کے علاوہ مراثی، فردیات، نظمیں، رباعی، گیت اور مثنویاں سب ہی اصناف سخن موجود ہیں۔ شاہیؔ کے کلام میں مقامی تہذیبی روایات اور مقامی ماحول کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ اس نے اپنے تجربات زندگی، مشاہدات اور احساسات کو سادگی اور روانی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے ۔

قصیدہ :

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل　　　عقل معلم اپن قصہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے، عقل ہمہ کار ہے　　　عقل کا جاسوس ہو مکھ پہ اچھے یو کرن
عقل کسوٹی ہوئی طبع کے کسنے بدل　　　خوب دساوے جھلک در جگ در عدن
عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بھتر　　　بوجھ رکھیا ہے صراف قلب کیرا جیو کنچن

غزل :

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو　　　یاقوت ہور مرجان میں کو ہے رتن برتر کہو
یاقوت اور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل　　　سن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

مرثیہ:

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے　　　جگ منے جوں ہیں ابھالاں ہائے ہائے
نت کریں عادل علی یک دل ستی　　　شہ کا ماتم ماہ و سالاں ہائے ہائے

10.2.7 نصرتیؔ؛

شیخ نصرت نصرتیؔ سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ نصرتی کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔ نصرتی علی عادل شاہ شاہیؔ کے بچپن کا ساتھی تھا اس لیے بادشاہ کے مزاج میں بھی دخیل تھا۔ اس کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ نصرتی کا خاندان دکن آ کر آباد ہو گیا تھا شائد اسی لیے مقامی لوگ اس کے خاندان کو باہر کا خاندان کہتے اور اس سے حسد کرتے تھے۔ بالآخر اسے شہید کر دیا۔

نصرتی کی تین مثنویاں گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری کے علاوہ غزلوں، قصائد اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان ملتا ہے۔ مثنوی گلشن عشق نصرتی کی اولین تصنیف ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1068ھ ہے۔ اس میں نصرتی نے کنور منوہر اور مد مالتی کی عشقیہ داستان نظم کی ہے۔ مثنوی کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جیسے حمد، نعت، منقبت، مدح گیسو دراز، مدح بادشاہ وغیرہ۔ ان تفصیلات کے بعد اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر باب کے شروع میں نصرتی نے ایک شعر لکھا ہے۔ عنوانات کے سارے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں اگر ان اشعار کو یکجا کر لیا جائے تو مثنوی کے قصے کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔

نصرتی کی دوسری تصنیف ''علی نامہ'' ہے۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جو 1076ھ میں لکھی گئی اس میں ان جنگی مہمات کا ذکر ہے، جو

سلطان علی عادل شاہ ثانی کو شیواجی مرہٹہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے اور مغلوں کے حملوں کی مدافعت میں پیش آئی تھیں۔اس مثنوی میں تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جنھیں بیان کرنے سے تاریخ بھی قاصر ہے۔اس طرح یہ مثنوی مورخوں کے لیے ایک اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔اس مثنوی میں نصرتی کے چھ بلند پایہ قصیدے بھی شامل ہیں۔

نصرتی کی تیسری مثنوی ''تاریخ اسکندری'' بھی ایک رزمیہ مثنوی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1083ھ ہے۔اس مثنوی میں نصرتی نے عادل شاہی سپہ سالار بہلول خاں اور شیواجی کے درمیان لڑی گئی جنگ کو موضوع بنایا ہے، جس میں شیواجی کو شکست اور بہلول خاں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔مثنوی اور قصیدے کے علاوہ نصرتی غزل اور رباعی میں بھی اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے۔

گلشن عشق :

جو سب نس تلک کھائے خون جگر — تو یک بھار لاتا ہوں روشن گہر
رھنا کر مشقت کی اپنی پچھان — شفق کر دکھاتا لہو کی نشان
کتا ہوں مشقت میری کھول میں — گہر کئیں نہ رکھتا ہوں بے ڈول میں
ہر یک سخت الماس کوں کر تلاش — بنایا ہوں لئی بار پھر پھر تراش
ہر یک رنگ پو جڑنے رتن بر محل — کیا ہوں کتے بار اپس لھو کا جل
ہر ایک سطر ہے گرچہ نیلم کی لڑ — معانی کے ہیں لعل یکس یک تے جڑ

علی نامہ:

کتا ہوں اتا فوج دہلی کی بات — چلی تھی دکن پہ کس دہات سات
کہ جس فوج کوں دیکھتے ہیں سچ — دسے نا کسے انتہا ہور اوچ
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل — نہا جس میں سردار اصحاب فیل
یک یک ملک کے نام آور جواں — دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں

غزل:

چندر بدن کھیا تو کہی منہہ سنبال بول — سورج مکھی کھیا تو کہی یوں نہ گھال بول
بولیا کہ تج فراق تھے کئی عاشقاں خراب — بولی کہ میرے وصل منے کیا ہے حال بول
بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام — بولی بتاں کے ہت سے ٹوٹے تو حلال بول

10.2.8 ہاشمی بیجاپوری؛

سید میراں میاں خاں ہاشمی علی عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا وہ مہدوی مذہب کا پیرو تھا اور سید شاہ ہاشمی کا مرید تھا۔مورخوں کا بیان ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھا۔بیجاپور کے زوال کے بعد اس نے ارکاٹ میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ ہاشمی ایک قادرالکلام اور پر گو شاعر تھا۔اس نے

غزل، ریختی، قصیدہ اور مرثیے میں طبع آزمائی کی تھی۔ہاشمی کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی ''یوسف زلیخا''، مثنوی عشقیہ، معراج نامہ، مخمس در نعت و مدح مہدی جونپوری، قصائد اور ہجویہ مثنوی شامل ہیں۔

مثنوی ''یوسف زلیخا'' ہاشمی کی سب سے ضخیم مثنوی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1099ھ ہے۔یہ مثنوی ہاشمی نے اپنے مرشد کی فرمائش پر قلم بند کی ہے۔ہاشمی نے اس میں یوسف زلیخا کے روایتی قصے کو نظم کیا ہے۔مثنوی مختلف فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔فصلوں کے عنوانات اشعار میں ہیں جنہیں یکجا کرنے سے مربوط نظم بن جاتی ہے۔اس مثنوی کا بنیادی وصف اس کی سادگی اور سلاست ہے۔مثنوی یوسف زلیخا کو بیجا پور کی مثنویوں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں اپنے عہد کے سماجی مظاہر کی بڑی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔اس زمانے کے مختلف قسم کے پکوان، مشروبات، رہن سہن کے طریقے، لباس، زیورات اور آداب محفل کو ہاشمی نے اپنی اس مثنوی میں محفوظ کر دیا ہے۔

''مثنوی عشقیہ'' ہاشمی کی دوسری اہم مثنوی ہے۔اس میں کشمیر کی شہزادی اور ایک معمولی نوجوان کے عشق کی المیہ داستان اور ایک بقال زادے سے شیخ سعدی کی محبت کے قصے کو باہم مربوط کر کے پیش کیا ہے۔

''معراج نامہ'' میں ہاشمی نے معراج کے واقعات کو موضوع بنایا ہے۔یہ ایک عوامی انداز کی مثنوی ہے جو محفلوں میں پڑھ کر سنانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔

ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کر کے 1961ء میں شائع کیا۔ہاشمی کے دیوان میں ریختی کے انداز کی غزلوں کے علاوہ مسلسل ریختیاں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔اسے ریختی کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جا سکتا ہے۔اس نے عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے اشعار میں دکنی عورتوں کی آواز اور ان کا لب ولہجہ صاف سنائی دیتا ہے۔

ہاشمی نے دو قصیدے بھی لکھے تھے جو ذوالفقار خاں صوبے دار ارکاٹ کی مدح میں ہیں۔ایک مختصر مثنوی ''ابیات ہندی تصنیف ہاشمی'' کے عنوان سے ہے۔یہ ایک ہجویہ مثنوی ہے جس میں شاہ داول کی مذمت کی گئی ہے اور عورتوں کو نصیحت کی باتیں بتائی گئی ہیں۔

نمونہ کلام پیش ہے۔

قصیدہ یا غزل اپنی کہیں جب شوق سوں اپنے	کہوں ہر بیت کوں دو دو طلب سوں کا ندیتی ہوں
جاتا سوں اے مسافر رہنے کی بھی خبر ہے	آیا اتا کدھر سوں جاتا سو کہو کدھر ہے
سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی	بہانا کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
اونوں یاں آ کیئں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں	اٹھلتی اور مٹھلتی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی

10.2.9 مرزا:

تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد دوم) میں پروفیسر سیدہ جعفر رقم طراز ہیں کہ ''بساتین السلاطین'' میں ابراہیم زبیری نے علی عادل شاہ ثانی کے دربار سے متوسل شعرا کا ذکر کرتے ہوئے مرزا کا بھی نام لیا ہے۔مرزا نے سوائے مرثیہ نگاری کے کسی دوسری صنف میں دلچسپی نہیں

لی۔اس نے خود کو حمد رب العالمین' نعت سید المرسلین اور منقبت ائمہ طاہرین کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بیجا پور میں اس کے مرثیے زبان زد خاص و عام تھے۔مرزا حب اہل بیت سے سرشار تھا اور ہر وقت مدح ائمہ طاہرین میں مصروف رہتا تھا۔تمام عمر کسی امیر یا بادشاہ کی مدح نہیں کی ۔مرزا نے مرثیہ گوئی کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا تھا اور نہ وہ اس سے قرب شاہی یا مالی منفعت حاصل کرنا چاہتا تھا۔مرزا کی زندگی کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ شب عاشور وہ رات بھر مرثیہ خوانی کرتا رہا صبح کے وقت کسی دشمن نے اسے خنجر سے شہید کر دیا۔دوسرے دن یوم عاشور تھا عادل شاہ نے حکم دیا کہ شہر کے تمام تعزیے اور علم ابراہیم پور کے دروازے سے جو فتح پور دروازہ کے نام سے موسوم تھا لے جائے جائیں۔تعزیوں اور علم کے پیچھے مرزا کا جنازہ روانہ ہوا۔ بیجا پور میں مرتضیٰ قادری کی درگاہ کے باہر پیوند خاک ہوا۔

مرزا کے مراثی کی ایک اہم خصوصیت ان کا تسلسل ہے۔حضرت قاسم کا مرثیہ 1223 اشعار پر محیط ہے ۔اس میں مرزا نے حضرت قاسم کی شہادت کی تفصیلات مسلسل نظم کی ہیں ۔ابتدا میں حضرت قاسم کی بہادری کی تعریف کی ہے پھر ان کے بھائی عبداللہ کی شہادت مختصراً بیان کی ہے۔حضرت قاسم کے بازو پر بندھے تعویذ کا پس منظر' امام حسین سے آخری رخصت' قاسم ابن حسن کی شادی' میدان جنگ کو روانگی' ارزق کے چاروں بیٹوں سے جنگ اور پھر حضرت قاسم کی شہادت بیان کی گئی ہے۔اس طرح کا سب سے طویل اور مسلسل مرثیہ سب سے پہلے احمد جگراتی اور پھر مرزا کے یہاں نظر آتا ہے۔ورنہ دکنی ادب میں عام طور سے چھوٹے چھوٹے مرثیے غزل کی ہئیت میں نظم کرنے کی روایت تھی۔ مرزا کے مرثیوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اجزائے مرثیہ کے اعتبار سے مرثیے لکھے ہیں،جیسے رخصت' آمد' رجز اور جنگ جیسے اجزائے مرثیہ جو بہت بعد میں شمالی ہند میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

مرزا کے مرثیوں میں شعری سانچوں کا تنوع نظر آتا ہے۔مرزا نے مختلف بحروں سے کام لیا ہے۔حضرت حر کو مرثیہ قصیدے کے فارم میں ہے جس میں مثنوی کی طرح قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔مرزا کے طویل مرثیے مربع کے فارم میں بھی ہیں اور غزل کی ہئیت میں بھی۔ مرثیوں سے اقتباسات پیش ہیں۔

آمد:

کیے قاسم کوں رخصت جب چڑے تازی پہ غازی تب
ملک دیکھ آہ مارے سب کرو زاری مسلماناں
دیکھو تب قاسم شہہ جاں ترنگ چڑ دل اوپر آوان
کیے اس کرن منے جولاں کرو زاری مسلماناں

رجز:

دیکھو جد ہیں منجے ویسے محمد ہور علی ایسے
سو جدہ فاطمہ جیسے کرو زاری مسلماناں
پدر میرا دو جگ رہبر حسنؑ ابن علیؑ صفدر
یو عمو ہے حسینؑ سرور کرو زاری مسلماناں

جنگ:

غضب میں آ وہ غازی تب سؤ بھاوے دَل میں تازی تب
کیے یوں شاہ بازی تب کرو زاری مسلماناں
اچا پیادیاں سواراں پر سٹے بھاراں کوں بھاراں پر
کیے یک ہات ہزاراوں پر کرو زاری مسلماناں

شہادت:

تب اس یک تن پہ ساراں کئی ہر یک جن سے ہتیاراں کئی
کیے چو پھر سوں واراں کئی کرو زاری مسلماناں
لگے بے حد زخم تن پر نکس ہو قاسم رہبر
پڑے وئیں رَن میں شیر نر کرو زاری مسلماناں
پڑے جب رن میں ہو پر خوں اپس عموئے سرور کوں
پکارے تب یو نعرے سوں کرو زاری مسلماناں
حسین اس غم سوں رورو کر سو قاسم کا مبارک سر
لیے زانو پہ تب سرور کرو زاری مسلماناں

عادل شاہی دور کے شاعروں نے اگر چہ قصیدہ، غزل، رباعی اور مرثیہ کی صنف پر بھی توجہ دی ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی مثنوی کی صنف ہی غالب نظر آتی ہے۔ عادل شاہی دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی گئی چوں کہ اس دور کی کم و بیش تمام نثری تصانیف صوفیائے کرام کی نگارشات ہیں اس لیے ان پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ نثری تصانیف میں برہان الدین جانم کا نثری رسالہ کلمۃ الحقائق اسی دور میں لکھا گیا۔ نثر کی روایت کو آگے بڑھانے میں جانم کے خلیفہ شیخ محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ کے نثری رسائل نے بھی اہم خدمت انجام دی۔

10.3 اکتسابی نتائج

☆ عادل شاہی دور دکن کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ 895ھ سے 1098ھ تک اس خاندان کے نو حکمرانوں نے مملکت بیجا پور پر نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ عادل شاہی حکمران علم و ادب اور فنون لطیفہ کے شائق تھے۔ انہوں نے علما، فضلا، شعرا، ادبا اور اہل ہنر کی قدر دانی اور سرپرستی کی۔

☆ عادل شاہی حکومت میں دکنی زبان اور شعر و ادب کو بے مثال ترقی حاصل ہوئی۔

☆ حسن شوقی، شاہی، نصرتی اور ہاشمی اس دور کے نمائندہ شعرا ہیں جنہوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا

منوایا ہے۔

☆ شاہی کے علاوہ دیگر شعرا نے مثنوی نگاری میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے،لیکن شاہی نے غزل گوئی اور قصیدہ نگاری میں اپنا لوہا منوایا ہے۔

☆ حسن شوقی کی مثنوی میزبانی نامہ،فتح نامہ نظام شاہ،نصرتی کی گلشن عشق اور علی نامہ،ہاشمی کی یوسف زلیخانہ صرف دبستان بیجاپور کی شاہ کار مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں بلکہ اردو مثنوی کی تاریخ میں بھی اہم مقام کی مستحق ہیں۔

☆ مرزا اس دور کے مشہور مرثیہ گو شاعر ہے۔

10.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
خود مختار	آزاد،با اختیار
ثقافت	تہذیب، کلچر
مستحکم	مضبوط
بہرہ مند	فائدہ اٹھانے والا
صناعی	ہنرمندی، کاریگری
دقیقہ اٹھا نہ رکھنا	کسر نہ چھوڑنا
فرماں روا	حاکم، بادشاہ
ناچاقیاں	ان بن، بگاڑ
باکمال	کمال رکھنے والا
رزمیہ	جنگی داستان یا نظم
مورخ	تاریخ لکھنے والا
ریختی	وہ شاعری جو عورتوں کی زبان میں کی جائے

10.5 نمونہ امتحانی سوالات

10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور تصنیف کون سی ہے؟

2۔ نصرتی کی رزمیہ مثنوی کا نام کیا ہے؟

3۔ حسن شوقی کی مثنویوں کے نام بتایئے۔

4۔ ’’علی نامہ‘‘ کس کی تصنیف ہے؟

5۔ مثنوی یوسف زلیخا کے مصنف کون ہیں؟

6۔ ریختی کسے کہتے ہیں؟

7۔ شیخ نصرتی کا پورا نام کیا تھا؟

8۔ بیجاپور کا مشہور مرثیہ گو شاعر کون ہے؟

9۔ مثنوی ''یوسف زلیخا'' کی سن تصنیف کیا ہے؟

10۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ عادل شاہی دور کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بارے میں لکھیے۔

2۔ عادل شاہی دور کی کسی ایک مثنوی کا جائزہ لیجیے۔

3۔ ہاشمی بیجاپوری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

4۔ سب رس پر ایک نوٹ لکھیے۔

5۔ مرزا کی مرثیہ نگاری کے بارے میں لکھیے۔

10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ نصرتی کی ادبی خدمات تفصیل سے بیان کیجیے۔

2۔ عادل شاہی دور کی مثنویوں کا جائزہ لیجیے۔

3۔ ذیل کے کسی دو شاعروں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1۔حسن شوقی 2۔شاہی 3۔مرزا 4۔ہاشمی

10.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
3۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
4۔	تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد دوم، سوم)	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
5۔	دکنی کی تین مثنویاں	پروفیسر محمد علی اثر

اکائی 11: قطب شاہی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

11.0		تمہید
11.1		مقاصد
11.2		قطب شاہی دور کا سماجی اور تمدنی پس منظر
	11.2.1	قطب شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا
	11.2.2	محمد قلی قطب شاہ
	11.2.3	اسد اللہ وجہی
	11.2.4	عبداللہ قطب شاہ
	11.2.5	جنیدی
	11.2.6	غواصی
	11.2.7	ابن نشاطی
11.3		اکتسابی نتائج
11.4		کلیدی الفاظ
11.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	11.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	11.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	11.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
11.6		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید

اردو ادب کی تاریخ میں قطب شاہی دور کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔اس سلطنت کے تمام حکمران علم و ادب کے دل دادہ اور شاعروں اور فن کاروں کے قدر دان تھے۔ بیشتر سلاطین جیسے جمشید قلی، محمد قلی، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد کو دکنی ادب کی تاریخ کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔محمد قلی قطب شاہ ایک پر گو اور قادر الکلام شاعر تھا۔اس کے دور کے اہم شعرا میں وجہی، غواصی اور ابن نشاطی کے نام اہم ہیں۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو قطب شاہی دور میں اردو ادب سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ قطب شاہی دور کے سماجی اور تمدنی پس منظر کا جائزہ لیں۔

☆ اس دور کے اہم شعرا اور نثر نگاروں کی خدمات پر روشنی ڈالیں۔

11.2 قطب شاہی دور کا سماجی اور تمدنی پس منظر

بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد دکن میں جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں سلطنت گولکنڈہ کو اس کے محل وقوع، خوش گوار آب و ہوا، سیاسی استحکام، معدنی دولت، تہذیب وشائستگی، فنون لطیفہ کے فروغ اور علم و ہنر کی سرپرستی کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل ہے۔قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان محمد قلی کے آباواجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔اس خاندان کے بعض افراد ترکستان سے ایران اور پھر ہندوستان منتقل ہو گئے تھے۔سلطان محمد قلی بہمنی خاندان کے فرماں روا محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں بیدر آیا اور دربار شاہی میں ملازمت اختیار کر لی۔سلطان قلی نے اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت بڑی ترقی کی۔1496ء میں اس کو تلنگانہ کا گورنر بنایا گیا۔اپنی گورنری کے زمانے میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے تلنگانہ کے عوام میں کافی مقبولیت حاصل کی۔جب بہمنی سلطنت کو زوال ہوا تو اس نے 1518ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔سلطان قلی کو بڑھاپے میں اس کے بیٹے جمشید قلی نے قتل کروایا اور جمشید قطب شاہ کے نام سے (1543ء۔1550ء) تخت نشین ہوا۔جمشید کی موت پر سلطان قلی کا چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب شاہ (1550ء) تخت نشین ہوا۔ابراہیم کے عہد میں گولکنڈہ کو بڑا استحکام حاصل ہوا۔اس نے نظم ونسق میں مفید اصلاحیں کیں۔اس کے دور میں دکنی کلچر کا خمیر اٹھا اور ایک گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ابراہیم نے ہندوستان اور ایران کی تہذیبوں کے امتزاج سے ایک ایسے نئے کلچر کی تعمیر وتشکیل کی جو مقامی عناصر اور عجمی تصورات کا خوب صورت امتزاج تھا۔ابراہیم کی زندگی کا ایک بڑا حصہ چوں کہ ایک تلگو ریاست وجیانگر میں بسر ہوا تھا اس لیے اس کے مزاج میں مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے تعلق سے مروت اور رواداری کے جذبات موجود تھے۔یہی وجہ ہے کہ ابراہیم قلی قطب کے عہد میں تلنگانہ میں بسنے والے مختلف طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔

ابراہیم قلی کو فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ تلگو زبان سے بھی دلچسپی تھی۔تلگو شاعروں میں وہ بالعموم ''ملک برام'' کے نام سے مشہور تھا۔اس نے اپنے عہد حکومت میں علم و ہنر اور شعر وادب کی ترقی اور فروغ سے دلچسپی لی اور گولکنڈے میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جو بعد میں بھی علم وادب کی ترقی کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ابراہیم کے عہد میں بادشاہ کی علم دوستی کا چرچا سن کر احمد نگر، گجرات اور بیدر سے بہت سے شعرا اور اہل علم وحرفہ نے گولکنڈہ کا رخ کیا اور یہیں کے ہو رہے تھے۔قطب شاہی دور کے اولین شعرا فیروزؔ، محمودؔ اور ملا خیالیؔ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم کے انتقال کے بعد محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں تخت نشین ہوا۔اس کا دور حکومت گولکنڈے کا عہد زریں ہے۔وہ خود ایک صاحب دیوان اور بلند پایہ شاعر تھا۔اس نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی اور ریختی وغیرہ میں طبع آزمائی کر کے اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا تھا۔محمد قلی کو فن تعمیر، شاعری، موسیقی، نقاشی، خطاطی اور مصوری سے غیر معمولی شغف تھا۔اس نے جب شہر حیدرآباد بسایا تو تعمیر کاری، تزئین وآرائش

اور دولت وثروت کے اعتبار سے اسے ایک بے مثل شہر بنایا۔شاعروں' ادیبوں اورفن کاروں کی قدر افزائی اور سر پرستی کرنے میں اس نے کوئی کسرنہیں اٹھا رکھی، جس کی وجہ سے اس وقت کے مشہور علما' شعرا اور ادیب اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔گجرات کے مشہور شاعر شیخ احمد گجراتی اسی کے دور میں گولکنڈہ آئے تھے۔اسداللہ وجہی اسی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔

محمد قلی کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔وہ بڑا علم دوست حکمران تھا محمد قلی کے دیوان پر اس کا منظوم دیباچہ اس کے کلام کا واحد نمونہ ہے۔محمد قطب شاہ ایک خدا پرست اور دین دار بادشاہ تھا اس لیے اس کے دور میں مذہبی امور کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔اسی نے حیدرآباد کی تاریخی مسجد'' مکہ مسجد'' کی بنیاد رکھی۔اسے کتابیں جمع کرنے اوران پر اپنی رائے تحریر کرنے یا دستخط ثبت کرنے کا شوق تھا۔اس نے اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا فرزند عبداللہ قطب شاہ 1626ء میں گولکنڈہ کا حکمران بنا۔اس کا عہد حکومت (1626ء تا1672ء)سب سے طویل تھا۔اس کے عہد میں گولکنڈے کی تہذیبی سرگرمیوں کا دوبارہ احیا ہوا جوشعرا اورفن کار سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں گوشہ نشین ہو گئے تھے وہ پھر منظر عام پر آ گئے۔عبداللہ قطب شاہ کے مزاج اور کردار میں اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ سے بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی تھی۔غواصی نے لکھا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشین ہونے سے ایسا معلوم ہورہا ہے گویا محمد قلی دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا داماد ابوالحسن تانا شاہ 1672ء میں گولکنڈہ کا آخری تاجدار بنا۔تانا شاہ کا دور اگرچہ گولکنڈہ کے زوال کا دور ہے،لیکن شعروادب کی ترقی کے سلسلہ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔بادشاہ خود بھی شعر کہتا تھا اور اپنے دور کے شاعروں اور ادیبوں کا سرپرست تھا۔فائز' طبعی اور عابد شاہ حسینی اسی دور کے شاعر وادیب ہیں۔بالآخر سقوط گولکنڈہ نے اردو ادب کے ایک زریں دور اور ایک دبستان کا خاتمہ کر دیا۔

11.2.1 قطب شاہی دور میں شعروادب کا ارتقا

قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں فیروز' محمود اور خیالی کے نام ملتے ہیں۔یہ تینوں شعرا ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔قطب الدین فیروز دراصل بیدر کا باشندہ تھا اور بعد میں گولکنڈہ چلا آیا تھا۔فیروز کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔مگر اس کی شاعری کی عظمت اور استادی کا اعتراف گولکنڈے کے شعرا وجہی اور ابن نشاطی نے کیا ہے۔اس کی تصانیف میں ایک مختصر مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔فیروز کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ بعد کے زمانہ میں ولی کی دہلی میں۔

فیروز کی طرح سید محمود اور ملا خیالی بھی قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔وجہی' محمد قلی اور ابن نشاطی نے انھیں عظیم المرتبت شاعر اور استاد سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔محمود کے کلام کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' (جلداول) میں محمود کی چند غزلیں اور بعض غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں۔ملا خیالی کی صرف ایک ہی غزل دستیاب ہوئی ہے۔

11.2.2 محمد قلی قطب شاہ؛

گولکنڈے کا پانچواں حکمران محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں تخت نشین ہوا۔اس نے شہر حیدرآباد بسایا اور اس شہر میں بسنے والے مختلف

طبقوں کے درمیان خلوص اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترویج کی۔محمد قلی قطب شاہ کوایک مستحکم اور طاقتورحکومت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔اس کا دورحکومت مجموعی طور پر امن وامان میں گزرا۔اس کے دور میں ایران کے مشہور عالم اور مدبر میر مومن حیدرآباد میں تھے،جنہیں اس نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا سلطنت کے بیشتر کاروبار کی نگرانی میر مومن ہی کے سپرد تھی۔یہی وجہ ہے کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی الجھنوں سے آزاد رہ کر بڑی حد تک عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔

محمد قلی قطب شاہ دکنی اردو کا ایک قادرالکلام شاعر تھا۔موجودہ معلومات کی روشنی میں محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے،جس کو اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔اس کے دیوان میں غزلیں‘ قصیدے‘ مثنویاں‘ مرثیے‘نظمیں‘ رباعیاں تقریباً سبھی اصناف سخن موجود ہیں،لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔

محمد قلی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگیٔ بیان ہے۔اس نے اپنے جذبات‘ احساسات اور تجربات زندگی کو سادگی‘ روانی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔محمد قلی کی شاعری گویا اس کی زندگی کا آئینہ ہے،جس میں اس کے واقعاتِ حیات کی متحرک تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔وہ ایک کثیرالمحبوب شاعر تھا۔مورخوں کا بیان ہے کہ بیسیوں ملکوں کی حسینائیں اس کے محل میں جمع تھیں۔محمد قلی نے انہیں مختلف نام بھی دیے تھے اور ان میں سے بعض محبوب حسیناؤں کا ذکر تفصیل سے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔محمد قلی کے کلام میں درد وغم اور ہجر وفراق کی کیفیات کی ترجمانی نہیں ملتی۔اس اعتبار سے وہ اردو کا ایک منفرد شاعر ہے،جس کے کلام میں ہر جگہ آسودگی اور وصال کی کیفیات کی تصویریں ملتی ہیں۔

محمد قلی کی شاعری اپنے عہد کے تہذیبی عناصر کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔اس نے اپنے دور کے لباس‘ زیورات‘ طرز معاشرت اور ثقافت سے متعلق جو معلومات اپنے اشعار میں پیش کی ہیں وہ ہماری تہذیب کے بیش بہا خزانے ہیں جنھیں اشعار کی صورت میں محمد قلی نے ہمیشہ کے لیے تاریخ وثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔اس نے اپنی شاعری میں اپنے محلوں کا ذکر بھی کیا ہے اپنے ہاتھی گھوڑے پر بھی نظمیں کہی ہیں۔شادی بیاہ کے رسوم ورواج‘ عیدوں‘ تہواروں‘ موسموں کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات کو بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔یہ ساری تقاریب خواہ مذہبی نوعیت کی ہوں یا موسمی تہواروں کی‘ محمد قلی کے لیے عیش وعشرت کے ایک تازہ عنوان کی حیثیت رکھتی تھیں اور وہ خدا کا شکر کرتا ہے کہ نبیؐ اور علیؑ کے صدقے سے دن رات عیش کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔

محمد قلی کا کلام اس کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا بھی مظہر ہے۔اس نے دکن کے ذرے ذرے سے محبت کی۔اس سرزمین کے موسموں‘ پہاڑوں اور دریاؤں اور یہاں کے شب وروز سے اسے والہانہ وابستگی تھی۔ہندوستانی معاشرت‘ ہندوستانی طرز زندگی‘ یہاں کے رسم ورواج اور ثقافتی میلانات محمد قلی کے طرز فکر میں اتنے رچ بس گئے تھے کہ جگہ جگہ یہ عناصر اپنا پرتو دکھاتے ہیں۔کلام سے اقتباسات پیش ہیں۔

مناجات:

مناجات میرا تو سن یا سمیع　　مجے خوش توں رک رات دن یا سمیع
میرے دوستاں کوں تو نت دے جنت　　میرے دشمناں کوں اگن یا سمیع
میرا شہر لوگاں سوں معمور کر　　رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

عیدمیلادالنبی:

درود لک اس نبی پر جو نرنجن رب کے پیارے ہیں جو فیروزی مہاڑیاں نوجنن کے تئیں سنگارے ہیں
انن دن مولود آئے خوش خبر قدسی جو پائے خوش پھرا مولود گنائے خوش جنت آٹو سنوارے ہیں

بسنت:

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

مرگ سال:

مرگ سال آئیا پھر تھے مرگ نینی سنگاراں کر جڑت مانگ بہوٹیاں لعل موتیاں لیک دھاراں کر

غزل:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

ہمیں ہیں بے ہنر' گر ہوئے نظر یار ہنر داراں میں دِیسیں گے ہنردار
دیا استاد منج تعلیم کچھ ہور ہمن کچھ دیکھ کر باندھے ہیں زنار
درد جانے حکیمِ خوب دانا ہمارا درد کیا بوجھیں گے اغیار

مرثیہ:

محرم مھینے میں آیا اماماں کا سوغم پھر کر زمیں ہور آسماں میانے بھریا سر تھے الم پھر کر

رباعی:

تج روپ بنا میری نظر میں سو نہ آوے تج کوچے میں بن منج کوں گزر کرنے نہ آوے
تج دور میں نیند سب کوں خوش آوے ولے منج نین منے نیند سو یک پل نہ سماوے

11.2.3 اسداللہ وجہی؛

اسداللہ وجہی قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور با کمال نثر نگار ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک بلند پایہ عالم اور فلسفی بھی تھا۔اس کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔غالباً وہ گولکنڈہ کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے عہد(1550ء۔1580ء) میں پیدا ہوا اور پھر اس نے مزید تین قطب شاہی سلاطین محمد قلی قطب شاہ (1580ء۔1611ء)' محمد قطب شاہ (1611ء۔1626ء)اور عبداللہ قطب شاہ(1626ء۔1674ء) کا زمانہ بھی دیکھا۔وجہی نے مثنوی قطب مشتری' تاج الحقائق' سب رس اور فارسی دیوان کے علاوہ چند غزلیں اور مرثیے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اسے بے حد عزیز رکھتا تھا اس نے وجہی کو اپنے دربار کا '' ملک الشعرا'' مقرر کیا تھا۔اس دور میں وجہی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔وہ بادشاہ وقت کا دست راست بن گیا تھا۔اسی دور میں اس نے اپنی شاہ کار مثنوی '' قطب مشتری'' (1018ھ م1609ء) لکھی۔یہ وجہی کی طبع زاد مثنوی ہے۔اس مثنوی کو وجہی نے صرف بارہ دن میں مکمل کیا۔اس کا موضوع قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان عشق ہے۔مثنوی کا آغاز حمد، مناجات اور نعت و منقبت سے ہوتا ہے۔اس کے بعد مدح بادشاہ ہے پھر وجہی نے '' درشرح گوید'' کے تحت شاعری سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں، جس سے اس کے تنقیدی تصورات کی عکاسی ہوتی ہے۔اس مثنوی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کم و بیش تمام کرداروں کے نام محمد قلی قطب شاہ کے خاندانی نام'' قطب'' کی مناسبت سے ستاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں، جیسے مشتری، عطارد، زہرہ، مریخ وغیرہ۔وجہی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔اس مثنوی میں وجہی نے انسانی جذبات کی تصویر کشی، کردار نگاری اور منظر نگاری کے دل کش مرقع پیش کیے ہیں۔قطب مشتری میں مثنوی کے درمیان وجہی نے رباعیاں اور غزلیں بھی کہی ہیں اور یہ رباعیاں اور غزلیں متن کے جزو کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وجہی صرف ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے دور کا ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھا۔وجہی کی نثری تصنیف '' سب رس'' ہے۔اس کتاب کو وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045ھ م1635ء میں لکھا تھا۔اس کتاب کی وجہ سے وجہی کو شہرت اور عظمت حاصل ہوئی۔'' سب رس'' کو نہ صرف دکنی زبان میں بلکہ سارے اردو ادب میں پہلا ادبی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔حالاں کہ '' سب رس'' سے پہلے دکنی زبان میں نثری رسالے ملتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ادبی نہیں بلکہ مذہبی ہے۔'' سب رس'' وہ پہلی نثری کتاب ہے جو عشقیہ قصے پر مبنی ہے اور ادبی معیارات پر پوری اترتی ہے۔'' سب رس'' کا قصہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی نثری تصنیف '' قصہ حسن و دل'' سے ماخوذ ہے۔وجہی نے اپنی بے پناہ علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کتاب کو ایک تخلیقی تصنیف کا درجہ دے دیا ہے۔اس کا اسلوب مقفیٰ ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار ہے۔قصے کے دلچسپ عناصر، اس کی ادبی اور تخلیقی نثر، وجہی کا زور بیان اور اس کی انشا پردازی کے سبب یہ کتاب اردو نثر کے لازوال نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

'' سب رس'' ایک تمثیلی قصہ ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات اور انسانی صلاحیتوں اور قوتوں جیسے عشق، عقل، حسن، غمزہ، عشوہ، ناز، ناموس، ہمت، دل، نظر، خیال، وہم، صبر، وفا وغیرہ کو کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔یہ قصہ دو سطحوں پر آگے بڑھتا ہے۔ایک سطح ظاہری کہانی کا انداز لیے ہوئے ہے اور دوسری سطح علم باطنی سے متعلق ہے۔

'' سب رس'' کا قصہ ظاہری سطح پر آب حیات کی تلاش اور حسن و عشق کا بیان ہے۔مغرب میں سیستان نام کے ایک شہر میں بادشاہ عقل کی حکومت تھی۔اس بادشاہ کا ایک بیٹا تھا، جس کا نام دل تھا جو لیاقت، ہنر مندی، بہادری، عقل مندی اور حسن و جمال میں بے مثال تھا۔بادشاہ عقل نے اپنے شہزادہ دل کو شہر تن کی حکومت عطا کی تھی۔شہزادہ دل کو آب حیات کی تلاش تھی۔اس کا دوست نظر اپنے دوست کی خاطر آب حیات کی تلاش میں نکلتا ہے۔بالآخر اسے پتہ چلتا ہے کہ آب حیات شہزادی حسن کے شہر دیدار کے باغ رخسار کے چشمۂ دہن میں ہے۔نظر کسی نہ کسی طرح شہزادی حسن تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی حسن ایک ہیرے پر کندہ تصویر پر فدا ہے۔اتفاق سے وہ تصویر شہزادہ دل کی ہوتی ہے۔جب شہزادی حسن کو نظر سے شہزادہ دل کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ نظر سے درخواست کرتی ہے کہ کسی بھی طرح وہ شہزادہ

دل کو شہر دیدار لے آئے۔

یہاں سے قصہ آب حیات کی تلاش کے بجائے حسن و عشق کے بیان تک محدود ہو جاتا ہے۔نظر مملکت تن پہنچ کر شہزادہ کو نہ صرف آب حیات کی خوش خبری سناتا ہے بلکہ شہزادی حسن کی تعریف کچھ اس طرح کرتا ہے کہ دل شہزادی حسن کو دیکھے بغیر ہی اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور شہزادی حسن سے ملنے شہر دیدار چلنے تیار ہو جاتا ہے۔جب بادشاہ عشق کو اطلاع ملتی ہے تو وہ شہزادہ دل کو گرفتار کرنے کے لیے لشکر بھیجتا ہے۔شہزادہ دل گرفتار ہو کر شہزادی حسن کے پاس لایا جاتا ہے اور بادشاہ عشق کے حکم سے قید کر دیا جاتا ہے۔شہزادہ دل اور شہزادی حسن دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔رقیب کی بیٹی غیر کی سازش کی وجہ سے حسن اور دل میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور رقیب شہزادہ کو اپنے قید خانے ہجراں میں قید کر دیتا ہے،لیکن جب حسن کو حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شہزادہ دل بے قصور ہے تب وہ بہت پچھتاتی ہے۔ادھر عقل کے وزیر قامت کے ذریعے شہنشاہ عشق اور بادشاہ عقل میں صلح ہو جاتی ہے۔حسن کی درخواست پر بادشاہ عشق اپنی فوج بھیج کر شہزادہ دل کو رقیب کی قید سے نجات دلاتا ہے اور حسن اور دل کی شادی ہو جاتی ہے۔

ظاہری طور پر تو یہ حسن و عشق کا بیان ہے،لیکن داخلی سطح پر وجہی نے تصوف کے اسرار و رموز کو قصے کے طور پر بیان کیا ہے۔یعنی قصے کے ذریعے حسن حقیقی تک پہنچنے اور اس کا دیدار حاصل کرنے کے دوران پیش آنے والے واقعات اور کیفیات کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔وجہی نے قصے کے بیان کے ساتھ ساتھ پند و نصیحت کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔کلام سے اقتباسات پیش ہیں۔

قطب مشتری:

شہنشہ مجالس کیے ایک رات　　وزیران کے فرزند تے سب سنگات
ہر یک خوب صورت، ہر ایک خوش لقا　　سو ہر ایک دلکش ہر ایک دلربا
مہابت کے کاماں میں جم جم ہے جیو　　شجاعت کے کاماں میں رستم ہے جیو

نگر میں جو آیا قطب شاہ نول　　گگن بجنے چوندھر خوشیاں کے طبل
شہر میں سو عید آج لوگاں کیے　　گھرے گھر انند کاج لوگاں کیے

جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس　　بھلا ہے جو اک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس کیرے بات میں　　پڑیا جائے کیوں جز لے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فام نیئں　　اسے شعر کہنے سوں کچھ کام نیئں

اگر فام ہے شعر کا تجکوں چھند　　چنے لفظ لیا ہور معنی بلند

نکو بول مضمون تو ہور کا کہ کالا ہے دو جگ میں منہ چور کا
جتا چوری کر چور اپے ساؤ ہوئے دغا باز اچکے کوں مانے نہ کوئے
چرا کر چراتا نہ کی چور کوئی یو باتاں سمجھتے سو ہیں ہور کئی

11.2.4 عبداللہ قطب شاہ؛

عبداللہ قطب شاہ گولکنڈہ کا ساتواں تاجدار تھا۔ وہ محمد قطب شاہ اور حیات بخشی بیگم کا فرزند اور محمد قلی قطب شاہ کا نواسہ تھا۔ عبداللہ قطب شاہ 1023ھ میں پیدا ہوا اور 1083ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ گولکنڈہ میں مدفون ہے۔ عبداللہ قطب شاہ بھی اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح ایک قادرالکلام اور صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس نے شاہ عبدآ، عبدلاؔ، عبداللہ، قطب شاہ عبداللہ اور عبداللہ سلطان تخلص استعمال کیے ہیں۔

شاہ عبداللہ نبیؐ کے صدقے تیرے عشق میں یوں ہوا مشہور جگ میں جیوں ہے مشہور آفتاب
نبیؐ صدقے عبداللہ سلطان سوں ملا رکھ منج نت میرے ربنا
نبیؐ صدقے عبداللہ اوتار شہہ ہے خدا کن جو امید مانگیا سو پایا
صدقے نبیؐ کے شکر کرے شاہ عبدلا تج سا چڑھیا دیکھ ور شاہوار ہات

عبداللہ قطب شاہ کا دور امن و امان کا دور تھا۔ ادبی اعتبار سے یہ گولکنڈے کا سنہرا دور تھا۔ عبداللہ کے دربار میں ایسے نامور شعرا تھے جن کے ادبی کارناموں پر اردو ادب ناز کرسکتا ہے۔ اس نے محمد قلی قطب شاہ کے روایات کی پیروی کی اور انھیں حیات نو عطا کی۔ اسے اپنے نانا کی طرح موسیقی، ادب اور فنون لطیفہ سے طبعی مناسبت تھی۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی قدردانی و سرپرستی کی وجہ سے قطب شاہی دربار پھر سے شعر و نغمہ کی دلفریب صداؤں سے گونج اٹھا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کی علم دوستی اور جوہر شناسی نے ایران و توران اور شام و روم کے باکمالوں کو قطب شاہی پایۂ تخت آکر قسمت آزمانے اور علم و ادب کی خدمت کرنے کا موقع عطا کیا۔ فارسی کی مشہور لغت ''برہان قاطع'' اسی دور کی یادگار ہے۔ حضرت ابن خاتون نے ''کتاب الارشاد'' اور'' جامع عباسی'' پر حواشی لکھے ۔ ملا جمال الدین نے ''کتاب المصباح'' کو ملا علی ابن طیفور نے ''عیون اخبار رضا'' کو فارسی میں منتقل کیا۔ اور مولانا حسین آملی نے ''نہج البلاغہ'' کی شرح لکھی۔

عبداللہ قطب شاہ محمد قلی کی طرح باغ و بہار شخصیت کا مالک شاعر تھا اسی لیے شوخی، رنگینی و شادابی، پیرایہ اظہار کا بانکپن اور سحر طرازی اس کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا کی طرح فن موسیقی کا بھی دلدادہ تھا۔ اس کے اشعار صوری حسن کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس نے الفاظ کی جھنکار اور ان کی بندش سے اپنے کلام میں ایک ہلکی سی موسیقیت پیدا کی ہے۔ ترنم ریزی اور غنائیت سے اس کے اشعار معمور ہیں۔ بقول پروفیسر سیدہ جعفر'' عبداللہ قطب شاہ نے نہ صرف عملی زندگی میں اپنے نانا کی روایات کو نئی زندگی بخشی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کلام محمد قلی کی شعری روایات کا بھی پرستار تھا۔ جس طرح محمد قلی کے کلام کے دو عناصر یعنی مذہب پرستی اور عیش کوشی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں .اسی طرح ان عناصر کا پرتو عبداللہ قطب شاہ کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔''

11.2.5 غواصی:

غواصؔی قطب شاہی عہد کا ایک عظیم المرتبت اور قادر الکلام شاعر تھا۔غواصؔی کا نام شیخ عبدالطیف' لقب غواصی' کنیت ابو محمد اور تخلص غواصی تھا۔اس کی تاریخ پیدائش اور حالات زندگی بڑی حد تک پردۂ تاریکی میں ہیں۔اس کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔محمد قلی قطب شاہ کے دور میں اس نے شاعری کا آغاز کیا۔اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کا دور غواصؔی کی شاعری کا زریں دور ہے۔

غواصؔی کی ابتدائی زندگی مفلوک الحالی میں گزری۔ ملک الشعرا کا اعزاز ملنے سے قبل وہ ایک معمولی ملازم تھا۔اور پہرے داری کی خدمت پر مامور تھا۔یہ ملازمت غواصی جیسے حساس شاعر کے لیے تکلیف دہ تھی۔اس لیے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے ایک قصیدے میں بادشاہ سے درخواست کی کہ اسے ایک گاؤں بخشا جائے اور پہرے کی خدمت سے معاف فرمایا جائے۔عبداللہ قطب شاہ جو نہ صرف شاعروں' ادیبوں اور اہل کمال کا قدردان تھا اس نے نہ صرف غواصؔی کی خاطر خواہ سرپرستی کی بلکہ اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایا اور قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے اس کو بیجا پور روانہ کیا اور ''فصاحت آثار'' کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔

غواصؔی کی تین مثنویوں مینا ستونتی' سیف الملوک اور بدیع الجمال اور طوطی نامہ کے علاوہ غزلوں' قصیدوں' رباعیوں اور مرثیوں پر مشتمل دیوان منظرعام پر آچکا ہے۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصؔی دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔اظہار بیان کی سادگی غواصؔی کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

مثنوی نگاری میں غواصؔی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔''مینا ست ونتی'' غواصؔی کی پہلی مثنوی ہے،جس کا قصہ حمیدؔی کے فارسی ''عصمت نامہ'' پر مبنی ہے۔اس مثنوی کا مرکزی تصور عورت کی عظمت وعفت اور اخلاقی اقدار سے متعلق ہے۔اس میں بالا کنور نامی ایک راجہ کی حسین بیٹی ''چندا'' کے ایک شادی شدہ چرواہے ''لورک'' پر فریفتہ ہونے اور اس کے ساتھ فرار ہونے کی داستان بیان کی گئی ہے۔لورک کی بیوی کا نام ''مینا'' ہے جو ایک ہندوستانی باعصمت' شوہر پرست اور وفا شعار عورت ہے۔بالا کنور اپنی بیٹی کا بدلہ لینے کی غرض سے ''مینا'' کو اپنے محل کی زینت بنانا چاہتا ہے۔اس کام کے لیے ایک چالاک دلالہ مقرر کی جاتی ہے جو مینا کو برائی کا راستہ اپنانے کے لیے اکساتی ہے،لیکن مینا دلالہ کے جال میں گرفتار نہیں ہوتی۔غواصؔی نے اس مثنوی میں اپنے عہد کی نسوانی زبان' عورتوں کے طرز تکلم' روزمرہ' محاوروں' ضرب الامثال اور عورتوں کے انداز فکر کی اچھی عکاسی کی ہے۔

مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کا قصہ داستان الف لیلہ کے فارسی نثری ترجمے پر مبنی ہے۔اس میں مصر کے شہزادے سیف الملوک اور جنوں کی شہزادی بدیع الجمال کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔یہ مثنوی صرف غواصؔی کی ہی نہیں بلکہ دکنی اردو کی شاہ کار مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔اس مثنوی میں غواصؔی نے جذبات نگاری' سراپا نگاری' رزم نگاری اور منظر نگاری کے خوب صورت نمونے پیش کیے ہیں۔یہ مثنوی عہد سلطان محمد قطب شاہ کے آخری زمانے 1035ھ م 1626ء کی تصنیف ہے جسے غواصؔی نے صرف ایک ماہ کے عرصے میں مکمل کیا تھا۔

مثنوی طوطی نامہ 1049ء کی تصنیف ہے جس کا قصہ سنسکرت کی مشہور تصنیف ''شکا سب تتی'' (طوطے کی کہی ہوئی 70 کہانیاں) کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔شکا سب تتی کو مولانا ضیاء الدین نخشبی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔انہوں نے ستر کہانیوں میں سے 52 کہانیوں کا انتخاب

کیا۔غواصیؔ کے طوطی نامہ کا ماخذ نخشبی کا طوطی نامہ ہی ہے۔غواصیؔ نے بھی اختصار سے کام لیتے ہوئے باون کہانیوں سے صرف 45 کہانیوں کو اپنی مثنوی کے لیے منتخب کیا۔''طوطی نامہ'' کا قصہ اگر چہ کہ غواصیؔ کا طبع زاد نہیں ہے،لیکن قصہ کی جزئیات' انسانی نفسیات کی مرقع کشی اور مناظر فطرت کے بیان میں غواصیؔ نے اپنے شاعرانہ کمال کا اس طرح مظاہرہ کیا ہے کہ یہ تصنیف غواصیؔ کی طبع زاد مثنوی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کلام سے اقتباسات پیش ہیں۔

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال:

کیا شعر تازہ بڑے چھند سوں   ہر اک بند بسلائیا بند سوں
جو لفظاں ملایا رنگیلی نچھل   پرویا جواہر کی چھبیلی نچھل
خیالوں کے فوجاں کو دوڑائیا   ہزاراں نئے تشبہاں لائیا
بنایا نوے مضموناں ہور بھی   دیا طبع کو زور پر زور بھی

مثنوی طوطی نامہ:

سنیا ہوں جو تھا کوئی اِک لشکری   اسے ایک عورت تھی جیوں شہ پری
مکھ اس نار کا چودواں چاند تھا   دل او لشکری اس نے اسوں لئی باندتھا
ادک گن میں بے مثل ناری تھی او   وفادار ہور ست میں ساری تھی او
ولے او سپاہی زمانے پو جا   اچھے اس کی رک دیک میں جابجا
دیوانہ ہو گھر میں تے نکلے نہ بھار   گذرنے لگی مفلسی بے شمار

قصیدہ:

دو کون کا جو ہے خالق خدائے عزو جل   کیوں اس کے ناؤں ہر دم نہ جاوں میں بل بل
کہ لا مکان و قلم اوجِ عرش ہور کرسی   فلک ستارے چندر سو ر برق ہو ر بدل
تمام اس کی خدائی اپر گوہی دیں   کہ بغیر نہیں دُسرا کئی آخر و اول

غزل:

عاشق کوں اس ہوا میں مد رنگ لال ہونا   معشوق خوب عالی صاحب جمال ہونا
منج نین کے چمن میں لئی نازکی سوں ڈُلنے   نازاں کے پھول کی وہ نازوک ڈال ہونا

11.2.5 جنیدی

احمد جنیدی کے حالات زندگی بھی دوسرے شعرا کی طرح پردہ تاریکی میں ہیں۔اس کے نام کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔''اردوئے قدیم'' میں شمس اللہ قادری احمد جنیدی کا نام شیخ احمد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں''شیخ احمد نام' سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں اس نے''ماہ پیکر' ' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔''نصیر الدین ہاشمی نے شاعر کا نام صرف احمد لکھا ہے اور لکھتے ہیں کہ اس

نے شاعری ترک کر کے برہان پور میں اقامت اختیار کی تھی۔ڈاکٹر زور،شمس اللہ قادری پر تنقید کرتے ہوئے''اردو شہ پارے'' میں لکھتے ہیں کہ''چوں کے ان کی نظر سے مثنوی''ماہ پیکر'' کا کوئی نسخہ نہیں گزرا اسی لیے جنیدی کا نام شیخ احمد بتایا ہے۔''ڈاکٹر زور نے مثنوی''ماہ پیکر'' کے شاعر کا نام اکبر جنیدی دکھنی بتایا ہے۔''پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ''کسی قدیم تصنیف میں احمد جنیدی کے حالات زندگی محفوظ نہیں اس کی مثنوی واحد ماخذ ہے،جس سے اس کے نام اور بعض واقعات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔یہ امر غور طلب ہے کہ مثنوی''ماہ پیکر'' میں شاعر نے اپنا نام کہیں شیخ احمد تحریر نہیں کیا ہے۔بلکہ ہر جگہ وہ خود کو احمد جنیدی ہی کہتا ہے ۔

رھوے نانوں زباں پر محمد جرم — کہ احمد جنیدی پہ کر یوں کرم

دیکھا چاند کوں کاڑ برقعہ سے بھار — کہ احمد جنیدی توں دک یو بچار

کہ اک ماہ پیکر کا غم سات بول — کہ احمد جنیدی یو غم خانہ چھوڑ

مثنوی''ماہ پیکر''1064ھ مطابق 1653ء میں لکھی گئی۔جیسا کہ خود احمد جنیدی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے ۔

چہار سال تین بیس بھی یک ہزار — نبیؐ کی سو ہجرت کا یو تھا قرار

مثنوی کی سبب تالیف بتاتے ہوئے احمد جنیدی کہتا ہے کہ ایک دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کے پیکر اور ماہ کا قصہ ہم کو سنا۔یعنی نظم کر۔وہ دونوں پاکباز عاشق و معشوق تھے۔میں نے عذر کیا اور اپنے دوستوں کو جواب دیا کہ مدت دراز سے شاعری کا مشغلہ میں نے ترک کر دیا ہے اور ایک عرصہ ہوا شعر گوئی سے کنارے کشی اختیار کر لی ہے۔اس واقعہ کے کئی دن بعد یکا یک مجھے ایک رات الہام ہوا کہ تو''جواہر کی در جگ'' کھولنے عذرمت کر،تو اپنے دل کے دریا میں غوطہ لگا کر غواصی کر اور درشہوار لے آ۔میں فکر مند ہو گیا تو میرے پیر نے ہمت بندھائی اور میں نے مثنوی مکمل کی۔بقول عبدالقادر سروری''ماہ پیکر'' ایک نایاب مثنوی ہے۔ساری دنیا میں اس مثنوی کے صرف دو نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔یہ دونوں نسخے کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔پروفیسر سیدہ جعفر نے اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

اس مثنوی کی ادبی'لسانی' تاریخی اور ثقافتی اہمیت مسلمہ ہے۔ماہ پیکر مثنوی کی ہیروئین کا نام نہیں بلکہ پیکر اس قصہ کا ہیرو اور ماہ اس کی محبوبہ ہے۔اس مثنوی میں ان کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔احمد جنیدی نے قطب شاہی عہد کی معاشرت کی کامیاب عکاسی کی ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے قطب شاہی تہذیب کے خدوخال پر روشنی پڑتی ہے۔مثنوی کے آخر میں ماہ اور پیکر کی شادی کی ان رسومات کی تصویر کشی کی گئی ہے ،جو قطب شاہی عہد میں مروج تھیں۔احمد جنیدی کو منظر کشی اور محاکات نگاری میں کمال حاصل تھا۔اس دور کی طرز معاشرت' خواتین کے سنگھار' عطریات' خوشبودار اشیا اور سامان آرائش کی ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔احمد جنیدی نے شادی کی جن رسومات کی تصویر کشی کی ہے وہ آج بھی جنوبی ہند میں رائج ہیں۔تقریباً ساڑھے تین سو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔بقول پروفیسر سیدہ جعفر''ماہ پیکر'' عہد گزشتہ کے تہذیبی مظاہر کی ایک اہم دستاویز ہے۔شاعر کے وسیع مشاہدے اور اس کے ثقافتی شعور نے اس مثنوی میں ایک مٹی ہوئی تہذیب کے نقوش کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔اگر ہم قطب شاہی تمدن کی ایک جھلک دیکھنا چاہیں تو اس عہد گزشتہ کے تمدنی عناصر اور ثقافتی میلانات کا پرتو ہمیں احمد جنیدی کی ماہ پیکر میں نظر آ سکتا ہے۔شادی کی تقاریب کی محفلوں کو کس طرح آراستہ کیا جاتا تھا اور مہمانوں کے استقبال کے آداب کیا تھے اس کا اندازہ اس مثنوی سے ہوسکتا ہے۔فرش کی آرائش اور محفل رقص و موسیقی کے دل کش مرقعے اس مثنوی میں دیکھے

جا سکتے ہیں۔مثنوی سے اقتباس پیش ہے۔

جلے عود بتیاں بر مکی باس سوں — دھویں سوں نہ طاقت اتھا سانس کوں
کہ جلوے کے کارن نہلانے کوں سر — کرن لاگے چکسا سو ہم یک دیگر
عنبر ہور ہلد زعفراں بھاکلا — گلاب ہور مشک سارا اس میں میلا

11.2.6 ابن نشاطی؛

قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ایک نام ابن نشاطی کا بھی ہے،جس کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی اردو کی منتخب مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ابن نشاطی کا پورا نام شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی تھا۔اس کے مفصل حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔پھول بن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اچھی تعلیم وتربیت حاصل کی تھی۔مثنوی میں بعض ایسے اشارے موجود ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کوفن بلاغت اور علم معانی و بدیع سے خاص شغف تھااور فارسی پر عبور رکھتا تھا۔وہ بنیادی طور پر ایک انشا پرداز تھا،لیکن اس کی انشا پردازی کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہیں آیا۔مثنوی ''پھول بن'' سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں 1066ھ میں صرف تین ماہ میں لکھی گئی۔اس مثنوی کی زبان سلیس و سادہ ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے شاعر کی قادر الکلامی اور کمال فن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔مثنوی فارسی تصنیف ''بساتین الانس'' کے قصے پر مبنی ہے،لیکن ابن نشاطی نے اصل قصے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور اسے کئی ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک ایسے شعر سے کیا ہے،جس میں اس باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔اگر تمام ابواب کے عنوانی اشعار کو یکجا کردیں تو پوری مثنوی کا لب لباب سامنے آجاتا ہے۔''پھول بن'' میں جملہ 1744اشعار ہیں۔ابن نشاطی کہتا ہے کہ اس نے'' پھول بن'' میں انتالیس صنائع' چھیاسٹھ موقعوں پر استعمال کیے ہیں اور اپنی قادرالکلامی اور استادانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔مثنوی میں ابن نشاطی نے جذبات نگاری' کردار نگاری اور منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

''پھول بن'' اپنی روانی و بے ساختگی' زبان و بیان کی صفائی' طرز ادا کی دل کشی اور فنی رچاؤ کے اعتبار سے دکنی ادب کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' میں گوپی چند نارنگ نے ابن نشاطی کی'' پھول بن'' کے ادبی محاسن کو بہت سراہا ہے اور ابن نشاطی کو ایک ''شعلہ بیان شاعر'' اور''الفاظ کا ساحر'' قرار دیا ہے۔گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ'' پھول بن'' میں مکالموں کی برجستگی' زور طبیعت' شاعرانہ لطافت' انداز بیان کی خوبیاں اور زبان و بیان کا لوچ دل پر گہرا اثر کرتا ہے۔''

مثنوی سے اقتباس پیش ہے۔

مرا تھا باپ سوداگر ختن کا — نہ تھا پروا اسے کچ مال و دھن کا
بڑا تھا بھوت سب سوداگراں میں — اتھا مشہور سالم بندراں میں
ہو کر مشہور تھا سوداگری سوں — کتے تھے کارواں سالار اس کوں

پڑے تھے اس کنے مہراں کے انبار	ڈھگاراں سوں تھے روپیے ہور دینار
اتھی اس ٹھار پر زاہد کوں بیٹی	فرشتہ خوی تس عابد کوں بیٹی
چتر چنچل سرک کنتل سہانی	نہ اس کوں کوئی تھا صورت میں ثانی
بھنواں کے کیوں کہوں محراب تھے کر	وہ کاں ہے نور محراباں کے اوپر
چندر آدھا کہوں میں کیوں پیشانی	چندر آدھا نہیں ویسا نورانی
نین کوں نرگساں کہتا ہے نا ساز	چمن کے نرگساں میں کاں ہے وہ ناز
کہوں رخسار کوں کیوں اس کے لالا	ہر یک لالے کے درمیانی ہے کالا
میں سرتے پاؤں لگ اس موہنی کا	کہ تھا تیوں کیا صفت کرنے سکوں گا

قطب شاہی عہد کے دیگر شاعروں میں احمد گجراتی، عبداللہ قطب شاہ، فائز، طبعی اور جنیدی کے نام بھی اہمیت رکھتے ہیں۔احمد گجراتی نے اپنی دو مثنویاں یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کی تھیں۔اسی طرح فائز کی رضوان شاہ و روح افزا، طبعی کی بہرام وگل اندام قطب شاہی دور آخر کی منتخب اور نمائندہ مثنویاں ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

2۔ وجہی نے کون کون سے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا؟

3۔ سب رس پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

11.3 اکتسابی نتائج

☆ قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی تھا جس نے 1518 میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔اس کے بعد مزید سات سلاطین نے سر زمین گولکنڈہ پر 169 سال تک حکومت کی۔

☆ قطب شاہی سلاطین نہ صرف علم دوست اور شعرا اور ادبا کے سرپرست و قدر دان تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی شعر کہتے تھے خصوصاً محمد قلی قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ دکنی اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔

☆ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

☆ محمد قلی کے علاوہ اس دور کے دوسرے عظیم شعرا میں اسداللہ وجہی، غواصی، جنیدی اور ابن نشاطی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

☆ وجہی نے قطب مشتری اور مینا ستونتی جیسی لازوال مثنویاں لکھیں۔

☆ وجہی اس دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں تھا بلکہ اعلیٰ درجہ کا نثر نگار بھی تھا۔اس کی تصنیف ''سب رس'' اردو نثر کی تاریخ میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆ غواصی کی مثنویاں سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ، جنیدی کی ماہ پیکر اور ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن اس دور کی اہم مثنویاں

ہیں۔

☆ بہ حیثیت مجموعی قطب شاہی دور کو مثنویوں کے دور کہا جا سکتا ہے۔مثنوی کے بعد اس دور میں غزل کی صنف کو فروغ ہوا ساتھ ساتھ مرثیہ، قصیدہ اور رباعی پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔

11.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
مستحکم	مضبوط
خودمختاری	بااختیار ہونا، آزادی
حرفہ	پیشہ، ہنر، کاری گری
عہدزریں	سنہرا دور
رقیب	دشمن
ہجراں	جدائی
مجاز	حقیقت کے برعکس
طبع زاد	اپنی ایجاد
اسرار و رموز	پوشیدہ راز
مفلوک الحالی	تباہ حالی، خستہ حالی
جزئیات	جزو کی جمع، حصے، چھوٹے چھوٹے امور
مرقع کشی	تصویر کشی
لب لباب	خلاصہ، نچوڑ
ادبی محاسن	ادبی خوبیاں

11.5 نمونۂ امتحانی سوالات

11.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

2۔ وجہی نے کون کون سے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا؟

3۔ ''سب رس'' کب لکھی گئی؟

4۔ مینا ستونتی کے چند کرداروں کے نام لکھیے۔

5۔ ''طوطی نامہ'' کس کی تصنیف ہے؟

6۔ ملا وجہی نے ''سب رس'' کس کی فرمائش پر لکھی؟

7۔ ''قطب مشتری'' کس کی تصنیف ہے؟

8۔ ''پھول بن'' کس کی مثنوی ہے؟

9۔ غواصی کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

10۔ گولکنڈہ کے پانچویں حکمران کا کیا نام تھا؟

11.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ قطب شاہی دور کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ لیجیے۔

2۔ محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور ادبی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ جنیدی کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

4۔ ابن نشاطی کے بارے آپ کیا جانتے ہیں لکھیے۔

5۔ کسی دو پر نوٹ لکھیے۔

I۔ سب رس II۔ سیف الملوک و بدیع الجمال III۔ مینا ستونتی IV۔ پھول بن

11.5.3 طویل جوابات کے حامل سولات؛

1۔ قطب شاہی دور کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2۔ غواصی کے ادبی کارنامے بیان کیجیے۔

3۔ وجہی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

11.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
3۔	تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد سوم، چہارم)	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
4۔	دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیدہ جعفر
5۔	دبستان گولکنڈہ، ادب اور کلچر	پروفیسر محمد علی اثر
6۔	اردو کی اہم مثنویاں	ڈاکٹر احمد علی شکیل

اکائی 12: ولی اور سراج کا عہد

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 ولی اور ان کے اورنگ آبادی معاصرین
12.2.1 ولی کے دیگر دکنی معاصرین
12.2.2 ولی کے گجراتی معاصرین
12.3 اکتسابی نتائج
12.4 کلیدی الفاظ
12.5 نمونہ امتحانی سوالات
12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

12.0 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں دکنی شعروادب کے فروغ کا مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں ہم ان سلطنتوں کے زوال کے بعد دکنی شاعری کی صورت حال کا جائزہ لیں گے۔

اورنگ زیب نے 1685ء میں بیجاپور اور 1686ء میں گولکنڈہ فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے شاہی درباروں میں دکنی شعرا کی بڑی قدر و منزلت تھی، لیکن ان سلطنتوں کے زوال کی وجہ سے ان کی قدر دانی بھی کم ہوگئی۔

اورنگ زیب نے 1062 اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا تھا جس کی وجہ سے اس شہر کی رونق بڑھنے لگی۔ مغلیہ سلطنت کا مستقر ہونے کی وجہ سے یہ شہر شمالی ہند کے علما و فضلا کا مرکز بن گیا۔ وہاں شعروشاعری کا چرچا بڑھنے لگا۔ اورنگ زیب کی وفات 1706ء کے وقت تقریباً پورا دکن مغلیہ سلطنت میں شامل تھا۔ دکن کے مختلف حصوں میں مغل شہنشاہ کے مقرر کیے ہوئے صوبیدار صوبے کا نظم و نسق چلاتے تھے۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کی نا اہلی اور عیش پرستی کی وجہ سے ملک کا نظم و نسق بگڑ گیا اور سلطنت کے مختلف صوبے آزاد اور خود مختار ہونے لگے۔ اس انتشار اور بد نظمی کے پیش نظر نواب میر قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ نے 1136ھ/1723ء میں دکن میں آصفیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کے خاتمے سے لے کر دکن میں آصف جاہی سلطنت کے قیام کا درمیانی عہد دکنی ادب کا مغل دور کہلاتا

ہے۔اس دور کا سب سے بڑا شاعر ولؔی اورنگ آبادی ہے۔

آصف جاہ اول سے لے کر آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں کے ابتدائی دور تک اورنگ آباد مملکت آصفیہ کا پایہ تخت رہا۔نواب میر نظام علی خاں نے 1768ء میں اپنا پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا۔یہ دور دکنی زبان وادب کا آصف جاہی دور ہے۔اس دور کے سب سے بڑے اور نمایاں اُردو شاعر سراج اورنگ آبادی ہیں۔دکن کا مغل دور اور ابتدائی آصف جاہی دور ایک طرح سے ولی اور سراج کا دور ہے۔اس دور میں دکن اور گجرات میں متعدد شعرا بالترتیب دکنی اُردو اور گجری اُردو میں داد سخن دے رہے تھے۔آئندہ اوراق میں ہم ان میں سے چند اہم شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کو مکمل کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ ولی اور سراج کے حالات زندگی بیان کرسکیں۔

☆ ولی وسراج کے اورنگ آبادی معاصرین اوران کی تصانیف پر اظہار خیال کرسکیں۔

☆ ولی وسراج کے دیگر دکنی معاصرین اوران کی شعری خدمات کی تحسین کرسکیں۔

☆ ولی وسراج کے گجراتی معاصرین اوران کی ادبی خدمات پر بحث کرسکیں۔

12.2 ولی اوران کے اورنگ آبادی معاصرین

ولی اورنگ آبادی : ولی اورنگ آبادی کو اردو شاعری میں صنف غزل کے معمار کی حیثیت حاصل ہے،لیکن ان کے حالات زندگی کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔تذکرہ شعرائے دکن کے مصنف عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے ولی کا سال ولادت 1079ھ متعین کیا تھا جسے عام طور پر قبول کرلیا گیا۔ان کا نام ولی محمد تھا۔ولی کے وطن کے بارے میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر زور ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ مانتے ہیں جبکہ ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی اور قاضی اختر جونا گڈھی ولی کو گجراتی الاصل قرار دیتے ہیں۔اس اختلافی بحث میں درج ذیل نکات قابل غور ہیں۔

گجراتی شعرا مثلاً امین گجراتی (مصنف مثنوی یوسف زلیخا)اور افضل (مصنف مثنوی شمس وقمر)وغیرہ اپنی زبان کو صاف طور پر ''گوجری'' کہتے ہیں جبکہ ولی نے اپنی زبان کو دکنی کہا ہے۔

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولا کوئی یک شعر خوشتر ایں نمط

ولی کے ہاں دکنی زبان کے مخصوص ''چ'' تاکیدی اور ''نکو'' کا استعمال ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ گجراتی نہیں تھے۔

پیتارا نئیں ترے کہنے کا جب حیران کرنا کی
جو من میں نیئچ ملنے کا تو پھر تکرار کرنا کی
عالم کوں تیغِ ناز سوں بے جاں نکو کرو

غمزے سوں اپنے غارت ایماں نکو کرو

اپنی زباں کو دکنی کہنے کے علاوہ ولی نے خود اپنے آپ کو بھی دکن کا باشندہ ظاہر کیا ہے اس کے بعد بھی انھیں گجراتی کہنا تحقیق اندھیر ہے۔

وؔلی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگر چہ شاعر ملک دکن ہے
یہ مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی محفل
ولی پر وانگی کرتا تری ملک دکھن بھیتر

وؔلی کی کلیات میں ایک قطعہ" درفراق گجرات" اور شہر سورت کی تعریف میں ایک مثنوی پائی جاتی ہے،لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ گجرات کے باشندے تھے۔غالب نے بھی کلکتے کی تعریف میں ایک قطعہ لکھا ہے،لیکن اس سے وہ بنگالی نہیں ہو جاتے۔

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ولی نے بیس برس کی عمر میں حصول علم کی خاطر خاندان اور وطن کو خیر باد کہا اور احمد آباد پہنچے۔یہاں وہ شاہ وجیہ الدین علوی کے قائم کردہ مدرسے میں داخل ہوئے۔ولی کو سفر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔

وہ حج بیت اللہ اور روضۃ النبیؐ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ولی کا سال وفات بھی متنازعہ ہے۔دیوان ولی کے ایک قلمی نسخے میں درج قطعہ تاریخ کی بنیاد پر مولوی عبدالحق نے ولی کا سال وفات 1119ھ میں متعین کیا۔(مجلّہ الموسی، یادگار وؔلی ص 63) لیکن ڈاکٹر جمیل کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں کہ وؔلی نے 1133ھ کے بعد اور 1138ھ سے قبل وفات پائی۔(جالبی تاریخ ادب اردوٗ جلد اول 535-538)

ولی ایک خوش فکر شیریں گفتار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی کلیات میں غزلیات کے علاوہ مخمسات، رباعیات، مستزاد، ترجیع بند، مرثیہ، قصائد، مثنویات اور قطعہ شامل ہے۔وؔلی بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔انھوں نے دکنی غزل کی روایات کی پابندی کرتے ہوئے غزل کی روایت میں توسیع کی۔وؔلی کی غزل واردات قلب، تجربات اور مشاہدات کی ترجمان ہے۔طبعاً وہ جمال پرست واقع ہوئے تھے۔انھوں نے حسن کی مختلف کیفیتوں اور مختلف اداؤں کو دیکھا اور محسوس کیا اور اپنی غزل میں ان کی عکاسی کی۔ن کی غزل محبوب کے حسن و جمال، نازو انداز اور دلربائی کا آئینہ اور ان کا فن حسن کے بیان کا وسیلہ ہے۔

ترا مکھ حسن کا دریا و مو جاں چین پیشانی
اُپر ابرو کی کشتی کے یوتل جیوں ناخدا دستا
پڑیا ہے لعل میں پر تو سجن تجھ مکھ کی لالی کا
بیاں ہے مہ سوں روشن تر تری صاحب کمالی کا
دیکھ تیرے سو یو کھبا لے بال
رشک سوں جل گئے ہیں کالے بال

ولی کی شاعری کا دوسرا امتیازی پہلو ان کا ہندوستانی تخیل ہے، جس نے ان کے شعری افکار میں ایک عجیب مٹھاس اور دلکشی پیدا کی ہے۔ان کی غزل کی فضا میں ہندوستانی دھرتی کی مہک اور مقامی تہذیب وتمدن کی رنگینی بسی ہوئی ہے۔

جوگی دل وہاں کا باسی ہے　　کوچۂ یار عین کا سی ہے

ہندوئے ہر دوار باسی ہے　　اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال

تل نزک اس کے جیوں سناسی ہے　　زلف تیری ہے موج جمنا کی

ولی نے دکنی شاعری کے جن صحت مند رجحانات کو اپنی شاعری میں برقرار رکھا ان میں محبوب کا واضح تصور بھی ہے ان کا محبوب کوئی فرضی یا خیالی مخلوق نہیں بلکہ وہ مادی وجود رکھتا ہے اور پوری نسوانیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں محبوب کا ذکر صیغہ تانیث میں کیا ہے۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھا تی جا
تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھا ؤ بتاتی جا
اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکا ر سناتی جا

ولی ایک عہد ساز شاعر تھے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دکنی ادب کی تین سو سالہ روایت کو جس کے سوتے خشک ہورہے تھے ایک طرف تو شمالی ہند کی معیاری بولی ریختہ سے ہم کنار کیا اور دوسری طرف اپنی جدت طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے فارسی غزل کے موضوعات ومضامین اور فارسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے بے دریغ استفادہ کیا۔اس طرح انہوں نے اُردو غزل میں نئے امکانات پیدا کیے۔

ولی نے 1112ھ (1700ء) میں دہلی کا سفر کیا۔اس وقت شمالی ہند کے شعرا صرف فارسی میں دادِسخن دیتے تھے۔اردو کو وہ بازاری زبان سمجھتے تھے۔ولی نے دہلی میں اُردو غزل کی شمع روشن کی۔ان کے اثر سے شمالی ہند کے شعرا نے اردو میں غزل گوئی کا سلسلہ شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو غزل سارے شمالی ہند میں مقبول ہوگئی۔

سراج اورنگ آبادی : ان کا اصل نام سید سراج الدین اور تخلص سراج تھا۔ان کے والد کا نام سید درویش تھا۔سراج 1128ھ کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔(بحوالہ پروفیسر سید عبدالقادر سروری' کلیات سراج' مقدمہ ص 39-40) بارہ سال کی عمر تک سراج کی تعلیم وتربیت ان کے بزرگوں کی نگرانی میں ہوئی۔بارہ سال کی عمر میں ان کی طبیعت پر دیوانگی کا عالم طاری ہوا۔وہ سات برس تک جذب اور بے خودی کی حالت میں رہے۔ سات سال کے بعد ان کو افاقہ ہوا۔صحتیابی کے بعد سراج نے شاہ عبدالرحمٰن چشتی (1161ھ) سے بیعت کی۔

سراج اپنے عزیز دوست اور برادر طریقت شاہ عبدالرسول چشتی کی فرمائش پر اردو میں شعر کہنے لگے۔شاہ عبدالرسول ان کے کلام کے شائق تھے۔انھوں نے ان کی غزلیات اور متفرق اشعار کو جمع کرکے دیوان کی شکل دی۔ دیوان کی تکمیل کے بعد سراج نے اپنے مرشد شاہ

عبدالرحمٰن چشتی کے حکم پر غزل گوئی ترک کی لیکن مثنویات لکھتے رہے۔ولی کے بعد سراج دکن میں مغلیہ دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔1117ھ میں جب سراج کی عمر پچاس سال تھی‘ان کا انتقال ہوا۔سراج کی تصانیف میں فارسی کلام ،کلیات اردو‘منتخب دیوانہا اور مثنوی بوستان خیال شامل ہیں۔

سراج عشق کے شاعر ہیں۔عشق ان کے فن اور تخلیق کا سرچشمۂ فکر کا مرکزی نقطہ اور زندگی کا دائرہ ہے۔وہ سرتاپا رہینِ عشق تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہستی‘عشق ومحبت کے سوا کچھ اور نہیں۔جس دل میں عشق کی روشنی جاگتی ہے اس پر کائنات کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

سراج کی شاعری کا دوسرا اہم موضوع تصوف ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا مخصوص صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور حقائق ومعارف کے دریا بہائے ہیں۔ان کے اشعار صوفیانہ تجربات کی ترجمانی‘نغمگی وترنم اور وجد آفریں کیف وسرور کا بہترین نمونہ ہیں:

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہانہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

سراج نے چھوٹی بڑی کل گیارہ مثنویاں لکھیں۔ان میں ’’بوستان خیال‘‘ نہایت اہم ہے۔سراج نے یہ مثنوی 1160 ہجری میں لکھی۔ ’’بوستان خیال‘‘اس کا تاریخی نام ہے جو اس مثنوی کے سنہ تصنیف اور تعداد اشعار (1160) کو ظاہر کرتا ہے۔انہوں نے یہ مثنوی صرف دو دن میں لکھی۔سادگی‘سلاست‘روانی اور ربط کلام کے اعتبار سے بوستان خیال اُردو کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔

داؤد اورنگ آبادی: داؤد اورنگ آبادی ایک صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے اہم ہیں۔ان کا اصل نام مرزا داؤد بیگ تھا۔ان کے والد کا نام مرزا سلیمان تھا۔داؤد کی ولادت اورنگ آباد میں ہوئی۔انھیں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا لیکن انھوں نے علما وفضلا کی صحبتوں میں رہ کر لیاقت پیدا کی۔

داؤد کا انتقال 1168ھ میں ہوا۔داؤد غزل گو شاعر تھے۔انہوں نے ولی کا اثر قبول کیا۔ولی کو وہ اپنا معنوی استاد اور اپنے آپ کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے۔

ولی کے تتبع میں داؤد نے بھی محبوب کے حسن کی رعنائیوں کو اپنی غزل کا مرکزی موضوع بنایا۔ان کی غزل محبوب کے حسن و جمال کی تفسیر ہے۔معشوق کے لب ورخسار کا تذکرہ اگر چہ روایتی ہے لیکن حسن کی مختلف کیفیات کو محسوس کرنے اور انھیں الفاظ کی گرفت میں لانے کا انداز داؤد کا اپنا ہے۔

جس نے وہ گلبدن نہیں دیکھا — اس نے سیر چمن نہیں دیکھا
غنچہ کیا پاوے تری گفتار کوں — سرو کیا پہنچے تری رفتار کوں
جب وہ مہ رخسار یکا یک نظر آیا — اس ماہ کی طلعت سوں سُرج دل میں در آیا
دیکھ داؤد ہے غزل تیری — مصحف حسنِ یار کی تفسیر

عاجز اورنگ آبادی: اصل نام عارف الدین خاں اور عاجز تخلص تھا۔ عاجز اصلاً ایرانی تھے۔ان کے والد اورنگ زیب کے زمانے میں بلخ سے ہندوستان آئے۔ عاجز ابھی کم عمر ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔نواب لشکر خاں بہادر نصرت جنگ صوبہ دار اورنگ آباد کی سر پرستی میں عاجز نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور انھیں کی سفارش پر آصف جاہ اول اور ناصر جنگ کے دربار میں باریاب ہوئے اور خطاب و منصب سے سر فراز کیے گئے۔1178ء میں ناندیڑ (مہاراشٹرا) میں عاجز کا انتقال ہوا وہیں آسودہ خاک ہوئے۔انھوں نے فارسی اور اردو میں ایک ایک دیوان مرتب کیا تھا۔

عاجز کی شاعری کا امتیازی وصف سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی اور ضائع و بدائع کا استعمال ہے۔انہوں نے مشکل قافیہ و ردیف اور مشکل بحروں میں غزلیں لکھ کر اپنی جولانی اور مشاقی کا مظاہر کیا ہے۔ان کے اشعار میں خیال کی تازگی' تشبیہات کی ندرت اور شگفتہ بیانی کا احساس ہوتا ہے۔

خیال اس شوخ کا کب مجھ دل بے تاب میں ٹھیرے　　　کہاں بجلی کا سایہ چشمہ سیماب میں ٹھیرے
بلبلو آج ہے صیاد کے آنے کی خبر　　　ہم میں نئیں طاقت پرواز خدا خیر کرے
چمن میں چل کے سجن بے حساب ساغر کھینچ　　　بہار رنگ گلستاں کے سر سے چادر کھینچ

دیوان غزلیات کے علاوہ عاجز سے ایک مثنوی لال و گوہر بھی یاگار ہے۔درحقیقت اس مثنوی کو ان کے دیوان سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔مثنوی لال و گوہر پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں عاجز نے بنگالے کے شہزادے لال اور پریوں کی شہزادی گوہر کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔

شاہ قاسم اورنگ آبادی: ولیؔ کے خورد ہم عصروں میں شاہ قاسم ایک اہم صاحب دیوان شاعر ہیں۔ان کا اصل نام شاہ قاسم علی تھا' قاسم تخلص کرتے تھے۔عاجز اورنگ آبادی کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔

شاہ قاسم کا سنہ ولادت اور سنہ وفات نامعلوم ہے۔ان کے والد کا نام شیخ عبداللہ انصاری تھا۔وہ ایک درویش طبع انسان تھے۔شاہ قاسم برہان پور میں پیدا ہوئے لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد اورنگ آباد آ گئے اور یہیں انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔

شاہ قاسم کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جنوب کے مختلف شہروں کی سیر کی تھی۔وہ حیدرآباد بھی آئے تھے۔شاہ قاسم ایک حسن پرست' عاشق مزاج اور رند مشرب انسان تھے۔انھوں نے ایک قلندر کی طرح زندگی گزاری۔

رند مشرب عاشق بے باک ہیں　　　ہم قلندر وضع بے پروا فقیر

شاہ قاسم کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔وہ اس فن میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے تھے۔

ترا یہ گرم بازار سخن سبز　　　رہے گا تا قیامت شاہ قاسم
کون دیوے ترا جواب سخن　　　شاہ قاسم دکن سیں تا دلی

سید شاہ غلام قادر سامیؔ: سامیؔ ولی کے کم عمر معاصرین میں سے تھے۔سامی کے والد نظام الملک آصف جاہ اول کے مصاحب تھے۔سامی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔سامی کو تحصیل علم کا شوق تھا۔وہ علما کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے۔

ساؔمی کو نو جوانی کی عمر سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ تھوڑے دنوں کی مشق سے قادرالکلام شاعر بن گئے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ ساؔمی نے 1196ھ میں وفات پائی۔ اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ ساؔمی صاحب دیوان شاعر تھے لیکن دیوان اب نہیں ملتا۔ انھوں نے 1175ھ میں ایک مثنوی' سرو وشمشاد لکھی۔ اس میں سرو اور شمشاد کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں ''اگرچہ سامی کی زبان گولکنڈہ و بیجا پور کے مثنوی نگاروں کے مقابلے میں صاف ہے' تاہم دکنی زبان کا اثر جگہ جگہ نمایاں ہے۔ حالانکہ ساؔمی کے دادا دہلی سے آئے تھے لیکن وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں کا روزمرہ سیکھا۔'' (ڈاکٹر زور' تذکرہ مخطوطات' جلد اول ص 73)

سید عبدالولی عزلتؔ: عزلتؔ اٹھارویں صدی کے ممتاز شاعر تھے۔ وہ 1104ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ سعداللہ جید عالم تھے۔ عزلت نے معقول اور منقول کی تعلیم انھیں سے حاصل کی۔ عزلت کو سیاحت کا شوق تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کی جن میں دہلی' اورنگ آباد' حیدرآباد اور مرشد آباد (بنگال) شامل ہیں۔ آخر عمر میں وہ حیدرآباد آئے جہاں نواب صلابت جنگ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ 1189ھ میں عزلت کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن (حیدرآباد) میں پیوند خاک ہوئے۔

عزلت جامع الکمالات واقع ہوئے تھے۔ انھیں کئی علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی۔ ان کی تصانیف میں دیوان فارسی' دیوان اُردو' مثنوی راگ مالا' ساقی نامہ' بارہ ماسی اور بیاض شعرا شامل ہیں۔ تذکرہ شعرائے دکن کے مصنف عبدالجبار خاں صوفی ملکا پوری لکھتے ہیں کہ امیر خسرو طوطی ہند تھے تو عزلت کو طوطی دکن کہنا چاہیے۔ (ملکا پوری' تذکرہ شعرائے دکن جلد دوم ص 812) عزلت کی غزلیہ شاعری کا نمونہ درج ذیل ہے۔

سدھارے گل کہاں سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے — گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنے
سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں — اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہے گا
مرے مرقد پہ ہو کر شعلہ رویاں سیم بر نکلیں — برنگ شمع میری استخواں سے چشم تر نکلیں

مثنوی ''راگ مالا'' عزلتؔ کی شاہکار مثنوی ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستانی راگوں اور اس کی ذیلی قسموں کی وضاحت کی ہے۔ یہ 1176 اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا سنہ تصنیف 1179ھ ہے۔ ساقی نامہ بھی عزلت کی ایک اہم تصنیف ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ وؔلی کا اصل نام اور ان کا سنہ وفات کیا ہے؟

2۔ سراج اورنگ آبادی کی تصانیف کے نام بتائیے؟

12.2.1 ولی کے دیگر دکنی معاصرین

شاہ معظم: شاہ معظم ولی کے بزرگ معاصر تھے۔ وہ بیجا پور کے باشندے تھے۔ ان کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ ان کے کلام کی داخلی شہادتوں سے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عادل شاہی خاندان کے آخری حکمراں سکندر عادل شاہ (1067ھ تا 1083ھ) کا عہد دیکھا اور شہنشاہ اورنگ زیب کا بھی۔

شاہ معظم کا پورا نام محمد حسینی قادری تھا۔ وہ چشتیہ سلسلے میں شاہ قادر لنگا کوتال کے مرید تھے۔معظم ایک کثیر التصانیف شاعر تھے۔ان کی تصانیف میں غزلیات کا ایک دیوان مثنوی مفتاح الاسرار' مثنوی شجرۃ الاتقیا' مثنوی گلزار چشت' معراج نامہ' ساقی نامہ' قصیدہ گفتار عقل وعشق وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ معظم نے دکنی نثر میں ایک مختصر نثری رسالہ'' شرح شکار نامہ'' بھی لکھا تھا جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے فارسی شکار نامہ کی شرح ہے۔معظم کی غزلیات' صوفیانہ خیالات اور عارفانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔انھوں نے اپنی ہر غزل میں اپنے پیرو مرشد قادر لنگا کوتال کا ذکر والہانہ انداز میں کیا ہے۔

بزرگی اسم اعظم کی لکھا قرآن میں لیکن | معظم کو ورد کرنے سو قادر نام خوش لگتا
قادر اُپر معظم کرتا ہے سر تصدق | یوں کوئی گر کرے تو اس کو کہتے فقیر

قاضی محمود بحری: شاہ معظم کی طرح بحری بھی ولی کے بزرگ معاصر تھے۔ان کا نام سید محمود اور تخلص بحری تھا۔بحری گوگی کے باشندے تھے جو سگر یا نصرت آباد(علاقہ کرناٹک) کے مضافات میں واقع ہے۔ان کے والد بحرالدین گوگی کے قاضی تھے۔

قاضی محمود بحری شیخ محمد باقر عرف منجن بحری کے مرید تھے۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے والد سے بھی بیعت و خلافت حاصل تھی۔ 1095ھ میں بحری گوگی سے بیجاپور گئے جہاں سکندر عادل شاہ (1083ھ تا 1097ھ) نے ان کی بڑی قدرومنزلت کی۔ اورنگ زیب نے بیجاپور فتح کرلیا تو بحری نے حیدرآباد کا رخ کیا۔اس سفر کے دوران ڈاکوؤں نے ان کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا جس میں ان کا کلام بھی شامل تھا جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔حیدرآباد میں بحری نے دو سال گزارے تھے کہ مغل فوجیں یہاں بھی حملہ آور ہوئیں۔ 1100ھ میں بحری اپنے پیرومرشد کے آستانے میں گوشہ گیر ہوگئے۔1130ھ 1717ء میں ان کا انتقال ہوا۔مزار گوگی (کرناٹک) میں واقع ہے۔

دکنی میں بحری کی تین اہم تصانیف ہیں:(1) مثنوی من لگن (2) بنگاب نامہ (3) دیوان غزلیات۔مثنوی من لگن ایک صوفیانہ مثنوی ہے بحری نے یہ مثنوی 1112ء میں تصنیف کی۔اس کے اشعار کی تعداد اٹھارہ سو سے زائد ہے۔اس میں سلوک ومعرفت کے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔مثنوی کی زبان نہایت ادق ہے کیونکہ اس میں سنسکرت الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔

''بنگاب نامہ'' بھی بحری کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔بنگاب نامہ میں بارہ بند ہیں جنھیں''جام'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ہر جام میں بارہ اشعار ہیں۔

بحری کا دیوان ایک سو تیرہ غزلیات پر مشتمل ہے۔غزلیات میں وہ ایک رند اور عاشق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔غزلیات کا زیادہ تر حصہ عشق مجازی کی ترجمانی کرتا ہے۔بحری کو دکن سے بہت محبت تھی۔انھوں نے اپنی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات کی ترسیل بڑے خوب صورت انداز میں کی ہے۔

اب دل پہ یہی ہے جو دکن چھوڑ نہ جانا
جُوتے یو دکھن ' کھن کے رتن چھوڑ نہ جانا
بحری کو دکن یوں ہے کہ جوں نل کو دمن ہے
پس نل کو ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

سید شاہ حسین ذوقی: ان کا اصل نام سید شاہ حسین، تخلص ذوقی اور خطاب ''بحرالعرفان'' تھا جو ان کے مرشد نے عطا کیا تھا۔ ذوقی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے سنہ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کی پانچ مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔ وصال العاشقین، غوث نامہ، وفات نامہ رسول اور نزہت العاشقین۔ ان کے متعدد مرثیے اور غزلیں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف ''صدوسی مسائل'' کا ذکر بھی ملتا ہے۔

وصال العاشقین ذوقی کی سب سے اہم مثنوی ہے۔ اس کا دوسرا نام حسن و دل ہے۔ اس میں ذوقی نے وہی داستان نظم کی ہے جسے وجہی نے سب رس کے نام سے دکنی نثر میں لکھا تھا۔ اس کا سنہ تصنیف 1109ھ ہے۔ ذوقی کی ایک اور مثنوی ''غوث نامہ'' بھی 1109ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے فضائل و کمالات بیان کیے گئے ہیں۔ ذوقی کی ایک اور مثنوی نزہت العاشقین ہے جس کا دوسرا نام منصور نامہ ہے۔ اس میں منصور بن حلاج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

سید محمد فراقی بیجاپوری: ان کا اصل نام سید محمد اور فراقی تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام سید کریم محمد حسینی تھا۔ فراقی 1097ھ میں بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ فراقی حافظ قرآن ہونے کے ساتھ معقول و منقول کے عالم، مفسر اور محدث تھے۔ انہوں نے 1144ھ میں وفات پائی۔ تصانیف میں ایک ضخیم مثنوی مراۃ الحشر کے علاوہ غزلیات اور نعتیں بھی ان سے یادگار ہیں۔ مثنوی مراۃ الحشر تین ہزار پچپن اشعار پر مشتمل ہے۔ فراقی نے یہ مثنوی 1133ھ میں تصنیف کی۔ اس میں حمد و نعت کے بعد عالم نزاع، احوال قبر، علامات قیامت، دابتہ الارض کے ظہور، یاجوج و ماجوج اور دجال کے خروج، حضرت عیسیٰ کے نزول، حشر و نشر، میزان، پل صراط وغیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

فراقی نے غزلیں بھی لکھیں، ان کی غزلوں میں عاشقانہ اور ناصحانہ دونوں رنگ صاف نظر آتے ہیں۔

لذت جو کوئی پایا اہے تجھ عشق کی تلوار کا
یک وار بیٹھے نیچ لگ مشتاق دسرے وار کا

گال ہے خال ہے الک ہے پلک
دل بچارہ کدھر کدھر ہونا

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھا تا آستیں آئے

فراقی نے ولی اور فقیر اللہ آزاد کے ساتھ سورت، احمد آباد اور دلی تک کا سفر کیا تھا۔

وجدی کرنولی: ولی وسراج کے عہد کے ایک اہم شاعر وجدی کرنولی ہیں۔ وجدی کا نام شیخ وجیہ الدین تھا۔ وجدی کی مثنوی ''مخزن عشق'' سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا وطن دھارور (مہاراشٹرا) تھا۔

وجدی پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے۔ وہ دھارور سے ترک وطن کر کے کرنول گئے اور نواب اسماعیل خاں پنی کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے پیر طریقت کا نام سید فخر الدین شامی تھا۔ وجدی کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا پتہ نہیں چلا۔ ان کی تین تصانیف دریافت ہوئی ہیں جو مثنویات کی شکل میں ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:

(1) مخزن عشق (باغ جانفزا)'(2) پنچھی باچھا (پنچھی نامہ)'(3) تحفہ عاشقاں (گل وہرمز)۔ان مثنویات کے علاوہ ان کے ایک دیوان کا بھی ذکر ملتا ہے جو اب نا پید ہے۔البتہ ان کی کچھ غزلیات ملتی ہیں۔

مثنوی مخزن عشق وجدی کی اولین تصنیف ہے ۔ یہ مثنوی وجدی نے 1145ھ میں مکمل کی۔اس میں وجدی نے ایران کے بادشاہ منوچہر کیومرثی کے وزیر بیدار دل اور چین کے بادشاہ فغفور کی دختر پری رخ کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔

وجدی کی دوسری تصنیف'' پنچھی باچھا'' ہے۔یہ فارسی کے مشہور صوفی شاعر شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا دکنی ترجمہ ہے۔وجدی نے اصل مثنوی کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے کہیں طوالت اور کہیں اختصار سے کام لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔وجدی کی تیسری مثنوی''تحفہ عاشقاں'' ہے۔یہ بھی شیخ فریدالدین عطار ہی کی فارسی مثنوی گل وہرمز کا ترجمہ ہے۔

ولی ویلوری: ولی ویلوری ولؔی اورنگ آبادی کے معاصر تھے ۔ولؔی ویلوری کا اصل نام میر ولی فیاض تھا۔وہ ویلور (ٹاملناڈو) کے باشندے تھے۔ابتدا میں انھوں نے سات گڑھ (شمالی ارکارٹ۔ٹامل ناڈو) کے امیر حراست خاں کی ملازمت اختیار کی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انھیں یہ ملازمت چھوڑنی پڑی ۔اس کے بعد وہ کڑپہ (آندھرا پردیش) کے صوبیدار نواب عبدالمجید خاں کے دربار میں حاضر ہوئے۔نواب نے انھیں سدھوٹ میں ملازمت دی۔

سدھوٹ میں ولی نے طویل مدت تک قیام کیا۔اس کے بعد وہ ویلور واپس آ گئے اور اپنی زندگی کا آخری حصہ وہیں گزارا۔ولی ویلوری نے ارکاٹ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ۔ولؔی ویلوری کا سنہ وفات نامعلوم ہے۔ولی ویلوری نے 1162ھ میں مثنوی روضۃ العقبیٰ تصنیف کی۔لہذا یہ بات یقینی ہے کہ ان کا انتقال 1162ھ کے بعد ہوا۔ولی ویلوری کی درج ذیل تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔

1۔ روضۃ الشہدا 2۔ روضۃ الانوار 3۔ روضۃ العقبیٰ 4۔ دعائے فاطمہ 5۔ مثنوی رتن پدم

ان پانچ مثنویوں کے علاوہ ولی کی تین اور تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ 1۔ مثنوی وفات نامہ نبیؐ 2۔ مثنوی اگر و ملا گیر 3 ۔ تنبیہ نامہ۔

روضۃ الشہدا ولی ویلوری کی سب سے مشہور مثنوی ہے جو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ایک عرصے تک اسے ولی اورنگ آبادی سے منسوب کیا جاتا رہا لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ یہ دراصل ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف روضۃ الشہدا کا منظوم دکنی ترجمہ ہے۔چونکہ اس میں دس ابواب ہیں اس لیے اس کا نام دہ مجلس بھی ہے۔اس میں کربلا سے ماقبل اور کربلا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔روضۃ الشہدا کا سنہ تصنیف 1137ھ ہے۔

ضعیفی: شیخ داوٗد نام ضعیفی تخلص قطب شاہی سلطنت کے عہد زوال کے شاعر تھے۔ان کی پرورش قطب شاہی دور کے آخر میں ہوئی تھی۔ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک متبحر عالم دین تھے اور انھیں عربی و فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ضعیفی کو حضرت گیسو دراز سے بڑی گہری عقیدت تھی۔انہوں نے اپنی مثنویوں میں حضرت گیسو دراز کی تعریف کی ہے ۔ضعیفی ایک کثیر التصانیف مذہبی شاعر تھے۔ان کی درج ذیل مثنویوں کا پتہ چلا ہے:

(1) ہدایت ہندی،(2) نصیحت مدن،(3) عشق صادق،(4) مثنوی تصرف،(5) رسالہ اذکار،(6) حرمت علیکم،(7) قصہ کفن چور،(8)

وفات نامہ،(9) رسالہ اذکار (منظوم)

ہدایت ہندی ایک فقہی مثنوی ہے جس میں احکام شریعت کی وضاحت کی گئی ہے۔ضعیفی نے یہ مثنوی 1100ھ 1688ء میں تصنیف کی۔ضعیفی کی یہ مثنوی زائد از تین ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

نصیحت مدن تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں احادیث نبویؐ کی روشنی میں اخلاق ونصیحت کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

مثنوی عشق صادق ایک ایسی عورت کی داستان ہے جسے رسول اکرمؐ سے سچی عقیدت تھی۔اس میں ضعیفی نے دکن کی خواتین کی زبان استعمال کی ہے۔اس طرح اس مثنوی میں خواتینِ دکن کی بول چال کی زبان اوران کے محاورے محفوظ ہوگئے ہیں

مثنوی قصہ کفن چور' میں ایک چور کی روداد بیان کی گئی ہے جو مردوں کے کفن چرایا کرتا تھا۔لیکن آخر میں وہ توبہ کر کے سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ان مثنویوں کے علاوہ ضعیفی کی متعدد غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔

عشرتی: عشرتی ولی اورنگ آبادی کے بزرگ معاصر تھے۔عشرتی کا اصل نام سید محمد تھا۔ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات نامعلوم ہیں۔زوال بیجا پور کے بعد عشرتی اورنگ زیب کی ملازمت میں داخل ہوئے۔عشرتی کا مزار شاہ راجو حسینی کے گنبد (مصری گنج۔حیدرآباد) کے پہلو میں واقع ہے۔

عشرتی کی تین تصانیف کا پتہ چلا ہے۔(1) قصہ پدماوت،(2) چت لگن،(3) دیپک پتنگ۔قصہ پدماوت فارسی میں ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1110ھ ہے۔عشرتی نے اس میں ملک محمد جائسی کی پدماوت کا خلاصہ پیش کیا ہے۔چت لگن دکنی زبان میں لکھی گئی ایک مثنوی ہے جس میں عشرتی نے ایک قدیم طرز کی داستان بیان کی ہے۔مثنوی دیپک پتنگ عشرتی کی شاہکار مثنوی ہے۔اس میں انھوں نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔لیکن یہ پدماوت کا براہ راست ترجمہ نہیں ہے بلکہ عشرتی نے پدماوت کے فارسی ترجمے مثنوی شمع و پروانہ (مصنفہ عاقل خاں رازی) کو پیش نظر رکھا ہے۔ڈاکٹر زور نے مثنوی دیپک پتنگ کا سنہ تصنیف 1114ھ بیان متعین کیا ہے۔(ڈاکٹر زور' دکنی ادب کی تاریخ' ص93)

والہ موسوی: والہ موسوی ولی اورنگ آبادی کے ہم عصر تھے۔ان کا پورا نام میر سید محمد اور تخلص والہؔ تھا۔وہ ملا سید محمد باقر موسوی خراسانی کے فرزند تھے۔ان کے سنہ پیدائش کا علم نہیں۔مقام پیدائش خراسان ہے۔والہ نے مروجہ علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔والد کے انتقال کے بعد وہ دہلی آئے۔نظام الملک آصفجاہ اول نے انھیں اپنا مصاحب مقرر کیا۔وہ ان کے ساتھ حیدرآباد آئے اور دکن ہی کے ہو رہے۔والہ موسوی ارکاٹ کے نواب محمد علی والا جاہ کے ہم زلف تھے۔اس رشتے سے وہ حیدرآباد سے ارکاٹ گئے اور ترچنا پلی میں مقیم ہوگئے۔وہیں 1184ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

والہ ایک زبردست عالم' سخنور' انشا پرداز اور نقاد تھے۔فارسی میں وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔فارسی کے علاوہ والہ نے دکنی زبان میں بھی شاعری کی۔دکنی کی اہم مثنوی '' طالب وموہنی'' والہ کی تصنیف ہے۔ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ یہ مثنوی 1150ھ کے قریبی زمانے میں حیدرآباد میں لکھی گئی۔(ڈاکٹر زور' طالب وموہنی (مطبوعہ) مقدمہ ص 17) اس میں طالب نامی ایک نوجوان مسلمان مسافر اور ایک ہندو مہاجن کی دختر موہنی کے عشق کی المیہ داستان بیان کی گئی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ شاہ معظم کی شعری تصانیف کا ذکر کیجیے؟

2۔ بحری کے حالات بیان کیجیے؟

12.2.2 ولی کے گجراتی معاصرین

ولی اور سراج کے عہد میں علاقہ گجرات میں بھی متعدد اُردو شعرا دادِ سخن دے رہے تھے۔ان میں بعض ولی سے عمر میں بہت بڑے تھے' بعض ہم عمر تھے اور بعض ولی کے شاگرد تھے۔ذیل میں ان میں سے چند اہم شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

شیخ محمد امین گجراتی: امین کا پورا نام شیخ محمد امین تھا۔وہ گودھرا (گجرات) کا باشندہ تھا۔امین کے حالات زندگی کی تفصیلات نامعلوم ہیں۔اس نے چار مثنویاں لکھیں جن کے نام یہ ہیں۔(1) یوسف زلیخا (2) تولد نامہ (3) معراج نامہ (4) وفات نامہ

ان مثنویوں کے علاوہ اس کا ایک قصیدہ بھی ملتا ہے۔امین کی اصل شہرت مثنوی یوسف زلیخا کی بدولت ہے۔اس نے یہ مثنوی مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں 1109ھ (1297ء) میں مکمل کی ۔قدیم زمانے میں گجرات کے شعرا اردو کو گجری کہتے تھے۔امین بھی اپنی زبان گجری کہتا ہے۔

سنو مطلب اہے اب یوں امین کا لکھے گجری منیں یوسف زلیخا

سید محمد اشرف: ان کا نام سید محمد اشرف اور تخلص اشرف تھا۔متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔اشرف احمد آباد کے مشہور صوفی بزرگ شاہ عالم کے خاندان میں مرید تھے۔شعر وسخن میں اشرف ولی کے شاگرد تھے۔وہ ایک پر گو شاعر تھے۔غزل کے علاوہ انھوں نے مثنوی اور مرثیہ جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔اشرف کو اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔انھیں استادِ فن مانا جاتا تھا۔اشرف کا ایک دیوان غزلیات' ایک مثنوی موسوم بہ جنگ نامہ حیدر اور تیرہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جو نہایت پر اثر ہیں۔

اشرف کا اصل میدان غزل ہے۔ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔اشرف کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیت جذبات کی فراوانی اور بیان کی سادگی ہے۔ان کا محبوب کوئی ماورائی ہستی نہیں بلکہ ارضی مخلوق ہے۔اس کی خصوصیات وہی ہیں جو عام انسانوں میں ملتی ہیں۔اشرف جب اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہیں تو اس کے ایک ایک لفظ سے اس کے محبت کے جذبات اور دلی کیفیات اپنا جادو جگاتی نظر آتی ہیں۔نمونۂ کلام:

اے ہوش ربا سندر مجھ پاس ٹک آتی جا
رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتی جا
دیدار ستی اپنے محروم نہ رکھ مجھ کوں
آنچل کوں اٹھا مکھ سوں' ٹک درس دکھاتی جا

ہاشم علی: ان کا نام ہاشم علی تھا اور وہ اپنے پورے نام کو بہ طور تخلص استعمال کرتے تھے۔ہاشم علی کا وطن گجرات تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ہاشم علی گجرات کے اہم مرثیہ گو شاعر تھے۔ان کے معاصرین میں روحی' مرزا دکنی اور قادر مرثیہ گوئی میں مشہور ہوئے۔ہاشم علی ان شاعروں کو اس طرح یاد کرتا ہے۔

ہزار حیف نہیں شاعران دکن　　　سو روحی و مرزا و قادر نہیں

ہاشم علی نے اپنے مرثیوں کا مجموعہ' دیوان حسینی' کے نام سے مرتب کیا۔اس دیوان سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشم علی نے مرثیے کے سوا کسی دوسری صنف سخن میں طبع آزمائی نہیں کی۔

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خوان راہ کا　　　جز مدح و منقبت اس نے لکھا نہیں

دیوان حسینی میں مرثیوں کی تعداد تین سو ہے جو ردیف وار مرتب کیے گئے ہیں۔ ہاشم علی کہتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد شاعری نہیں گریہ وزاری ہے۔ یہ مراثی زیادہ تر مربع اور مخمس کی ہیئت میں ہیں اور شاذ غزل کی ہیئت میں بھی۔

غلامی: غلامی کا نام غلام حیدر یا غلام مرتضیٰ تھا۔ان کا وطن گجرات تھا۔ یہ ہاشم علی کے ہم عصر تھے۔غلامی بنیادی طور پر مرثیہ گو تھے، لیکن انھوں نے چند کبت بھی لکھے ہیں۔ان کے لکھے ہوے سترہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ڈاکٹر زور کے مطابق ''اپنے ہم عصروں ہاشم علی اور رضا اور دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں حقیقت نگاری کے لحاظ سے وہ بہت اچھا شاعر تھا۔اس کے خیالات بھی اعلیٰ تھے۔کربلا کے دل شکن واقعات کو اس نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کو حقیقی تاریخی واقعات سمجھنے لگتا ہے۔''

ہاشم علی اور غلامی کے علاوہ رضا گجراتی بھی اس دور کا ایک اہم مرثیہ گو شاعر تھا جس کے چند مرثیے ملتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ امین گجراتی کے شعری کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دیوان حسینی کس قسم کا دیوان ہے، واضح کیجیے۔

3۔ سید محمد اشرف کے حالات بیان کیجیے۔

12.3 اکتسابی نتائج

☆ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی فتح دکن سے آصف جاہی سلطنت کے قیام کے ابتدائی دور تک کا زمانہ دکنی ادب کا مغل دور کہلاتا ہے۔اس دور میں دو اہم شعرا سرزمین اورنگ آباد سے اٹھے ایک ولؔی اور دوسرے سراج۔ دکنی شعر و ادب کا یہ دور ایک طرح سے ولؔی اور سراؔج کا عہد تھا۔

☆ ولؔی اورنگ آباد کے باشندے تھے۔بعض مصنفین نے انھیں گجرات کا باشندہ بتایا ہے لیکن ان کے دیوان کی داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اورنگ آباد کے باشندے تھے۔اردو شاعری کی تاریخ میں ولؔی ایک عہد ساز شخصیت کے مالک ہیں۔انھوں نے اردو غزل کا رشتہ فارسی غزل سے جوڑا اور روایتی دکنی غزل کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ولؔی نے 1700ء میں دہلی کا سفر کیا۔ان کے سفر دہلی کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ولؔی کی تقلید میں شمالی ہند کے شعرا نے اردو میں باقاعدہ غزل گوئی کا آغاز کیا۔

☆ ولؔی کے جانشین کے طور پر سراج کا نام روشن ہوا۔وہ 1128ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔وہ نہایت زود گو شاعر تھے۔ان کی غزل میں عشق کی حرارت اور صوفیانہ خیالات کی سرمستی پائی جاتی ہے۔وہ شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے مرید تھے۔مرشد کے کہنے پر انھوں نے شاعری ترک کردی۔سراج کی کلیات میں غزلوں کے علاوہ مثنویات، رباعیاں، قصائد وغیرہ شامل ہیں۔علاوہ ازیں ایک مثنوی"

بوستان خیال" بھی سراج کی اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنی روداد عشق بیان کی ہے۔

☆ وؔلی اور سراج کے عہد میں متعدد شعرا دکن کے مختلف علاقوں اور گجرات میں دادسخن دے رہے تھے۔ ولی اور سراج کے اورنگ آبادی۔ معاصرین میں داؔؤد غزل گو شاعر تھے جن سے غزلیات کا ایک دیوان یادگار ہے۔ عاؔجز بھی اورنگ آباد کے اہم شاعر تھے۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں ایک ایک دیوان مرتب کیا۔ علاوہ ازیں لال وگوہر کے نام سے ایک داستانی مثنوی لکھی۔ اسی دور میں شاہ قاسم بھی تھے جن کا دیوان غزلیات شائع ہو چکا ہے۔ ساؔمی، وؔلی کے کم عمر معاصر تھے۔ ان کا دیوان غزلیات ناپید ہے لیکن مثنوی ''سروشمشاد'' موجود ہے۔ ان کے علاوہ عزلت بھی عہد ولی وسراج کے اہم اورنگ آبادی شعرا ہیں۔

☆ ولی اور سراج کے دیگر دکنی معاصرین میں شاہ معظم حسینی نے غزلیات کے دیوان کے علاوہ متعدد صوفیانہ مثنویاں لکھیں جیسے شجرہ الاتقیا، گلزار چشت، معراج نامہ، ساقی نامہ وغیرہ۔ اسی زمانے کے ایک مشہور صوفی شاعر قاضی محمد بحری ہیں۔ ان کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی ''من لگن'' نہایت مشہور اور مقبول ہے۔

☆ سید شاہ حسین ذوؔقی بھی صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے سب رس کی داستان کو وصال العاشقین کے نام سے مثنوی کی شکل میں لکھا۔ دیگر مثنویوں میں غوث نامہ، وفات نامہ رسول اور نزہت العاشقین شامل ہیں۔ فراقی بیجاپوری وؔلی کے کم عمر معاصر تھے۔ ان کی چند غزلیات اور ایک ضخیم مثنوی "مراۃ الحشر" دستیاب ہوئی ہے جس میں قیامت کے احوال بیان کیے ہیں۔

☆ وجدی اصلاً دھارور (مہاراشٹرا) کے باشندے تھے لیکن کرنول میں بود و باش اختیار کی تھی۔ ان سے تین مثنویاں، مخزن عشق، پنچھی باچھا اور تحفۂ عاشقاں یادگار ہیں۔ ولی ویلوری بھی اس دور کے اہم دکنی شاعر تھے جنھوں نے ملا حسین واعظ کاشفی کی مثنوی روضۃ الشہدا کا دکنی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ ان کی آٹھ مثنویوں کا ذکر ملتا ہے۔ ملا داؤد ضعیفی نے فقہی مسائل اور اخلاق وتصوف پر مثنویاں لکھیں۔ عشرتی بھی اس دور کے اہم شاعر تھے جنھوں نے تین مثنویاں قصہ پدماوت، چت لگن اور دیپک پتنگ لکھیں۔

☆ ولی اور سراج کے عہد میں علاقہ گجرات میں بھی اردو شاعری کے چرچے تھے۔ وؔلی کے گجراتی معاصرین میں شیخ محمد امین گجراتی نہایت اہم ہیں جن کی چار مثنویاں ملتی ہیں۔ ان میں مثنوی یوسف زلیخا اہم ہے۔ ہاشم علی گجرات کا سب بڑا مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس کے مرثیوں کا مجموعہ دیوان حسینی ہے۔ ہاشم علی کے علاوہ غلامی اور رضا گجراتی بھی اس دور کے اہم مرثیہ گو شعرا تھے۔

12.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
پتیارا	اعتماد، اعتبار
غمزہ	آنکھ اور بھوں سے معشوق کا اشارہ کرنا
سرچشمہ	پانی کا سوتا
انبساط	خوشی، کھلنا
چین پیشانی	پیشانی کی شکن

کھبالے بال	گھنگریالے بال
جودھا	پہلوان، بہادر
بان	تیر
آزادمشرب	آزادخیال
الہام	دل پر خدا کی طرف سے کوئی بات ظاہر ہو جانا

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات ؛

1۔ ولؔی کا اصل نام اوران کا سنہ وفات کیا ہے؟

2۔ سراج اورنگ آبادی کی تصانیف کے نام بتائیے؟

3۔ عاجز اورنگ بادی اور سامؔی کی مثنویوں کے نام بتائیے؟

4۔ عزلت کی راگ مالا کس قسم کی تصنیف ہے؟

5۔ ولؔی نے کس سن میں دہلی کا سفر کیا؟

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات ؛

1۔ سراج اورنگ آبادی پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے؟

2۔ ولی کے گجراتی معاصرین کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

3۔ شاہ معظم کی شعری تصانیف کا ذکر کیجیے؟

4۔ بحرؔی کے حالات بیان کیجیے؟

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات ؛

1۔ ولؔی کے حالات زندگی اوران کے کلام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ ولؔی کے اورنگ آبادی معاصرین کا تعارف کرائیے۔

3۔ ولؔی کی غزل گوئی پر ایک مضمون لکھیے۔

12.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ دکن میں اردو — نصیرالدین ہاشمی

2۔ تاریخ ادب اردو جلد اول — ڈاکٹر جمیل جالبی

3۔ تاریخ ادب اردو، جلد اول و دوم — پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین

بلاک V: شمالی ہند میں شعر و ادب کا ارتقا

اکائی 13: دبستانِ دہلی

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 دبستان دہلی کا سماجی و تہذیبی پس منظر
13.3 میر تقی میرؔ
13.4 مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ
13.5 دبستانِ دہلی کے دیگر شعرا
13.5.1 مرزا محمد رفیع سوداؔ
13.5.2 خواجہ میر دردؔ
13.5.3 میر سوزؔ
13.5.4 مومن خاں مومن
13.5.5 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ
13.5.6 بہادر شاہ ظفرؔ
13.6 دبستانِ دہلی کی خصوصیات
13.7 اکتسابی نتائج
13.8 کلیدی الفاظ
13.9 نمونۂ امتحانی سوالات
13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.0 تمہید

اُردو شاعری کے دو اہم دبستان ہیں' ایک دبستانِ لکھنؤ اور دوسرا دبستانِ دہلی۔ اس اکائی میں دبستانِ دہلی کی شاعری کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ دبستانِ دہلی کے سماجی و تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس دبستان کے دو الگ الگ عہد یعنی اٹھارہویں وانیسویں صدی کے دو اہم شعرا میر تقی میؔر اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی حیات اور ان کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ میؔر اور غالبؔ کے ہم عصر جو اہم شعرا ہیں ان کی شاعری پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ دبستانِ دہلی کی خصوصیات پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس اکائی میں اپنی معلومات کی جانچ کے لیے سوالات بھی دیے گئے ہیں۔ پوری اکائی مکمل ہونے پر طلبا کی سہولت کے لیے نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں۔ آخر میں فرہنگ اور سفارش کردہ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی میں دبستان دہلی کے شعرا اور خصوصیات کو سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبا اس قابل ہوسکیں گے کہ:

☆ دبستان دہلی کی تہذیبی و سماجی مسائل کے بارے میں مختصراً جان سکیں

☆ میر تقی میؔر اور غالبؔ کی حیات و شاعری کو بیان کرنے کے قابل ہوسکیں

☆ مرزا محمد رفیع سوؔدا، خواجہ میر درؔد، میر سوؔز، مومن خاں موؔمن، ذوؔق اور بہادر شاہ ظفؔر کی شاعری کو مختصراً جان سکیں اور

☆ دبستان دہلی کو سمجھ سکیں اور اس کی خصوصیات بیان کرنے کے قابل ہوسکیں۔

13.2 دبستانِ دہلی کا سماجی و تہذیبی پس منظر

دبستان دہلی کو سمجھنے کے لیے اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ہندوستان کا سیاسی، سماجی و تہذیبی منظر نامہ پیش نظر رکھنا ہوگا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے 1707ء میں وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا اس وقت کا رواج بن گیا تھا۔ اورنگ زیب نے اسی ڈر سے اپنے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں اپنی سلطنت تقسیم کرکے جنگ وجدال سے بچانے کی کوشش کی مگر ایسا نہیں ہوا۔ معظم نے اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کردیا اور شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کرکے حکومت کرنے لگا۔ مگر پانچ سال بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے، جن میں معزالدین جہاں دار شاہ نے اپنے تینوں بھائی عظیم الشان، رفیع الشان اور خجستہ اختر جہاں شاہ کو قتل کرکے 1712ء میں بادشاہت حاصل کرلی۔ جہاں دار شاہ ایک نااہل اور عیاش بادشاہ تھا۔ اس لیے دوسرے افراد شاہی تخت پر نظر رکھنے لگے۔ جہاں دار کے بھتیجے فرخ سیر نے 1713ء میں بادشاہ کو شکست دے کر خود شاہی تخت پر قبضہ کرلیا۔ مگر سید برادران کو اس کی کوئی بات انتہائی ناپسند گزری اور انہوں نے 1719ء میں فرخ سیر کا قتل کرادیا۔ پھر محمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ محمد شاہ کے دور میں ملک کو پے در پے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ روہیلوں کی بغاوت ہوئی، نادر شاہ و احمد شاہ ابدالی کے حملے ہوئے اور ملک میں خانہ جنگی کے حالات پیدا ہوگئے۔ 1748ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوا تو احمد شاہ نے حکومت سنبھالی مگر 1754ء احمد شاہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ پھر عالم گیر ثانی، اس کے بعد شاہ جہاں ثانی کچھ عرصے تک تخت نشیں رہے۔ احمد شاہ ابدالی نے پھر دہلی پر حملہ کیا اور 1761ء میں اس پر

قبضہ کر کے شاہ عالم ثانی کو تخت نشیں کیا۔ اس طرح مغلیہ حکومت بالکل تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی۔ میر تقی میرؔ نے احمد شاہ ابدالی کی قتل و غارت گری کا حال 'ذکرِ میرؔ' میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مغلیہ حکومت کی کمزوری پر انگریزوں نے پوری نظر رکھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مغلیہ حکومت پر قبضہ کرنے لگے۔ 1803ء میں ولزلی نے دہلی پر قبضہ کرلیا مگر بادشاہ کا نام باقی رہا۔شہنشاہ دہلی کے احکامات صرف قلعے تک محدود ہوگئے۔ 1806ء میں اکبر شاہ ثانی تخت نشیں ہوئے۔ اس طرح کئی بادشاہ بنے مگر انہوں نے صرف انگریزوں کی کٹھ پتلی کے طور پر کام کیے۔عوام معاشی تنگی اور بدحالی سے گزرنے لگی۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ حکومت کے سب سے آخری بادشاہ رہے۔انگریزوں نے مغلیہ حکومت پر اتنا قبضہ کرلیا تھا کہ بادشاہ کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ اسی درمیان انقلاب 1857ء کا واقعہ رونما ہوا، جس میں بے انتہا ہندوستانی انقلابی شہید ہوئے۔ انگریزوں کو بہادر شاہ ظفرؔ سے پوری طرح حکومت چھین لینے کا اچھا بہانہ مل گیا۔انہوں نے بہادر شاہ ظفرؔ پر 1857ء میں ہندوستانی انقلابیوں کا ساتھ دینے کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ پھر انہیں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصے تک دہلی میں فسادات، بدنظمی اور بیچارگی صاف نظر آتی ہے۔ مغلیہ حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔عوام معاشی تنگ دستی سے پریشان تھی۔ کسی ملازم کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ شاہی زندگی گزارنے والے قلعہ کے افراد کو کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ان تمام صورت حال کا تہذیب وتمدن اور ادب پر براہ راست اثر پڑا۔ خاص کر اردو شاعری پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ دہلی کے اسی ماحول میں اُردو شاعری پروان چڑھی۔میرؔ نے دہلی کی اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ؎

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال کب ہوا؟

2۔ مغلیہ حکومت کے آخری بادشاہ کا نام بتائیں۔

13.3 میر تقی میرؔ

میر تقی میرؔ کی پیدائش 1722ء میں آگرہ میں ہوئی۔ اصل نام محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ان کے والد کا نام محمد علی متقی تھا۔ میرؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے دوست امان اللہ اور بعد میں اپنے والد سے حاصل کی۔ میرؔ ابھی بمشکل گیارہ برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والد کا 1733ء میں انتقال ہوگیا۔ یہیں سے میرؔ کی زندگی میں رنج والم کا باب کھل گیا۔ میرؔ نے آگرہ میں ہی روزگار تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ مجبوراً 1734ء میں تلاش معاش کی غرض سے دہلی روانہ ہوئے۔مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنے کے بعد جب ان کی ملاقات صمصام الدولہ سے ہوئی جن پر ان کے والد کے کئی احسانات تھے تو صمصام الدولہ نے میر تقی میرؔ کے لیے ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر کردیا۔ میرؔ واپس آگرہ آگئے جہاں کچھ عرصے تک ان کو وظیفہ ملتا رہا۔مگر جب صمصام الدولہ کا انتقال ہوا تو میرؔ کا وظیفہ بھی بند ہوگیا۔جس کے بعد میرؔ نے مجبور ہوکر دوبارہ دہلی

کا رخ کیا۔ اس بار میؔر نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزؔو کے گھر قیام کیا جو خود عالم اور مشہور شاعر تھے۔ یہاں میؔر سات سال تک مقیم رہے۔ میؔر کو یہاں نہ صرف معاشی پریشانیوں سے چھٹکارا ملا بلکہ وہ تعلیمی مراحل سے بھی گزرے۔ کسی بات کی وجہ سے جب سراج الدین علی خاں نے میؔر کے ساتھ بدسلوکی شروع کی تو تنگ دل ہو کر میؔر وہاں سے دوسری جگہ چلے گئے۔

میؔر جب سراج الدین علی خاں کے یہاں تھے تبھی سے شاعری کرنے لگے اور 1740ء میں بحیثیت شاعر ان کی شہرت ہوگئی۔ سراج الدین علی خاں کے یہاں سے نکلنے کے بعد میؔر مختلف حکام کے یہاں ایک عرصے تک نوکری کر کے گزر بسر کرتے رہے مگر وہ ہمیشہ پریشان رہے۔ کچھ دن ناگرمل سنگھ کے ساتھ بھی رہے۔ مگر جب مرہٹوں نے دہلی کو لوٹ لیا تو میؔر کوڑیوں کے محتاج ہوگئے اور صرف شاعری ان کا مشغلہ رہ گیا۔ اس طرح میؔر اپنی عمر کے پچاس سال تک مختلف پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ انہیں کبھی آرام کا موقع میسر نہ ہوسکا، جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

میؔر پر قسمت اس وقت مہربان ہوئی جب آصف الدولہ نے 1781ء میں انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت بھیجی۔ میؔر نے لکھنؤ پہنچ کر آصف الدولہ کی قصیدہ خوانی کی تو انہیں بہت پسند آئی اور تین سو تا چار سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بطور ملازم مقرر کیا۔ اس طرح میؔر کے لکھنؤ میں 31 برس آرام کے گزرے اور 20 ستمبر 1810ء جمعہ کے دن دارفانی کوچ کر گئے۔

میؔر نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی مگر غزل ان کا اہم میدان تھا۔ ان کی غزلیں ذاتی مسائل کے علاوہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی عکاس ہیں۔ میؔر ہر بات کو سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ میؔر کی سوانح عمری سے پتہ چلتا ہے کہ میؔر زندگی بھر مختلف پریشانیوں سے گزرے۔ تلاش معاش میں مختلف امرا کے یہاں کام بھی کیا۔ اس وقت دہلی کے حالات بھی کچھ ایسے رہے کہ دہلی کو بار بار لوٹا گیا۔ اس طرح میؔر کی شخصیت کے داخلی و خارجی دونوں پہلو پر غم کا اثر رہا جو میؔر کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ میؔر کی شاعری میں عصری جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ دہلی کی تباہی و بربادی اور بادشاہوں کے آنکھوں کو دہکتی سلائیوں سے جلانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میؔر اپنے اشعار میں اکثر ہم کلامی کرتے نظر آتے ہیں۔ میؔر کی آپ بیتی جگ بیتی لگتی ہے۔ کیوں کہ میؔر نے وہی کہا جو ان کے دل پر گزری۔ میؔر اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کو ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ان کے کلام کی سحر انگیزی سے بچ نہیں پاتا۔ چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی　　انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میؔر　　اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

میؔر اپنے محبوب کو مختلف طریقے سے یاد کرتے ہیں۔ محبوب کے سراپا اور اس کے حسن کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ میؔر کا محبوب اتنا حسین ہے کہ پھول وکلیاں بھی اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے کم کم کھلنا سیکھتی ہیں۔ اس کے ہونٹ پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم وخوبصورت

ہیں۔ پھول، آئینہ، چاند وسورج سب اس کے حسن کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ میؔر کے اشعار میں محبوب کی ہر ادا دکھائی دیتی ہے۔ معشوق کے قد و قامت، غمزہ و ادا اور میؔر کے ساتھ اس کے نخروں کی صاف تصویریں نظر آتی ہیں۔ میر ہر وقت بس ذکرِ محبوب میں مصروف رہتے ہیں۔

اگر چہ دیگر کئی شعرا نے عشق کو موضوع بنا کر غزل گوئی کی ہے مگر میؔر نے جس طرح مکمل طور پر عشق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر عشق کو موضوع بنایا ہے وہ دیگر شعرا کے یہاں نہیں ملتا۔ میؔر کی شاعری میں عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں ملتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف عشق حقیقی کو موضوع بنایا ہے بلکہ وحدت الوجود، وحدت الشہود، فنا و بقا، وحدت و کثرت، وجود و عدم، جبر و قدر پر بھی گفتگو کی ہے۔ میؔر کو زندگی کی بے ثباتی کا بھی احساس ہے۔ چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا   خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا   جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رو تھا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے

میؔر کے اشعار میں دل سوزی، حزنیہ کیفیات، المناک فضا اور نشتر کی طرح دل میں اتر جانے والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میؔر کی آپ بیتی جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اشعار سے قاری کو ایسی انسیت و اپنائیت ہوتی ہے گویا خود اسی کا معاملہ ہو۔ ان کی زبان نرم اور رسیلی ہے۔ میؔر کی شاعری میں کہیں کہیں حیات و کائنات کے رنگا رنگ مظاہر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ میؔر اپنے اشعار میں نشتریت وچبھن بھی پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

میؔر کے اشعار میں نرمی، غنائیت، موسیقیت اور ترنم اس طرح ہے جیسے نغمے کی لہر دوڑ جائے۔ وہ اپنے اشعار میں مترنم الفاظ، چھوٹی بحروں اور نغمگی پیدا کرنے والے ردیف و قافیہ کا استعمال کرتے ہوئے تکرار الفاظ سے نغمگی پیدا کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے   جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میؔر کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر میؔر نے غزل کو بلندیوں پر پہونچایا۔ غنائیت اور داخلی شاعری میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔ انہیں کی غزلیہ شاعری کا نتیجہ تھا کہ وہ دور غزل کا عہد زریں کہلایا۔ میؔر کے زیادہ تر اشعار حزنیہ کیفیت رکھتے ہیں مگر یہ اشعار مایوس نہیں کرتے بلکہ ناکامی و مایوسی سے نکل کر زندگی جینے کا سلیقہ دیتے ہیں۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر تقی میؔر کی مختلف تصانیف ملتی ہیں جن میں کلیاتِ اُردو، جو چھ دیوان پر مشتمل ہے، کے علاوہ فارسی دیوان، ذکر میر (فارسی میں میر کی سوانح عمری) اور نکات الشعرا (تذکرہ) ہیں۔ میؔر نے غزل کے بعد مثنوی پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مثنویات میں بطور خاص دریائے عشق، معاملات عشق، خواب و خیال، شعلۂ عشق اور جوش عشق قابل ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو میؔر کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کی ندرت، خوبصورت پیکر تراشی، عصری حسیت، روانی، سلاست، نغمگی، بے ساختگی، قوت متخیلہ، امیجری اور اپنے دور کے مسائل کی عکاسی میؔر کو آفاقی شاعر بنا دیتے ہیں۔ میؔر کی شاعری کی عظمت کے سبب انہیں خدائے

سخن کہا گیا۔ غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ، امیر مینائیؔ اور فراقؔ گورکھپوری جیسے شعرا نے نہ صرف میرؔ کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ ان کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ غالبؔ نے خود کہا کہ

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

13.4 اسداللہ خاں غالبؔ

مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ ابتدا میں اپنا تخلص اسدؔ رکھا مگر بعد میں غالبؔ استعمال کرنے لگے۔ غالبؔ کی عرفیت مرزا نوشہ قرار پائی۔ والد کا نام عبداللہ بیگ تھا۔ غالبؔ کے سر سے بچپن میں والد کا سایہ اٹھ چکا تھا، اس لیے ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے غالبؔ کی پرورش کی۔ مگر غالبؔ ابھی آٹھ سال کی عمر کو پہونچے تھے کہ ان کے چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ 1810ء میں تیرہ سال کی عمر میں غالبؔ کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ 1812ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ غالبؔ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ سات بچے پیدا ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔

غالبؔ کی پوری زندگی معاشی تنگدستی میں گزری۔ دہلی میں جب معاشی تنگی درپیش ہوئی تو غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے یہاں قلعہ میں ملازمت اختیار کرلی۔ جہاں بہادر شاہ ظفرؔ نے مرزا غالبؔ کو نجم الدولہ، دبیرالملک، نظام جنگ کا خطاب عطا کر کے 50 روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر کے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ ذوقؔ کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ کو اپنا استاد تسلیم کیا۔ 1857 کے بعد جب غالبؔ کی سرکاری پنشن بند ہوگئی تو ان کی زندگی نہایت ہی کس مپرسی میں گزرنے لگی۔ غالب کی صحت مزید خراب ہوتی گئی۔ مرنے سے ایک روز قبل دماغ پر فالج کا اثر ہوا اور 15 فروری 1869ء کو وفات پاگئے۔ دہلی کی بستی حضرت نظام الدین میں انہیں دفنایا گیا۔

غالبؔ نے اُردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہونچایا۔ نئے نئے موضوعات شامل کیے۔ فلسفیانہ خیالات کو جگہ دی۔ غالبؔ زندگی کا اچھا شعور رکھتے تھے۔ غالبؔ نے زندگی کے حقائق اور نفسیات کو بڑی سادگی سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے بنیادی معاملات ومسائل پر غور وفکر کرتے ہیں پھر ان کی گتھیوں کو سلجھا کر انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی مگر ان کو اُردو شاعری کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔ غالبؔ تقلید کے قائل نہیں تھے وہ اپنا راستہ خود بناتے تھے۔ انہوں نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربے کر کے اس میں وسعت بخشی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''غالبؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے متنوع موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے''۔

غالبؔ کی شاعری کئی حیثیت سے انفرادیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں طنز وظرافت، رمز وایمائیت، نکتہ آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات اور تصوف کا ذکر بالخصوص پایا جاتا ہے۔ غالبؔ کی غزل حسن خیال، حسن معنی اور حسن بیان کا پرتو ہے۔ ان کی شاعری میں قول محال کا استعمال ملتا ہے، یعنی ایسی بات جو بظاہر درست مفہوم نہ لگے مگر غور کریں تو درست ہو۔ ایک ہی شعر کے کئی کئی معانی نکلتے ہیں۔ لطافت ونکتہ آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ خوبصورت تشبیہات واستعارات کا استعمال ملتا ہے۔ انسان دوستی بھی ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ ذیل میں چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ شخصی طور پر ایک اچھے انسان بھی تھے اور شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ انھوں نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اچھی شاعری کی۔ غالبؔ نے قصیدے بھی لکھے، لیکن دراصل وہ قصیدے کے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا رنگ تو غزل میں کھلتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ غالبؔ کو بات کرنے کا انداز آتا تھا۔ وہ ایسی جدت اور ندرت سے کام لیتے تھے کہ بات کچھ کی کچھ ہو جاتی تھی۔ غالبؔ کے کلام کی خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ یہ اُن کی شخصیت کا کمال تھا کہ اتنی آفتوں کو سہنے اور ایسے ہولناک مناظر کو دیکھنے کے باوجود انھوں نے شوخی اور ظریفانہ حس کو برقرار رکھا۔

غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو بھی بلندیوں تک پہونچا۔ الغرض غالبؔ صرف اپنے دور کے ہی عظیم شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔ اُن کی عظمت کے گُن اُردو شعر و ادب میں ہمیشہ گائے جاتے رہیں گے۔

13.5 دبستان دہلی کے دیگر اہم شعرا

دبستان دہلی کو دو اہم ادوار میں تقسیم کرنے کے بعد دیکھا جائے تو ایک میرؔ کا عہد کہلاتا ہے تو دوسرا غالبؔ کا عہد۔ میرؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور میر سوزؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس عہد سے زبان کی اصلاح دینے والے شاہ حاتمؔ اور مظہر جان جاناںؔ کا تعلق بھی ہے۔ اس عہد میں قدیم ہندی و دکنی زبان متروک ہوئی۔ اس دور کا سب سے اہم کارنامہ ایہام گوئی کا ترک کیا جانا ہے۔ اُردو شاعری جس پر غزل کا قبضہ تھا اس میں قصائد، ہجو، مثنویاں اور مرثیے لکھے جانے لگے۔ شعرا کی تعداد بڑھی اور تذکرے بھی لکھے جانے لگے۔ غالبؔ کے عہد کے اہم شعرا میں مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دبستانِ دہلی کے ان شعرا پر ذیل میں مختصراً روشنی ڈالی جارہی ہے۔

13.5.1 مرزا محمد رفیع سوداؔ:

مرزا محمد رفیع سوداؔ 1706ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا محمد رفیع نام اور سوداؔ تخلص تھا۔ والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کو انہوں نے مخمس و شہر آشوب کی شکل میں بڑے دلکش انداز میں تحریر کیا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد دیگر کئی شعرا کی طرح وہ بھی لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ لکھنؤ میں شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں سبھی نے ان کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کیا۔ انہیں ملک الشعرا کا خطاب بھی ملا۔ وہیں 1781ء میں وفات پائی۔

اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔ انہوں نے فارسی قصیدہ نگاری کا بغور مطالعہ کیا اور اس کی تمام خصوصیات کو اردو قصیدہ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔

قصیدے کے علاوہ ان کی غزلیں، مثنویاں اور مراثی بھی ملتے ہیں۔

13.5.2 خواجہ میر دردؔ ؛

خواجہ میر دردؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ خواجہ میر ان کا نام اور تخلص دردؔ تھا۔ موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔ دردؔ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی مذہبیت و خدا شناسی ہے۔ 1785ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دردؔ نے فقیرانہ زندگی گزارنا پسند کیا۔ ان کی زندگی کا عکس ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔ سادگی، زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔ اُردو کو ابتدا میں ترقی دینے والے چار ستونوں مرزا مظہر جان جاناںؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے ساتھ ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

13.5.3 میر سوزؔ؛

میر سوزؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ محمد میر ان کا نام اور سوزؔ تخلص تھا۔ ابتدا میں میرؔ بھی تخلص رکھا تھا مگر میر تقی میرؔ کی شہرت کے باعث سوزؔ تخلص اختیار کرلیا۔ دہلی کی تباہی کے بعد فرخ آباد اور فیض آباد میں رہائش اختیار کی مگر آخر میں لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا۔ 99-1798ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سوزؔ کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت وصفائی ملتی ہے۔ سوزؔ کی محبت اس گوشت پوست کی دنیا کی محبت ہے جس میں ناکامی و کامیابی کی درمیانی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ناکامی کے بعد کی شدت ناپید ہے۔ البتہ ان کے یہاں سطحیت بھی نہیں ہے جو محبت میں کامیابی کے بعد ملتی ہے۔ ان کے یہاں روز مرہ کے عشق کی کیفیات کا اظہار ہے۔ وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔ سوزؔ کے یہاں فلسفہ تصوف بھی نہیں ملتا۔ سوزؔ کی شاعری میں سادگی، بے تکلفی و شیرینی ملتی ہے۔ سوزؔ کا خاص میدان غزل ہے مگر مثنوی، رباعی اور مخمس میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ سوزؔ کی حیثیت میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے مساوی نہیں ہے مگر دبستانِ دہلی کے ایک اہم رکن کی حیثیت ضرور رکھتے ہے۔ چند منتخب اشعار دیکھیے۔

صنم کا وصل جو چاہے تو حائل ہو نہ اے عاشق
غبار جسم اٹھ جاوے تو کچھ حائل نہیں ہوتا

بلبل نے جس کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا
وہ آنکھ موند اپنی ہم من ہی من میں دیکھا

اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ یارب راز دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

13.5.4 مومن خاں مومنؔ ؛

مومن خاں مومن کی پیدائش 1800ء میں دہلی میں ہوئی۔ اصل نام محمد مومن تھا۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھا جو دہلی کے مشہور حکیم تھے۔ چونکہ مومنؔ کا خاندانی پیشہ طب تھا، اس لیے انہیں بھی طب کی اچھی معلومات ہوگئی تھی۔ وہ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ وہ نہایت ہی خوبصورت اور حسین تھے۔ مومنؔ کی زندگی کا سب سے دلچسپ حصّہ ان کی حیات معاشقہ ہے۔ ان کی شاعری میں عشق مجازی کا پورا رنگ ملتا ہے۔ مومنؔ کی وفات 1852ء میں دہلی میں ہوئی۔

مومن خاں مومن کی غزلوں کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت بھی ملتے ہیں، مگر غزل ان کا خاص میدان ہے۔

تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کی غزل کی خصوصیات ہیں۔تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع کو بھی مومنؔ نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ان کی شاعری میں مکر شاعرانہ بھی پایا جاتا ہے یعنی شاعر بظاہر ایسی بات کرتا ہے جس میں محبوب کے فائدہ کا احساس ہوتا ہے مگر دراصل اس میں عاشق کا فائدہ ہوتا ہے۔عشق مجازی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔ وہ عشق کے مختلف جذبات وحالات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وعدہ کرنا اور پھر اس کو نہ نباہنا، روٹھنا اور تمنا کرنا کہ کوئی منالے، جذبات نگاری کی جو دلکش تصویرکشی مومن کے یہاں ملتی ہے وہ دیگر شعرا میں کم ملتی ہے۔

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری ۔۔۔ واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو ۔۔۔ کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

مومنؔ کی درج ذیل غزل بہت مشہور ہوئی، جو معاملہ بندی کی پوری تصویرکشی کرتی ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ۔۔۔ وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں ۔۔۔ وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی ۔۔۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا ۔۔۔ میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومنؔ کے یہاں نازک خیالی، ندرت اسلوب اور شاعرانہ شوخی ملتی ہے۔مومنؔ کی عظمت کا انداز اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ درج ذیل شعر کے تعلق سے غالبؔ نے کہا تھا کہ مومنؔ مجھے یہ شعر دے دیں اور میرا دیوان لے لیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

13.5.5 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ:

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ 1790ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوقؔ تخلص تھا۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ جب وہ پیدا ہوئے تو دہلی میں شعروشاعری کا دور دورہ تھا۔انہوں نے بھی بہت کم عمر میں شاعری شروع کردی۔انہوں نے اس عہد کے مشہور استاد سخن استاد نصیر کی شاگردی اختیار کی۔مگر کچھ دنوں بعد ذوقؔ نے اپنی غزلوں پر خود ہی نظر ثانی کرنے لگے اور جلد ہی دہلی کے مشہور شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ وہ نہ صرف شاعری کرنے لگے بلکہ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔وہ بہادر شاہ ظفر کے بھی استاد رہے۔ ذوقؔ کو موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی۔ دربار دہلی سے انہیں ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا۔ 1854ء میں دہلی میں ذوقؔ کا انتقال ہوگیا۔

غزل اور قصیدہ ذوقؔ کے خاص موضوعات تھے۔اس کے علاوہ مثنوی، قطعہ، واسوخت بھی تحریر کیے۔ ذوقؔ کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبی محاورہ شمار کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے حسن تعلیل اور محاورے کو خوب استعمال کیا ہے۔سوداؔ کے بعد قصیدہ میں ان کا کوئی مقابل نہیں ہے۔شیخ محمد ابرہیم ذوقؔ کے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے
تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی — ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے
خط بڑھا کاکل بڑھے زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے — حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

13.5.6 بہادر شاہ ظؔفر:

بہادر شاہ ظؔفر کی پیدائش 1775ء دہلی میں ہوئی۔ ان کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ابوظفر ان کا تاریخی نام تھا۔ اسی رعایت سے اپنا تخلص ظؔفر رکھا۔ تعلیم و تربیت قلعۂ معلیٰ میں ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر اپنے والد اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے وارث مقرر ہوئے۔ یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ بہادر شاہ ظؔفر کی آمدنی کم اور شاہی اخراجات زیادہ تھے۔ اس لیے دھیرے دھیرے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ 1857ء کی تحریک انقلاب کی ناکامی کے بعد جسے انگریزوں نے 'غدر' کا نام دیا تھا، بہادر شاہ ظؔفر کو انگریزوں نے گرفتار کر کے ان پر باغی ہونے کا مقدمہ چلایا۔ پھر مجرم ثابت کر کے قیدی بنا کر انہیں رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور رنگون ہی میں مدفون ہوئے۔

بہادر شاہ ظؔفر کی شاعری پر دہلی کے ابتر حالات کا اثر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں خارجیت و داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔ ذوؔق کے بعد غالؔب سے اپنی شاعری پر اصلاح لی۔ تصوف، اخلاق اور معاملہ بندی ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں۔ شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، قطعات و رباعیات ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ کلیات میں تیس ہزار کے قریب اشعار ملتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں — جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی — جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

بہادر شاہ ظؔفر کی پوری زندگی دہلی کے قلعہ معلیٰ میں گزری مگر زندگی کے آخری ایام میں انقلاب 1857ء کے بعد حالات ایسے بدلے کہ انہیں رنگون میں قید کر دیا گیا جہاں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ حالانکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ دہلی میں رہیں۔ اپنی اس مجبوری کی داستان اپنی شاعری میں تحریر کی ہے۔

13.6 دبستان دہلی کی خصوصیات

دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں دہلی کے حالات بہتر نہ تھے۔ مختلف حکمرانوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ کیا اس طرح دہلی کئی بار اجڑی اور پھر بسی۔ چونکہ شاعر کی شاعری پر اس کے اردگرد کے حالات و مسائل کا بھی اثر پڑتا ہے، اس لیے دہلی کے شعرا پر بھی دہلی کے حالات کا اثر پڑا۔ دہلی میں رہنے والے میؔر اور غالؔب جیسے اہم شعرا کی ذاتی زندگی بھی معاشی اعتبار سے کافی پریشان کن تھی، اس لیے ان کی شاعری پر اس کا مزید اثر ہوا۔ یہی وجہ رہی کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، جس کے سبب دہلی کے شعرا کے یہاں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ و سلیس

زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ملتی ہے۔

دہلی کے سیاسی حالات نے ہر شخص کے دل کو گداز اور دردمند بنادیا تھا۔ حالات کے نشیب و فراز نے انھیں سادگی پسند اور تکلف و تصنع سے دور رکھا۔ زندگی کی سادگی اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ میرؔ و سوداؔ سے لے کر انشاؔ و مصحفیؔ کی شاعری میں ہمیں تکلف اور بناوٹ کی جگہ سادگی اور خلوص کا احساس نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ جی سے بُھلایا نہ جائے گا (میرؔ)

جو ملا اُس نے بے وفائی کی — کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا (مصحفیؔ)

تیرا جو ستم ہے اُس کی تو جان — اپنی تھی سو خوب کر گئے ہم (سوداؔ)

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، وہ اس لیے ہے کہ ان شعرا کا غم صرف اپنی ذات کا غم نہیں تھا بلکہ ایک عظیم الشان تہذیب کے خاتمہ کا غم تھا۔ جس کا احساس اور ملک و سماج کی ابتر حالت نے ان کی زندگیوں میں غم و یاس کا زہر گھول دیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے — دردوغم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا (میرؔ)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے (دردؔ)

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں (غالبؔ)

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تصوف کے اس اثر نے جذبات میں گہرائی اور خیالات میں بلندی پیدا کر دی۔ چند اشعار دیکھیے۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا — موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا (سوداؔ)

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر — جدھر دیکھتا ہوں وہی روبہ رو ہے (دردؔ)

اُردو شاعری کے پورے سرمایہ میں مضامین عشق و محبت کو ایک غالب عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انہوں نے لکھنوی شعرا کی طرح اپنی عشقیہ شاعری کو جذبے کی بالائی سطح کے اظہار کا اسیر نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی ترجمانی کی۔ ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کی دل کی تپش اور روح کی بے قراری کا اندازہ اُن کے محبوب کو ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں روح کی تڑپ سوز و گداز اور درد و اضطراب کی کیفیت ملتی ہے۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے (میرؔ)

جہاں تک دبستانِ دہلی سے وابستہ شعرا کی زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس میں بھی اُن کے مزاج کی سادگی، صفائی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ دہلی کے روزمرہ محاوروں پر جان دیتے ہیں۔ وہ تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔ لکھنؤ کے

شعرا کی طرح عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے زبان کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ آسان وشیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح صفائی، سادگی اور سلاست دبستان دہلی کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے   (دردؔ)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے   (میرؔ)

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو   (غالبؔ)

اس طرح دبستان دہلی کی خصوصیات میں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ وسلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ہے۔ بقول نور الحسن ہاشمی ''دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتادِ ذہنی، ایک مزاج شعری کا، جسے سمجھنے کے لیے لکھنویت سے قدم بقدم مقابلہ کرنا ہوگا۔'' اس لیے مختصراً دبستان لکھنؤ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ دراصل دہلی کے مسائل سے پریشان ہوکر جب چند شعرا نے آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ کا سفر کیا تو انہیں یہاں کا ماحول بڑا سازگار معلوم ہوا۔ یہاں نوابوں کے یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ جب شعرا کو انعامات اور عزت واحترام ملنے لگا تو آرزو، فغاں، میر حسن، حسرت، مصحفی وغیرہ کئی شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ رہنے لگے۔ ان شعرا کے سبب یہاں شعر وشاعری کا ایک ماحول بنا اور چونکہ یہاں معاشی تنگی نہیں تھی اس لیے ان شعرا کی شاعری میں واہ اور خارجیت کے ساتھ ہی معنی کے بجائے لفظیات پر توجہ دی جانے لگی۔ محبوب کا سراپا کھلے لفظوں میں پیش کیا جانے لگا۔ مشکل سے مشکل تر الفاظ کا استعمال کرنا شاعری کی عظمت شمار کیا جانے لگا۔ لکھنؤ کے شعرا دہلی سے اپنی شاعری کو ممتاز کرنے کی غرض سے حد سے تجاوز کر گئے اور واہ، خارجیت اور مشکل الفاظ کے استعمال کو اپنی پہچان بنالی۔

غرض دبستانِ دہلی کی شاعری ہر اعتبار سے عوام وخواص میں بے حد مقبول رہی۔ واضح رہے کہ دہلویت سے مراد صرف وہی شعرا نہیں ہیں جو دہلی میں رہے بلکہ وہ شعرا بھی ہیں جو دہلی کے باہر رہے مگر دہلوی انداز شاعری اختیار کی اور ان کی شاعری میں وہ خصوصیات باقی رہیں جن کی وجہ سے دبستان دہلی جانا جاتا ہے۔

13.7 اکتسابی نتائج

☆ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے 1707ء میں وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا اس وقت کا رواج بن گیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد اس کا لڑکا معظم (بہادر شاہ) اپنے بھائیوں کو قتل کر کے تخت نشیں ہوگیا۔ جیسے ہی اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا معز الدین جہاں دار شاہ نے اپنے بھائیوں کو قتل کر کے 1712ء میں بادشاہت حاصل کرلی۔ 1713ء میں جہاں دار کے بھتیجے فرخ سیر نے اس کو شکست دے کر خود شاہی تخت پر قبضہ کرلیا۔ 1719ء میں جب فرخ سیر کو قتل کردیا گیا تو محمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ، عالم گیر ثانی، شاہ جہاں ثانی اور شاہ عالم ثانی حکومت کرتے رہے۔ مغلیہ حکومت کی کمزوری پر انگریزوں نے پوری نظر رکھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مغلیہ حکومت پر قبضہ کرنے لگے۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ حکومت کے سب سے آخری بادشاہ رہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفرؔ پر 1857ء میں ہندوستانی انقلابیوں کا ساتھ دینے کے جرم گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

☆ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصے تک دہلی میں فسادات، بدنظمی اور بیچارگی صاف نظر آتی ہے۔ان تمام صورت حال کا تہذیب وتمدن اور ادب پر براہ راست اثر پڑا۔خاص کر اردو شاعری پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔اٹھارہویں صدی کے اہم شعرا یعنی میرؔ ،سوداؔ، دردؔ اور میر سوزؔ کی شاعری پر اس کا اثر پڑا۔اسی طرح انیسویں صدی کے شعرا یعنی غالبؔ ،مومن خاں مومن ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری پر بھی ان حالات کا اثر ہوا۔ان حالات کے پیش نظر دہلی کی شاعری نے جو خصوصیات اختیار کر لی وہی دبستان دہلی کہلایا۔

☆ میر تقی میرؔ کی پیدائش 1722ء میں آگرہ میں ہوئی۔ابھی بمشکل گیارہ برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والد کا 1733ء میں انتقال ہو گیا۔یہیں سے میرؔ کی زندگی میں رنج والم کا باب کھل گیا۔تلاش معاش کی غرض سے میرؔ نے دہلی کا سفر کیا۔جہاں کچھ دن تو آرام ملا مگر پھر معاشی تنگی پیش آ گئی۔میرؔ اپنی عمر کے پچاس سال تک دہلی میں مختلف پریشانیوں میں مبتلا رہے۔انہیں کبھی آرام کا موقع میسر نہ ہوسکا۔آصف الدولہ نے جب 1781ء میں میرؔ کو لکھنؤ بلایا اور ماہانہ تنخواہ پر بطور ملازم مقرر کرلیا تو میرؔ کی زندگی آرام سے بسر ہونے لگی۔اس طرح میرؔ لکھنؤ میں 31 برس آرام کے گزار کر 1810ء میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔

☆ میرؔ نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی مگر غزل ان کا اہم میدان تھا۔ان کی غزلیں ذاتی مسائل کے علاوہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی عکاس ہیں۔میرؔ کی شاعری میں عصری جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔دہلی کی تباہی و بربادی اور بادشاہوں کے آنکھوں کو دہکتی سلائیوں سے جلانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔میرؔ اپنے اشعار میں اکثر ہمکلامی کرتے نظر آتے ہیں۔میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی لگتی ہے۔کیوں کہ میرؔ نے وہی کہا جو ان کے دل پر گزری۔میرؔ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کو ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ان کے کلام کی سحر انگیزی سے بچ نہیں پاتا۔میرؔ کے اشعار میں دل سوزی، حزنیہ کیفیات، المناک فضا اور نشتر کی طرح دل میں اتر جانے والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔

☆ میرؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور میر سوزؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔انہوں نے متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔خواجہ میر دردؔ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔سادگی، زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔سوزؔ کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت وصفائی ملتی ہے۔ان کے یہاں روزمرہ کے عشق کی کیفیات کا اظہار ہے۔وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔

☆ مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔بعد میں آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔غالبؔ کی پوری زندگی معاشی تنگدستی میں گزری۔ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔بالآخر 1869ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔غالبؔ نے اُردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہونچایا۔نئے نئے موضوعات شامل کیے۔فلسفیانہ خیالات کو جگہ دی۔غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی مگر ان کو اُردو شاعری کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔انہوں نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربے کر کے اس میں وسعت بخشی۔غالب

کی شاعری کئی حیثیت سے انفرادیت رکھتی ہے۔ان کی شاعری میں طنز وظرافت، رمز وایمائیت،نکتہ آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات اور تصوف کا ذکر بالخصوص پایا جاتا ہے۔ غالبؔ کی غزل حسن خیال، حسن معنی اور حسن بیان کا پرتو ہے۔ایک ہی شعر کے کئی کئی معانی نکلتے ہیں۔ لطافت ونکتہ آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے۔غالبؔ کے کلام کی خصوصیت شوخی اورظرافت بھی ہے۔انھوں نے فارسی اوراُردو دونوں زبانوں میں اچھی شاعری کی۔ غالبؔ نے قصیدے بھی لکھے۔غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو بھی بلندیوں تک پہنچایا۔الغرض غالبؔ صرف اپنے دور کے ہی عظیم شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔

☆ غالبؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مومن خاں مومن، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا نام لیا جاسکتا ہے۔مومن خاں مومن کا غزل خاص میدان ہے۔تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کے غزل کی خصوصیات ہیں۔عشق مجازی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔وہ عشق کے مختلف جذبات وحالات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔

☆ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ غزل اور قصیدہ دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ان کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبی محاورہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ا

☆ دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں دہلی کے حالات بہتر نہ تھے۔مختلف حکمرانوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ کیا اس طرح دہلی کئی بار اجڑی اور پھر بسی۔ دہلی میں رہنے والے میرؔ اور غالبؔ جیسے اہم شعرا کو دیکھتے ہیں تو ان شعرا کی ذاتی زندگی بھی معاشی اعتبار سے کافی پریشان کن تھی۔یہی وجہ رہی کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔حالات کے نشیب وفراز نے انھیں سادگی پسند بنایا اور تکلف وتصنع سے دور رکھا۔زندگی کی سادگی اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

☆ دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی ترجمانی کی۔دبستانِ دہلی کی زبان و بیان میں بھی سادگی،صفائی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

13.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
غنائیت	موسیقیت
امیجری	تصویر کشی
تصنع	دکھاوا، بناوٹ
ندرتِ اسلوب	انوکھا اسلوب

طرزِ بیان	بیان کرنے کا طریقہ
تصوف	دل سے خواہشوں کو دور کر کے اللہ کی طرف دھیان لگانا

13.9 نمونۂ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال کب ہوا؟

2۔ مغلیہ حکومت کے آخری بادشاہ کا نام بتائیں۔

3۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو گرفتار کر کے کہاں بھیجا گیا تھا؟

4۔ اکبر شاہ ثانی کس سنہ میں تخت نشیں ہوا؟

5۔ ''نکات الشعرا'' کس کا تذکرہ ہے؟

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ غالبؔ کی شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ مومن خاں مومنؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفر میں سے کسی ایک کی شاعری پر روشنی ڈالیں۔

3۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی شاعری میں فرق واضح کریں۔

4۔ خواجہ میر دردؔ کی صوفیانہ شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

5۔ مومن خاں مومنؔ کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

13.9.3 طویل مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ دبستان دہلی سے آپ کیا سمجھتے ہیں، خصوصیات بیان کرتے ہوئے وضاحت کریں۔

2۔ میرؔ کی شاعری کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ پیش کیجیے۔

3۔ غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ پیش کیجیے۔

13.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	دلی کا دبستان شاعری	نورالحسن ہاشمی
2۔	تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	میر تقی میرؔ (مونوگراف)	مظفر حنفی
4۔	بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز

اکائی 14: دبستانِ لکھنؤ

اکائی کے اجزا

14.0		تمہید
14.1		مقاصد
14.2		دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر
14.3		دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات
14.4		دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا
	14.4.1	شیخ قلندر بخش جرات
	14.4.2	انشااللہ خاں انشا
	14.4.3	غلام ہمدانی مصحفی
	14.4.4	شیخ امام بخش ناسخ
	14.4.5	خواجہ حیدر علی آتش
14.5		دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا
14.6		اکتسابی نتائج
14.7		کلیدی الفاظ
14.8		نمونۂ امتحانی سوالات
	14.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	14.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	14.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
14.9		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.0 تمہید

دبستان' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی اسکول و مدرسہ کے ہیں۔ ادب میں چار دبستانوں کا ذکر ملتا ہے۔ دبستانِ دہلی' دبستانِ لکھنؤ' دبستانِ عظیم آباد اور دبستانِ رامپور۔ ان میں دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ جب کسی عہد یا علاقے میں وسیع

تناظر میں خیال، موضوع، لب ولہجہ وغیرہ میں یکسانیت پائی جانے لگے اور ان ہی بنیادوں پر اس کی شناخت قائم ہو جائے تو اسے دبستان کہتے ہیں۔ دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کی خصوصیات اپنی اپنی جگہ مسلم ہیں۔ دونوں دبستانوں میں کچھ افتراقات وامتیازات ہیں۔ دلی کی شاعری میں آمد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ کیفیت اُس عہد کے بیشتر شعرا کے یہاں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ دلّی کی زبان میں سادگی، سلاست اور روانی ایک اہم جزو کی شکل میں موجود ہے۔ غزلوں میں کرداروں کی ایک دُنیا آباد ہوتی ہے۔ رقیب، محبوب، پیامبر، عاشق، مخبر وغیرہ دلّی کی شاعری میں ان کرداروں میں مجموعی طور پر سادگی پائی جاتی ہے۔ یہاں شاعر محبوب کے سراپے کے بیان اور عشقیہ اظہار جیسے موضوعات کی وضاحت بھی اشارے کنایے میں کرتا ہے اور اس فنی باریکی کے ہنر سے خوب واقف ہے۔ دوسری طرف دبستانِ لکھنؤ نے اُردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ وہاں کی شاعری میں آورد کی کیفیت موجود ہے۔ اس کیفیت سے وہاں کے شاعروں نے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ اِرادہ کر کے شعر باندھنا بھی ہنر ہے۔ صنعتوں کا استعمال، زبان کی صحت پر زور اور صنف ریختی کے فروغ جیسے غیر معمولی کمالات دبستانِ لکھنؤ کے ہی مرہونِ منت ہیں۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ دبستان کے معنی ومفاہیم واضح کر سکیں۔
- ☆ دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات مثالوں سے سمجھا سکیں۔
- ☆ دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر جرات سے متعلق گفتگو کر سکیں۔
- ☆ انشا کے طرزِ تحریر کے بارے میں سمجھا سکیں۔
- ☆ مصحفی کی شاعری کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- ☆ آتش کے کلام کی خصوصیات کون کون سی ہیں، حوالوں سے سمجھا سکیں۔
- ☆ اصلاح زبان کی تحریک پر روشنی ڈال سکیں۔

14.2 دبستانِ لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی پس منظر

اُردو ادب کی تاریخ میں دبستانِ لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی پس منظر ہمیشہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کی مضبوط ومستحکم بنیاد سعادت خاں برہان الملک نے رکھی۔ اُنہوں نے اودھ میں خودمختار حکومت کی ابتدا کی۔ یہ حکومت تقریباً سوا سو سال کی تاریخ پر محیط ہے جس میں شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ، سعادت خاں غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ کے دورِ حکومت شامل ہیں۔ برہان الملک بہادر بڑے دور اندیش انسان تھے۔ وہ صوبے کے کاموں میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔

فیض آباد اودھ کا پہلا دارالخلافہ تھا، لیکن یہ منصوبہ بند طریقے سے نہیں بسایا گیا تھا۔ اس بنگلے کے اطراف واکناف میں بتدریج ترقی ہوتی جا رہی تھی اور پھر یہ نہایت بارونق اور آبادی سے بھرا پُرا ہو گیا۔ شجاع الدولہ اور اُن کی اہلیہ بہو بیگم نے فیض آباد کو ادبی وثقافتی اعتبار سے پہچان عطا کیا۔ جب دلی پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس وقت متعدد شاعر، فن کار اور مختلف پیشے سے وابستہ پریشان حال لوگوں نے اودھ کا ہی رُخ کیا تھا۔ بعض شاعروں کو شجاع الدولہ نے از خود اودھ آنے کی دعوت دی تھا اور آنے والوں کو عزت وتوقیر عطا کی۔ شجاع الدولہ کے بعد

نواب آصف الدولہ نے بھی اپنی دانشمندی سے مملکت کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا۔ ان کے عہد میں فنِ تعمیر کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ انہیں ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ مہمان نواز اور کھلے دل و دماغ کے شخص تھے۔ انہوں نے آنے والوں کی پذیرائی کی اور انہیں انعامات و اکرامات سے نوازا۔ آصف الدولہ کے بھائی سعادت علی خاں تھے۔ انہوں نے تقریباً سولہ سال تک تخت و تاج سنبھالا۔ لکھنؤ کی تاریخ میں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کا دور بہترین دور رہا ہے۔ غازی الدین حیدر بھی اودھ کے نواب وزیر رہے ہیں۔ لیکن اِس زمانے کے آتے آتے انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا اور اُن کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ اس دبستان کا آخری بادشاہ نواب واجد علی شاہ تھے۔ انہیں فنونِ لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ انہیں اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان سے بھی بہت لگاؤ تھا اور وہ ان دونوں زبانوں میں لکھا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اس آخری تاجدار، واجد علی شاہ کو انگریزوں نے مٹیا برج بھیج دیا۔ اس طرح لکھنؤ کے بادشاہوں کی سخاوت، آپسی محبت و بھائی چارگی، ادب دوستی، شاعروں اور دیگر فنکاروں کی قدردانی و سرپرستی کا چراغ جو برہان الملک کے عہد سے روشن تھا وہ واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ 1856ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

دبستانِ لکھنؤ ہمیشہ سے تہذیب کا مرقع رہا ہے۔ نوابین، امرا و رؤسا اور زندہ دل لوگوں کی آماجگاہ یہ شہر اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ مرکزِ نگاہ رہا ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں یہ بات بڑے دعوے کے ساتھ لکھی ہے کہ ''حال خطّہ بے نظیر دل پذیر رشک گلشن جنان مسکن حور و غلمان جائے مردم خیز باشندے یہاں کے ذکی فہیم عقل کے تیز۔ اگر دیدہ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھیے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے، آنکھ بند کرے شعر سنا۔ رضوان بھی جس کا خوشہ چیں ہے وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمین ہے۔'' سرور کے اس خیال سے انکار ممکن نہیں ہے۔

کسی بھی شہر کی تاریخ میں وہاں کے بنیاد گزار کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ متذکرہ خطے کے حوالے سے شجاع الدولہ، آصف الدولہ، غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ وہ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی اس دلچسپی کی بازگشت ان کے عہد سے عصرِ حاضر تک سنائی دیتی ہے۔ ہر علاقے کی اپنی اپنی تہذیب ہوتی ہے جس کے سبب اس علاقے کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کی جھلک وہاں کے لباس، طرزِ معاشرت، غذا، عادات و اطوار میں واضح طور پر ملتی ہے۔ مثلاً کڑھائی کیے ہوئے کُرتے، چوڑی دار پاجامے، دوپلّی ٹوپی، ریشمی رومال، مخملی جوتے وغیرہ وہاں کے خاص لباس ہیں۔ وہاں کی رضائی گوٹے کنارے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ چکن کا کام ساری دُنیا میں مشہور ہے بلکہ اب تو یہ مخصوص کام لکھنوی ورک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

لکھنؤ کے رہن سہن، طرزِ زندگی، رسومات، عقائد، توہمات وغیرہ منفرد نوعیت کے ہوتے ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری اور نثر میں طوائفوں کا ذکر بھی اکثر و بیشتر ملتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہاں کے نوابین اور معتبر لوگوں کے یہاں طوائفوں کو معیوب نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ لکھنؤ کے تہذیبی عناصر کا ایک اہم جز تھیں۔ وہ نوجوان لڑکوں کو آدابِ زندگی اور سلیقہ مندی کی تربیت دیتی تھیں۔ مجرے، خواجہ سرا، لونڈیاں اور ماما ئیں وغیرہ وہاں کے معاشرے کا حصہ تھیں۔ سلام کرنے کا طریقہ، آداب کہنے کا انداز، چھوٹوں کو دعا دینے اور اُن سے شفقت سے پیش آنے میں وہاں کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ لکھنؤ کے بازار، باغات، سڑکیں، چوک وغیرہ بھی اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔

لکھنؤ اہلِ تشیع کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو جتنی شہرت لکھنؤ میں ملی، کسی دوسرے شہر میں نہ مل سکی۔

وہاں محرم کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہاں کے مختلف علاقوں میں امام باڑے موجود ہیں جن میں سے بعض کی تو تاریخی اور ادبی حیثیت بھی ہے۔ وہ امام باڑے فنِ تعمیر کے بہترین نمونے ہیں اور قابل دید ہیں۔لکھنؤ کی تہذیب میں فنونِ لطیفہ کا بھی دخل ہے۔ وہاں کے عوام موسیقی، مصوری اور خطاطی کے ساتھ ساتھ کبوتر بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی وغیرہ میں بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جنہیں دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر کہا جاسکتا ہے اور اِسی پس منظر میں وہاں کی شاعری پروان چڑھی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ فیض آباد کے بعد لکھنؤ کو اودھ کا دارالخلافہ کس بادشاہ نے بنایا؟

2۔ ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

3۔ انگریزوں نے کس بادشاہ کو ''مٹیا برج'' بھیج دیا؟

14.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات

اٹھارہویں صدی دلی اور لکھنؤ کی ادبی دُنیا اور خصوصاً شاعری کے لیے بہت نشیب وفراز کا دور رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ میں اُردو شاعری کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ دوسری طرف دلّی میں بھی اٹھارہویں صدی میں متعدد بلند پایہ شاعر و ادیب موجود تھے۔ میرتقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، سوزؔ جیسے قدآور شعرا اس عہد میں شاعری کے گیسو سنوار رہے تھے۔ اِن میں سے ہر شاعر یکتا تھا۔لیکن وہاں طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہونے لگیں اور وہ دلّی جو عالم میں انتخاب تھا اُسے واقعی لوٹ کر ویران کر دیا گیا۔ مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس عہد میں وہاں کے شعرا و ادبا کو دلّی کے روح فرسا ماحول نے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں سے بہت سے شعرا نے اودھ جانے کو ترجیح دی۔

لکھنؤ میں شعروادب کے لیے ہر طرح سے ماحول سازگار تھا۔ وہاں کے شاعر، ادیب و فنکار سبھی کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ، سعادت علی خاں، واجد علی شاہ ادب دوست اور ادب نواز تھے۔ وہ نہ صرف شاعری سے شغف رکھتے تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی شاعر تھے۔ واجد علی شاہ کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ نیر مسعود نے اپنے ناول ''طاؤس چمن کی مینا'' میں واجد علی شاہ کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کا نقشہ کھینچا ہے اور اودھ کے زوال آمادہ معاشرے کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ دلّی سے جتنے شعرا ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچے اُنہیں وہاں ایک اچھا ماحول میسر آیا، دربار تک رسائی ہوگئی۔ وہاں کے نوابین، امرا و رؤسا نے ان کے شایان شان اُنہیں نوازا۔ وہاں ان شاعروں کو چین و سکون نصیب ہوا۔ وہاں کی فارغ البالی کے ماحول نے ایسے شاعروں کی شعری تخلیقیت کو مزید قوت و توانائی عطا کی جس سے ان کی شاعری کا حسن دوبالا ہوگیا۔

دبستانِ لکھنؤ کی سرزمین ادبی حوالے سے دلّی سے مختلف تھی۔ وہاں کے ماحول اور مزاج میں رنگینی رچی بسی تھی۔ ہر طرف خوشحالی تھی۔ نوابوں کے اپنے اپنے شوق تھے۔فنون لطیفہ سے دلچسپی، گھڑسواری کا شوق، تلوار بازی اور بٹیر بازی میں دلچسپی تھی۔ گھنگھرؤں اور پائلوں کی جھنکار گلی کوچے میں سنائی دیتی تھی۔عیش وعشرت اور داد و دہش کا دور تھا۔اس ماحول میں جو شاعری ہو رہی تھی ان میں لفظی صنعت گری، زبان کی بازی گری، تصنع و تکلفات، صنعتوں کا استعمال، مشکل پسندی، دور کی کوڑی لانے کی کوشش، حسن وعشق اور محبوب کے سراپا کا بیان وغیرہ شامل

ہیں۔ یہ ایسے اجزا و عناصر ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری پُر ہے۔ جو شعرا یہاں پہلے سے موجود تھے ان کی شاعری متذکرہ خصوصیات سے مزین ہے۔ اسی تسلسل میں یہ بات بھی حقیقت ہے کہ دلی سے آنے والے شعرا بھی یہاں کے اسی ماحول میں رفتہ رفتہ ڈھل گئے۔ اس ماحول میں ڈھلنا اُن کے طبعی میلان کے ساتھ ساتھ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ ان کی مجبوری بھی تھی۔ ایسے شعرا بادشاہِ وقت کی خوشنودگی' دربار تک رسائی اور داد و تحسین' نیز عوام میں کلام کی مقبولیت کا ایک بہترین ذریعہ شاعری میں انفرادیت اور جدت پیدا کرنا سمجھتے تھے۔ اِسی لیے شاعروں نے شعوری اور غیر شعوری دونوں طور پر اس رنگ کو اختیار کر لینے کی کوشش کی تھی۔

ادب کی تمام اصناف میں غزل کو ہر زمانے میں شہرت ملی جس کا موضوع اور دائرہ کار اور مرکز و محور حسن و عشق ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں ان روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ محبوب کے سراپا کا بیان اور اس کی جزئیات نگاری پر زور دیا گیا ہے تاکہ لطف و انبساط کا ذریعہ بن سکے اور اسی سبب بعض دفعہ فحش اور ابتذال جیسی باتیں بھی شاعری میں در آتی تھیں۔ غزل کی مقبولیت کا یہ عالم رہا ہے کہ معروف ادیب رشید احمد صدیقی نے اسے اُردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔ ابتدائی دنوں میں غزل میں عشق کی کیفیات اور قلبی واردات' جذباتی کیفیات کا اظہار ہوتا تھا۔ غزل اپنے اصطلاحی معنوں میں اس صنف سخن کو کہا جاتا ہے کہ جس میں عورتوں سے باتیں کی جائیں یا اس کے بارے میں باتیں کی جائیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ دُنیا کی بے ثباتی' معاشرے کے جیتے جاگتے واقعات' بہار کے موسم' گرما کی شدت وغیرہ جیسے موضوعات بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ عہد حاضر میں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس کے تعلق سے غزل کے شعر نہ کہے گئے ہوں۔ آج ہر موضوع پر غزل کہی جا رہی ہے۔

دبستانِ لکھنؤ میں اُردو کی ایک اور شعری صنف ''ریختی'' کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس صنف کی ابتدا دکن میں ہاشمی بیجاپوری سے ہوتی ہے اور لکھنؤ میں رنگین اس جانب متوجہ ہوئے۔ رنگین کے ساتھ انشا بھی تھے۔ رنگین کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ اِس صنف میں عورتوں کی زبان میں شاعری کے ساتھ ساتھ اس کے دُکھ درد' نفسیات و کیفیات' عورت کے ناز و ادا اور اس کی نشست کے آداب وغیرہ کی مکمل عکاسی کی جاتی ہے تاکہ مکمل شبیہ اُبھر سکے۔ یہ بات بھی حیران کن ہے کہ ریختی مرد حضرات ہی نے لکھی ہے۔ یہاں تک کہ دربار میں بھی اُنہوں نے ہی پیش کی ہے۔ ایسے شعرا عموماً نسوانی لب و لہجے اور انداز و ادا کے ساتھ نسوانی لباس بھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ مثال دیکھیے:

مردوں پر جو جان کھوتی ہیں اور مستانیاں وہ ہوتی ہیں (مرزا شوق لکھنوی)

ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں (انشا)

ابتدا سے ہی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ صنعتوں کا استعمال شاعری میں حسن پیدا کرتا ہے۔ دبستان لکھنؤ میں بھی اس کا کثرت سے استعمال کیا گیا۔ تشبیہ' استعارے' مجاز مرسل' مراۃ النظیر' لف و نشر وغیرہ صنعت کی قسمیں ہیں۔ ایہام بھی ایک صنعت ہے۔ ایہام کے معنی وسوسہ پیدا کرنا ہے۔ اس میں کسی لفظ کو شعر میں اس طرح برتا جاتا ہے کہ اُس سے دو معنی نکلتے ہوں۔ اس طرح قاری ایہام کا شکار ہو جاتا ہے کہ آیا شاعر نے کون سے معنی مراد لیے ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری میں صنعت ایہام کا استعمال ایک فن تصور کیا جاتا تھا۔ وہاں کے شعرا ایہام سے شاعری میں فضا قائم کرتے تھے۔ ایسے ایسے ذو معنی الفاظ تلاش کر کے شاعری میں استعمال کرتے کہ حسن میں اضافے کے ساتھ ساتھ لطف کا سامان مہیا ہو

جائے۔ دبستانِ لکھنؤ میں اسے ہنر اور کمال تصور کیا جاتا تھا لیکن جب کوئی بھی چیز حد سے تجاوز کر جائے تو اس میں کچھ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری بھی تکلفات کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ اُسی عہد میں ناسخ اور مرزا مظہر جان جاناں نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی۔ اُنہوں نے زبان کی صفائی پر زور دیا۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے گریز کیا۔ قواعد کے مطابق زبان کی اصلاح کی اور نئی نئی بندشیں اور تراکیب ایجاد کیں۔ اِنہیں دبستانِ لکھنؤ میں ایک منفرد مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔ دبستانِ لکھنؤ میں ایک طرف منفرد لب و لہجے کی شاعری ہو رہی تھی وہیں دوسری طرف اسی دور میں مرثیے کی ایک صحت مند روایت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ وہاں حمد' نعت' منقبت وغیرہ بھی کہے جا رہے تھے۔ میر انیس اور دبیر نے مرثیے اور رباعی کو بام عروج تک پہنچایا بلکہ اُس کے لیے سازگار ماحول بھی بنایا۔ ان کے یہاں دل و دماغ کی پاکیزگی اور خراج عقیدت پیش کرنے کا جذبہ تھا۔ مرثیے کو ثواب کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں واقعات کربلا اور شہدائے کربلا کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے جس سے ایک روحانی فضا قائم ہوتی ہے۔ انیس و دبیر اس دور کے اہم مرثیہ گو تھے۔

دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات اور اہمیت دبستانِ دہلی کے مدمقابل قدرے کم تسلیم کی جاتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری نے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ یہاں کے شعرا نے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی غرض سے نئے نئے تراکیب ایجاد کیے' مشکل ردیف وقوافی میں شاعری کی' الفاظ کا مختلف انداز سے استعمال کیا' خارجی کیفیات و احساسات کے بیان پر کافی زور دیا۔ امرا و رؤسا اور نوابوں کو خوش کرنے کے لیے قصد کر کے شاعری کرتے تھے جس سے اُن کی مشق سخن جاری رہی۔ اپنی اِس صلاحیت پر وہ نازاں و فرحاں رہا کرتے تھے۔ آتش نے بجا کہا ہے:

بندشیں الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش نے الفاظ کی مرصع سازی کو ایک فن مانا ہے۔ شاعری میں الفاظ ایسے ہی جڑے جاتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگوں کو جڑا جاتا ہے۔ اِس فنکاری سے دبستانِ لکھنؤ کے شعرا بحسن وخوبی واقف تھے اور عمل پیرا بھی تھے۔ یہ اس دبستان کا خاصا بن کر رہ گیا تھا۔ دبستانِ لکھنؤ میں زبان کی نفاست ونزاکت پر زور دیا گیا ہے۔ اِس دبستان کے شعرا کو بادشاہ کی سرپرستی حاصل تھی اور معاشرہ خوشحال تھا۔ اسی لیے وہاں شاعروں کو خوب پھلنے پھولنے اور اپنے کمالات کے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ وہاں شاعری میں غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی اور مرثیے کو بھی خوب شہرت حاصل ہوئی۔

14.4 دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا

14.4.1 شیخ قلندر بخش جرات؛

شیخ قلندر بخش جرات کا اصل نام یحیٰ امان تھا۔ جرات اُن کا تخلص تھا۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ مغل دربار میں خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ والد کا نام حافظ امان تھا۔ وہ خوددار اور خدا ترس انسان تھے۔ اورنگ زیب کے انتقال کے کچھ برسوں بعد جب نادر شاہ نے دلی پر حملے کیے اور حد درجہ تباہی و بربادی مچادی تب دلی اُجڑ سی گئی۔ نادر شاہ کے حملے کا ذکر کتابوں میں تاریخی سانحے اور ایک سیاہ باب کی طرح ملتا ہے۔ اس حملے کے دوران جرات کے والد بھی مارے گئے۔ جرات بے سروساماں ہو گئے۔ مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

جرات کا شعروشاعری سے طبعی میلان تھا۔ وہ ابتدا میں جعفرعلی حسرت کے شاگرد تھے۔ جرات کو حسرت سے بہت عقیدت تھی۔ وہ ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔ شاعری کے علاوہ جرات علوم نجوم سے واقف تھے۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی اور ستار بھی اچھا بجایا کرتے تھے۔ لیکن اُن کی شہرت ومقبولیت بحیثیت شاعر ہوئی۔ جرات کی جوانی میں ہی دونوں آنکھوں کی روشنی چلی گئی جس کا قلق اُنہیں عمر بھر رہا۔ مرزا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ چلے آئے اور دربار سے وابستہ ہوگئے۔ لکھنؤ میں انشا و مصحفی کا طوطی بول رہا تھا۔ جرات سے اُن کے معرکے شروع ہوگئے اور ان معرکوں اور مقابلوں کے باوجود جرات نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرلی۔

جرات مزاجاً بڑے رنگین تھے۔ انہیں زبان پر بھی قدرت تھی۔ لہٰذا وہ جذبات وکیفیات کا بیان بڑے عمدہ طریقے سے کرتے تھے۔ روانی اور بے ساختگی ان کی شاعری کی ایک اہم خوبی تھی۔ موضوع کے اعتبار سے اُن کا مرکز ومحور عاشقانہ تھا۔ کبھی کبھی عشق کے بیان میں اتنی شدت اور گہرائی پیدا ہوجاتی تھی کہ وہ فحش نگاری تک پہنچ جاتی تھی۔ جرات کی شاعری میں معاملہ بندی کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ جرات کے استاد جعفرعلی حسرت کے یہاں بھی یہی خصوصیت ملتی تھی لیکن جرات اُن سے بھی آگے نکل گئے۔

جرات کی زندگی خاصہ حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ ان کی شاعری دبستانِ لکھنؤ کی شعری خوبیوں سے مملوومزین تھی۔ جرات کا محبوب تخیلاتی و تصوراتی نہ ہوکر حقیقی تھا۔ اُنہوں نے غزلیں، مثنویاں، مرثیے اور قطعات یادگار چھوڑے ہیں۔

14.4.2 انشا اللہ خاں انشا:

انشاءاللہ خاں انشا 1756ء میں مرشدآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں اپنے والد ماشاء اللہ، کے ہمراہ دلی تشریف لائے۔ انشا کافی پڑھے لکھے انسان تھے۔ بلا کے ذہین، بذلہ سنج اور حاضر جوابی میں یکتا تھے۔ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ترکی، بھاکا، فارسی، سنسکرت وغیرہ زبانوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ انشا بڑے ہی ہنسوڑ قسم کے انسان تھے۔ وہ کسی بھی محفل میں بلاتکلف اور بغیر کسی مصلحت کے کچھ بھی کہہ جاتے تھے۔ جو دل میں آتا اُسے کہنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ وہ جب دلی میں تھے اس وقت بھی انشا کی اپنے معاصرین سے سرد جنگ چلتی رہتی تھی۔ انشا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مصحفی پہلے سے موجود تھے۔ دونوں میں نظریاتی اختلاف شروع ہوگیا اور حد درجہ تلخی پیدا ہوگئی۔ مصحفی وہاں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن انشا نے بھی اپنی ذہانت سے سبھوں کو قائل کرلیا اور دبستانِ لکھنؤ کی دُنیائے شاعری پر چھاگئے۔ انشا کی سعادت علی خاں کے دربار تک رسائی ہوگئی۔

سعادت علی خاں انشا کے لطیفے اور ان کی ذہانت کے اتنے قائل ہوگئے کہ انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ انہیں وہ وقار اور سہولتیں عطا کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انشا اپنی اس عزت افزائی اور وقار کو سنبھال نہ سکے۔ وہ اکثر حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ کبھی کبھی لطیفوں اور گفتگو کے درمیان ایسی مثالیں دے دیتے کہ وہ سعادت علی خان کی ناراضگی کا باعث ہوجاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ناراضگی تلخی میں بدل گئی۔ انہیں دربار سے ملنے والی سہولتوں اور بادشاہ کی کرم فرمائیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انشا کا آخری وقت بہت عسرت میں گزرا۔ انشا کی شاعری ان کے ذاتی مزاج اور لکھنوی شاعری کی خصوصیات سے مزین ہے۔ کلام میں سادگی کی جگہ زندہ دلی ہے۔ وہ ایسی فضا قائم کرتے تھے جہاں ہنگامہ اور حرکت ہو۔ انشا سوز وگداز کے شاعر نہیں تھے۔ وہ زندگی کو جینے کے قائل تھے۔ جب وہ لکھنؤ پہنچے تو وہاں کی شاعری پورے آب وتاب

اور شباب پر تھی۔لکھنوی شاعری کا وہ انداز، وہاں کا عیش ونشاط،محبوب کا سراپا اور معاملہ بندی کا بیان انشا کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔انشا در بارتک رسائی اور معاصر شاعروں سے معرکے کے سبب بھی ہمیشہ تذکروں میں رہے۔ان کے زمانے میں لوگ اور بالخصوص معاصر شعراان پر رشک کیا کرتے تھے۔لیکن اعتدال نہ ہونے کے سبب انہوں نے سب کچھ کھودیا۔

انشا بیک وقت شاعر اورنثر نگار دونوں تھے۔انہوں نے اردوقواعد کی کتاب'' دریائے لطافت'' کے نام سے لکھی۔انہوں نے دو داستانیں''رانی کیتکی کی کہانی'' اور''سلک گوہر'' لکھیں۔ دونوں ہی داستانوں میں انہوں نے عام روش سے ہٹ کر جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔''سلک گوہر'' بغیر نقطے کی داستان ہے یعنی پوری داستان میں ایسا کوئی بھی حرف استعمال نہیں کیا گیا ہے جس میں نقطہ آتا ہو۔''رانی کیتکی کی کہانی'' خالص بھاشا میں لکھی گئی ہے۔اردو کی یہ داستان عربی وفارسی کے الفاظ سے عاری ہے۔

14.4.3 غلام ہمدانی مصحفی:

مصحفی کے تخلص سے مشہور اس معروف شاعر کا اصل نام غلام ہمدانی تھا۔وہ 1750 عیسوی میں امروہہ ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کی پانچویں، چھٹی دہائی مغل سلطنت کے زوال اور شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔مصحفی بچپن ہی میں دلی چلے آئے تھے۔یہاں انہیں ادبی ماحول ملا۔مصحفی نے دلی میں رہتے ہوئے عربی اور فارسی زبان پر دسترس پیدا کی۔عمر کے ساتھ ساتھ شاعری میں دلچسپی کا اضافہ ہوا،محفلوں اور مشاعروں میں جانا بھی شروع کر دیا۔مصحفی کو کتب بینی کا شوق بچپن سے تھا۔جب دلی کے حالات بدل گئے اور شعرا نے لکھنو کے لیے رخت سفر باندھنا شروع کر دیا تو مصحفی نے بھی دلی کو خیر باد کہتے ہوئے پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔یہاں مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔جب مصطفیٰ لکھنؤ آئے اس وقت انشا اور جرات وہاں پہلے سے موجود تھے۔مصحفی کی انشا سے ان بن رہنے لگی جو لکھنو کی شاعری کی طرح ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بن گئیں۔دونوں ہی شعرا بہت مشہور تھے اور ان کی شاعری کو پسند کرنے والوں اور شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔آئے دن ان کے مداحوں اور شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔اساتذہ کی چشمک مداحوں اور شاگردوں میں منتقل ہوگئی اور وہ ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کرنے لگے۔محمد حسین آزاد نے''آب حیات'' میں دونوں شاعروں کے اختلافات کا ذکر خوب کیا ہے۔ایسے بلند پایا شعرا کے درمیاں چشمک اور تہذیب کی حدود کو عبور کرتی ہوئی سطحی باتیں،ان کی عظمت اور عزت و وقار کو کم کرتی تھیں۔مصحفی آخر وقت تک لکھنؤ ہی میں رہے اور 1824ء میں یہیں ان کا انتقال ہوا۔

مصحفی بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ بہترین تذکرہ نگار کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔انہوں نے فارسی شعرا کے تذکرے''عقد ثریا'' کے نام سے رقم کیا اور دو تذکرے شعرائے اردو سے متعلق لکھے جو''ریاض الفصحا'' اور''تذکرہ ہندی'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

مصحفی قادرالکلام اور زودنویس شاعر تھے۔انہوں نے کثیر تعداد میں غزلیں کہی ہیں۔معاشی تنگی کی وجہ سے وہ اپنی غزلیں معاوضہ لے کر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔انہیں دلی اور لکھنؤ کے درمیان کا پل بھی کہا جاتا ہے۔اس لیے کہ ان کے یہاں دلی کی شاعری کی خصوصیات بھی ملتی ہیں اور لکھنوی شاعری کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔اس عہد میں دلی میں میر،سودا،درد،سوز وغیرہ چھائے ہوئے تھے جن کے یہاں شاعری داخلیت یعنی داخلی کیفیات سے پر ہے۔اس دور کی دلی کی شاعری تغزل سے بھرپور ہوتی تھی۔دوسری طرف دبستانِ لکھنؤ ہے جہاں خارجیت اور تصنع وتکلفات موجود ہیں۔لکھنو کی شاعری ان خصوصیات سے بھری پڑی ہے۔اس کی بھرپور نمائندگی انشا،جرات اور رنگین کر رہے

تھے۔مصحفی کو دونوں دبستانوں سے سروکار رہا۔مصحفی ماضی کی یاد لیے حال میں جی رہے تھے اور اس ماضی و حال کے درمیان انہیں ایک نئی راہ اختیار کرنی تھی جو منفرد بھی ہو اور ممتاز بھی۔مجنوں گورکھپوری کا یقین ہے کہ مصحفی کی شاعری میں کئی شعرا کے کلام کی خصوصیات موجود ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مصحفی بڑے پر گو شاعر تھے۔ان کا کلام بہت سی خصوصیتوں کا حامل ہے جس میں سودا کی شوکت الفاظ، میر کا سوز و گداز، درد کی شگفتگی،فغاں کی رنگینی،انشا کی ترکیب الفاظ اور جرات کی سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔انہوں نے اپنی غزل کی بنیاد خلوص اور محبت پر رکھی ہے۔'' (مصحفی اور ان کی شاعری،ص15 مشمولہ ولی سے آتش تک' مرتبہ ایم حبیب خاں)

14.4.4 شیخ امام بخش ناسخ؛

امام بخش نام تھا اور ناسخ تخلص فرماتے تھے۔ان کے والد شیخ خدا بخش تجارت کی غرض سے لاہور سے اودھ آئے اور یہیں ناسخ کی پیدائش ہوئی۔ناسخ متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔تعلیم و تربیت کا بھی معقول انتظام تھا۔یہ بہت لمبے چوڑے انسان تھے جنہیں کھانے کا بہت شوق تھا۔انہیں آم سے بہت رغبت تھی۔باقاعدگی سے ورزش کیا کرتے تھے۔ناسخ بنیادی طور پر اصول پسند انسان تھے۔جب لکھنؤ دارالخلافہ بن گیا تو فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔شعر و شاعری سے انہیں ابتدا ہی سے شغف تھا،لیکن خود ہی مشق سخن کیا کرتے تھے۔کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔ناسخ نے جب شاعری کی ابتدا کی اور رفتہ رفتہ مشاعروں میں جانے لگے تو جلد ہی بہت مقبول ہو گئے۔شہر کی مشہور و معروف شخصیات نے ان کی شاگردی قبول کی۔ناسخ کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔وہ کبھی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ان کے معاصر آتش تھے جن سے ان کی معرکہ آرائی تھی۔ناسخ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ان کی شناخت دو حیثیتوں سے ہے۔شاعری اور اصلاح زبان کی کوششوں کے حوالے سے۔لکھنوی شاعری میں جو خصوصیات موجود تھی وہ کسی حد تک ناسخ کے یہاں بھی موجود ہیں۔البتہ تصنع اور صنعتوں کا کثرت استعمال ناسخ کی شاعری کی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔بقول احتشام حسین''غزل میں جو جذباتی اقبال اور سوز و گداز ہوتا ہے وہ نہ صرف کہ یہاں بہت کم ہے۔'' جذباتی ابال اور سوز و گداز کی کمی کے باوجود ناسخ کی غزلیں لفظی شان و شوکت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔انہوں نے کبھی کسی کی شان میں قصیدے نہیں لکھے۔ناسخ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے اور استاذ الاساتذہ کہلاتے تھے۔

ناسخ کا اہم کارنامہ اصلاح زبان کی تحریک ہے۔وہ اس کے موجد کہلاتے ہیں۔انہوں نے زبان کی تذکیر و تانیث اور قواعد کا تعین کیا۔ ہندی کے ثقیل الفاظ خارج کر کے اردو زبان کو صحت و سلاست اور روانی عطا کی۔ناسخ کے زمانے میں دبستان لکھنو کی شاعری کا جو انداز تھا' ناسخ نے اس سے منفرد ایک ایسا طرز ایجاد کیا جس سے لکھنؤ کی ادبی دنیا مزید مستحکم ہوگئی۔ناسخ نے اردو زبان کے لیے جو اصول و قواعد وضع کیے وہ خود بھی ان اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہے۔یہی اصول کی پابندی ان کی شاعری کے اڑان اور پرواز میں حارج ہو جاتی ہے۔زبان کی صفائی کے سبب شاعری میں پابندی سی لگ جاتی ہے اور شاعر خیال بندی کے بجائے قوائد و مفاہیم کا شکار ہو جاتا ہے۔

14.4.5 خواجہ حیدر علی آتش؛

خواجہ حیدر علی نام اور آتش تخلص تھا۔آتش کے بزرگوں کا وطن بغداد تھا مگر ان کے آباو اجداد دلی منتقل ہو گئے تھے۔والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔آتش اپنے والد کے ہمراہ نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد چلے آئے۔وہ جب کم عمر ہی کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو

گیا۔والد کے انتقال کی وجہ سے ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی ۔آتش کی دوستی کچھ ایسے لڑکوں سے ہوئی ہے جو امرا و رؤسا کے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی دوستی کی وجہ سے آتش کی زبان کافی نکھر گئی ۔وہ عربی و فارسی زبان کی درسی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے تاکہ اس میں مہارت پیدا کرسکیں۔اس زمانے میں فیض آباد میں ''سپاہ گری''اور''تلوار بازی'' کا بھی شوق پایا جاتا تھا۔آتش نے بھی ان کی تربیت حاصل کی اورمہارت پیدا کرلی۔معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ وہ ''تلوار یے'' کے نام سے مشہور ہوگئے۔وہاں کے رئیس محمد تقی خاں سے آتش کی ملاقات ہوئی۔وہ آتش کی شاعری سے متاثر ہوئے اورانہیں اپنے یہاں ملازمت پر رکھ لیا۔غازی الدین حیدر کے زمانے میں محمد تقی حافظ آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگئے۔آتش بھی ان کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔اس وقت وہاں جرات' انشا' مصحفی' رنگین وغیرہ شاعری کی دنیا پر راج کررہے تھے۔انشا و مصحفی کی معرکہ آرائیاں شباب پر تھیں۔آتش نے بعض معنوں میں مصحفی کا رنگ اختیار کیا اور ان ہی کی شاگردی قبول کی۔رفتہ رفتہ آتش کی ایک منفرد پہچان بن گئی اوران کا شمار لکھنؤ کے مشہور شعرا میں ہونے لگا۔

آتش کے مزاج میں توکل تھا۔مال و دولت سے بے نیاز رہے۔دربار تک رسائی کی تگ ودو یا امرا و رؤسا سے قربت کی کوشش انہوں نے کبھی نہیں کی ۔نہ کسی کے لیے قصیدے لکھے۔قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے جہاں آسائش کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔امیروں کے بجائے غریبوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔شاعروں کی سیاست اور سماجی ہنگامہ خیز باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔اودھ کے دربار سے انہیں 80 روپے ماہوار ملتے تھے۔اسی میں گزر بسر کرتے تھے۔ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ان میں رند' صبا' وزیر اور نسیم نے خوب شہرت پائی۔آتش کے معاصر شاعروں میں ناسخ بھی تھے جن سے ان کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی لیکن دونوں کوایک دوسرے کا پاس ولحاظ بھی تھا۔خصوصاً آتش ناسخ کا باقاعدہ ادب کیا کرتے تھے۔ان کی معرکہ آرائی کی بھی ادبی' تہذیبی اوراخلاقی حدیں تھی۔

آتش کے کلام کے موضوعات میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے ان کی شاعری میں رنگا رنگی تنوع اور تہہ داری پائی جاتی ہے۔لیکن بنیادی طور پر ان کی شاعری میں عشق' تصوف اور بنی نوع انسان کی بقا کا تصور ملتا ہے۔اُردو شاعری میں عشق کے موضوعات ابتدا ہی سے ملتے ہیں۔ دبستانِ لکھنو کی شاعری میں یہ رنگ اور بھی گہرا ملتا ہے۔آتش نے اس روایتی انداز کو اختیار کیا۔

حالانکہ خلیل الرحمٰن اعظمی کہتے ہیں کہ''آتش کے بہترین کلام پر بھی خارجیت کا رنگ بہت گہرا ہے لیکن یہ خارجیت اس خارجیت سے بہت مختلف ہے جس کے لیے اہل لکھنؤ بدنام ہیں۔''

آتش کی شاعری لکھنؤ کی پرتکلف اور پرکشش ماحول میں پروان چڑھی تھی۔اس میں مزید نکھارنے اور سنوارنے کا کام آتش کے استاد مصحفی نے کیا۔آتش کی غزل میں محبوب کا سراپا' انداز وادا' اوراس کے جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

آتش کی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی گہرا ہے۔وہ قناعت پسند صبر وشکر کرنے والے اور درویشانہ مزاج کے مالک تھے۔ان کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور پختگی تھی ۔کسی بھی بڑی شخصیت سے وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ان کی اپنی ایک دنیا آباد تھی جس میں وہ بہت خوش اور مطمئن تھے کہتے ہیں:

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریئے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کر

بادشاہی سے فقیری اور تخت سلیماں کے بجائے بوریا کو اہمیت دینا آتش کی شاعری کے صوفیانہ رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ آتش نے عام روش سے ہٹ کر ایک راہ نکالی اور اس طرح دبستان لکھنؤ کے سرمایہ سخن میں بیش بہا اضافہ کیا اور آنے والے شعرا کے لیے راستے ہموار کیے۔ آتش کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔ اس میں ہر مذہب وملت کی شمولیت تھی۔ وہ انسانیت کے قائل تھے۔ اُن کی شاعری میں اخلاق، انسانی مسائل، آپسی میل جول اور بھائی چارے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ آتش کے شاگردوں میں دیاشنکر نسیم، وجے دیال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اپنی مثنوی کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر خواجہ حیدر علی آتش کا انتقال 1846ء میں ہوا۔

14.5 دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا

دبستانِ لکھنؤ کے مشہور ومعروف شعرا میں انشا، مصحفی، ناسخ وآتش وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ ادب میں ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف کیا جاتا رہے گا۔ ایسے شعرا کو بقائے دوام عطا کرنے والے ان کے شاگرد رشید بھی ہوتے ہیں۔ ناسخ کے تلامذہ میں وزیر، برق، رشک وغیرہ اہم نام ہیں۔ وزیر لکھنؤ کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دُنیاوی و مادی چمک دمک سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ امرا، رؤسا اور نوابین وغیرہ کی قربت اور مہربانیوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ واجد علی شاہ نے انہیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی لیکن اُنہوں نے اُسے نظر انداز کر دیا۔ وہ ناسخ کے زبردست حامی تھے۔ ناسخ کے بنائے ہوئے اصلاح زبان سے متعلق اصول وقواعد کی پیروی بھی کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اس کی تقلید کی۔ اُن کا انتقال 1853ء میں ہوا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں اپنا دیوان مرتب نہیں کیا تھا۔ بعد میں ان کے شاگردوں نے ان کی غزلیں اکٹھا کر کے دیوان کی شکل میں شائع کیا اور اس کا نام دفتر فصاحت رکھا۔ ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نا مہرباں، کل مہرباں ہو جائے گا

رشکؔ کا ناسخ کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں زبان، قواعد، لفظیات، محاورے وغیرہ پر خاص غور وفکر کیا کرتے تھے۔ رشک کی شاعری ان خوبیوں سے بھری پڑی ہیں لیکن شاعری صرف انہیں اوصاف کی متقاضی نہیں ہوتی ہے۔ ہر صنف کے اپنے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ رشک کی غزلوں میں ایجاز واختصار اور رنگینی ودلکشی کی کمی کھٹکتی ہے۔ غزلوں میں نزاکت اور سوز وگداز کو بھی لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ ترنم وروانی بھی غزل کو مزید حسن عطا کرتی ہے۔ اور یہ تمام وہ خصوصیات ہیں جو غزل کو مقبول عام سے خاص بنا دیتی ہیں۔ رشک کی غزلوں میں ان خصوصیات کی واضح کمی نظر آتی ہے۔ اُن کی وفات 1867ء میں ہوئی۔

خواجہ حیدر علی آتش کے بھی متعدد شاگرد تھے جن میں سے رند، شوق لکھنوی اور دیاشنکر نسیم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نسیم کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ 1812ء میں پیدا ہوئے۔ نسیم نے ابتدا میں غزلیں کہی تھیں۔ ایک شعر دیکھیے:

اب درد جگر ہو کے نکلتا ہے دہن سے
وہ جوش جو برسوں مرے سینے میں نہاں تھا

نسیم کی غزلیں اب بہت کم ملتی ہیں۔ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں محض مثالیں ہی بن کر رہ گئی ہیں۔ نسیم اُردو کے علاوہ فارسی زبان کے اچھے واقف کار تھے۔ اُنہوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کی غزلیں بھی فن کے اعتبار سے بھرپور تھیں لیکن وہ اپنی شاہکار مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کے حوالے سے یاد کیے جاتے ہیں۔ گلزارِ نسیم ابتدا میں کافی طویل تھی۔ نسیم اسے اپنے استاد آتش کے پاس لے گئے اور آتش ہی کے مشورے سے اُنہوں نے اسے مختصر کر دیا۔ گرچہ اس میں تشبیہ و استعارے کا خوبصورت و برمحل استعمال اور رعایت لفظی کا التزام کیا گیا ہے مگر اس مثنوی کی نمایاں خوبی ایجاز و اختصار بن گئی۔ بقول رشید حسن خاں:

> ''اختصار (واقعات اور الفاظ دونوں کا) رعایت لفظی کی مدد سے معنویت کی پیکر تراشی، بندش کی چستی، جس کے فیض سے اشعار کی روانی، ضرب الامثال سے چشمک زنی کرتی ہے۔ ان بنیادی خصوصیات کے علاوہ تشبیہوں اور استعارات کی ندرت بھی اس مثنوی کی ایک خاص صفت ہے۔'' (مثنوی گلزارِ نسیم، معیاری ادب۔ ص8)

توتا کا شجر پر آنا اور پھل کھا کر انسانی شکل اختیار کر لینا انتہائی کم سے کم الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے کہانی کو آگے بڑھانے میں کافی مدد ملتی ہے۔ گلزارِ نسیم طبع زاد مثنوی نہیں ہے۔ یہ کہانی پہلے فارسی زبان میں نثر میں تھی۔ نہال چند لاہوری نے اسے اُردو میں ترجمہ کیا جسے بعد میں نسیم نے نظم میں ڈھال دیا۔ اس بلند پایہ مثنوی نگار کی وفات 1844ء میں ہوئی۔

لکھنو کے ایک اور اہم شاعر میر حسن ہیں جو میر غلام ضاحک کے صاحبزادے تھے۔ ضاحک دلی کے متوطن تھے۔ میر حسن کی پیدائش بھی دہلی میں ہی ہوئی تھی لیکن جب اٹھارہویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں مرہٹوں اور جاٹوں نے دہلی میں تاراجی پھیلا دی تب دہلی کے دیگر شاعروں کی طرح میر غلام ضاحک کو بھی اپنے فرزند کے ساتھ لکھنؤ آنا پڑا۔ اس وقت میر حسن کی عمر محض تیرہ برس تھی۔ میر حسن کے فرزند میر خلیق تھے اور خلیق کے فرزند میر انیس تھے۔ خلیق نے تاعمر مرثیہ ہی لکھا اور انیس نے مرثیہ نگاری کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

میر حسن نے مرثیے، قصیدے، غزلیں، مثنویاں اور تذکرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن میر حسن ہمیشہ اپنی مثنویاں خصوصاً گلزارِ ارم اور ''سحرالبیان'' کے لیے یاد کیے جاتے ہیں۔ سحرالبیان ان کی آخری مثنوی ہے جسے ان کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا حاصل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس مثنوی کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ سادہ بیانی، جذبات نگاری اور جزئیات کی عکاسی اس کی اہم خصوصیات ہیں۔ محمد حسین آزاد اپنی مایہ ناز کتاب آبِ حیات کے دور چہارم میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''میر حسن مرحوم نے اسے لکھا اور ایسی صاف زبان، فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا جیسے آبِ رواں۔ اصل واقعہ کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا اور انہیں باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں جو اس وقت وہاں ہو رہی تھیں۔ باوجود اس کے اصول فن سے بال بھر ادھر یا اُدھر نہ گرے۔ قبول عام نے اسے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں پر رکھا اور آنکھوں نے دل و زبان کے حوالے کیا۔ اس نے خود اس اہل سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام جو حرف بھی نہ پہچانتے تھے وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔ ارباب نشاط نے محفلوں میں اس کی نغمہ سرائی کر کے لوگوں کو رُلایا۔'' (آبِ حیات۔ ص44-243)

سحرالبیان 1784ء میں لکھی گئی۔ دلّی میں میر حسن کی خواجہ میر درد سے قربت رہی اور لکھنؤ میں میر ضیا سے شاعری پر مشورہ لیا کرتے

تھے۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری جن خصوصیات کی وجہ سے جانی جاتی ہے' سحر البیان میں اس کا اثر کم ہی نظر آتا ہے۔ ذومعنویت اور صنعتوں کے کثرتِ استعمال کی بجائے اُس میں سادگی' سلاست اور روانی موجود ہے جو دبستانِ دہلی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ البتہ سحر البیان کی مرکزی کردار بدرمنیر لکھنؤ کے نوابی گھرانوں کی نسوانی کردار کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ بے نظیر کا کردار بھی اِسی نوعیت کا ہے۔ مثنوی کا اگر فنی تجزیہ کیا جائے تو ان دونوں کرداروں میں حرکت وعمل کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ لکھنؤ کے ایسے ماحول کے پروردہ کردار ہیں جہاں کے شہزادے شہزادیوں سے عیش وعشرت کے علاوہ مزید کچھ توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ زندگی کے مسائل سے نبردآزما نہیں ہوسکتے تھے۔ معرکے سر کرنا ان کی زندگی کا مقصد نہیں ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو میر حسن نے اپنے عہد کے لکھنؤ کے کردار کو من وعن پیش کیا ہے۔ اور ان کی یہی خوبی انہیں دبستانِ لکھنؤ کے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

جرات اور انشا کے معاصرین میں رنگین بھی ایک اہم شاعر ہیں۔ رنگین کا قیام چند سالوں کے لیے مرزا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ میں رہا۔ رنگین بہت ہی ذہین' ذکی وفہیم اور وسیع المطالعہ تھے۔ اُنہیں اُردو' عربی' فارسی' ترکی' پنجابی' مرہٹی وغیرہ زبانوں پر دسترس حاصل تھا۔ شعروادب کے علاوہ فلسفہ' حکمت اور قرآن وحدیث کا اچھا مطالعہ تھا۔ رنگین جب دلّی سے لکھنؤ تشریف لائے تو وہ عہد لکھنو کے عروج کا دور تھا۔ رنگین مزاجاً اسم بامسمیٰ تھے اور اسے مزید تقویت وہاں کے ماحول سے حاصل ہوئی۔ وہ شاعری میں خارجی پہلو کا بیان بڑی جزئیات کے ساتھ کرتے تھے۔ صنف ریختی کی مقبولیت میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔ رنگین مولانا روم سے بہت متاثر تھے اور یہی وجہ ہے کہ رنگین کے مجموعۂ کلام میں حکیمانہ وصوفیانہ موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس پر مولانا روم کی تحریروں کا اثر نظر آتا ہے۔ رنگین کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں شاعر وادیب' نواب' طبیب' مولوی غرضیکہ مختلف پیشے سے وابستہ لوگ موجود تھے۔ رنگین ان تمام سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے۔ رنگین کی غزلوں کا مرکز ومحور عشق تھا اور عشق کے بیان میں وہ کسی حد تک جاسکتے تھے۔ انہیں طوائفوں سے بڑی قربت تھی۔ انہوں نے اس طبقے کی بہت عمدہ جزئیات نگاری کی ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر دیکھیے:

حوروں کے عوض مجھے الٰہی   دُنیا میں تو ایک نازنین دے
کب مجھ کو بہشت کی خواہش   جو کچھ دینا ہے سو یہیں دے

مندرجہ بالا شاعروں کے علاوہ بھی لکھنؤ میں کثیر تعداد میں شاعر وادیب تھے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔ قدیم سے لے کر جدید دور تک وہاں کے شاعر وادیب نے ادب میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا احساس دلایا ہے۔ وہاں کی زبان' تہذیب وتمدن' لباس اور نشست کے آداب وغیرہ اسے منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔ اس کی اپنی ایک ادبی تاریخ رہی ہے جس کے نگار خانے میں جرات' انشا' مصحفی' ناسخ' آتش' نسیم' میر حسن' میر ضمیر' میر خلیق' میر انیس' مرزا دبیر' ہادی رُسوا' چکبست' ثاقب' محشر' آرزو' اثر لکھنوی وغیرہ جیسے شعرا جگمگا رہے ہیں۔

14.6 اکتسابی نتائج

☆ اُردو ادب میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان دبستانوں نے اُردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

☆ یہاں کے شعرا اور دلّی سے ہجرت کر کے آنے والے شاعروں کو بھی یہاں کے نوابین اور امرا کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہاں کے فرمانروا شجاع الدولہ، آصف الدولہ، غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کھلے دماغ کے مالک تھے۔ ان میں سے بیشتر کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔

☆ غازی الدین حیدر خود بھی شاعری کرتے تھے اور واجد علی شاہ کی تو کئی کتابیں تھیں۔ شاعروں کو انعامات و اکرام سے سرفراز کرنا اور اُن کی قدر و منزلت اُن کے مزاج کا خاصا تھا۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں دیگر فنی خصوصیات کے علاوہ لفظی صنعت گری، تصنع و تکلف، صنعتوں کا استعمال، محبوب کے سراپے کا کھل کر بیان وغیرہ جیسی خصوصیات کثرت سے موجود تھیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔ دبستان لکھنؤ میں صنف ریختی کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا۔

☆ لکھنؤ کے مشہور شعرا میں ناسخ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اُنھوں نے مرزا مظہر جان جاناں کے ساتھ اصلاح زبان کی تحریک چلائی۔ اُنھوں نے زبان کی صفائی پر زور دیا۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے گریز کیا۔

☆ قواعد کے مطابق زبان میں درستگی، نئی نئی بندشیں اور تراکیب ایجاد کیں۔ دبستان لکھنؤ میں غزلوں کے ساتھ ساتھ مرثیے کو بھی خوب ترقی ملی۔

☆ انیس و دبیر نے مرثیہ نگاری کو اوج ثریا تک پہنچایا۔ لکھنؤ کے اہم شاعروں میں جرات، انشا، مصحفی، ناسخ، آتش، نسیم، شوق، رنگین، رشک وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعرا کی غزلوں میں دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہے جسے اُردو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

14.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	لفظ	معنی
ریختی	وہ نظم جو عورتوں کی زبان میں کہی جائے	فحش	بیہودہ باتیں
ترجیح	فوقیت، برتری	اسم بامسمی	جیسا نام ویسا ہی عمل
مرہون منت	احسان مند، شکر گزار	موقر	توقیر والا، عزت والا
جزئیات	تفصیل، معمولی سے معمولی بات کی وضاحت		
طبع زاد	اپنی ایجاد، اختراع		
انتشار	گھبراہٹ، تتر بتر ہونا، پریشانی، فکر		
صنعت	شاعری کی اصطلاح، مراد فنکاری و کاریگری، پیشہ، ہنر		

14.8 نمونہ امتحانی سوالات

14.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فیض آباد کے بعد لکھنؤ کو اودھ کا دارالخلافہ کس بادشاہ نے بنایا؟

2۔ ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

3۔ انگریزوں نے کس بادشاہ کو 'مٹیا برج'' بھیج دیا؟

4۔ جرات کا پورا نام کیا تھا؟

5۔ جرات ابتدا میں کس شاعر سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے؟

14.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ دبستانِ لکھنؤ کے نسبتاً کم معروف شعرا کا تعارف کرائیے۔

2۔ مصحفی اور اُن کی شاعری کے بارے میں ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

3۔ انشاءاللہ خاں انشا کی شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔ آتش کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔

5۔ اصلاح زبان کی تحریک پر روشنی ڈالیے۔

14.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ دبستانِ لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات کیا ہیں؟ مثالوں سے سمجھائیے۔

3۔ خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

14.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	کشاف تنقیدی اصطلاحات	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی
2۔	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ابواللیث صدیقی
3۔	ولی سے آتش تک (کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین، جلد اول)	ایم حبیب خاں
4۔	تاریخ ادب اُردو (جلد دوم، حصہ دوم)	جمیل جالبی
5۔	اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین

اکائی 15: شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید
15.1 مقاصد
15.2 شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل
15.3 اٹھارہویں صدی کی اہم نثری تصانیف
15.3.1 کربل کتھا
15.3.2 قصۂ مہر افروز و دلبر
15.3.3 نوطرز مرصع
15.3.4 نو آئین ہندی
15.3.5 عجائب القصص
15.4 متن برائے مطالعہ
15.5 اکتسابی نتائج
15.6 کلیدی الفاظ
15.7 نمونۂ امتحانی سوالات
15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
15.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید

اُردو زبان و ادب میں نثر اور نظم کا مفہوم بہت وسیع معنوں میں لیا جاتا ہے۔نظم سے مراد تمام شعری اصناف ہیں اور نظم از خود ایک مقبول صنف سخن ہے۔ اور اسی طرح ہم نثری ادب سے مراد اُن اصناف کو لیتے ہیں جو شعری نہ ہوں۔ نثری ادب کی دو شاخیں ہوتی ہیں۔ افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب۔ افسانوی ادب سے مراد وہ اصناف ہیں جن کی بنیاد قصے کہانیوں پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کہانیوں میں تصوراتی اور

تخیلاتی عناصر کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ دراصل تخلیقی ادب ہوتا ہے۔ غیر افسانوی ادب کا تعلق انسان کے ذاتی تجربات و مشاہدات سے ہوتا ہے جسے وہ ادبی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً سفرنامے، خودنوشت، خاکے، رپورتاژ وغیرہ۔ افسانوی ادب میں داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانہ شامل ہے۔ داستان اُردو کی قدیم نثری صنف ہے۔ جب انسان فرصت کے اوقات میں اپنی دل بستگی کے سامان کا متلاشی تھا اُس وقت داستانوں کا سننا اور سنانا کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ اُردو نثر میں داستان وہ واحد صنف ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر ہوا کرتے ہیں۔ ڈرامہ، ناول اور افسانہ سماجی مسائل و معاملات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ہر صنف کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور انہیں تقاضوں کے پیش نظر ادب میں اس صنف کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ نیز اس کا تعین قدر کیا جاتا ہے۔ یہاں اس موضوع پر آپ کو معلومات فراہم کرنا مقصود ہے کہ شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا کس طرح ہوا۔ مزید یہ کہ اس دور میں کون کون سے مصنف تھے اور ان کی کون کون سی تصنیفات سامنے آئیں۔

15.1 مقاصد

زیر نظر اکائی شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل سے متعلق لکھی گئی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ نظم و نثر کی تعریف و تفہیم کر سکیں۔
- ☆ اُردو نثر کے ابتدائی نقوش کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' سے متعلق سمجھا سکیں۔
- ☆ قصۂ مہر افروز و دلبر اور نواب عیسوی خاں کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔
- ☆ نوطرز مرصع کی موضوعاتی و فنی خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ نو آئینِ ہندی اور عجائب القصص کی تفصیل سے واقف کرا سکیں۔

15.2 شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل

فورٹ ولیم کالج سے قبل اُردو زبان نوخیز تھی۔ شمالی ہند میں نثری ادب کی صورت گری ہو رہی تھی۔ اس میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کی آمیزش کثرت سے تھی۔ اس صورتحال میں اُردو، دوسری زبانوں سے دامن بچاتے ہوئے نکھرنے سنورنے اور اپنی منفرد شناخت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اُردو کے ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین اپنی مایہ ناز کتاب ''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' میں اُردو کے ابتدائی دور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''لسانیات کے علما نے دلّی کے آس پاس کی اُردو زبان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بول چال کے لیے یہ زبان ایک ترقی پذیر شکل میں بہت دنوں سے رائج تھی اور آپس کے تعلقات میں بہت سی ایسی کہاوتیں، ایسے محاورے اور جملے پیدا ہو گئے تھے جو عوام سے اس کے تعلق کا پتہ دیتے ہیں۔'' (ص۔78)

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں صنف داستان کی مضبوط و مستحکم بنیاد رکھی گئی اور نثری تصنیفات کی مختلف النوع تحریریں سامنے

آ ئیں۔ دیباچے٬ اُردو شاعروں سے متعلق تذکرے٬ لغات اور ترجمے وغیرہ اُردو نثر کی ابتدائی شکل میں موجود ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ اُردو کا ابتدائی دور تھا، جسے اُردو زبان کہا جا رہا تھا٬ اسی آدھی ادھوری زبان میں شاعری کی باقاعدہ ابتدا ہو چکی تھی اور نثر کی شمع نے بھی روشنی دینی شروع کر دی تھی۔ جعفر زٹلی جو اس عہد کا بہت ہی معروف شاعر تھا٬ وہ اپنی مزاحیہ شاعری اور پھکڑ پن کے لیے جانا جاتا ہے۔ اُس کے یہاں نثر کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ یہ نثری تحریریں باضابطہ طور پر نہیں ہیں بلکہ ٹکڑوں کی شکل میں ملتی ہیں جن سے اُس عہد کی سیاسی اور معاشی حالات کا پتہ چلتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں خصوصاً شمالی ہند میں اُردو نثر میں بہترین اضافہ ہوا ہے۔ یہ میرؔ و سوداؔ کا دور تھا جسے اُردو شاعری کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اس وقت اُردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر خواجہ میر دردؔ اور ان کے برادر خورد خواجہ میر اثرؔ بھی موجود تھے۔ میر سوز٬ انشا٬ مصحفی٬ نظیرا کبرآبادی٬ میر حسن وغیرہ جیسے مایہ ناز شعرا بھی شاعری میں کمالات دِکھا رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سبھی بحیثیت شاعر اپنی شناخت رکھتے تھے۔ یہ نثر نگار نہیں تھے۔ البتہ اس زمانے میں نثر کا ایک بہترین نمونہ سودا کے دیباچے کی شکل میں منظر عام پر آتا ہے جس سے اس عہد اور وہاں کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ گرچہ اُردو قصیدے کے صف اول کے شاعر مانے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنہوں نے قصیدے کے فن کو اوجِ ثریا تک پہنچایا ہے۔ اُنہوں نے ہجویہ قصیدے لکھ کر ایک نئی طرح کی بنیاد ڈالی۔ سودا نے غزلیں بھی خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ مثنویاں بھی لکھی ہیں اور مرثیے لکھ کر بھی اُردو ادب میں بہترین اضافہ کیا ہے۔ اُنہوں نے جب مرثیوں کو مرتب کیا تو اس پر ایک مبسوط دیباچہ بھی تحریر کیا جو کئی بار مجموعے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس نثری نگارش کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ سودا نے میر تقی میر کی مثنوی ''شعلہ عشق'' کو نثری پیکر عطا کیا، لیکن اب یہ نثری کارنامہ دستیاب نہیں ہے۔ تذکرے اور تاریخ کی کتابوں میں محض ذکر ملتا ہے۔ سودا کے معاصر ناخدائے سخن میر تقی میر جو اُردو غزل کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں۔ انہوں نے بھی نثری کارنامے انجام دیے ہیں۔ میرؔ نے نکات الشعرا لکھ کر اُردو شاعروں کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اس میں شاعروں سے متعلق معلومات فراہم کر کے اُردو ادب کو بیش قیمت تحفہ عطا کیا ہے، لیکن اس تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ اُردو ادب میں ترجمے کے ذریعے بھی غیر معمولی اضافے ہوئے ہیں۔ ترجمہ بنیادی طور پر ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو کہتے ہیں۔ ترجمے کے ذریعے دوسری زبانوں کے ادب اور اس کی باریکیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ دونوں اپنے وقت کے عالم دین تھے اور اسلام کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کے والد متقی٬ پرہیزگار٬ صوفی بزرگ تھے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دونوں ہی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے کام کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مذہب کی تبلیغ میں خاص حلقے یا طبقے کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے بلکہ اس معاملے میں عوام و خواص ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں سے تبادلۂ خیال کا بہترین ذریعہ آسان اور عام فہم زبان اُردو تھی۔ اُردو زبان کی توسیع و ترویج میں صوفیائے کرام کا بھی حصہ رہا ہے۔ اس دور میں بھی مذہبی نوعیت کی کتابیں لکھی گئیں مگر وہ وقت کے ہاتھوں تلف ہو گئیں۔

تصوف اور ترجمے کے حوالے سے ایک اہم نام معین الدین حسین علی کا ہے جنہوں نے فارسی تصنیف کو اُردو میں منتقل کیا۔ جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''1760-61ء میں معین الدین حسین علی نے تصوف کی فارسی کتاب جامِ جہاں نما کو اپنے الفاظ میں اُردو نثر میں لکھا جس میں تصوف کے دقیق نکات کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اسی تسلسل میں مزید فرماتے ہیں کہ جامِ جہاں نما میں دراصل تصوف کے مسائل پر بات کی گئی ہے۔اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کی نثر میں غور وفکر کے ساتھ تصوف جیسے سنجیدہ موضوع پر نہ صرف گفتگو کی جارہی تھی بلکہ رقم طرازی بھی کی جارہی تھی۔شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی بھی ایک مترجم کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔اُنھوں نے ''عم پارہ'' کی تفسیر خدائی نعمت کے عنوان سے کیا ہے۔اس کی اشاعت کئی بار عمل میں آئی اور ''تفسیر مرادیہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں رستم علی بجنوری نے ''قصہ و احوال روہیلہ'' کے عنوان سے تاریخ لکھی، جس میں 1730ء سے لے کر 1755ء تک رونما ہونے والے روح فرسا واقعات کو قلم بند کیا ہے۔اٹھارہویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی میں دلّی اُجڑ سی گئی تھی۔مغل حکومت کی جو بنیاد بابر کے زمانے میں رکھی گئی تھی وہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت تک مزید مستحکم ہوتی رہی لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس میں وہ پائیداری نہ رہی۔ایک عجیب سی کشمکش کے ساتھ زندگی گزر رہی تھی۔سچ پوچھیے تو نہ پہلے جیسی دلّی تھی اور نہ داد دینے کا ماحول باقی تھا۔مورخوں نے ان تمام حالات و واقعات کو کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔تاہم رستم علی بجنوری نے روہیلہ کی جو تاریخ رقم کی ہے' اُس میں تمام واقعات کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی کیفیات کو بھی پیش کیا ہے۔یہ تاریخ بہت ہی آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔نیز واقعات کو ترتیب وار اور پراثر بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔''قصہ و احوال روہیلہ'' میں رستم علی نے انگریزی الفاظ کا بھی جا بجا استعمال کیا ہے۔

شمالی ہند میں پہلی باقاعدہ نثری کتاب واقعات کربلا کے بیان پر مشتمل ''کربل کتھا'' ہے۔یہ فضلی کی تصنیف ہے (جس پر آگے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔)

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک شمالی ہند میں نثری ادب کے فروغ میں دیباچے' تاریخ اور ترجمے نے بہت اہم کردار نبھایا ہے۔اُردو کی قدیم نثری صنف داستان ہے۔داستان نویسی کا باقاعدہ آغاز 1635ء میں وجہی کی تصنیف ''سب رس'' سے ہوتا ہے۔وجہی دکن کا رہنے والا تھا۔وہ قطب شاہی عہد کا بہت ہی مشہور شاعر و ادیب تھا۔دربار سے اُس کی گہری وابستگی تھی۔اور یہیں اس نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر داستان قلم بند کی۔دکن میں داستان نگاری کی تقریباً ایک صدی کا وقفہ گزر جانے کے بعد عطا حسین تحسین نے ''نوطرز مرصع'' کے عنوان سے ایک داستان لکھی۔''قصہ مہر افروز دلبر'' کے عنوان سے عیسوی خاں بہادر نے داستان لکھی۔مہر چند کھتری نے ''نوآئین ہندی'' اور شاہ عالم ثانی نے ''عجائب القصص'' اور شاہ حسین حقیقت نے جذب عشق لکھ کر داستان نگاری کی صحت مند روایت کی بنا ڈالی۔ان تمام داستانوں سے متعلق مزید معلومات فراہم کی جائے گی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ ''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' کے مصنف کا نام بتائیے۔

2۔ ''نکات الشعرا'' کس زبان میں لکھی گئی ہے؟

3۔ وجہی نے کس کی فرمائش پر ''سب رس'' قلم بند کی؟

15.3 اٹھارہویں صدی کی اہم نثری تصانیف

15.3.1 کربل کتھا؛

شمالی ہند میں اُردو نثر کے ابتدائی دور کے مصنفین میں فضل علی فضلی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔تاریخی اعتبار سے شمالی ہند میں اُردو نثر کی ابتدا محمد شاہی عہد سے ہوتی ہے جس میں فضلی کی تصنیف کربل کتھا کو اولیت حاصل ہے۔ان کا نام فضل علی تھا۔اُنہوں نے 33-1732ء میں کربل کتھا تصنیف کی اور 48-1747ء میں نظر ثانی کی ہے۔انتخاب کربل کتھا کے مرتب پروفیسر حنیف نقوی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''فضلی کے بارے میں اب تک مستند طور پر جو معلومات فراہم ہوسکی ہیں' اُن کا واحد ماخذ کربل کتھا ہے۔اس کتاب کے دیباچے کے مطابق 1145ھ تک جبکہ اُس کا نقش اول تیار ہوا' اُن کی عمر نے ''حدود عشرین سے دو تین منزل تجاوز کیا تھا'' بالفاظ دیگر وہ اُس وقت بائیسویں یا تیئسویں برس میں تھے۔اس اعتبار سے محتاط طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ 1122ھ/1710ء کے اواخر یا 1123ھ / 1711ء کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔اپنی تعلیم وتربیت اور مبلغ علم کی طرف اُنہوں نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔''

ان کے حالات زندگی کے بارے میں باقاعدہ طور پر کچھ نہیں ملتا ہے۔محققین کی رائے میں بھی اختلاف ہے۔مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے ''طبقات الشعرائے ہند'' میں فضلی اور کربل کتھا کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد تحقیق کا ایک سلسلہ چل پڑا اور اب یہ تصنیف شہرت عام حاصل کر چکی ہے۔فضلی کی ترجمہ شدہ تصنیف ''کربل کتھا'' میں چیدہ چیدہ دکنی زبان کے الفاظ اور محاورے ملتے ہیں،لیکن اس کے باوجود محققین کی رائے ہے کہ وہ شمال کے رہنے والے تھے۔فضلی فارسی زبان کے اچھے واقف کار تھے۔کربل کتھا میں فارسی کے اشعار'الفاظ اور عربی زبان میں عبارتیں ملتی ہیں۔اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔اول اس زمانے میں اُردو'فارسی آمیز ہوتی تھی۔دوم اس تصنیف کا پس منظر مذہبی نوعیت کا ہے۔کربل کتھا کا ماخذ ''روضۃ الشہدا'' ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تحریر کردہ ہے۔وہ ایران کا رہنے والا تھا۔اس کی مادری زبان فارسی تھی اور فارسی میں ہی اُنہوں نے روضۃ الشہد ارقم کی جو تاریخی و مذہبی نوعیت کی کتاب ہے۔اسے محرم کے مہینے میں پڑھا جاتا تھا۔روضۃ الشہدا میں حضرت امام حسین کی شہادت کا بیان بہت ہی پردرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔تاہم فارسی ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا آسان نہ تھا۔فضلی نے اسے اُردو زبان میں منتقل کر کے کارِنیک کیا ہے اور اس کا نام کربل کتھا رکھا۔کربل سے مراد کربلا اور کتھا کا مطلب کہانی ہے۔یعنی کربلا کی کہانی۔کربل کتھا میں مقدمہ' دیباچہ' بارہ مجلس اور خاتمہ کی پانچ فصلیں ہیں۔

پہلی مجلس میں حضور نبی کریم' ان کی عزیز از جان صاحبزادی حضرت فاطمہ اور دونوں نواسوں حضرت امام حسین اور حسن کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ان سب کی محبت اٹوٹ تھی۔مصنف نے اسے تمہیدی انداز سے پیش کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کا ذہن پوری طرح سے تیار ہو جائے۔دوسری مجلس میں نبی کریم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ' ان کے خاوند حضرت علی اور ان کے بیٹے حضرت حسن اور حسین کی قربت اور ان کی آپسی محبت کا ذکر کیا گیا ہے۔کربل کتھا کے اس دوسری مجلس میں حسن اور حسین کے کردار کو اُبھارا گیا ہے۔حضرت فاطمہ کی وفات کا بیان انتہائی درد آمیز انداز میں موجود ہے۔ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے کہ:

یہ دوسری مجلس ہے سو اس میں سر بہ سر
خیر النسا کے مرنے کا' یاروں حوال ہے

اس مجلس میں حضرت فاطمہ کی خوبیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ حضرت فاطمہ کو اپنے شوہر حضرت علی سے بہت محبت تھی۔ وہ ان کا بہت احترام کرتی تھیں۔ حسن اور حسین سے محبت اور اُن کے تئیں فکر کو بھی اُبھارا گیا ہے۔ تیسری مجلس میں حضرت علی' چوتھی مجلس میں حضرت حسن اور پانچویں میں حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت اور وصال کا بیان ہے۔ چھٹی مجلس کربل کتھا کا بہت ہی پراثر حصہ ہے۔ اس میں حضرت مسلم بن عقیل کے دو فرزند حضرت محمد اور ابراہیم کی شہادت کا بیان پیش کیا گیا ہے۔ حضرت مسلم کے ان دونوں فرزندان کے سر قلم کر کے دریائے فرات میں بہا دیے گئے تھے۔ کربل کتھا کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ ساتویں مجلس میں حضرت امام حسین اور حضرت حُر کی آپسی محبت کو پیش کیا گیا ہے۔ مجلس کے اس حصے میں حُر کی شجاعت' امام حسین سے وفاداری کا بیان ملتا ہے۔ اس مجلس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

یہ مجلس ہے گی ساتویں' تس میں حسین کا
کعبے سے کوفے کوں سفر اور حُر کا حال ہے

آٹھویں مجلس میں حضرت امام قاسم کی شہادت کا بیان ہے۔ کربل کتھا کا یہ حصہ اس لیے بھی بہت پُر اثر اور دردناک ہو گیا ہے کہ حضرت قاسم کا اُسی دن عقد ہوتا ہے اور اسی دن وہ شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ سانحہ کوئی اتفاقیہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ حضرت قاسم' امام حسین اور نئی نویلی دُلہن وغیرہ سبھوں کو معلوم تھا۔ اُردو مرثیہ گوئیوں نے واقعات کربلا کے اس دن کے منظر پر بہت لکھا ہے۔ نویں اور دسویں مجالس میں بھی حضرت علی اکبر امام حسین کی شہادت کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ گیارہویں مجلس میں شیر خوار علی اصغر کی شہادت کا بیان ہے۔ علی اصغر معصوم چھوٹے بچے تھے۔ انہیں پیاس لگی تھی ،لیکن دُشمنوں نے تیر چلا دیا تھا ،جس سے وہ شہید ہو گئے۔ بارہویں مجلس آخری مجلس ہے ج،س میں حضرت امام حسین کی شہادت کا بیان انتہائی پردرد انداز میں کیا گیا ہے۔ اس شہادت کے ساتھ ہی واقعات کربلا تاریخ کا ایک باب بن جاتا ہے جو آج تک لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں محفوظ ہے۔ اس حصے کا آخری باب بہت ہی روح فرسا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اے شِمر! جانتا ہے کہ آج کون دن ہے؟ کہا؛ جمعہ اور روزِ عاشورا۔ پھر فرمائے؛ پہچانتا ہے کہ کون سی ساعت ہے؟ کہا؛ وقت خطبہ اور نماز پڑھنے کا۔ فرمائے کہ اِس وقت خطیب میرے دادا کی اُمّت کے منبروں پر خطبے پڑھتے اور نعت میرے دادا کی کہتے اور توں مجھ پر ایسا ظلم کرتا؟ رسولِ خدا نے منھ اپنا میری چھاتی پر رکھا اور توں اِس طرح میری چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ وہ بوسے میرے حلق پر دیا اور توں شمشیر یہاں چلاتا۔ میں روحِ زکریا نبی اپنے داہنے طرف اور روحِ یحیٰؑ بائیں طرف اپنے دیکھتا اور توں میری چھاتی پر چڑھا۔ اے شمر! وقتِ نماز ہے۔ اُٹھ میری چھاتی سے کہ منھ طرف قبلہ کے کروں اور دو رکعت نماز پڑھوں کہ مجھ کوں نماز میں شہید ہونا باپ سے میراث ہے۔ جب کہ میں نماز میں ہوں' جو چاہے سو کر' آہ! تب شمرِ لعین سینۂ بے کینہ امام پر سے اُٹھا اور حضرت اتنی طاقت رکھتے تھے کہ منھ قبلہ طرف کر کے نماز میں مشغول ہوئے۔ واویلا' شمرِ ملعون روسیاہ صبر نہ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (کربل کتھا ص 85-84)

بارہ مجلسوں کے بعد پانچ فصلیں ہیں۔ اُن میں واقعات کربلا کے بعد کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

کربل کتھا کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ فضلی نے روضۃ الشہد اسے ترجمہ کر کے اسے حیات جاودانی عطا کی۔ جب یہ تصنیف معرض وجود میں آئی اس وقت یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ البتہ رفتہ رفتہ مرثیے کی شکل میں اس واقعے کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا۔

15.3.2 قصہ مُہر افروز و دلبر ؛

قصہ مہر افروز و دلبر اُردو کی قدیم داستان ہے۔ اس کے مصنف نواب عیسوی خاں ہیں۔ وہ ہندی زبان میں بھی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ''بہاری ست سئی'' کے دوہوں کی شرح ''رس چندرِکا'' کے عنوان سے لکھی۔ قصہ مہر افروز دلبر میں بھی عربی فارسی سے زیادہ سنسکرت الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ پوری داستان پر دیومالائی اثرات ملتے ہیں۔ یعنی اس میں ہندوستانی تہذیبی عناصر پر مبنی متعدد کہانیاں اور ذیلی قصے موجود ہیں۔ مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ ''یہ قدما کی زبان کا پہلا ہیولیٰ یا زبان دہلی کا پہلا ادبی نقش ہے' جس پر ایک طرف ہندی شاعری کی چھاپ ملتی ہے' دوسری طرف فارسی داستانوں کے جملوں کا دروبست پایا جاتا ہے۔'' (قصہ مہر افروز و دلبر ص۔22)

مجموعی طور پر اس داستان کی زبان سادہ' سلیس اور عام فہم ہے۔ کہانی دلچسپ اور تجسس سے بھرپور ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی کہانی کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو اس کی مجموعی فضا میں محو کر دے۔ قصہ مہر افروز و دلبر میں قدیم مثنویوں کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ ایک طبع زاد داستان ہے۔ کرداروں کی بہتات اور مافوق الفطرت عناصر کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں روایتی انداز سے ایک بادشاہ ہے جو لاولد ہے۔ اولاد کی محرومی کے سبب تخت و تاج سے کنارہ کشی اختیار کر کے فقیری کا روپ دھار لیتا ہے اور جنگل کو اپنا ٹھکانا بنا لیتا ہے۔ لیکن خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ایک فقیر کی دعا سے اُس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ شہزادے کا نام مہر افروز رکھا گیا اور شاہانہ انداز سے اُس کی پرورش کی گئی اور پھر تربیت کا اہتمام کیا گیا۔ اُسی محل میں وزیر زادہ اندیش بھی رہتا ہے۔ یہ دونوں جنگل جاتے ہیں اور ایک خوبصورت جانور کا تعاقب کرتے ہیں مگر جانور اچانک نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور یہ دونوں خود کو پریوں کے دیس میں پاتے ہیں۔ وہ ایک جادوئی دُنیا ہے۔ بقول مسعود حسین خاں ''سنگ مرمر کی چار دیواری' حکاکی' لاجوردی' طلائی کام دروازے' پانی کی چدّریں' نشیمنے' چبوترے اور بنگلے' غرض کہ کوہِ قاف میں پہنچ گیا۔'' (قصہ مہر افروز و دلبر۔ص19) مہر افروز وہاں پریوں کے بادشاہ کی بیٹی دلبر سے ملتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ پھر کے بعد دیگر کئی معرکے سر کرنے پڑتے ہیں۔ کئی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل و دماغ ششدر رہ جائے۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد مہر افروز اور دلبر کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور آخر کار دونوں کی مرادیں بر آتی ہیں۔ داستان کے اختتام پر مصنف نے غیر محسوس طریقے سے قصے سے مربوط کر کے ''نصیحت نامہ'' پیش کیا ہے۔ یہ نصیحت نامہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک ایک حصے میں بادشاہ اور وزیر اپنے اپنے فرزند کو نصیحتیں کرتے ہیں۔ پوری داستان میں چھ ضمنی کہانیاں ہیں۔ یہ داستان ادب میں ایک خاص مقام و مرتبے کی حامل ہے۔ اس کی وجہ شمالی ہندوستان کی قدیم داستان ہونے کے علاوہ اس کا اُردو ہندی زبان کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہونا بھی ہے۔ مسعود حسین خاں اس داستان سے متعلق فرماتے ہیں:

> ''قصہ مہر افروز و دلبر کی ادبی حیثیت پلاٹ کی ندرت یا کردار نگاری سے زیادہ اس کے سادہ و ادبی اسلوب میں ہے۔ اُردو کے قدیم ادب میں اس سے زیادہ سہل اور سادہ عبارت نظم و نثر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔'' (قصہ مہر افروز و دلبر۔ص20)

عیسوی خاں کی یہ داستان ناموں کے حوالے سے تمثیلی نوعیت کی ہے۔ مصنف نے یہ اہتمام شعوری طور پر کیا ہے۔ مثلاً بادشاہ کا نام عادل شاہ ہے۔ فرزند مہرافروز اور ملکہ پری چہرہ ہے۔ اکثر داستانوں میں وزیر کو عقلمند اور وزیرزادے کو ذہین اور متحرک دِکھایا جاتا ہے۔ اس داستان میں بھی وزیر کا نام جہاں دانش اور وزیرزادے کا نیک اندیش ہے۔

پرستان کے شہر کا نام حسن آباد، باغ محبت افزا، پہاڑ کوہ گلستاں، بادشاہ جہاں بخش اور بیٹی دلبر ہے۔ یہی دلبر اور مہرافروز اس داستان کے بنیادی کردار ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو وجہی کی داستان ''سب رس'' میں بھی ناموں کا یہی انداز ہے اور اس طرز کو سراہا گیا ہے۔ عیسوی خاں کی معلومات وسیع اور نظر گہری تھی۔ اُنہوں نے عوام کے ذوق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کامیاب کوشش کی ہے۔ پوری داستان میں تجسس اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ قصہ مہرافروز ودلبر میں دلّی اور اس کے اطراف واکناف کی تہذیب ومعاشرت، وہاں کے آداب اور ماحول کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ ایک یادگار داستان ہے اور اُردو ادب کی تاریخ میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ ''کربل کتھا'' کے مصنف کا نام بتائیے۔

2۔ کیا ''قصہ مہرافروز ودلبر'' طبع زاد داستان ہے؟

15.3.3 نوطرز مرصع ؛

نوطرز مرصع عطا حسین تحسین کی تصنیف ہے۔ یہ ایک فارسی داستان بعنوان ''قصہ چہار درویش'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ نوطرز مرصع کا اصل نام ''انشائے نوطرز مرصع'' ہے۔ اس میں انشا پردازی اور تخیل کی آمیزش ملتی ہے۔ اُس میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کم ہوتی چلی گئی۔ ایک زمانے تک قصہ چہار درویش کے مصنف امیر خسرو کہلاتے رہے لیکن کتاب کی داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے بلکہ محمد معصوم اس کے مصنف ہیں۔

عطا حسین تحسین اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک انگریز جنرل اسمتھ کے میر منشی تھے۔ اُنہیں کے ساتھ تحسین نے کلکتے کا سفر بھی کیا۔ اسمتھ اپنے وطن کو لوٹ گیا اور تحسین پٹنہ ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے۔ وہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا اور اُن کی خوب طوطی بولتی تھی۔ تحسین کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی تصنیف شجاع الدولہ کے حضور میں پیش کریں لیکن صد افسوس کہ کتاب کی تکمیل سے قبل شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ تحسین نے اُن کے صاحبزادے آصف الدولہ کو اپنی یہ تصنیف پیش کردی۔

داستان ''نوطرز مرصع'' کی ابتدا پہلے لکھی گئی مثنویوں اور داستانوں کے انداز سے ہوتی ہے۔ ولایت روم کا بادشاہ فرخندہ سیر ہے اور وہ لاولد ہے۔ اولاد کے غم میں وہ سلطنت سے کنارہ کشی کر کے ایک گوشے میں پناہ لے لیتا ہے۔ اس کا وزیر خردمند ہے۔ وزیر نے بادشاہ کو بہت سمجھایا اور خدا پر بھروسہ رکھنے کی ترغیب دی۔ بادشاہ از سرِنو سلطنت کی ذمہ داری نبھانے لگتا ہے اور راتوں کو عبادت اور مقابر کی زیارت میں گزارتا ہے۔ ایک رات اُس نے دیکھا کہ دور کہیں ایک چراغ ٹمٹا رہا ہے۔ بادشاہ اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چار درویش آپس میں باتیں کررہے ہیں۔ بادشاہ چھپ کر اُن کی باتیں سننے لگا۔ پہلے درویش نے اپنی کہانی سنائی جو ملک دمشق سے متعلق تھی۔ دوسرے درویش نے حاتم طائی کی سرگزشت اور ملکہ بصرہ اور شہزادہ نیم روز کا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد تیسرے درویش نے اپنا قصہ بیان کیا اور اتنے میں صبح ہو

گئی۔ بادشاہ دربار میں واپس آ گیا اور یہاں اُس نے سبھی درویشوں کو بلایا تا کہ وہ چوتھے درویش سے قصہ سن سکے۔ بادشاہ نے بھی فرخ سیر اور خواجہ سگ پرست کا قصہ سنایا۔اس کے بعد چوتھا درویش اپنی کہانی سناتا ہے۔اسی دوران خوشخبری ملتی ہے کہ بادشاہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کالے بادل کا ایک ٹکڑا آتا ہے اور شہزادے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ دو دن بعد وہ شہزادہ واپس آتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح شروع ہو گیا۔کافی وقت گزر جانے کے بعد بادشاہ نے چار درویشوں کے مشورے سے ایک خط شہزادے کے ساتھ بھیج دیا۔اب جبکہ شہزادہ واپس آیا تو بادشاہ کے خط کے جواب میں جناب ملک شہپال بن شاہ رُخ نے اسے آنے کی دعوت دی۔ بادشاہ درویشوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اور وہاں سب کی مرادیں بر آئیں۔مجموعی طور پر یہ داستان بھی دیگر داستانوں کی طرح خوشیوں پر ختم ہوجاتی ہے۔ بظاہر داستان میں ایک قصہ ہوتا ہے اور پھر قصے کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے قصے ہوتے ہیں۔ یہاں اِس داستان میں پانچ قصے ہیں۔ چار درویشوں کے چار قصے اور ایک بادشاہ کی طرف سے سنایا گیا قصہ۔مصنف کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے تمام قصوں میں ایک منطقی ربط پیدا کردی ہے اور اس کا تسلسل کچھ اِس طرح رکھا ہے کہ یہ بظاہر ایک ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔

''نوطرز مرصع'' کے حوالے سے یہ عام تاثر ہے کہ اس کی عبارت کو پرتکلف زبان، فارسی الفاظ کے کثرت استعمال اور صنعتوں کے افراط نے بوجھل بنادیا ہے۔ کہیں کہیں تو مقفع و مسجع انداز کی عبارت بھی ملتی ہے۔لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ اٹھارہویں صدی میں زبان وادب کی صورتحال کے پس منظر میں نوطرز مرصع کی زبان مشکل نہیں تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اُردو زبان نکھرتی چلی گئی۔اس کی زبان ثقیل ہے اور تفہیم کا مسئلہ اس داستان کی شہرت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ پُرتکلف اور مرصع و مسجع زبان نے اسے عوام پسند نہیں بننے دیا۔ بعد میں منظر عام پر آنے والی میرامن کی تصنیف ''باغ و بہار'' کا ماخذ نوطرز مرصع ہی ہے۔اس کا متن سادہ اور عام فہم ہے۔ باغ و بہار میں آسان زبان استعمال کرنے کا مقصد انگریزوں کو اُردو سے واقف کرانا تھا۔قابل غور یہ بھی ہے کہ جس زمانے میں نوطرز مرصع لکھی گئی اس وقت اُردو زبان پر عربی اور خصوصاً فارسی زبان کا خاصا اثر موجود تھا۔اور یہی خواص کی زبان، علمی و ادبی حلقوں کی زبان بھی سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کا معتبر شاعر نظیر اکبر آبادی بول چال اور عام فہم زبان استعمال کرنے کے سبب اپنے عہد میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہوسکا۔لوگوں نے ان کے کلام کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔اس طرح نوطرز مرصع زبان و بیان کے اعتبار سے کافی اہم داستان ہے اور یہیں سے آنے والے وقتوں میں نثر کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔

15.3.4 نوآئینِ ہندی؛

''نوآئین ہندی'' کا شمار اٹھارہویں صدی کی منفرد تصنیف میں ہوتا ہے۔ یہ سیاسی خلفشار کا زمانہ تھا۔انگریزوں کا تسلط بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ اُنہیں بتدریج کامیابی ملتی جارہی تھی اور اسی کامیابی کی وجہ سے ان کے ارادے پختہ ہوتے جارہے تھے۔ ان حالات میں انہیں ہندوستان کی مقامی زبان اُردو سیکھنے کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔انگریزوں کی ضرورت اور خواہش نے مصنفین کو ایسی نثر لکھنے کی طرف متوجہ کیا جو آسان ہو،روزمرہ سے قریب ہو اور عام بول چال میں استعمال کی جاتی ہو۔''نوآئین ہندی'' اس کی بہترین مثال ہے۔

مہر چند کھتری علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ان کی زندگی لکھنؤ اور اکبر آباد میں گزری۔ ان کے والد کا نام رام چندر تھا۔ یہ خاندان محمد شاہ کے زمانے میں لاہور سے دہلی آیا اور شاہی ملازمت سے وابستہ ہوگیا۔ مہر چند کے بڑے بھائی شاعر تھے اور بندو تخلص فرماتے

تھے۔ چھوٹے بھائی کشن چند کا تخلص ''عاشق'' تھا۔ مہر چند فارسی زبان میں بھی شاعری کیا کرتے تھے اور ''ذرہ'' تخلص کرتے تھے۔

نو آئین ہندی کے بارے میں محققین کی رائے ہے کہ یہ داستان کئی لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں اُردو اور فارسی زبانوں میں لکھی ہے۔ ان میں سے رجب علی بیگ سرور کا نام کافی اہم ہے۔ اُنھوں نے شگوفہ محبت کے عنوان سے یہی داستان قلم بند کی ہے جو سرور کی ایک اہم تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔

نو آئینِ ہندی مہر چند کھتری مہر کی تصنیف ہے، جو 1793ء میں تحریر کی گئی۔ دراصل مہر کسی انگریز کو اُردو زبان سکھانے پر معمور ہوئے تھے۔ اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ آسان اور عام فہم زبان میں کوئی ایسی کہانی تحریر کی جائے جس سے زبان سکھانے میں سہولت ہو۔ ان کے سامنے تحسین کی تصنیف نوطرز مرصع موجود تھی لیکن اس کی زبان انہیں مشکل لگی۔ مہر چند کھتری آسان اور روزمرہ کی زبان میں لکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ تفہیم و ترسیل کا مسئلہ پیش نہ آئے اور خاص و عام اس سے استفادہ کر سکیں۔ لہٰذا اُنھوں نے فارسی زبان میں تحریر کردہ ''آذر شاہ اور سمن رُخ بانو'' کا قصہ آسان زبان میں اُردو میں لکھا۔ یہ قصہ بہت مشہور تھا۔ حالانکہ یہ اس سے قبل لکھی جانے والی داستانوں کی طرح ہی ہے۔ بادشاہ آذر شاہ اور ان کی بیگم زلالہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بادشاہ مایوسی کے عالم میں سلطنت چھوڑ دینے کا ارادہ کرتا ہے لیکن ایک پہنچے ہوئے فقیر نے کہا کہ اگر ملک ختن کی شہزادی سمن رُخ بانو سے شادی کرلے تو اولاد جیسی نعمت نصیب ہوگی۔ آذر شاہ سمن رُخ بانو سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن ان کی پہلی بیوی زلالہ، سمن رُخ بانو کی دُشمن بن بیٹھی اور اسے نقصان پہنچانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرنے لگی۔ سمن رخ بانو اور آذر شاہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ یہاں تصادم، کشمکش، تجسس، چھوٹے چھوٹے واقعات اور ضمنی کرداروں کی مدد سے داستان اختتام پذیر ہوتی ہے۔

مہر کھتری نے نوطرز مرصع کے انداز پر اپنی داستان کا نام نو آئینِ ہندی رکھا۔ یہ داستان ملک محمد اور گیتی افروز کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ملک محمد کے اطراف پوری کہانی گھومتی نظر آتی ہے۔ داستان دلچسپی سے پُر ہے۔ مصنف نے واقعہ نگاری پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔

15.3.5 عجائب القصص:

عجائب القصص شاہ عالم ثانی کی تصنیف ہے جو اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں لکھی گئی۔ ممتاز محقق ڈاکٹر جمیل جالبی اس کی تاریخ تصنیف 93-1792 بتاتے ہیں۔ اس کی تصنیف کے وقت شاہ عالم ثانی نابینا تھے۔ عجائب القصص بہت طویل داستان ہے۔ گیان چند جین ''اُردو کی نثری داستانیں'' میں لکھتے ہیں''ایک نابینا شخص اتنی طویل داستان کا شیرازہ درست نہیں رکھ سکتا۔ منشیوں نے اس کی ترتیب میں ہاتھ بٹایا ہوگا۔ چنانچہ پلاٹ میں بھول چوک حیرت انگیز حد تک مفقود ہے۔''

داستان کی ابتدا حمد، نعت، منقبت کے بعد اصل قصے سے ہوتی ہے۔ ملک ختن کے بادشاہ مظفر شاہ اور اُس کے وزیر کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ فقیروں کی دعاؤں سے دونوں کے یہاں لڑکے تولد ہوئے۔ اسی طرح روم کے بادشاہ اور اس کے وزیر کے یہاں بھی درویشوں کی دعاؤں سے لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بادشاہ مظفر شاہ کا فرزند شجاع الشمس خواب میں روم کے بادشاہ کی بیٹی مہر نگار کو دیکھتا ہے اور اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ مظفر شاہ اپنے بیٹے کے لیے مہر نگار سے شادی کا پیغام بھیجتا ہے۔ ابتدا میں مہر نگار شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بعد میں وہ بھی شجاع الشمس کو

خواب میں دیکھ کر دل دے بیٹھتی ہے۔ کافی مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

شاہ عالم ثانی کی تصنیف عجائب القصص جب منظرعام پر آئی تو اُس وقت اُردو زبان' عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ کی گرفت سے قدرے باہر آ چکی تھی۔ اس دور کی اُردو میں سلاست اور روانی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ عجائب القصص بھی زبان کی اِنہیں خصوصیات سے مملو دکھائی دیتی ہے۔ رواں زبان کے علاوہ اس زمانے کے رسوم و رواج' عقائد' تہذیب' آداب و اطوار کا عکس بھی اِس میں دکھائی دیتا ہے۔ بقول جمیل جالبی

''عجائب القصص اُردو نثر کی تاریخ کی وہ کڑی ہے جس نے فورٹ ولیم کالج سے پہلے اس کے سفر مستقبل کا رُخ متعین کر دیا۔''

(تاریخ ادب اُردو' جلد دوم' حصہ دوم' ص996)

کہانی کے اعتبار سے اس داستان میں جدت نہیں پائی جاتی ہے۔ اس کے مطالعے سے اُس زمانے میں لکھی گئی مثنویوں اور نثری داستانوں کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔ اس میں نوطرز مرصع اور سحرالبیان کا خصوصی طور پر عکس نظر آتا ہے۔ اکثر داستانیں کسی ملک کے شہزادے سے شروع ہوتی ہیں۔ بادشاہ کا لاولد ہونا' سلطنت اور دولت وحشمت کو چھوڑ کر فقیری اختیار کرنے کا سلسلہ عام طور پر ملتا ہے۔ پھر نجومی کی پیشن گوئی پر بادشاہ یا شہزادے کا عمل پیرا ہونا' اولاد کا نہ ہونا' کسی پری وش کو خواب میں دیکھ کر اُس پر فریفتہ ہونا یا کسی کی زبانی دور دراز کی شہزادی کے حسن کی تعریف سن کر دل و جان سے فدا ہونا' داستانوں کی عام روایت رہی ہے۔ داستانوں میں تلاش وجستجو بھی لازمی جزو کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ شہزادی کی تلاش' نایاب قسم کے پھول کی تلاش' آب حیات کی تلاش وغیرہ۔ اور اس تلاش میں عموماً شہزادہ صحرا کی خاک چھانتا ہے اور آخر میں منزل مقصود کو پالیتا ہے۔ لیکن کچھ داستانیں اپنی زبان و بیان' لفظیات' صنعتوں کے استعمال وغیرہ سے منفرد اور ممتاز ہوتی ہیں۔ داستانوں میں اپنے عہد کے سماجی' سیاسی اور تہذیبی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں جس سے اس دور کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔

شمالی ہند میں اِس دور کی آخری تصنیف شاہ حسین حقیقت کی ''جذب عشق'' کی شکل میں سامنے آتی ہے جسے اُنہوں نے فارسی سے اُردو میں 97-1796ء میں منتقل کیا ہے۔ شاہ حسین حقیقت معروف شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اُنہوں نے محض 25 برس کی عمر میں جذب عشق رقم کی۔ اس قصے کے دیباچے میں شاہ حقیقت نے خود لکھا ہے کہ یہ ایک سچے واقعے پر مبنی ہے۔

''جذب عشق'' موضوعاتی سطح پر ایک رومانی قسم کی داستان ہے۔ اس کا مرکزی کردار جوان رعنا ہے جو مرہٹوں کی فوج میں شامل ہے۔ ایک دفعہ اتفاقیہ طور پر اس کی نظر ایک خاتون پر پڑتی ہے۔ وہ بھی اُسے دیکھتی ہے اور دونوں ہی ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن جب لڑکی کے گھر والوں کو اس کی خبر ملتی ہے تو وہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جب دونوں محو گفتگو تھے تو لڑکی کے گھر والے جوانِ رعنا پر پیچھے سے وار کر دیتے ہیں۔ جوانِ رعنا بڑی بہادری سے اُن کا سامنا کرتا ہے۔ لیکن لاعلمی کے سبب وہ تالاب میں کود جاتا ہے۔ اسے تیرنا نہیں آتا ہے۔ لڑکی بھی اس کی محبت میں تالاب میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد دو لاشیں ایک ساتھ سطح آب پر نظر آتی ہیں اور باوجود کوشش کے دونوں کو ایک دوسرے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پانی میں ڈوب کر مرنا اور مرنے کے بعد اس طرح ایک ہو جانا میر تقی میر کی مثنویوں' خاص طور پر ''دریائے عشق'' کی یاد دلاتا ہے۔ جذب عشق ایک عشقیہ داستان ہے۔ اس داستان کی مقبولیت کم ہے اس لیے کہ یہ زبان و بیان کے اعتبار سے ایک کمزور داستان تصور کی جاتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ ''نوطرز مرصع'' کس تصنیف کا ترجمہ ہے؟

2۔ ''نو آئینِ ہندی'' کس سنہ میں تحریر کی گئی؟

3۔ بادشاہ مظفر شاہ کس ملک کا رہنے والا تھا؟

4۔ شاہ عالم ثانی کی تحریر کردہ کسی ایک تصنیف کا نام بتائیے۔

15.4 متن برائے مطالعہ (نمونۂ متن)

کربل کتھا؛

آہِ دردناک بھر زار زار رو کہا؛ اے جانِ حسین! اپنے باپ کی وصیّت پر عمل کرے گا اور مجھ لیے مَرے گا۔ پس مجھے بھی تیرے حق میں ایک وصیّت کی ہے چاہیے کہ میں بھی بجالاؤں۔ پھر ہاتھ قاسم کا پکڑ، خیمہ میں سِدھار، قاسم کی ماں کوں فرمائے پوشاکِ نو قاسم کو پنھاؤ اور اپنی بہن زینب کوں فرمائے؛ جامہ دانی بھائی حسن کی لاؤ، اُس میں سے جامہ قیمتی بھائی حسن کا نکال قاسم حسن کوں پنھائے اور چیرا اپنے ہاتھ سے اُس سر پر باندھ اپنے بھائیوں عون و عباس کوں بُلائے۔ پھر وہ بیٹی اپنی کہ نام زدِ قاسم تھی اس سے نکاح باندھے فرمائے؛ اے قاسم! یہ امانت تیرے باپ کی ہے، وہ آج لگ مجھ پاس تھی، اب لے۔ یہ کہہ ہاتھ اُس کا قاسم کے ہاتھ دے باہر سِدھارے۔

قاسم ہاتھ دلھن کا پکڑ منھ اُس کا دیکھتا تھا کہ لشکرِ عمرِ سعد سے آواز آئی؛ اے حُسین! کوئی اور رہا ہے تو میدان میں بھیج۔ جوں وہ آواز قاسم کے کان پہنچی، ہاتھ دلھن کا چھوڑ، چاہا کہ باہر جاوے دلھن نے دامن پکڑ کہا؛ اے قاسم! کیا خیال رکھتا اور کہاں جاتا؟ قاسم نے کہا؛ اے نورِ دیدہ! قصدِ میدان رکھتا۔ دامن چھوڑ کہ تیری دُلھنی اور میری دامادی قیامت پر پڑی۔ پھر دلھن کہی؛ عجب بات فرماتے کہ دُلھنی تیری اور دامادی میری قیامت پر پڑی۔ پس فردائے قیامت تمھیں کہاں پاؤں اور کس نشان سے پہچانوں؟ قاسم اپنی آستین پھاڑ کہا؛ اِس نشان سے، مجھے میرے باپ اور اپنے دادا پاس ڈھونڈیو۔

قصہ مہر افروز و دلبر؛

بادشاہ کیں ایک وزیر تھا، تِس کا نانو تھا جہاں دانش۔ تِس کا ایک بیٹا تھا کہ نیک اندیش اُس کا نانو تھا۔ سو اُس میں اور بادشاہزادے میں بہت اخلاص تھا، اور ہمیشہ وہ ساتھ ہی رہتے تھے، ایک روز ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ بادشاہزادہ و وزیرزادہ شکار میں اکیلے ہو جاتے ہیں تو ان کے تائیں جانور درخت کے اوپر ایک خوش رنگ بولتا ہوا نظر پڑا کہ ایک ایک پَر کا رنگ اُس کے ہزاروں پر مور کے کوں کِشت دیتا تھا اور آواز اُس کی کوں بلبل کی مثال دیجے، تو بلبل تو ہزار داستان ہوتی ہے، پر اس کی ایک ایک داستان ہزار ہزار داستان تھیں، اور جو اُسے سُرود کہیے تو سُرود ایک سوز رکھتا ہے۔ اُس کی ایک ایک آواز ہزاروں سوز رکھتی تھی۔ شاہزادے کوں دل و جان سے آواز، رنگ اُس کا خوش آیا۔ تماشے کے واسطے نزدیک اُس کے گیا۔ وہ جانور وہاں سے اُڑ کر اور جگہ جائے بیٹھا۔ بادشاہزادہ اور اُس کے پچھیں جاتا ہے۔ از بسکہ بادشاہزادہ محو جو ہو گیا تھا،

نوطرزِ مُرصّع؛

آہ حسرت مرے دل کی نہیں برآتی ہے

مفت باتوں میں مری عمر چلی جاتی ہے
قطع اُمید ہے اور یاس نظرآتی ہے
ہائے یہ زندگی کیا کیا مجھے دکھلاتی ہے
اس مصیبت کا بیاں کیجیے کس سے افسوس
درد اس دل کا عیاں کیجیے کس سے افسوس

یہ کہتا خراماں خراماں مضطر و متفکر خفگی طبیعت کی سے سب کار پردازان کارگاہِ خلافت کے تئیں، جواب مجرے کا فرما کے، قدم فراں روائی و جہانداری کا بیچ دامن قناعت کے کھینچ کر ایک گوشہ میں تنہا جا بیٹھا اور ساری حلاوت و مزہ زندگانی کے سے تلخ کام ہو کے ارشاد فرمایا کہ ہرگز کوئی خویش و بیگانہ سے سوائے خادمانِ درگاہ کے بیچ خلوت سرائے بادشاہی کے باریاب نہ ہو اور اضطراب شدتِ رقّتِ طبع کے سے مجنون دل، اندوہ منزل، اُس کے کا بیچ خیال جمال لیلیٰ کامرانی کے پڑھنے، اس بند مخمس کے سے مشتغل تھا۔

یاالٰہی میں کہوں کس سیتی اپنا احوال
تجھ سوا کون ہے، جس سے میں کہوں دل کا ملال
یارب اس رنج سے اب اس دل شیدا کوں نکال
تیری ہی ذات سے رکھتا ہوں میں ہردم یہ خیال
ساز آباد خدایا دلِ ویرانہ را

15.5 اکتسابی نتائج

☆ اٹھارہویں صدی کے نثری کارناموں کے محاسبے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی میں نثر کے مختلف نمونے ملتے ہیں اور مختلف النوع قسم کے اسالیب بھی ملتے ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی بنیادی طور پر شعری اصناف کے لیے جانی جاتی ہے۔ میر، سودا، درد، سوز، انشا، میر حسن وغیرہ ایسے متعدد شاعر ہیں جو اس صدی میں موجود تھے۔ لیکن ان میں سے بعض ایسے شاعر ہیں جو نثری کارناموں کے حوالے سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

☆ اٹھارہویں صدی میں نثر کے حوالے سے جعفر زٹلی کا نام سرفہرست ہے جن کے نثری نمونوں کے مطالعے سے اس وقت کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ سودا نے بھی مرثیوں کو یکجا کر کے دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ دیباچہ خود ایک عمدہ نثری نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میر تقی میر نے بھی اُردو شاعروں کے تذکرے لکھے۔ اس کی کافی اہمیت ہے لیکن یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔

☆ اس کے علاوہ ترجمے کے توسط سے بھی نثر میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قران کے تراجم کیے۔ ادبی نوعیت کی کتابوں میں فضلی کی ''کربل کتھا''، تحسین کی ''نوطرز مرصع'' جیسی نادر تصانیف ترجمے ہی کی مرہون منت ہیں۔ قصہ مہر افروز و دلبر عیسوی خاں بہادر کی داستان ہے۔ اسے شمالی ہند کی قدیم نثری تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆ ہری چند مہر کی تصنیف ''نو آئینِ ہندی''، اور شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' بھی اٹھارہویں صدی کی نمائندہ کتابیں ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے آخر تک اُردو نثر اپنا ارتقائی سفر طے کرتی رہی ہے اور اس عہد میں نثر کی صحت مند

روایت ملتی ہے۔اسلوب کی سطح پر بھی اس صدی میں بہترین تبدیلی ملتی ہے۔

☆ اُردو پر عربی اور فارسی کے نمایاں اثرات ہونے کے باوجود ایک نکھرا ہوا اسلوب سامنے آتا ہے۔سلیس اور رواں زبان میں ادب پارے لکھے گئے جن میں سے کئی اب بھی اُردو ادب کے شاہکار ہیں۔

☆ غرضیکہ اس صدی میں اُردو نثر کی مضبوط اور مستحکم داغ بیل ڈالی گئی جس نے فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں کے لیے راہیں ہموار کردیں اور جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

15.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
رفاقت	ساتھ، دوستی، محبت
کربل کتھا	کربلا کی کہانی
مختلف النوع	مختلف قسم کی
معاصر	ایک ہی دور کے، ہم عصر
نظم	موزوں کلام، شعر
نثر	وہ عبارت جو منظوم نہ ہو
ملفوظات	ملفوظ کی جمع، جو پڑھنے میں آئے
تذکرے	یادگار، سرگزشت، سوانح عمری
محاورے	وہ کلمہ یا کلام جسے اہل زبان نے لغوی معنی سے الگ کسی خاص مفہوم کے لیے مخصوص کرلیا
کہاوتیں	قول، ضرب المثل
اوجِ ثریا	انتہائی بلندی پر
کثرت	زیادہ
آمیزش	ملاوٹ
نوطرزِ مرصع	نئے انداز کی سجی ہوئی تحریر
مقفیٰ	جس میں قافیے کا اہتمام کیا گیا ہو
نگارشات	نگارش کی جمع، تحریریں

15.7 نمونۂ امتحانی سوالات

15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ''کربل کتھا'' کے مصنف کا نام بتایئے۔

2۔ کیا ’’قصہ مہر افروز و دلبر‘‘ طبع زاد داستان ہے؟

3۔ کیا میؔر و سوؔدا شاعر کے علاوہ نثر نگار بھی تھے؟

4۔ ’’کربل کتھا‘‘ میں کتنی مجلسوں کا ذکر ملتا ہے؟

5۔ ’’اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ‘‘ کے مصنف کا نام بتائیے۔

6۔ ’’نکات الشعرا‘‘ کس زبان میں لکھی گئی ہے؟

7۔ وجہی نے کس کی فرمائش پر ’’سب رس‘‘ قلم بند کی؟

8۔ ’’نوطرز مرصع‘‘ کس تصنیف کا ترجمہ ہے؟

9۔ ’’نو آئینِ ہندی‘‘ کس سنہ میں تحریر کی گئی؟

10۔ بادشاہ مظفر شاہ کس ملک کا رہنے والا تھا؟

15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ’’نوطرز مرصع‘‘ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ ’’کربل کتھا‘‘ پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ عجائب القصص کا خلاصہ لکھیے۔

4۔ ’’نکات الشعرا‘‘ کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

5۔ نواب عیسوی خاں بہادر کی کردار نگاری ’’قصہ مہر افروز و دلبر‘‘ کے حوالے سے بیان کیجیے۔

15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نثر کی تعریف کیجیے اور اُردو نثر میں ’’نو آئینِ ہندی‘‘ کے مقام کا تعین کیجیے۔

2۔ اُردو نثر کی تاریخ میں عطا حسین تحسین کے مقام و مرتبے کا تعین کیجیے۔

3۔ شمالی ہند میں اُردو نثر کے ابتدائی نقوش سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

15.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ کلاسیکی نثر کے اسالیب	آفتاب احمد آفاقی
2۔ اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	احتشام حسین
3۔ تاریخ ادب اُردو (جلد دوم، حصہ دوم)	جمیل جالبی
4۔ قصہ مہر افروز و دلبر (مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں)	عیسوی خاں بہادر
5۔ کربل کتھا (مرتبہ حنیف نقوی)	فضل علی فضلی
6۔ نوطرز مرصع (ترتیب وتہذیب: پروفیسر ارتضیٰ کریم)	میر محمد حسین عطا خاں تحسین

بلاک VI : ادارے ٔ رجحانات اور تحریکات

اکائی 16: فورٹ ولیم کالج

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد
16.3 کالج کا نصاب
16.4 ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی اردو خدمات
16.5 کالج کے اہم مترجمین اور ان کی خدمات
16.5.1 میر امن دہلوی
16.5.2 سید حیدر بخش حیدری
16.5.3 میر شیر علی افسوس
16.5.4 مرزا علی لطف
16.5.5 میر بہادر علی حسینی
16.5.6 مظہر علی خاں ولا
16.5.7 میر کاظم علی جوان
16.5.8 نہال چند لاہوری
16.6 کالج کے دیگر ملازمین
16.7 کالج کا زوال
16.8 اکتسابی نتائج
16.9 کلیدی الفاظ
16.10 نمونہ امتحانی سوالات
16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید

کالج کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسی عمارت کا خاکہ ابھرتا ہے، جس میں طالب علموں کی صلاحیت کو نکھارنے کے لیے اساتذہ یا مدرس اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔ کالج عام طور پر سماجی اقدار، تہذیب وثقافت کو نصاب کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرنے کا کام کرتا ہے، لیکن ہم یہاں جس کالج کے بارے میں پڑھنے جا رہے ہیں وہ طالب علموں کے لیے نہیں کھولا گیا بلکہ اس کالج کا بنیادی مقصد انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبان (اردو) سکھانا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ وہ بہت مؤثر انداز سے ہندوستان میں ان کی مقبوضہ ریاستوں میں حکومت کرسکیں۔ چنانچہ 10/ جولائی 1800ء کو کلکتہ کے فورٹ ولیم نامی قلعے میں ایک کالج قائم کیا گیا، جسے فورٹ ولیم کالج کا نام دیا گیا۔ یہ کالج لارڈ ویلزلی کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس کی اجازت سے قائم کیا گیا۔ اس کالج میں بہت سے علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ اردو نثر کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقصد پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ فورٹ ولیم کالج کے اہم ملازمین اور ان کی خدمات کے بارے میں لکھ سکیں۔

☆ اردو نثر کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈال سکیں۔

16.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض ومقاصد

فورٹ ولیم کالج کی ابتدا جس زمانے میں ہوئی وہ ہندوستان کی تاریخ کا پر آشوب دور تھا۔ صوبائی بغاوتیں شہنشاہیت کو نقصان پہنچا رہی تھیں اور غیر ملکی طاقتیں اس دور کے سیاسی انتشار سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل تھیں۔ بنگال' پلاسی کی جنگ 1757ء کے نتیجے میں فرنگی تسلط میں آ گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو صرف تجارتی مقصد سے قائم کی گئی تھی اب سیاست کے میدان میں بھی قدم جمانے لگی تھی۔ بکسر کی لڑائی کے بعد انگریز تسلط نہ صرف مشرقی اضلاع پر مستحکم ہوا بلکہ مغربی اور جنوبی ہند تک پہنچ چکا تھا۔ اس تسلط کو برقرار رکھنے' مزید سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور حکومت کے کاروبار چلانے کے لیے انگریز افسروں کا دیسی زبانوں سے واقف ہونا ضروری تھا۔ فارسی کا عروج ختم ہو چکا تھا۔ اردو ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ملک کے اکثر و بیشتر حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ عوام میں اردو کا چرچا ہونے لگا تو کمپنی بہادر کے حکام نے بھی اردو سیکھنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں 1800ء میں قائم کیا۔ اس کالج کا مقصد اردو کی بقا یا ترویج واشاعت نہ تھا بلکہ کمپنی کے انگریز ملازمین کو اردو سکھانے کا انتظام کرنا تھا۔ اس وقت ملک کی ابھرتی ہوئی زبان اردو ہی تھی جو ہندوستان کے طول وعرض میں نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ اس میں تصنیف وتالیف کا کام بھی ہو رہا تھا۔ چنانچہ ارباب مقتدر اس زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے لیے مجبور تھے۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام چوں کہ سرکاری طور پر منظّم کاوش تھی اس لیے اس کا اردو نثر کی ترقی ورفتار پر خوش گوار اثر پڑا۔

16.3 کالج کا نصاب

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں' اسی لیے سادہ اور سلیس زبان میں تیار کی گئیں ۔ اردو قواعد کی کتابیں اور لغات بھی تیار کی گئیں۔ اردو میں جو نثری کتابیں تھیں وہ مشکل زبان میں تھیں اور تمام تر مذہبی تھیں۔ تاریخ اور دوسرے علمی موضوعات پر اردو میں کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی کاموں کے لیے ایک مدت تک فارسی ہی استعمال کی جاتی تھی اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔

یہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب کا ایک پہلو ہے جسے اردو والوں نے ایسی تشہیر بخشی کہ فورٹ ولیم کا نام آتے ہی ذہن میں صرف اردو زبان کے تعلق سے ایک کالج کا نقشہ آتا ہے، جس میں مشرقی شعبے کے تحت عربی فارسی اور اردو کا درس دیا جاتا ہوگا۔ لیکن حقیت میں اس کالج میں جغرافیہ، کیمیا اور دوسری یوروپی زبانیں (لاطینی، انگریزی، کلاسیکی یونانی) بھی سکھائی جاتی تھیں۔ چونکہ ہندوستان میں بھیجے گئے افسران کم عمر ہوتے تھے اس لیے انہیں اپنے زبان وادب اور تہذیب سے واقف کرنے کے لیے استاتذہ مقرر کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی سائنس میں علم نباتات (Botany)، علم کیمیا (Chemistry) اور علم نجوم (Astronomy) کی بھی تعلیم کا نظم ونسق بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اس وقت تک اردو میں کلاسیکی داستانوں کے علاوہ صرف شاعری کا ہی چرچا تھا۔ اردو میں دوسرے علوم (تاریخ اور جغرافیہ) کی کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ترجمہ وتالیف کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ جس میں تمام ملک سے افراد کو منتخب کر کے کلکتہ میں جمع کیا گیا اور ان سے نثر میں کتابیں تالیف کرائی جانے لگیں۔

اس کے علاوہ عیسائی مذہب کی تعلیمات کو بھی کالج کے نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ کالج میں مسیحی عبادت پر زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ کالج ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے لیے نہ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوا بلکہ عیسائی نظریات اور مذہبی تبلیغ کو فروغ دینے میں بھی کالج کے عیسائی ملازمین نے اہم کردار ادا کیا۔

16.4 ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی اردو خدمات

گل کرسٹ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ (John Barth wick Gilchrist) تھا۔ وہ اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ 1783ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔ ہندوستان میں دہلی اور لکھنؤ میں رہ کر انہوں نے اردو اور فارسی سیکھی اور کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی کے بجائے اردو کو دفتری زبان بنانا زیادہ مفید ہوگا۔ بعد میں ان کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے 1832ء میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے گل کرسٹ نووارد انگریز عہدیداروں کو فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جب 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہوا تو ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں کالج میں ہندوستانی (اردو) کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ گل کرسٹ 1804ء تک کالج کی خدمات انجام دیتے رہے۔ خرابی صحت کی وجہ سے پنشن لے کر اپنے وطن لوٹ گئے۔ 1818ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان میں اورینٹل انسٹیٹیوٹ قائم کیا تو وہ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اس ادارے کے برخاست ہونے تک کام کرتے رہے۔ 1814ء میں 88 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کی مدت کل بیس برس کی ہے جس میں پچاس یا ساٹھ کتابیں منظر عام پر آئی لیکن مجموعی طور پر شہرت انہیں کتابوں کو ملی جو جان گل کرسٹ کے کالج سے وابستہ رہتے ہوئے لکھی گئیں۔انہوں نے صرف چار سال تک ہی فورٹ ولیم کالج میں خدمات انجام دیں لیکن ان چار سالوں میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں تمام ہندوستان سے قابل اور لائق ماہرین زبان کو جمع کیا اور ان سے تصنیف و تالیف کا کام اس طرح لیا کہ مختلف موضوعات پر اردو میں نثری کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا۔اس کے علاوہ اردو سیکھنے کے لیے بنیادی کتابوں کا جتنا ذخیرہ انہوں نے فراہم کیا وہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ان کی اہم تصانیف یہ ہیں:

1۔ **انگریزی ہندوستانی ڈکشنری:** یہ لغت انگریزی لغات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

2۔ **ہندوستانی گرامر:** یہ اردو صرف و نحو سے متعلق کتاب ہے اور فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل ہونے کی وجہ سے متعدد بار شائع بھی ہوئی۔میر بہادر علی حسینی نے اس کا خلاصہ بھی مرتب کیا۔

3۔ **مشرقی زبان دان:** اس کو اورینٹل لنگوسٹ بھی کہتے ہیں۔اس میں اردو زبان کا مقدمہ اور تعارف ہے، ساتھ ہی اردو انگریزی کی ایک فرہنگ بھی شامل ہے۔

4۔ **فارسی افعال کا نظریہ جدید:** اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔یہ افعال کے پہلوؤں پر بحث کرتی ہے اور اس میں انگریزی اور اردو میں مختلف افعال کے مترادفات بھی شامل ہیں۔

5۔ **رہنمائے اردو:** انگریز افسروں کو کم سے کم وقت میں اردو سے واقفیت حاصل کی غرض سے یہ کتاب لکھی گئی۔اس کا پہلا ایڈیشن 1802ء میں کلکتہ سے اور دوسرا ایڈیشن لندن سے 1808ء میں شائع ہوا۔

6۔ **مشرقی قصے:** اس کتاب میں حکایات لقمان اور دوسری زبانوں کی حکایتوں اور کہانیوں کے ترجمے شامل ہیں۔اس کتاب کی تالیف میں گل کرسٹ نے کالج کے دوسرے اہل قلم سے بھی مدد لی تھی۔

7۔ **بیاض ہندی:** فورٹ ولیم کالج کے مولفین کے کارناموں کا انتخاب وغیرہ۔

8۔ **اتالیق ہندی:** اردو سیکھنے اور پڑھنے لکھنے میں مزید آسانی کے لیے کالج کے اہم قلم کروں سے مضامین لکھوائے گئے۔اس کے علاوہ فارسی کے کچھ آسان مضامین کا ترجمہ بھی کرایا گیا اور کتاب کی ابتدا میں فارسی صرف و نحو اور اس کے ابتدائی مسائل پر بحث کی گئی۔

9۔ **عملی خاکے:** اردو الفاظ کو تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کے اصول کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

10۔ **ہندی الفاظ کی قرأت:** اس میں ہندی الفاظ کی قرأت اور تلفظ کے اصول سے متعلق مدلل بحث کی گئی ہے۔کچھ لوگوں نے اسے علمی خاکوں کی ترمیم شدہ شکل بھی کہا ہے۔

11۔ **ہندی عربی آئینہ:** یہ ایک رسالہ ہے جس میں عربی کے ایسے نقشے شامل ہیں جو اردو زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔یعنی اردو اور عربی میں مشترک الفاظ کو ان کی شکلوں کے مطابق سمجھایا گیا ہے۔

12۔ **انگریزی ہندوستانی بول چال:** یہ رسالہ 1820ء میں لندن سے شائع ہوئی۔اس رسالے کو ترتیب دینے کا مقصد یہ تھا کہ اس کی مدد سے انگریز اردو بول چال سیکھ سکیں اور روزمرہ کے کاموں میں مقامی لوگوں سے بات چیت کرنے میں انہیں کسی مشکل کا

سامنا نہ کرنا پڑے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد کپتان ٹامس روبک اردو کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ان کا تعلق فوج سے تھا۔ انہوں نے کالج کے اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا اور کئی کتابیں شائع کیں۔انھوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔''لغت جہاز رانی'' کے نام سے لغت لکھی اس کے ساتھ ایک مختصر اردو قواعد بھی شامل کی۔ان کی دوسری کتاب ''ترجمان ہندوستان'' ہے۔اس میں بھی قواعد زبان کی تشریح کی گئی ہے۔ان اردو کتابوں کے علاوہ انہوں نے فورٹ ولیم کالج کی تاریخ بھی لکھی۔

کپتان جوزف ٹیلر اردو کے پروفیسر تھے انھوں نے بھی ایک مبسوط اردو انگریزی لغت لکھی۔

16.5 کالج کے اہم مترجمین اور ان کی خدمات

16.5.1 میر امن دہلوی:

میر امن کا نام میر امان تھا۔دہلی کے رہنے والے تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔ان کے آباء واجداد ہمایوں کے دور سے مغلیہ سلطنت میں خدمات انجام دے رہے تھے۔دربار سے وابستہ رہتے ہوئے انہوں نے وظائف اور جاگیریں حاصل کیں،لیکن جب دہلی میں تباہی آئی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے میں اوروں کے ساتھ ان کا گھر بھی تاراج ہوگیا،سورج مل جاٹ نے ان کی جاگیر پر قبضہ کرلیا تو انہوں نے عظیم آباد کا رخ کیا جہاں ایک مدت گزارنے کے بعد 99-1798ء میں کلکتہ پہنچے جہاں نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق بنے۔اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت تھی۔ 1801ء میں بہادر علی حسینی کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہوئے۔

میر امن کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات نہیں ملتی۔ان کے بارے میں جو بھی معلومات دریافت ہوئی ہے اس کا ماخذ'باغ و بہار' کا دیباچہ ہے۔کچھ تذکرہ نویسوں نے ان کا نام امان بتایا ہے اور امّن تخلص بتایا ہے، جو کہ اب قابل قبول نہیں ہے۔پانچ سال تک کالج سے وابستہ رہنے کے بعد میں ضعیفی کے سبب 4 جون 1806ء میں کالج کی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔

میر امن نے فورٹ ولیم کالج میں دو کتابیں لکھیں لیکن 'باغ و بہار'' کے حصے میں جو شہرت آئی،اس کی برابری ''گنج خوبی'' نہ کرسکی۔''گنج خوبی'' میر امن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''اخلاق محسنی'' کا اردو ترجمہ ہے جو انہوں نے ۱۸۰۲ء میں مکمل کی۔رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں یہ معلومات بہم پہنچائی ہے کہ اس کتاب پر میر امن کو چار سو روپیے انعام بھی ملا تھا۔چونکہ فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کی کوششوں سے جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان میں سب سے زیادہ شہرت 'باغ و بہار' کے حصے میں آئی لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تا کہ اس کی وجہ تشہیر دریافت کی جاسکے۔

'باغ و بہار' کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا سلیس اور سادہ اسلوب ہے۔اس کی نثر میں تازگی،توانائی اور دلکشی ہے۔عبارت میں وہ سادگی اور روانی ہے کہ پڑھتے ہوئے کسی طرح کی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔میر امن کو زبان دہلی پر قدرت حاصل تھی لہذا جزئیات نگاری اور واقعہ نگاری کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ان کے اسلوب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے قبل میر عطا حسین خاں تحسین اسی داستان کو ''نوطرز مرصع'' کے نام سے رنگین عبارت میں ترجمہ کر چکے تھے۔کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل قصہ فارسی میں تھا جس کی

تصنیف کا سہرا طوطی ہند امیر خسرو کے سر تھا۔ایک باران کے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے دوران یہ قصہ سنایا اور جب غسل صحت تمام ہو چکا تو آپ نے دعا دی کہ جو کوئی بھی اس قصہ کو سنے گا وہ بیماری سے نجات پائے گا۔

فارسی میں اس قصے کی مقبولیت کے سبب تحسین نے اسے 'بیچ عبارت رنگین زبان ہندی' میں لکھا۔نوطرز مرصع کے ذیل میں یہ مذکور ہوا کہ اس کو لکھتے ہوئے تحسین کے سامنے غالباً کوئی نسخہ نہیں تھا بلکہ انہوں نے کشتی میں ایک عزیز کے منہ سے داستان سنی،اسی کو اپنی قلم سے قرطاس پر رقم کر دیا۔لیکن عرف عام میں اس قصے کی مقبولیت کا وہی حال تھا جو فضلی کی کربل کتھا سے قبل ملا حسین واعظ کاشفی کی 'روضۃ الشہدا' کا تھا۔وہاں لوگ اس کو سن کر آہ نالہ نہ کر پاتے تھے اور یہاں اس داستان کی عبارت رنگین ہونے سے مکمل طور پر لطف نہیں لے پاتے تھے۔فورٹ ولیم کالج میں نو آموز انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے ضروری تھا کہ عبارت صاف اور سادہ ہو۔لہٰذا گلکرسٹ نے اس کام کی ذمہ داری میر امن کے سپرد کی کہ اس کتاب کو بہ زبان دہلی ترجمہ کریں۔

میر امن کی داستان میں جدت سے انکار نہیں کیا جا سکتا،لیکن چونکہ یہ داستان طبع زاد نہیں تھی اور اسے لکھنے کے لیے میر عطا حسین خاں تحسین کی نوطرز مرصع کو سامنے رکھا لہٰذا کہانی کے پلاٹ میں ہونے والی خامی یا خوبی کے لیے میر امن کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے لیکن جہاں جہاں معاشرے کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے قلم نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔وہ دلی کے روڑے تھے اور یہاں کی زبان کا عرق ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا لہٰذا کسی بھی مقام پر روزمرہ کی شیرینی اور محاروں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ ''باغ و بہار'' کے ذریعے میر امن نے جغرافیائی حد بندیوں کو توڑ کر مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن اور ذائقوں کو ہندوستانی دسترخوان پر لا کر رکھ دیا ہے۔جزئیات نگاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔وہ جب کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے تمام انواع و اقسام کو ایک سانس میں گناتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں انھوں نے دو کتابیں'' باغ و بہار'' اور'' گنج خوبی'' لکھیں ۔میر امن نے قصہ چہار درویش کو'' باغ و بہار'' کے نام سے لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر لی ۔اردو میں میر امن سے پہلے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے قصہ چہار دویش کو'' نوطرز مرصع'' کے نام سے لکھا تھا۔تحسین کا یہ قصہ بہت مشکل زبان میں ہے اور اس کی عبارت مقفیٰ مسجع ہے۔میر محمد عطا حسین خاں تحسین کے علاوہ قصہ چہار درویش کو بہت سے لوگوں نے لکھا،لیکن'' باغ وبہار'' جس ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے اور قصہ چہار درویش کو جتنی شہرت اور مقبولیت اس کتاب سے حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہوسکی ۔میر امن کی باغ و بہار نے نہ صرف اردو میں شہرت حاصل کی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔

میر امن کی دوسری کتاب'' گنج خوبی'' ہے،جو دراصل ملا حسین کاشفی کی مشہور فارسی کتاب'' اخلاق محسنی'' کا اردو ترجمہ ہے۔اس میں اخلاقی حکایتوں کو پیش کر کے نصیحت آموز نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے دوران دو کتابوں کا ترجمہ کیا جن میں ایک باغ و بہار اور دوسری گنج خوبی ہے۔ان میں اوّل الذکر کی مقبولیت سے انکار نہیں کی جا سکتا،لیکن گنج خوبی ان کا بالکل غیر معروف کارنامہ ہے جو گل کرسٹ کے ایما پر نو آموز طالب علموں کے لیے ترجمہ کرائی گئی۔اس کتاب کا اصل ماخذ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب'' اخلاق محسنی'' ہے اور گنج خوبی اس کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہ اخلاقیات کی

بہت معتبر کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ کتاب 1802ء میں باغ و بہار کو مکمل کر کے اس کا ترجمہ شروع کیا۔ وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے میر امن خود لکھتے ہیں:

''سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے ''باغ و بہار'' کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ از بس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دنیا کے نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں۔ اس واسطے اس کا نام ''گنج خوبی'' رکھا۔''

میر امن ایک اچھے نثر نگار کے ساتھ بہترین مترجم بھی تھے لہٰذا گنج خوبی اپنے موضوع کے باعث لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرتی ہو لیکن اس کا بھی ترجمہ کرتے ہوئے میر امن نے جدت سے کام لیا ہے اور لفظی ترجمہ نگاری کے بجائے آزاد ترجمہ کو ترجیح دی ہے۔ اخلاق محسنی میں پند و نصائح اور اخلاقی موضوعات کے باعث سنجیدگی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے پھر بھی جہاں مناسب معلوم ہوا، روزمرہ کے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور یہی وہ خوبی ہے، جس نے ان کے ترجمے کو کامیاب بنایا ہے۔

16.5.2 سید حیدر بخش حیدری؛

اگر فورٹ ولیم کالج میں کتب کی تعداد کے اعتبار سے کسی مصنف کی عظمت کا اندازہ لگایا جائے تو حیدر بخش حیدری کا نام سرفہرست ہوگا۔ انہیں نثر اور شاعری دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ ان کا آبائی وطن نجف اشرف تھا لیکن اجداد معاش کی تلاش میں دہلی آئے اور یہیں کے ہو کر رہے۔ جب معاشی پریشانیوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو روزگار کی تلاش میں کلکتہ کا رخ کیا اور ''قصہ مہر و ماہ'' گلکرسٹ کی خدمت میں لکھ کر پیش کیا اور جب 1801ء میں منشیوں کا تقرر ہوا تو ان میں ایک نام حیدر بخش حیدری کا بھی تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں سب سے زیادہ کتابیں لکھیں اور کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ 1823ء میں بنارس میں ان کا انتقال ہوا۔ حیدر بخش حیدری کی درج ذیل تصانیف ہیں۔

1۔ ''قصہ مہر و ماہ'': یہ حیدری کی پہلی تصنیف ہے۔
2۔ قصہ لیلیٰ مجنوں: یہ حضرت امیر خسرو کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔
3۔ طوطا کہانی: یہ سنسکرت زبان کی ''شکاسب تتی'' پر مبنی ہے۔ شکاسب تتی کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں
4۔ آرائش محفل: یہ قصہ حاتم طائی پر مبنی ہے۔ یہ قصہ بھی فارسی سے ترجمہ کیا گیا۔
5۔ ہفت پیکر: حضرت نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی 'ہفت پیکر'' سے متاثر ہو کر اسی طرز پر اردو مثنوی 'ہفت پیکر'' ہی کے نام سے لکھی۔
6۔ تاریخ نادری: نادر شاہ کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تاریخ فارسی میں لکھی گئی تھی جس کا حیدری نے اردو میں ترجمہ کیا۔
7۔ گل مغفرت: روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔
8۔ گلزار دانش: شیخ عنات اللہ کی مشہور فارسی کتاب ''بہار دانش'' کا ترجمہ ہے۔
9۔ گلشن ہند: اردو شعرا کا تذکرہ کے علاوہ ''گلدستہ حیدری'' میں مضامین' دیباچے اور نظمیں ملتی ہیں۔ اسی نام سے ایک تذکرہ مرزا علی لطف نے بھی لکھا, لیکن حیدری نے اپنے تذکرے کو اس لائق نہیں سمجھا اور اس پر نظر ثانی نہیں کی۔

ان کی سب سے پہلی تصنیف ''قصہ مہر و ماہ'' (1799ء) ہے جس میں خاور شاہ کے بیٹے اور شہزادی ماہ کی عشقیہ داستان بیان کی گئی

ہے۔ یہ قصہ اسی نام کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔اس کی بنیاد پر حیدری کونوکری تو مل گئی لیکن یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔ دوسری کتاب ''قصہ لیلیٰ مجنوں'' ہے , جو 1801ء میں مکمل ہوئی۔اس قصے کو شاہ عالم کے عہد میں یٰسین شاہجہاں آبادی نے ہندی میں اس کو نظم کیا تھا اور پھر گلکرسٹ کی فرمائش پر حیدری نے اسے نثری جامہ پہنایا۔تو تا کہانی کی طباعت ۱۸۰۲ء میں شروع ہوئی لیکن کالج کے پرنسپل کے حکم سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔آخر کار 1804ء میں یہ مکمل طور پر شائع ہو کر سامنے آئی۔یہ کتاب بھی محمد قادری کے ''طوطی نامہ'' کا اردو ترجمہ ہے، لیکن ''طوطی نامہ'' بھی سنسکرت کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جسے سب سے پہلے مولانا ضیاء الدین بخشی نے 1330ء میں فارسی میں منتقل کیا۔اگر چہ طوطی نامہ کی زبان مشکل اور بوجھل ہے پھر بھی حیدری نے اس کا ترجمہ کرتے وقت سہل اور سلیس نثر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب خوب مقبول ہوئی۔گیان چند جین نے لکھا ہے کہ اس وقت تک اردو میں نثر کی کتابیں معدودے چند تھیں ان میں سیدھی سلیس اور بامحاورہ کتابوں کا بھی قحط تھا۔

حیدری کی دوسری مشہور کتاب ''آرائش محفل'' 1803ء میں شائع ہوئی۔اس میں حاتم طائی کے متعلق قصوں کو مربوط اور مسلسل بیان کیا گیا ہے۔اس قصے کی اصل فارسی ہے جسے گلکرسٹ کے کہنے پر ترجمہ کیا گیا۔حیدری نے اس قصے میں متعدد دفعہ تبدیلی کر کے قصے کو طور دیا ہے اور اس اعتبار سے ترجمہ سے زیادہ ان کی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ یہ باغ و بہار کے بعد سب سے مقبول داستان تھی۔حیدری کے یہاں طلسم اور ساحری کے وہ کرشمے ہیں جو ''طلسم ہوش ربا'' جیسی ضخیم داستانوں میں پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ 'ہفت پیکر' نام سے ایک مثنوی تصنیف کی، جو کہ حضرت نظامی گنجویؒ کی مشہور مثنوی 'ہفت پیکر' کی طرز پر لکھی گئی۔یہ کتاب 1805ء میں شائع ہوئی، لیکن اس کی اشاعت مشکوک ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی کی ''روضۃ الشہدا'' کی شہرت یوں تو سب سے پہلے فضلی کے ترجمے سے ہوئی، لیکن اس کے ترجمے کا سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا۔فورٹ ولیم کالج میں حیدر بخش حیدری نے ''گلشن شہیداں'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا اور پھر ''گل مغفرت'' کے نام سے شہدائے کربلا کے حالات پر مشتمل ایک انتخاب کیا۔انہوں نے اپنے ایک رفیق سید حسین جونپوری کی فرمائش پر اس کا انتخاب کر کے کلکتہ سے 1812ء میں شائع کرایا۔فضلی کی طرح حیدری نے جوں کا توں لفظی ترجمہ نہ کر کے آزاد ترجمہ کیا اور بہت سے اضافے کر دیے کہ یہ ترجمہ کے بجائے ان کی تالیف معلوم ہوتا ہے۔فضلی کی ''دہ مجلس'' کی طرز پر اسے ''دہ مجلس حیدری'' بھی کہا جاتا ہے۔اس میں شہادت کے درد انگیز واقعات کو رقت آمیز طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ برٹ ریاں نامی ایک فرانسیسی نے اس کا ترجمہ اپنی زبان میں کر کے 1845ء میں پیرس سے شائع کرایا۔

حیدری کی ایک اور کتاب ''گلزار دانش''، مشہور فارسی کتاب ''بہار دانش'' کا ترجمہ ہے، جس کے خالق شیخ عنایت اللہ تھے۔یہ ایک نیم تاریخی قصہ ہے اور سنہ تالیف اس کا 1651ء ہے، لیکن اردو ترجمے کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتیں کہ اب اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں۔فورٹ ولیم کالج میں ''گلشن ہند'' کے نام سے دو تذکرے لکھے گئے۔ایک مرزا علی لطف نے لکھا جسے خوب شہرت ملی۔دوسرا تذکرہ جو حیدری کا ''گلشن ہند'' ہے جو اب تک نہ شائع ہوا ہے اور نہ کسی نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔شاید حیدری نے اپنے کارنامے کو اس قابل نہیں سمجھا، ورنہ ان کی نثر کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے گلکرسٹ کے سامنے یہ نسخہ پیش کیا ہوتا تو وہ اس کی قدر کیوں کر نہ کرتے۔یہ تذکرہ 1801ء کے آس پاس لکھا گیا۔حیدری نے 1801ء میں اپنے مضامین کا مجموعہ ''گلدستۂ حیدری'' کے نام سے مرتب کیا، جس میں

مضامین، دیباچے اور شاعری کو شامل کیا ہے۔اس میں مجموعۂ حکایات، مجموعہ مراثی، قصہ مہر و ماہ کا دیباچہ، قصہ لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ کے علاوہ شعرائے اردو کا تذکرہ بھی اس میں شامل ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں میر امن کے بعد سب سے معتبر نام حیدر بخش حیدری کا ہے، تاہم ان کی نثر کسی بھی سطح پر میر امن سے کم نہیں ہے۔دونوں اپنے اپنے میدان کے بہترین انشا نگار ہے۔میر امن کی نثر میں صرف دہلی کی بولی اور محاورے ملتے ہیں لیکن حیدری کے یہاں سادہ اور صاف زبان ملتی ہے۔میر امن کے یہاں ہندی الفاظ کی کثرت ہے لیکن حیدی کے یہاں عربی، فارسی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ان کی ابتدائی تحریروں پر فارسی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے، لیکن ''آرائش محفل'' تک آتے آتے ان کی نثر سادی اور عبارت سلیس ہو جاتی ہے۔ان کے یہاں سنجیدگی، قواعد کی پابندی ہونے کے بعد بھی نثر گنجلک نہیں۔میر امن کے ہم عصر ہونے کے باوجود ان کی نثر آج کی نثر سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔

میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی منشیوں میں سب سے ممتاز عہدے پر فائز تھے۔شہرت کے اعتبار سے میر امن اس کالج کا سب سے بڑا نام تھا جن کی تنخواہ چالیس روپئے ماہانہ تھی لیکن افسوس کو سو روپئے ماہانہ ملتے تھے۔شیر علی افسوس کالج میں اپنے ترجمہ ''گلستان سعدی'' کی وجہ سے معروف ومقبول ہیں۔ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے گلکرسٹ نے یہ ترجمہ انہیں دیا تھا۔افسوس نے ''گلستان سعدی'' کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ان کا ترجمہ اپنے زمانے میں اردو کا بہترین نمونہ ہے۔''گلستاں'' میں جا بجا برمحل اشعار کثرت سے ملتے ہیں، لیکن ان کا اردو ترجمہ کرنے پر ان کا حسن باقی نہیں رہتا۔ان میں سے بہت سے ایسے مصرعے ہیں جو خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، ان کا ترجمہ کرنا ان کی اہمیت کو مجروح کرنا تھا لہٰذا افسوس نے انہیں جوں کا توں لکھ دیا ہے۔ان کی زبان میں سلاست اور صفائی ہے اور عربی فارسی الفاظ کے استعمال میں یہ حیدری سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔افسوس نے ''گلستاں'' کی حکایتوں کا ترجمہ کر کے ''باغ اردو'' کے نام سے شائع کیا۔اس ترجمے کا آغاز 1800ء میں ہوا اور 1802ء میں مکمل ہوا۔1803ء میں ہندوستانی مصنفین کی کتب پر انعام کی سفارش ہوئی اور ''باغ اردو'' پر چار سو روپئے کا انعام ملا۔

16.5.3 میر شیر علی افسوس؛

حیدر بخش حیدری کی طرح میر شیر علی افسوس بھی فورٹ ولیم کالج کے بہت ہی مشہور و معروف مصنفین میں سے ہیں۔افسوس کے دادا محمد شاہ کے عہد میں عراق سے ہندوستان آئے اور نواب عمدۃ الملک کے ملازم ہوئے۔افسوس دہلی میں 1735ء میں پیدا ہوئے۔نواب عمدۃ الملک کے انتقال کے بعد افسوس کے والد پٹنہ گئے اور بعد میں اودھ پہنچ کر وہاں کی سرکار میں ملازمت کی اس کے بعد حیدر آباد آ گئے اور یہیں انتقال کیا۔میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج میں تقرر ہونے سے قبل ہی دلی، پٹنہ اور لکھنؤ کی محفلوں میں خوب نام پیدا کر چکے تھے۔انھوں نے میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، جراتؔ اور انشاؔ کا زمانہ دیکھا تھا اور ان کے ساتھ مشاعروں میں بھی شریک تھے۔جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت پیش آئی تو ایک نواب کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔1805ء میں وفات پائی۔

فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کی فرمائش پر انھوں نے فارسی کی دو کتابوں کا ترجمہ کیا۔

1۔ باغ اردو : گلستان سعدی کا ترجمہ ہے۔

2۔ آرائش محفل: منشی سجان نے ہندوستان کی معتبر اور مستند تاریخ خلاصۃ التواریخ کے نام سے فارسی میں لکھی تھی اسی تاریخ کو افسوس نے

اردو میں منتقل کیا۔

''آرائش محفل'' کا ذکر اس سے قبل حید بخش حیدری کے حوالے سے آ چکا ہے۔فورٹ ولیم کالج میں اس نام سے دو کتابیں لکھی گئیں۔دوسری کتاب شیر علی افسوس کی ''آرائش محفل'' (1805ء) ہے جو ہندوستان کی ایک معتبر و مستند تاریخ ''خلاصۃ التواریخ'' کا اردو ترجمہ ہے۔اصل کتاب کے مصنف ''منشی سجان رائے'' پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔آرائش محفل میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کا مفصل حال اور زمانہ قدیم سے لے کر اسلام تک کی جامع اور وسیع تاریخ بیان کی گئی ہے، نیز ہندوستان کے موسم تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کا بیان بھی کیا ہے۔

افسوس ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔انہیں عربی، فارسی، ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں پر بھی کمال حاصل تھا۔''آرائش محفل'' کی زبان بالکل سلیس اور صاف ہے اور مروجہ کتابوں کی طرح اس میں مبالغہ آرائی بھی نہیں ہے۔افسوس نے زبان اردو میں اسے اس طرح لکھا ہے کہ جملوں میں دلکشی کے علاوہ انداز بیان بھی دلکش ہو گیا ہے۔وہ دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ کو اردو میں اس طرح کھپا دیتے ہیں کہ اس پر تالیف کا گمان ہونے لگتا ہے۔صنائع لفظی اور معنوی نے بھی ان کی نثر کی شیرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ہندوستانی پھولوں کا ذکر کرتے ہیں تو میر حسن کی مثنوی سامنے آ جاتی ہے۔یہاں نثر مقفع ہے لیکن روانی اور بے تکلفی میں فرق نہیں۔ایک نمونہ دیکھیں:

16.5.4 مرزا علی لطف؛

مرزا علی نام تھا اور لطف تخلص۔دہلی کے رہنے والے تھے۔دہلی کی بربادی نے دہلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔وہ لکھنو آئے اس کے بعد پٹنہ گئے اور وہاں سے پھر کلکتہ پہنچ گئے۔گلکرسٹ نے ان سے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی۔مرزا علی لطف اپنے مایۂ ناز تذکرہ ''گلشن ہند'' کی وجہ سے مشہور ہیں۔ان کا ذکر ''گلشن بے خار'' اور ''سخن الشعرا'' میں بھی ملتا ہے۔مرزا دہلی میں پیدا ہوئے اور تباہی کے ایک عرصے بعد تک دہلی میں مقیم رہے۔پھر تلاش معاش میں دہلی کو خیر باد کہا اور حیدر آباد کا رخ کیا۔ان کا ارادہ عظیم آباد، سے پٹنہ ہوتے ہوئے دکن آنے کا تھا لیکن حسن اتفاق گلکرسٹ سے ملاقات ہو گئی اور ان کی فرمائش پر 1801ء میں ''تذکرہ گلشن ہند'' ترتیب دیا۔

اس تذکرے کا ماخذ نواب علی ابراہیم کا فارسی تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' ہے۔لطف نے خود لکھا ہے کہ اس کی سنہ تصنیف 1184ء ہے۔جب یہ تذکرہ گلکرسٹ کے سامنے سے گزرا تو خیال آیا کہ اردو شعراء کا یہ تذکرہ اردو میں ترجمہ ہو جائے تو خوب ہو۔لطف نے پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن آسانی کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان فارسی کے بجائے اردو ہے اور لطف نے شعرا کے احوال میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کیا ہے بلکہ تحقیقی نگاہ ڈالی ہے۔لطف نے اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔زبان کی سطح پر یہ تذکرہ بہت کامیاب نہیں ہے۔اس کی زبان مشکل اور پیچیدہ ہے۔عبارت مقفیٰ و مسجع ہے لیکن اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی تھیں جو اس زمانے کے تذکروں میں عام طور پر نہیں ملتیں۔انھوں نے شعرا کے حالات ہی بیان نہیں کیے بلکہ اس دور کے ماحول اور پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔اس میں انداز بیان گنجلک اور تعقید سے پر ہے۔عبارت مسجع و مقفع ہے۔حالانکہ لطف کو حکم ملا تھا کہ اسے سلیس سادہ زبان میں لکھو تاہم انہوں نے فارسی اور عربی الفاظ کو اس لیے شامل کیا کہ انہیں پڑھ کر لوگ سبحان اللہ کہیں گے۔مؤرخین نے ان کی قافیہ پیمائی اور مقفع مسجع عبارت پر اعتراض کیا ہے۔

16.5.5 میر بہادر علی حسینی؛

میر بہادر علی حسینی کالج میں چیف منشی تھے۔1801ء میں کالج میں آئے۔''باغ و بہار'' کے دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میر امن سے پہلے ہی اس کالج میں آئے لیکن ان کا کوئی بھی کارنامہ 1802ء سے پہلے کا نہیں ہے۔گلکرسٹ نے ان کی سفارش پر میر امن کا تقرر کیا۔حسینی اپنے نثری کارناموں کے لیے مشہور ہیں۔پھر بھی یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شاعری بھی کی ہوگی۔اخلاق ہندی میں بعض مقامات پر اشعار درج ہیں جو غالباً ان کے ہی ہوں گے،لیکن وہ اس لائق نہیں کہ ان کو شاعر کی حیثیت سے کوئی مقام دے سکیں،البتہ ان کی چار نثری کتابیں ہیں۔(1)نثر بے نظیر (2)اخلاق ہندی (3)تاریخ آسام (4)رسالہ ڈاکٹر گلکرسٹ۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے بعض کتابوں کے ترجمے میں گلکرسٹ کی مدد کی۔

بہادر علی حسینی کی سب سے پہلی کتاب ''نثر بے نظیر'' اردو کی شہرۂ آفاق مثنوی ''سحرالبیان'' کا نثری خلاصہ ہے۔1802ء میں حسینی نے اسے ترتیب دیا اور 1803ء میں اسے شائع کیا گیا۔حسینی نثر میں اگلے لوگوں سے سبقت نہ لے جا سکے۔ان کی زبان بظاہر سادہ اور سلیس ہوتی ہے لیکن انہیں روزمرہ کے زبان اور محاوروں کا شعور نہیں ہے اس لیے اس میں دلکشی کا پہلو نظر نہیں آتا۔انہیں مقفع و مسجع نثر لکھنے کا بھی شوق تھا لیکن ان کی نثر میں دلکشی اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ان کی دوسری کتاب ''اخلاق ہندی'' ہے۔یہ بہادر علی حسینی کا سب سے زیادہ مشہور کارنامہ ہے۔یہ گلکرسٹ کی فرمائش پر 1802ء میں لکھی گئی۔اس کی اصل کتاب ''ہتو پدیش'' سنسکرت زبان میں لکھی گئی۔فارسی میں اس کے دو ترجمے دستیاب ہیں جن میں ''نگار دانش'' اور ''مفرح القلوب'' کافی مشہور ہیں۔''اخلاق ہندی'' کا ایک طویل حصہ پہلے ہی ڈاکٹر گلکرسٹ کی ''بیاض ہندی'' میں شائع ہو چکا تھا۔جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ حسینی کا طرز بیان بالکل سادہ اور بے لطف ہے۔اس میں کوئی خاص دلکشی نہیں۔وہ مسلسل فقرے لکھتے چلے جاتے ہیں اور قاری ان سے لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ان کی نثر میں نہ تو عربی الفاظ کی کثرت ہے اور نہ ہندی الفاظ کی بھرمار،ان کی نثر سادہ ہے،لیکن اس میں ایک پھکا پن ہے۔اس کے علاوہ زبان میں فرسودگی بھی پائی جاتی ہے۔وہ قواعد پر اچھی گرفت رکھتے ہیں جو ان کی نثر کو مزید بوجھل بنانے کا ایک سبب ہے۔وہ میر امن اور شیر علی افسوس کی طرح نثر کی روح تک نہیں پہنچ پاتے۔

اس کے علاوہ بہادر علی حسینی نے ''تاریخ آسام'' بھی لکھی۔اس کا ماخذ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تصنیف ''تاریخ آسام'' کا اردو ترجمہ ہے۔اس کتاب میں اورنگ زیب عالم گیر کے سپہ سالار میر جملہ کی مہم کی تفصیلی تاریخ ہے۔یہ ترجمہ اب ناپید ہے اس لیے اس کی نثر کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔اس کے علاوہ حسینی نے ''قواعد زبان اردو'' بھی لکھی جو ''رسالہ گلکرسٹ'' کے نام سے مشہور ہے۔یہ دراصل گلکرسٹ کی کتاب ''ہندوستانی کی صرف نحو'' کا خلاصہ ہے۔گلکرسٹ کی کتاب کی ضخامت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تلخیص لکھنے کی فرمائش کی گئی جسے حسینی نے علمی جامہ پہنایا۔

16.5.6 مظہر علی خاں ولاؔ؛

مظہر علی خاں نام اور ولا تخلص تھا۔ممنونؔ، مرزا جان طپشؔ اور مصحفی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔1802ء میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے اور لگ بھگ سات کتابوں کا ترجمہ کیا لیکن چند کتابیں ہی شائع ہوسکیں۔مظہر علی خاں ولا نے مادھونل اور بیتال پچیسی ہفت گلشن اور پند نامہ سعدی شیرازی کا اردو میں ترجمہ کیا،لیکن ان کی شہرت تاریخ شیر شاہی سے ہوئی۔یہ تاریخ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے عباس خاں شیروانی نے لکھی تھی۔ بیتال پچیسی کے ترجمے میں ولاؔ کے ساتھ للو لال اور تارنی چرن متر بھی

شامل تھے۔اصل کتاب سنسکرت سے برج بھاشا میں ترجمہ کی گئی۔اس کتاب میں پچیس کہانیاں ہیں جو ایک بیتال نے بکرماجیت کو سنائی تھیں۔ کتاب میں نصیحتوں کو اس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ناصحانہ انداز قاری کو نہیں کھٹکتا،البتہ کچھ کہانیوں میں ناصحانہ انداز کہانی کی دلکشی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ہندی الفاظ کا کثیر استعمال نثر کو گراں بار بنا دیتا ہے۔اگر ہندی الفاظ میں تناسب کا خیال رکھا جاتا تو کتاب کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔

مظہر علی خاں نے فورٹ ولیم کالج میں درج ذیل کتابوں کا اضافہ کیا ہے:

1۔ مادھونل کام کندلا : یہ کتاب ہندی سے اردو میں نقل کی گئی ہے۔یہ ایک برہمن مادھونل اور ایک رقاصہ کندلا کی داستان عشق ہے۔

2۔ ترجمہ کریما : سعدی شیرازی کے مشہور پند نامہ ''کریما'' کو ولاؔ نے اردو میں منظوم کیا۔

3۔ ہفت گلشن : ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کو اردو میں منتقل کیا۔اس میں تہذیب وا اخلاق کے قاعدے، نصیحت آموز کہانیاں اور حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔

4۔ اخلاق ہندی : اس میں اخلاقی حکایات ملتی ہیں۔

5۔ بیتال پچیسی : یہ ولاؔ کا مشہور کارنامہ ہے۔یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ برج بھاشا میں اس کا ترجمہ ہوا۔ برج بھاشا سے ولا نے اردو میں منتقل کیا۔

6۔ تاریخ شیر شاہی : یہ شیر شاہ سوری کے عہد کی تاریخ ہے۔

7۔ جہانگیر نامہ : تزک جہانگیر کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔

16.5.7 میر کاظم علی جوانؔ:

میر کاظم علی نام اور جوانؔ تخلص تھا۔فورٹ ولیم کالج سے مشہور منشیوں میں تھے۔دہلی کے رہنے والے تھے۔دہلی کی تباہی کے بعد مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔کرنل اسکاٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تالیف وتصنیف سے وابستہ ہوئے۔انہیں اردو، فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں پر قدرت تھی۔ان کی سب سے مشہور کتاب ''شکنتلا'' ہے۔1802ء میں للو لال جی کی مدد سے سنگھاسن بتیسی بھی مرتب کیا۔ان کا اسلوب سادہ اور عبارت میں دلکشی پائی جاتی ہے،لیکن کہیں کہیں بھاشا کے الفاظ کی تعداد زیادہ ہی نہیں بلکہ غیر مانوس اور مشکل الفاظ اردو عبارت میں کھٹکنے لگتے ہیں۔ان کی مشہور کتاب ''شکنتلا'' کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔یہ کہانی مہابھارت کی طرز پر لکھی گئی۔پہلے اس کو کالی داس نے برج بھاشا میں لکھا اور اسی کو سامنے رکھ کر جوان نے اردو نثر کا جامہ پہنایا۔انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۔اس ترجمہ میں اور بھی منشی شامل تھے۔یہ ترجمہ 1804ء میں مکمل ہوا۔اس پر انہیں پانچ سو روپئے انعام کا اعلان ہوا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باقی منشیوں کے مقابلے میں ان کا دخل کتنا زیادہ تھا۔اس کے علاوہ ایک مثنوی ''بارہ ماسہ یادستور ہند'' کے نام سے لکھی جس میں سال کے بارہ مہینوں میں ہندو اور مسلمانوں کے تہواروں کی ساری تفصیل جزئیات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔''تاریخ فرشتہ'' کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ بھی کیا جس میں سلاطین بہمنی کا ذکر ملتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے شعرائے اردو کے کلام کے انتخاب کا کام دوسرے مولفین کے ساتھ انجام دیا اور کئی کتابوں کی ترتیب

واشاعت میں بھی حصہ لیا۔

16.5.8 نہال چند لاہوری؛

نہال چند لاہوری فورٹ ولیم کالج کے ایک مشہور منشی تھے ۔ان کے آباواجداد دہلی کے رہنے والے تھے ۔دہلی کی تباہی کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کی ۔ایک انگریز کپتان کے وسیلے سے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ہاں پہنچے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تالیف وترجمہ میں انہیں ملازم رکھ لیا گیا۔ کالج میں نہال چند لاہوری کا نام ''مذہب عشق'' کی وجہ سے مشہور ہوا۔گل کرسٹ کی فرمائش پر ''تاج الملوک'' کو نثر کا جامہ پہنایا اور تاریخی نام ''مذہب عشق'' رکھا۔اس کا ماخذ عزت اللہ بنگالی کا قصہ تاج الملوک اور گل بکاولی بتایا جاتا ہے۔1803ء میں ترجمہ مکمل ہوا اور 1804ء میں اسے شائع کیا گیا۔اسی قصے کو دیاشنکر نسیم نے نظم میں باندھا۔نہال چند لاہوری نے اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے،تکرار لفظی کو بھی ترک نہیں کیا۔ترجمہ اصل سے قریب ہونے کی وجہ سے سلیس اور رواں نہیں ہے۔تمام کتاب پر فارسی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

16.6 کالج کے دیگر ملازمین

پچھلی سرخی کے تحت ہم نے فورٹ ولیم کالج کے ان مصنفین اور مترجمین کے بارے میں پڑھا جن کے بغیر کالج کی تاریخ ادھوری ہے۔ اُن مشاہیر کی تصنیف وتالیف میں جن اہل قلم نے مدد کی ان کو کالج کے دیگر مصنفین کی فہرست میں رکھا جارہا ہے۔یہاں ہم ان کی خدمات پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

مولوی اکرام علی 1800ء میں کالج سے وابستہ ہوئے ۔ان کی کوئی بھی تخلیق یا ترجمہ سامنے نہیں آسکا۔ان سے محض ایک کتاب ''اخوان الصفا'' منسوب ہے اور اسی سے ان کا نام زندہ ہے۔یہ داستان امیر حمزہ کے بعد سب سے ضخیم کتاب ہے۔اخلاق اور پند و نصائح کے خشک موضوع اور عربی جیسی وسیع زبان سے ترجمہ کرنا مولوی اکرام علی کا ہی کام تھا۔اس ترجمہ میں نہ صرف آزادی سے کام لیا گیا بلکہ اصل کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

للولال جی 1801ء میں کالج میں ملازم ہوئے ۔کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں ولا ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔انہوں نے ساتھ مل کر کئی تراجم بھی کیے۔کاظم علی جوان کے ساتھ مل کر انہوں نے ''شکنتلا'' ناٹک کا ترجمہ کیا،وہ بیتال پچیسی کے ترجمے میں بھی شریک رہے۔''لطائف ہندی'' ان کی مشہور ترین تصنیف ہے۔اس میں دلچسپ قصے کہانیاں، کہاوتیں، لطائف اور امثال وغیرہ شامل ہیں۔یہ کتاب ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع ہوئی۔کتاب کے آخر میں ہندی اور اردو زبانوں کی فرہنگ بھی ہے۔

ان مصنفین اور مترجمین کے علاوہ بنی نرائن جہاں نے تذکرہ ''دیوان جہاں'' اور ایک عشقیہ قصہ ''چار گلشن'' لکھا۔مولوی حفیظ الدین نے ''عیار دانش'' کا ترجمہ ''خرد افروز'' کے نام سے کیا۔اس کا ماخذ عربی کی مشہور کتاب ''کلیلہ و دمنہ'' ہے۔ملا حسین واعظ کاشفی کے بعد ابو الفضل نے اس کی تلخیص کی اور ''خرد افروز'' اسی تلخیص کے نصف حصے کا ترجمہ ہے۔اس کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے اور اس کی شہرت کا باعث ہے۔ہندی و فارسی کا امتزاج بھی نثر کو دلکش بناتا ہے،فصاحت کے ساتھ سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے۔خلیل خاں اشک کا نام ''داستان امیر حمزہ'' کی وجہ سے زندہ رہے گا۔یہ کتاب اگست 1802ء میں شائع ہوئی۔اشک نے لفظی ترجمہ کرتے ہوئے اصل عبارت کو اپنے الفاظ میں سیدھی سادی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ان کے یہاں میر امن کی سادگی ،لطافت اور فصاحت نہیں پائی جاتی لیکن کالج کی نثر کے

معیار کے مطابق یہ غیر معیاری نہیں ہے۔ان کی دوسری تصانیف میں ''قصہ گلزار چین'' یا ''نگار خانہ چین'' بھی شامل ہے۔یہ داستان بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے۔منصور علی بھی فورٹ ولیم کالج کے ملازم میں شامل تھے۔انہوں نے محمد عمر کی مثنوی ''سیف الملوک'' کا ترجمہ نثر میں کیا اور اس کا نام ''بحر عشق'' رکھا۔یہ ترجمہ 1803ء میں مکمل ہوا۔اس میں بول چال کی سادہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

16.7 کالج کا زوال

ہالٹ میکنزی (Halt Mackenzie) وہ پہلا شخص تھا جس نے کالج کے وجود پر سوالیہ نشان لگایا۔1835ء میں جب وہ کالج کونسل کا صدر بنا تو اس نے ممبران کے درمیان پہلی بار یہ شبہ ظاہر کیا کہ کالج اپنے مقاصد کی تکمیل میں کھرا نہیں اتر رہا ہے۔اس نے ویلزلی کے منصوبے پر تنقید کی اور نئے تعلیمی نظام کی پرزور حمایت کی۔

یکم اگست 1828 کو ولیم بنٹک کل اور کالج بند کرنے کے سلسلے میں میکنزی کی حمایت کی،اس کے باوجود ہندی کے پروفیسر کیپٹن پرائس نے 22/مارچ 1830 کو اس کے اس فیصلے کے خلاف لکھا لیکن 4/مئی 1830 کو نئے تعلیمی منصوبہ سرکاری طور پر منظور کر لیا گیا۔یکم مارچ 1831ء کو کالج کی کونسل کر منسوخ کر کے کتابیں ایسیا ٹک سوسائٹی لائبریری کو منتقل کر دی گئیں۔1835ء میں اس نے رائٹرس بلڈنگ کے دروازے پر تالا ڈال کر کالج کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔1854ء میں لارڈ ڈلہوزی کی رپورٹ پر گورنر جنرل نے اس کے خاتمے کا سرکاری حکم جاری کیا۔

16.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ فورٹ ولیم کالج 10/جولائی 1800 کو کلکتہ میں قائم ہوا۔

☆ اس کے قیام کا مقصد نو وارد انگریز عہدے داروں کو ہندوستانی زبان اور یہاں کے طور طریقوں سے روشناس کرنا تھا۔

☆ ہندوستانی عوام پر حکومت کرنے کے لیے یہاں کے باشندوں کے رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت سے واقفیت درکار تھی لہٰذا اس کے لیے داستان اور کہانیاں سب سے بہترین ذریعہ تھیں۔اس ادارہ سے اردو نثر کو بے حد فائدہ پہنچا اور بہت سے فارسی عربی اور دیگر زبانوں کے قصے کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا،جس سے اردو کے ادبی سرمائے میں وسعت پیدا ہوئی۔

☆ اردو نثر میں اس وقت جو کتابیں تھیں ان کی زبان بہت مشکل تھی۔ چند کتابیں جو سادہ نثر میں تھیں وہ مذہبی رسالے تھے،جو مذہب اسلام کے مسائل اور عقائد کی توضیح و تشریح کے لیے لکھے گئے تھے۔اس لیے ڈاکٹر گل کرسٹ نے ملک کے ہر حصے سے ادیبوں کو جمع کر کے کتابوں کو ترجمہ و تالیف کروایا۔

☆ فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین میں میر امن' سید حیدر بخش حیدری' میر شیر علی افسوس' مرزا علی لطف' میر بہادر علی حسینی' مظہر علی خاں ولا' میر کاظم علی جوان اور نہال چند لاہوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

☆ فورٹ ولیم کالج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو سادہ' سلیس اور ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کے قابل بنایا۔اسی کالج کی خدمات کی بدولت ہی غالب نے اردو کو اس قابل بنایا کہ وہ مراسلہ اور مکالمہ میں بھی سلاست اور روانی کو برقرار رکھ سکے۔

16.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مسلط	قبضہ کرنا	تصانیف	تصنیف کی جمع
تالیف	مختلف کتابوں سے مضامین چن کر پیرائے میں ترتیب دینا		
ثقافت	تہذیب، کلچر	تدوین	مرتب کرنا

16.10 نمونہ امتحانی سوالات

16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ فورٹ ولیم کالج میں میرامن نے کون سی دو کتابیں لکھیں؟

2۔ سید حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں کیا خدمات انجام دیں؟

3۔ میر شیر علی افسوس کی تصانیف کے نام لکھیے۔

4۔ نثر بے نظیر کے مصنف کون ہیں؟

5۔ فورٹ ولیم کالج کب قائم کیا گیا؟

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ میرامن اور باغ و بہار کی اردو نثر میں کیا اہمیت ہے؟

3۔ سید حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس نے اردو ادب کی کیا خدمات انجام دیں؟

4۔ میر بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر گل کرسٹ کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

2۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ جان گلکرسٹ کی اردو خدمات کا جائزہ لیجیے۔

16.15 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات : ڈاکٹر عبیدہ بیگم

2۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد : ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی

3۔ میرامن سے عبدالحق تک : ڈاکٹر سید عبداللہ

اکائی 17: قدیم دہلی کالج

اکائی کے اجزا

17.0 تمہید
17.1 مقاصد
17.2 کالج کا قیام
17.2.1 اردو ذریعہ تعلیم
17.2.2 شعبہ جات
17.2.3 کالج کے پرنسپل
17.2.3.1 مسٹر جوزف ہنری ٹیلر
17.2.3.2 مسٹر فلیکس بترو
17.2.3.3 ڈاکٹر الواس اشپرنگر
17.2.4 کالج کے اساتذہ
17.2.4.1 مولوی مملوک علی نانوتوی
17.2.4.2 امام بخش صہبائی
17.2.4.3 ماسٹر رام چندر
17.2.4.4 منشی ذکاء اللہ
17.2.4.5 مولوی سبحان بخش
17.2.4.6 مولوی ضیاء الدین
17.2.5 کالج کے نمایاں طلبا
17.2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد
17.2.5.2 مولوی محمد حسین آزاد
17.2.5.3 پنڈت موتی لال بسمل
17.2.5.4 مولوی قاسم نانوتوی
17.2.5.5 مولوی کریم الدین پانی پتی

17.2.6 ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی
17.2.6.1 ترجمہ شدہ کتابیں
17.3 اکتسابی نتائج
17.4 کلیدی الفاظ
17.5 نمونہ امتحانی سوالات
17.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
17.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
17.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
17.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

17.0 تمہید

ہندوستان میں مغربی قوموں بالخصوص انگریزوں کی آمد کے بعد تین اہم تعلیمی اداروں فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ان میں تاریخی اعتبار سے فورٹ سینٹ جارج کالج پہلا جب کہ دہلی کالج آخری ہے۔ ان کے مقاصد، خدمات اور اثرات جداگانہ ہیں۔ ہم اردو والے سب سے زیادہ فورٹ ولیم کالج سے واقف ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں اول یہ کہ اس کالج پر نسبتاً زیادہ لکھا گیا دوم یہ کہ اس کالج کی خدمات کا بیشتر حصہ داستانوی ادب پر مشتمل ہے۔ حالانکہ سائنسی علوم افادیت پسندی، معاشی فلاح، سماجی اصلاح، اور فکری تنوع کے اعتبار سے دہلی کالج کا مقام بڑھا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا مقصد نووارد انگریز افسران کو ہندوستانی زبان سے روشناس کرانا جبکہ سینٹ جارج کالج کا مقصد ججوں، منشیوں اور وکیلوں کو تربیت دینا تھا مگر دہلی کالج صرف اور صرف ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا اردو ذریعہ تعلیم کا ادارہ تھا۔ چنانچہ اس اکائی میں آپ کو دہلی کالج کی اس شاندار خدمات سے واقف کرایا جائے گا جو زبان وادب کے علاوہ اردو میں دیگر علوم کے فروغ کے لیے ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

17.1 مقاصد

اردو زبان وادب کی تاریخ میں یہ تینوں ادارے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اس زبان وادب کے فروغ میں ان اداروں کا نمایاں کردار رہا ہے۔ جہاں تک دہلی کالج کی بات ہے یہاں ہندوستانی طلباء باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے تھے جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھی جبکہ ہر درجہ (Class) کا مکمل نصاب بھی تھا نیز مشرقی اور مغربی علوم کے شعبے مساوی طور پر قائم تھے۔ یوروپین پرنسپل، ہندوستانی اساتذہ اور ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے مل کر قلیل مدت میں ایک تاریخ رقم کر دی۔ لہٰذا اس اکائی کے مقاصد میں یہی بنیادی باتیں شامل ہیں جنہیں ہم اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔

17.2 کالج کا قیام

نوآبادیاتی نظریات کی حامل یوروپی استعماری طاقتوں نے صدیوں قبل مشرق اور مشرق بعید کے ممالک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ

سب کچھ تجارت کی آڑ میں ان کی کمپنیوں نے کیا۔ بالآخر جس کمپنی کے ہاتھ جو ملک آیا وہ کمپنی کی نو آبادیات یا دوسرے لفظوں میں غلام بن گیا ۔چنانچہ بڑے تصادم کے بعد ہندوستان، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصے میں آ گیا جس نے تجارت کے ساتھ ساتھ اقتدار کے لیے بھی راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا۔1757ء سے 1857ء کے درمیانی سو سالوں میں وہ یہ کام منظّم انداز اور شاطرانہ چالوں سے کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کمپنی ہر محاذ پر کامیاب ہوتی چلی گئی۔اس کے کیا اسباب تھے وہ آپ تاریخ میں پڑھیں گے البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ ہر ملک اور ہر عہد کا سیاسی نظام کے ساتھ ایک تعلیمی نظام بھی ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان میں بھی صدیوں سے ایک تعلیمی نظام رائج تھا۔ یہ تعلیم مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں دی جاتی تھی ۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی سیاست میں دخل اندازی شروع کر دی تو تعلیمی نظام سے وہ کیسے غافل رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ صدیوں سے مروج طرز تعلیم اور تعلیم گاہوں کو کچھ عرصہ تک اس نے برداشت کیا۔ کیونکہ کمپنی میں اس تعلیم کی ہمنوائی کرنے والوں کی ایک معتد بہ تعداد موجود تھی۔ بالآخر لارڈ میکالے کے انتہائی سخت موقف نے یوروپی طرز کی جدید تعلیم کے لیے راہ ہموار کر دیا۔

1813ء کے چارٹر ایکٹ میں کمپنی نے تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپیہ مختص کیے تھے مگر دس برسوں تک اسے خرچ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ آگے چل کر 1823ء میں دس افراد پر مشتمل ایک ''جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن'' تشکیل دے کر اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اس رقم کو تعلیم کے مد پر خرچ کرے۔کمیٹی نے سب سے پہلے ہندوستان کے مدارس کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک سرکلر جاری کیا۔مسٹر جے ایچ ٹیلر کو دہلی کے لیے منتخب کیا جنہوں نے بڑی سرگرمی سے دہلی کے مشرقی اداروں یعنی مدارس کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کی۔ منجملہ دیگر امور کے مسٹر ٹیلر نے مدرسوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کالج کے قیام کی تجویز کمیٹی کے سامنے رکھیں جس پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ظاہر ہے کالج کے لیے عمارت کا ہونا ضروری ہے جس کی تعمیر کے لئے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی ۔اس مسئلہ کا حل بھی تلاش کر لیا گیا یعنی مدرسہ غازی الدین حیدر کی پرشکوہ عمارت کو کمیٹی نے حاصل کر لیا اور 1825ء میں اس مدرسہ کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔

17.2.1 اردو ذریعہ تعلیم ؛

1835ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے بعد پورے ہندوستان میں ذریعہ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو لازمی قرار دے دیا گیا مگر دہلی کالج کی یہ خصوصیت تھی کہ ذریعہ تعلیم اردو تھا یعنی تمام علوم جو داخلِ نصاب تھے وہ اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ یہ ایک مشکل مگر کامیاب تجربہ تھا جسے ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ترجمہ کے ذریعے حل کر لیا گیا۔

دہلی کالج میں اردو کو ذریعۂ تعلیم رکھنے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طلبا محنت اور شوق سے سائنسی اور سماجی علوم پڑھتے تھے۔ نیز طلبا میں ذہنی بیداری، ملکی اور غیر ملکی حالات سے آگاہی میں اضافہ ہوا۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ پورے ملک میں جب تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو نافذ کر دیا گیا تو دہلی کالج ہی وہ ادارہ تھا جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی جس کی تعریف 1853 کی جنرل کمیٹی تعلیم عامہ کی رپورٹ میں یوں درج ہے۔

''اردو کے ذریعہ سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی مسٹر مواٹ نے بہت تعریف کی ہے۔ ہز آنر ایسی تعلیم کی جو اس ذریعے سے دی جاتی ہے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی بہت قدر کرتے ہیں۔''

اسی سال (1853) ناظم تعلیمات بنگال نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''ایک مدت سے دہلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آ رہی ہے جو اسے بالائی اور زیریں صوبہ جات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اور یہ خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم وبیش تاریخ اور اخلاق وفلسفہ کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بترو نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اشپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جز تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دے دیا جائے۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کالج تجربہ اور نتائج کے اعتبار سے مقبول ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ طلباء کے تقررات بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے جو اس بات کا غماز ہے کہ کالج کا معیار بلند تھا یقیناً اسے لائق اور فائق اساتذہ کی خدمات بھی حاصل رہی ہیں۔ دہلی کالج کے خطوط ہی چل کر سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور جامعہ عثمانیہ کا دارالترجمہ نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

17.2.2 شعبۂ جات؛

1825 میں دہلی کالج مدرسہ غازی الدین حیدر کی عمارت میں قائم کیا گیا جو مشرقی علوم کی درس گاہ تھی اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں البتہ مسٹر ٹیلر کی رپورٹ کے مطابق 1824ء میں نو طالب علم اور ایک استاد مولوی عبداللہ تھے۔ جب دہلی کالج وجود میں آ گیا تو مشرقی شعبہ کو برقرار رکھتے ہوئے 1828ء انگریزی شعبہ کو عمل میں لایا گیا۔

مشرقی شعبہ میں فارسی اور عربی کے درجات تھے جس میں دونوں زبانوں کی قواعد، صرف ونحو، نثر ونظم، حدیث، فقہ، ریاضی و تاریخ، منطق و فلسفہ، جغرافیہ وسائنس اور قانون سیاست وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جبکہ شعبۂ انگریزی میں حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، عربی و فارسی زبان وادب کو چھوڑ کر وہ تمام مضامین پڑھائے جاتے تھے جو مشرقی صوبہ میں زیر نصاب تھے البتہ اضافی طور پر انگریزی زبان و ادب شامل نصاب تھا۔

آغاز میں تمام طلباء کو وظائف دیے جاتے تھے 1831 میں ایک رپورٹ پیش کی گئی جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دہلی کا کوئی باشندہ تعلیم کی اجرت دینے پر آمادہ نہیں ہوگا خواہ وہ انگریزی شعبہ میں پڑھتا ہوں یا مشرقی شعبہ میں۔ چنانچہ کئی سال تک طلباء سے فیس نہیں لی گئی آگے چل کر انگریزی شعبہ کے طلباء سے فیس لینے کی ابتدا ہوئی، جس کا اطلاق رفتہ رفتہ مشرقی شعبوں پر بھی کیا گیا۔ تعلیمی رپورٹ اور طلبا کی لیاقت کا سال بہ سال جائزہ لینے کے بعد کالج کی انتظامیہ نے ایک بڑا قدم یہ اٹھایا کی دونوں شعبوں کے نصاب تعلیم کو یکساں کر دیا جائے اس کے بعد 1844ء میں مشرقی اور انگریزی شعبوں کو ضم بھی کر دیا گیا۔

17.2.3.0 کالج کے پرنسپل؛

کالج قائم کیا گیا تو انتظامی امور کی نگرانی کے لیے ایک مجلس مقامی (Local Comittee) کی تشکیل عمل میں آئی۔ مزید برآں کالج کی سالانہ رپورٹ صوابدید اور منظوری کے لیے صدر مجلس تعلیمات عامہ (General Comittee of public Instruction) کو بھیجی جاتی تھی جو کہ احاطۂ بنگال کی درسگاہوں کی نگراں تھی۔ اس وقت دہلی بھی احاطہ بنگال کا حصہ تھا مگر 1843ء میں دہلی کے تعلیمی اداروں

کی نگرانی مغربی وشمالی صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ نصاب کی جزوی تبدیلی بھی لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری کے بغیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ بہرحال کالج کی اصل کمیٹی یعنی مجلس مقامی نے تجویز پیش کی کہ کالج کا ایک پرنسپل مقرر کیا جائے جو اپنا بیشتر وقت کالج کے فرائض انجام دینے میں صرف کرے ساتھ ہی مجلس مقامی کے سکریٹری کی خدمات بھی انجام دے۔مجلس مقامی کے پہلے سکریٹری مسٹر جوزف ہنری ٹیلر تھے لہذا کالج کا پہلا پرنسپل انھیں کو بنایا گیا۔

17.2.3.1 مسٹر جوزف ہنری ٹیلر؛

1836ء مسٹر جوزف ہنری ٹیلر کو کالج کا پہلا پرنسپل بنایا گیا۔ 1841ء تک وہ اس عہدہ پر برقرار رہے۔ دوسری معیاد کے لیے 1843ء سے 1850ء کے درمیانی عرصہ میں تین سال تک پرنسپل رہے۔ پھر تیسری مرتبہ 1854ء سے 1857ء میں اپنی وفات تک وہ پرنسپل رہے۔ 1857ء کے قیامت خیز ہنگامہ کی زد میں مسٹر ٹیلر بھی آ گئے اور انھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

1824ء سے 1857ء تک مسٹر ٹیلر کا دہلی کالج سے کسی نہ کسی طرح تعلق رہا۔اس طرح 33 برس لگاتار انہوں نے دہلی کالج کی خدمت کی۔ مرزا اسداللہ خان غالبؔ کو انہوں نے دہلی کالج میں بحثیت استاد تقرر کرنا چاہا مگر مرزا نوشہ کب نوکر(سرکاری ملازم) بننا چاہتے۔ مسٹر ٹیلر نے بغیر کسی مخالفت کے بہت سی اصلاحات کیں اور کالج کو ترقی کے درجے تک پہنچایا۔منشی ذکاء اللہ کے سوانح نگار سی۔ایف۔اینڈریوز (C.F. Andrews) کا کہنا ہے کی کالج کے اساتذہ اور طلبا مسٹر ٹیلر سے بہت متاثر تھے دراصل وہ طلبا پر بڑی شفقت کرتے اور انھیں اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ان کا یہ رویہ ہی تھا کہ کالج سے تاریخ ساز شخصیتوں نے جنم لیا۔

17.2.3.2 مسٹر فلیکس بترو؛

مسٹر فلیکس بترو نے 1841ء میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ وہ کم عمری میں اپنے وطن فرانس سے ہندوستان آ گئے تھے اس لئے اردو زبان پر دسترس حاصل کرلی۔ان کی بڑی خواہش تھی کہ مشرقی شعبے میں مغربی علوم کی ترویج ہونی چاہیے۔ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن تھا جب مغربی علوم کو مشرقی زبانوں میں ترجمے کے ذریعے منتقل کیا جائے۔ چنانچہ ورنا ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اس سوسائٹی کی ترقی اور کتابوں کے ترجمے کے لئے مسٹر بترو نے جس مستعدی اور خلوص کا مظاہرہ کیا وہ تاریخِ ادب کا ایک حصہ ہے۔مشرقی شعبے کو انہوں نے انگریزی شعبے کے برابر لا کر کھڑا کیا۔

مشہور فرانسیسی اسکالر گارساں دتاسی کا کہنا ہے کہ مسٹر بترو نے فارسی کے بجائے ہندوستانی (اردو) کو رواج دینے کے لئے راستہ ہموار کیا۔ نیز ہندوستانیوں کو نثر لکھنے کا شوق دلایا ورنہ عام طور پر یہ دستور تھا کہ صرف شعروشاعری سے شغف اور اسی کا چرچا تھا۔

مسٹر فلیکس بترو دہلی کالج کے پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کمیشن کے سکریٹری بھی تھے۔جس کے پیش نظر یہ کام تھا کہ طلبا کی ضرورتوں اور معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا نصاب تیار کیا جائے کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے ورنہ اس وقت تک اعلیٰ تعلیم عربی، فارسی اور سنسکرت کی وساطت سے دی جاتی تھی۔اس کمیشن نے تیس اعلیٰ پائے کی کتابیں مختلف موضوعات پر تیار کرائیں۔مسٹر فلیکس بترو نے خود تین کتابیں تحریر کیں جو قانون، مالیات اور حقوق سے متعلق ہیں۔1845ء میں صحت خراب ہونے کے بنا پر وہ اپنے وطن فرانس لوٹ گئے۔

17.2.3.3 ڈاکٹر الواس اشپرنگر؛

1845ء میں ڈاکٹر اشپرنگر دہلی کالج کے پرنسپل بن کر آئے۔اس سے قبل وہ بنگال ملٹری سروس میں اسسٹنٹ سرجن تھے 1847 میں نوابان اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کے لیے انہیں بھیجا گیا۔1850ء میں واپسی پر انھیں کالج کا دوبارہ پرنسپل مقرر کیا گیا۔

ڈاکٹر الواس اشپرنگر جس وقت دہلی کالج کے پرنسپل بنائے گئے اس وقت دہلی کالج کی نوعیت پرانے مدرسوں اور نئے کالجوں دونوں سے جداتھی ۔پرنسپل یوروپین ہوتا تھا جومشرقی علوم اوراس کے اصولوں سے ناواقف ہوتا تھا اس کے برعکس اکثر اساتذہ ہندوستانی تھے جومغربی خیالات اورطرز فکر سے اتفاق نہیں رکھتے تھے ان حالات میں ڈاکٹر اشپرنگر کا کالج پہنچنا اس کے حق میں بے انتہا مفید ثابت ہوا کیونکہ اشپرنگر مشرقی اور اسلامی علوم نیز عربی واردوزبانوں کے زبردست اسکالر تھے۔دہلی کالج کوایسے ہی شخص کی ضرورت تھی پرنسپل کا عہدہ سنبھالتے ہی اشپرنگر نے کالج کے نصاب میں اصلاح واضافہ کا کام انجام دیا۔جوکتابیں بہت ضروری اور نایاب تھیں ان کومہیا کرایا اور بعض کا ترجمہ اردو میں کرایا۔طرزتعلیم میں ایسی تدبیریں اختیارکیں جن سے پرانا ڈھانچہ بدل گیا۔فارسی جماعتوں کے ناقص ہونے کی بہت شکایت تھی اشپرنگر نے اس کا سبب دریافت کرلیا کہ انشاپردازی اوراسلوب نگارش میں متقدمین کی پیروی کی جارہی ہے۔چنانچہ مطالب کی ادائیگی میں سادگی پرانہوں نے زوردیا۔

ڈاکٹر اشپرنگر نے ایک باتصویر رسالہ کی بنیادرکھی جس کا نام ''قران السعدین'' تھا۔اس رسالہ کا مقصدمشرق ومغرب کے فاصلوں اور غلط فہمیوں کودورکرنا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی ۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ ایک دہے کے اندراس طرح کے بارہ سے زائدرسالے شائع ہونے لگے۔ڈاکٹر اشپرنگر کی ایک اہم تصنیف لائف آف محمدﷺ ہے ۔یہ کتاب کسی بھی یوروپین مصنف کے ذریعہ اب تک لکھی گئی سیرت کی کتابوں میں ممتاز درجہ رکھتی ہے کیونکہ ڈاکٹر اشپرنگر نے بنیادی آ ماخذ کا براہ راست مطالعہ کیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تنگ نظری اور لغزشیں نہیں پائی جاتیں۔ڈاکٹر اشپرنگر کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ شاہانِ اودھ کے کتب خانہ کی زمرہ سازی(Cataloguing)انھوں نے تیارکیا۔تقریباً دس ہزارمخطوطات کا مطالعہ کرکے ہرکتاب اوراس کے مصنف کامختصر حال لکھا۔ یہ کام انھوں نے لارڈ ہارڈنگ کی ایما پر 1847ء میں شروع کیا جس میں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔

ڈاکٹر اشپرنگر 1857ء میں سبکدوش ہوکراپنے وطن جرمنی لوٹ گئے اوراپنے ساتھ مشرقی کتابوں کا ایک بڑاذخیرہ جمع کرکے لے گئے جوآج بھی ''اشپرنگری ذخیرۂ مشرقیات'' کے نام سے برلن کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

17.2.4 کالج کے اساتذہ؛

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے دہلی کالج ایک ایسا ادارہ تھا جہاں باضابطہ تعلیمی نصاب تھا مشرقی اور جدیدعلوم کے شعبے تھے۔ ذریعۂ تعلیم اردوتھا اس لیے جدیدعلوم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے ترجمہ کی سوسائٹی بھی تھی ۔ان تمام امور کے پیش نظر یہاں انتہائی قابل اساتذہ کا تقررعمل میں آتا تھا۔جومختلف علوم وفنون پرکامل دسترس رکھتے تھے ساتھ ہی یہ اساتذہ ذولسان اورکثیراللسان بھی ہوتے تھے۔دہلی کالج کے ایسے چندقابل اساتذہ کا ہم یہاں تعارف کرائیں گے۔

17.2.4.1 مولوی مملوک علی نانوتوی؛

مولوی مملوک علی نانوتوی مشرقی شعبہ کے صدر تھے۔عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی حدیث، فقہ،علم ہندسہ اور

اقلیدس کے عالم تھے۔مولانا رشید الدین خان اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وغیرہ سے دہلی میں تعلیم حاصل کی،مملوک علی نانوتوی کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی،مولانا کی بے پناہ علمی استعداد اور تدریسی صلاحیت پر سب کا اتفاق ہے۔سرسید مرحوم نے ''آثار الصنادید'' میں ان کا ذکر بڑی عظمت سے کیا ہے۔مولوی کریم الدین پانی پتی طبقات شعرائے ہند میں رقم طراز ہیں:۔

''فارسی،اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے ہیں اور جس کام پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہو۔''

(تذکرۂ طبقات شعرائے ہند،مطبع العلوم مدرسہ دہلی،1848،ص463)

دہلی کالج میں رہتے ہوئے مولوی مملوک علی نانوتوی انگریز دشمنی کی ترجمانی کر رہے تھے۔جس کا سرا شاہ ولی اللہ سے جا کر ملتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' میں انگریز دشمنی کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔اسی مقصد کے تحت انھوں نے مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے طلباء کی تربیت کی اور تحریک ولی اللہی کی فکری قیادت سنبھالنے کے قابل بنا دیا۔ جنھوں نے 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحریک دیوبند کا منبع بھی دہلی کالج ہی ہے۔

17.2.4.2 امام بخش صہبائی؛

امام بخش صہبائی فارسی کے صدر مدرس تھے ان کے علم وفضل کی تعریف متعدد حضرات نے کی ہے۔گارساں دتاسی کا کہنا ہے کہ یہ قابل مصنف دہلی میں سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کیے جاتے ہیں۔امام بخش صہبائی کے مفتی صدر الدین آزردہ،شیفتہ اور غالب سے گہرے مراسم تھے۔صہبائی تدریس کے ساتھ تصنیف کا کام بھی انجام دیتے رہے،''ترجمہ حدائق البلاغت''''اردو صرف ونحو'' اور''شعرائے اردو کا تذکرہ'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

بے چارے امام بخش صہبائی کا انجام بڑا دردناک ہوا۔1857ء کی قیامت خیز بلا میں بلا قصور انگریزوں نے انھیں گولیوں کا نشانہ بنایا اور شہید کر دیا۔منشی صدر الدین آزردہ ان کی شہادت کی خبر سن کر تڑپ گئے اور کہا:۔

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

17.2.4.3 ماسٹر رام چندر؛

دہلی کالج کی ایک مشہور ومعروف شخصیت ماسٹر رام چندر کی تھی جو اسی کالج کے طالب علم رہے بعد میں بحیثیت استاد اور مترجم ان کا تقرر ہوا۔دوران تعلیم ہی ماسٹر رام چندر مضامین لکھتے رہے۔ریاضی میں آپ کو خاص دلچسپی تھی اس لیے ان کی سترہ(17) کتابوں میں بیشتر ریاضی سے متعلق ہیں۔ان کی کتاب ''رسالہ مسائل کلیات و جزئیات''(A Treatise on the Problems of Maxima and minima)اتنی مقبول ہوئی کہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر آگسٹن ڈی مارگٹن نے اپنے مقدمے کے ساتھ اسے شائع کیا اور انعام سے بھی نوازا گیا۔

ماسٹر رام چندر ریاضی کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور صحافی بھی تھے۔ اپنے رسالہ ''خیر خواہ ہند'' (بعد میں اس کا نام محبّ ہند ہو گیا) کے ذریعہ اردو تنقید کی وہ بنیاد رکھ چکے تھے۔ اردو شاعری پر انھوں نے جو صحت مند تنقید کی ہے ممکن ہے ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھنے سے قبل الطاف حسین حالی کی اس سے واقفیت رہی ہو۔

17.2.4.4 منشی ذکاءاللہ؛

ماسٹر رام چندر کی طرح منشی ذکاءاللہ بھی دہلی کالج کے طالب علم تھے۔ ریاضی، طبیعات، تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کی خدمات کے پیش نظر برطانوی حکومت نے انھیں پندرہ (1500) سو روپیہ کا انعام اور خان بہادر و شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ بلا کے ذہین تھے۔ مختلف علوم فنون پر انھوں نے ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں لکھیں جن میں صرف ریاضی (Mathemetics) پر ان کی ستاسی (87) کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے سیکڑوں مضامین شائع ہوئے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ باون ہزار صفحات انھوں نے سیاہ کیے ہیں۔

منشی ذکاءاللہ کی تصانیف معلومات کا خزانہ ہے۔ لیکن جہاں تک طرز تحریر کا سوال ہے وہ کسی قدر پھیکا ہے۔ شگفتگی اور دلکشی نہیں پائی جاتی۔ مگر اس کی امید بھی نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ ریاضی، سائنس اور تاریخی موضوعات میں اس کی گنجائش کم ہی رہتی ہے۔ پھر بھی طرز نگارش سلیس، رواں اور بے تکلف ہے۔ مشکل سے مشکل بات کو چند الفاظ میں سلجھا دیتے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مختلف علوم و فنون اور موضوعات کی کتابیں اردو میں لکھ کر یا ترجمہ کر کے جدید علوم کی تحصیل کے لیے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے قابل بنایا۔ ان کی مشہور کتابوں میں سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ، آئین قیصری، اقبال نامۂ اکبری، تاریخ ہندوستان اور رسالہ مجالس مناظرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منشی ذکاءاللہ کے جگری دوست سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے انگریزی میں ان کی سوانح عمری ''Zakaullah of Delhi'' نام سے تحریر کی جس میں موصوف کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

17.2.4.5 مولوی سبحان بخش؛

مولوی سبحان بخش دہلی کالج میں عربی اور فارسی کے ایک کامیاب مدرس تھے۔ انھوں نے ترجمہ کا کام بھی کیا ہے۔ ''تزک تیموری''، ''تاریخ ابن خلکان'' اور ''تذکرہ مفسرین'' کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی سب سے اہم کتاب ''محاورات ہند'' ہے۔

محاورات ہند کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ محاورات کی طرف ابھی تک کسی کا خیال نہیں ہوا۔ اس لیے جمع نہیں کیا گیا اور نہ یہ لکھا گیا کہ لفظ کیا معنی دیتے ہیں اور قائل کی مراد کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''مجھ کو یہاں کے رواج کے مطابق اور استعمال کے مطابق جتنے (محاورات) میسر ہوئے وہ بہ ترتیب حروف تہجی جمع کر دیے ہیں ور جن میں فحش تھا وہ ترک کر دیے اور واضح ہو کہ ان محاورات میں زبان کے لہجہ کو بہت دخل ہے اور ایک لفظ لہجہ بدلنے سے اور معنی دیتا ہے اور سامع اس کو خوب سمجھتا ہے لیکن مجبوری ہے کہ لہجہ لکھنے میں بالکل نہیں آتا۔''

محاورات ہند کو 1913ء میں مطبع مجتبائی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

17.2.4.6 مولوی ضیاء الدین؛

مولوی ضیاء الدین کا بھی ماسٹر رام چندر اور منشی ذکاء اللہ کی طرح دہلی کالج کے طلبا میں شمار ہوتا ہے۔ جن کا تقرر اسی کالج میں ہوا۔ شعبہ عربی کے ممتاز طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ چناچہ 1864ء میں وہ عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں شمس العماء کا خطاب ملا۔ البتہ انھوں نے کوئی قابل قدر تصنیف نہیں چھوڑی۔ تدریس سے ہی شغف تھا۔

مولوی ضیاء الدین کا انجام بھی امام بخش صہبائی کی مانند دردناک ہوا۔ انقلاب 1857ء کو کچلنے کے بعد جب انگریز دہلی میں داخل ہوئے تو وہ اپنے مکان میں موجود تھے۔ قضا آ گئی اور مولوی ضیاء الدین بھی گولی کا نشانہ بن کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

17.2.5.0 کالج کے نمایاں طلبا؛

قدیم دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبا میدان عمل میں اول درجہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالج کے طلبا کا تقرر ملک کے مختلف حصوں میں ہوتا تھا۔ جہاں بھی یہ طلبا جاتے عوام وخواص ان کا پرجوش خیر مقدم کرتے ان کا حوصلہ بڑھاتے۔ انگریز عملداری کے کالجوں میں بحیثیت استاد نیز نوابوں اور راجاؤں کے اتالیق حیثیت سے تقرر حاصل کرتے۔ دفتروں میں ملازم اور مترجم بھی بن کر جاتے۔ ہم عصر اخباروں میں ان حضرات کی مصروفیتوں اور کارناموں کی خبریں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ بہر حال کچھ طلبا کا یہاں ذکر کرنا مناسب ہے جن کی خدمات نمایاں ہے۔

17.2.5.1 ڈپٹی نذیر احمد؛

ڈپٹی نذیر احمد کے دہلی کالج میں داخلہ کی کہانی مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' میں تفصیلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد نذیر احمد اول پنجاب میں مدرس رہے پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور پہنچے۔ آخر میں حیدرآباد کے نظام سالار جنگ اول نے افسر بندوبست مقرر کیا نیز محکمۂ مال کے ممبر بھی بنایے گئے مگر وقت سے پہلے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے دہلی کے علمی ماحول سے خوب خوب استفادہ کیا۔ وہ مشرقی علوم کے ماہر اور مفسر قران کے علاوہ اردو ادب کے پہلے ناول نگار بھی ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کے مسائل، ان کی تعلیم، مسلم گھرانے کی اصلاح اور سماجی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، فسانہ مبتلا، ایامٰی اور رویائے صادقہ وغیرہ اسی موضوع پر لکھے گئے ناول ہیں۔ نذیر احمد کا ایک اہم ناول ابن الوقت ہے۔ جس میں انھوں نے اس وقت کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد مذہبی آدمی تھے۔ اس لیے ناولوں میں انھوں نے معاشرتی برائیوں کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم و تربیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا انداز خطیبانہ ہے مگر اردو میں مقصدی ادب کا نمونہ انھوں نے پیش کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا پلاٹ سادہ ہے۔ ان میں نہ کوئی جدت ہے نہ دلکشی لیکن مکالمے کے وہ بادشاہ ضرور ہیں۔ عورتوں کے لب و لہجے۔ انداز گفتگو اور روزمرہ پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ عام طور پر بیان میں روانی، جوش، شگفتگی، بے ساختگی غرض سبھی کچھ موجود ہے، لیکن اسلوب ناہموار ہے۔ اگر ایک جگہ عربی کے ثقیل الفاظ ومحاورات اور اشعار، آیات و حدیث لکھتے ہیں تو دوسری جگہ ٹھیٹھ ہندی کے سادہ اور سلیس الفاظ سے کام لیتے ہیں بہر حال نذیر احمد دہلی کالج کی ایک عہد آور شخصیت تھی جنھوں نے اردو ادب کو نہ صرف مالامال کیا بلکہ ایک صنف ادب کا آغاز بھی انھیں کے ہاتھوں ہوا۔

17.2.5.2 مولوی محمد حسین آزاد؛

مولوی محمد حسین آزاد مولوی محمد باقر کے فرزند اور دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد وہ اپنے والد کے اخبار ''دہلی اردو اخبار'' سے منسلک ہو گئے۔انقلاب 1857ء کے دوران انھوں اس اخبار کو حریت پسندوں کا آرگن بنا دیا۔انقلاب کو دبانے کے بعد مولوی محمد باقر کو بلا قصور انگریزوں نے شہید کر دیا تو یہ بمشکل جان بچا کر لاہور پہنچے۔ پنڈت منپھول کی کوششوں سے سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔حکومت نے ان سے ''قصص ہند'' اور بچوں کے لیے'' ریڈرس'' لکھوائیں۔''آب حیات'' سے مولوی محمد حسین آزاد کو زیادہ شہرت ملی جس میں ان کا تجر علمی اور اسلوب کی شوخی صاف دکھائی دیتی ہے گرچہ یہ موجودہ تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتی پھر بھی اس کی بنیادی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔آزاد کی دیگر تصانیف میں ''نیرنگ خیال''،''سخن دان فارس''،''دربار اکبری''،''قند پارسی''،''نگارستان فارس'' اور ''جانورستان''وغیرہ مشہور ہیں۔نیرنگ خیال مضمون اور طرز تحریر دونوں لحاظ سے بہت دلچسپ ہے سخن دان فارس کے ذریعہ آزاد نے اردو والوں کو علم السنہ سے متعارف کرایا اور دربار اکبری کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لارڈ میکالے کی کتاب تاریخ انگلستان کے تتبع میں لکھی گئی۔

مولوی محمد حسین آزاد کی ادبی و علمی زندگی کا سب سے روشن اور نمایاں پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب انھوں نے ڈاکٹر لائٹز کے ساتھ مل کر مئی 1874ء میں انھوں نے انجمن پنجاب لاہور کی بنیاد رکھی اور جدید شاعری کا آغاز کیا انھوں نے اردو ادب کو ایک نئی فکر اور جدید ذہن عطا کیا۔غزل کے بجائے نظم کی اہمیت پر زور دیا۔چنانچہ 8 مئی 1847ء کو آزاد نے ایک مدلل اور تاریخی تقریر کی جسے تحریک انجمن پنجاب لاہور کا منشور قرار دیا جا سکتا ہے۔اس موقع پر انھوں نے وہ تمام بنیادی مقاصد واضح طور پر بیان کر دیے جو آزاد کا مطمح نظر تھے۔آزاد کا کہنا ہے کہ سادہ جذبات کو اصلی رنگ میں پیش کرنے کے لیے بھاشا کا استعمال ضروری ہے۔چنانچہ بدیسی زبانوں کے بے محابہ استعمال نے اردو کو نقصان پہنچایا ہے یہی وجہ ہے کہ آزاد نے برج بھاشا کو اردو کی ماں قرار دیا۔ ہر چند کہ یہ نظریہ اب قابل قبول نہیں رہا تاہم آزاد کے اس بنیادی موقف کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا کہ اردو اسی سرزمین کی بولی ہے۔مولوی محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کے اس جلسے کے اختتام پر اپنی مشہور نظم ''مثنوی شب قدر'' پڑھ کر سنائی۔ بہر حال اردو کے عناصر خمسہ میں سے ایک مولوی محمد حسین آزاد کا اردو زبان وادب میں بڑا مقام ہے۔

17.2.5.3 پنڈت موتی لال بسمل؛

پنڈت موتی لال بسمل کا دہلی کالج کے ممتاز طلبا میں شمار ہوتا تھا۔تعلیم سے فراغت کے بعد ''قران السعدین'' کے اڈیٹر رہے۔ بعد میں ''بورڈ آف ایڈمینسٹریشن'' لاہور کے فارسی مترجم اس کے بعد اکسٹرا جوڈیشنل اسسٹنٹ اور آخر میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ پنڈت موتی لال بسمل کو غیر علمی و ادبی مصروفیتوں میں بھی علمی ذوق باقی رہا۔''تعلیم نسواں'' اور ''صغرسنی کی شادی'' پر انگریزی میں دو رسالے لکھے۔''مسمریزم'' کے موضوع پر دو کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں، اردو اور فارسی شعر وادب سے بھی شغف تھا۔شاعر تھے۔بسمل تخلص رکھا۔زبان سلیس اور شیریں ہے۔انداز بیان بھی والہانہ ہے۔

17.2.5.4 مولانا محمد قاسم نانوتوی؛

دہلی کالج کے تعلیم یافتہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تعلق مشرقی شعبہ کے صدر مولوی مملوک علی نانوتوی کے وطن سے تھا۔ 1844ء میں ان کا داخلہ ہوا اسی سال مشرقی ومغربی شعبوں کو ضم کر دیا گیا۔ چناچہ عربی پڑھنے والے طلبا بھی جدید علوم سے واقف ہو گئے۔اس کا بھرپور فائدہ

مولانا قاسم نانوتوی نے اٹھایا۔شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرسید مرحوم کی تعلیمی تحریک کی پرزورحمایت کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد میرٹھ کے ایک مطبع میں تصحیح کا کام انجام دے رہے تھے کہ انقلاب 1857ء کا واقعہ پیش آ گیا۔اس محاز آرائی میں اپنے رفقا کے ہمراہ مولانا قاسم محمد نانوتوی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اس انقلاب کو چند مہینوں کے اندر ہی انگریزوں نے قابو میں کرنے کے بعد جوظلم وستم ڈھایا وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ بہرحال اس طوفان کے تھمنے کے بعد قوم وملت کے مختلف قائدین اور مصلحین نے اپنے اپنے طور پر فلاح و بہبود کے لیے قدم اٹھائے۔مولانا قاسم نانوتوی کے اسلامی تشخص اورعلوم دینیہ میں ان مسائل کوتلاش کرنے کی سعی کی۔اس سلسلہ میں انھوں نے اتر پردیش کے قصبہ ''دیوبند'' میں 30 مئی 1866ء کو ایک ''ادارہ'' قائم کیا جس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ اس کا تعلق اور تعاون حکومت کے بجائے صرف عوام سے ہو۔جلد ہی اس ادارہ نے دارالعلوم دیوبند'' نام سے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ تعلیم گاہ کی شکل اختیار کرلی۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب اتفاق ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ڈانڈے دہلی کالج سے جا کر ملتے ہیں۔مولانا قاسم نانوتوی کے علاوہ دارالعلوم کے تقریباً تمام محرکین مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقارعلی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی اور مولانا منیر نانوتوی وغیرہ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

17.2.5.5 مولانا کریم الدین پانی پتی؛

دہلی کالج کے ایک نمایاں طالب علم مولوی کریم الدین پانی پتی تھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد آگرہ کالج میں اردوادب کے استاد مقرر ہوئے اس کے بعد سررشتہ دار عدالت لاہور میں ملازم رہے۔شعروادب سے خاص دلچسپی رہی۔ کچھ عرصہ تک اپنے مکان پر ہر ماہ مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔اس میں بڑھا جانے والا کلام ''گل رعنا'' کے نام سے شائع کرتے تھے۔تصنیف وتالیف کا ایک بڑا ذخیرہ بھی انھوں نے چھوڑا۔ چنانچہ قاضی عبدالودود نے مختلف علوم وفنون پر ان کی چونتیس (34) کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔مولوی کریم الدین پانی پتی کوسب سے زیادہ شہرت ''تذکرہ نگاری'' سے ملی۔ اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے تذکرہ نگاری سے کیا اور تا عمر اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ ان کے تذکروں میں ''طبقات شعرائے ہند'' اور گلدستہ نازنیناں'' زیادہ مشہور ہیں۔مولوی کریم الدین پانی پتی کے تذکروں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ تذکرے کوتاریخ کی ایک شاخ سمجھنے کی کوشش کی۔تاریخ اور تذکروں کی جوتعریف انھوں نے بیان کی اس سے پہلے کسی اور تذکرہ نگار نے اس طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔تذکروں کے بعد اس نے قلم کا جوہر'' تاریخ ابوالفداء'' کے ترجمے میں کھلتا ہے جوڈاکٹر اشپرنگر کی فرمائش پر کیا گیا۔

ان کے علاوہ دہلی کالج کے طلبا کی ایک طویل فہرست ہے جوتحصیل علم کے بعد پورے ملک میں پھیل گئے۔ یہ طلبا جہاں بھی جاتے عوام وخواص ان کا پرجوش خیرمقدم کرتے۔ تدریس کے علاوہ دیگر پیشوں سے یہ بھی وابستہ رہے مثلاً لالہ مکند لال گورنر جنرل کے سرجن مقرر ہوئے، پنڈت بشیشر ناتھ ایک کامیاب مترجم تھے۔مولوی محمد یعقوب اور مولوی ذوالفقارعلی ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔منشی امیدسنگھ مہاراجہ اندور کے اتالیق مقرر ہوئے۔

17.2.6 ورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی:

1835ء میں لارڈ میکالے کی نگارشات کے بعد دہلی کالج ہی وہ ادارہ تھا جس نے آخر تک اردو زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم کے طور پر

اپنائے رکھا۔لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا مغربی علوم اورافکار کی افادیت کے پیش نظرلوگوں کا رجحان اس طرف بڑھنے لگا۔مگر دیسی زبانوں میں اس طرح کی کتب کی عدم موجودگی کی وجہ سے دہلی کالج کی ورنا کلرٹرانسلیشن سوسائٹی نے اس کا بیڑا اٹھایا کہ تراجم کے ذریعہ مغربی علوم کا تعارف کرا کے مشرق کے فکری جمود کوتوڑا جائے۔

ورنا کلرٹرانسلیشن سوسائٹی کی داغ بیل کالج کے پرنسپل مسٹر بترو نے ڈالی۔ ماسٹر رام چندر اور امام بخش صہبائی ان کے اہم معاونین میں تھے۔شروع میں اسے ''انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور بعض اسے کتب خانہ برائے کار آمد معلومات (Library of usefull knowledge) بھی کہتے تھے۔ بعد میں ورنا کلرٹرانلیشن سوسائٹی کے نام سے موسوم کیا گیا۔سوسائٹی کا مقصد اردو، ہندی اور بنگالی تینوں زبانوں میں ترجمہ کا کام کرنا تھا لیکن محدود وسائل اور بعض دوسری مجبوریوں کی بنا پر صرف اردو میں ہی کام ہو سکا۔

ترجمہ کا کام گرچہ مسٹر بترو کی تقرری کے سال یعنی 1841ء میں ہی شروع ہو چکا تھا لیکن 1843ء میں انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی کے قائم ہونے پر یہ کام دہلی کالج میں باقاعدہ شروع ہو گیا اور ورنا کلرٹرانسلیشن سوسائٹی کی نگرانی میں کتابیں طبع ہونے لگیں۔ 1845ء میں مسٹر بترو یورپ چلے گئے تو ان کی جگہ ڈاکٹر اشپرنگر کا تقرر ہوا۔انھوں نے بھی ترجمہ وتالیف کے کام کو اسی شوق اور سرگرمی سے جاری رکھا۔

یہ سوسائٹی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ 1877ء میں دہلی کالج کو ختم کر کے لاہور اورینٹل کالج میں ضم کر دیا گیا۔ پھر بھی قلیل عرصہ میں اس نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔سوسائٹی کی زیرنگرانی ریاضی،طبعیات، کیمیا،طب،جغرافیہ،تاریخ، قانون،سیاسیات،معاشیات اور مذہب وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔مولوی عبدالحق نے ان کی تعداد 128 جبکہ مالک رام نے 131 شمار کرائی ہے۔ جو بھی ہو اس فہرست کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔نمونہ کے طور پر چند ترجمہ شدہ کتابوں کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

17.2.6.1 ترجمہ شدہ اہم کتابیں؛

تذکرہ طبقات شعرائے ہند کو مولوی کریم الدین پانی پتی نے مسٹر ایف فلین کے ساتھ مل کر'' گارساں دتاسی'' کی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔اس کی ضخامت 504 صفحات پر مشتمل ہے جو 1848ء میں مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوئی۔اس کے مقدمہ میں تاریخ اور تذکرہ کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔

تذکرہ شعرائے عرب کو مولوی کریم الدین پانی پتی نے خود اپنی عربی تصنیف ''فرائد الدہر'' کو اشپرنگر کی فرمائش پر اردو میں منتقل کیا جو 1847ء میں مطبع العلوم دہلی کالج سے شائع ہوئی۔اس میں 347 شعرا کے فکروفن کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے نمونہ کلام بھی پیش کیے گئے ہیں۔

دہلی کالج کے استاد مولوی سبحان بخش نے عربی تصانیف تذکرۃ المفسرین اور تذکرۃ الفقہا کا اردو ترجمہ تاریخ الحکماء نام سے کیا جو 1848ء میں شائع ہوا۔اس کتاب میں مختلف اہل فن کا ذکر کیا گیا ہے جو علم ہندسہ علم نحو اور اقلیدس وغیرہ کے ماہر تھے۔ترجمہ خوب البتہ املا قدیم طرز پر ہے۔

مشہور مورخ گولڈ اسمتھ کی انگریزی کتاب ''History of England'' کا ترجمہ'' تاریخ انگلستان'' نام سے دہلی کالج کے کئی اساتذہ نے مل کر کیا۔اسی طرح گولڈ اسمتھ ہی کی کتاب ''History of Rome'' کا ترجمہ منشی شیو پرشاد نے ''تاریخ روم'' کے نام سے کیا۔ کتاب کے آغاز میں نہ تو دیباچہ ہے اور نہ ہی وجہ ترجمہ بیان کیا گیا ہے۔ دراصل 1845ء تک کی طبع شدہ کتابوں میں وجہ ترجمہ بتانے یا

پیش لفظ لکھنے کا اہتمام نہیں تھا۔

دہلی کالج کے تعلیم یافتہ پنڈت رام کشن کو ترجمے میں بڑی مہارت تھی ان کے ترجمے میں روانی اور تصنیف کا احساس ہوتا ہے۔انھوں نے قوانین کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔کالج کے پرنسپل مسٹر بترو کی کتاب ''Principle of the Law of Nations'' کا ترجمہ ''اصول قوانین ممالک مختلف'' اور انھیں کی کتاب ''Principle of Public Revenue'' کا ترجمہ ''اصول سرکاری محاصل کے'' نام سے شائع کیا۔اسی طرح W.H. Macnaghten کی کتاب Principle of Hindu Laws'' کا ترجمہ ''اصول دھرم شاستر'' اور ''Dumont & Benthan'' کی کتاب ''Principle of Lagislature' کا ترجمہ ''اصول قواعد اخلاق اور قوانین'' نام سے کیا۔قانون ہی کی ایک کتاب ''نسخہ رہنما'' کا ترجمہ ''قانون مال کا'' عنوان سے دہلی کالج کے متعدد اساتذہ نے کیا۔

ماسٹر رام چندر اور مولوی ذکاء اللہ کا دہلی کالج کے نمایاں طلبا میں شمار ہوتا تھا۔دونوں ریاضی داں تھے۔انھوں نے ریاضی کی طبع زاد کتابیں تحریر کیں نیز انگریزی سے ترجمہ بھی کیں۔ماسٹر رام چندر کی کتاب ''رسالہ مسائل کلیات و جزیات'' (A Treatise on the Problems of Maxima and Minima'' اس قدر مشہور ہوئی کہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر آگسٹس ڈی مارگن نے (Augustus De Margon) نے اپنے مقدمہ کے ساتھ لندن سے شائع کیا۔منشی ذکاء اللہ نے ابتدائی درجوں کے طلبا کے لیے ''علم مثلث'' نام سے دو چھوٹے چھوٹے رسالوں پر مشتمل ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔منشی ذکا اللہ نے ریاضی کی اصطلاحات کو بڑی خوبصورتی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جبکہ ایسے خشک موضوع پر ترجمہ کرتے وقت زبان و بیان میں سلاست و روانی برقرار رکھنا بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔مشرقی شعبہ کے صدر مولوی مملوک علی نانوتوی نے ''تحریر اقلیدس'' نام سے بارہ مقالوں کا اردو ترجمہ کیا ہے جو مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا۔مولوی کریم الدین پانی پتی کا کہنا ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے۔

علم طبیعیات (Physics) کی متعدد کتابوں کے ترجمے سوسائٹی کے تحت ہوئے۔مثلاً ''Theodolite'' کی کتاب ''Practical land Surveying'' کا ترجمہ ''رسالہ پیمائش زمین کا'' عنوان سے منشی ہردیو سنگھ نے کیا۔یہ رسالہ آلات زمین کی پیمائش سے متعلق تھا۔اسی طرح Young کی کتاب ''Machanism'' کا ترجمہ ''رسالہ علم ادات'' نام سے پنڈت رادھا کشن نے کیا۔اس رسالہ میں جیومیٹری کی شکلیں بنانے اور ان کے اصولوں پر مختلف کل پرزے بنانے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔دہلی کالج علم کا ایسا مرکز تھا جہاں انگریز بھی مترجم تھے۔جی ہاں اردو کے مترجم ،اپنی مادری زبان سے بدیسی زبان میں ترجمہ کیا وہ بھی میڈیکل سائنس کی کتاب کا ترجمہ مترجم ہیں دہلی کالج کے پرنسپل جوزف ہنری ٹیلر جنھوں نے Cooper کی کتاب ''Treatise on Surgery'' کا اردو ترجمہ ''رسالہ بیچ بیان اعمالِ جراحی کے'' نام سے کیا۔جو مطبع العلوم دہلی سے 1848ء میں شائع ہوئی۔سرورق پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کتاب اور مترجم کا نام صاف لفظوں میں لکھا گیا ہے۔نمونے کے طور پر یہاں چند ترجمہ شدہ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ اس سے حوصلہ پا کر دیگر اردو ذریعۂ تعلیم کے ادارے بھی اپنے کام کو آگے بڑھا سکیں۔

17.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کے علم میں درج ذیل باتیں لائی گئیں۔

☆ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد تین اہم تعلیمی اداروں فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جنھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی۔

☆ 1825ء میں قائم کردہ دہلی کالج وہ ادارہ تھا جو ہندوستانیوں کے لیے قائم کیا گیا اور ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔

☆ دہلی کالج کے پرنسپل یوروپین اور اساتذہ ہندوستانی تھے۔ اس کالج میں مشرقی اور مغربی علوم کے شعبے مساوی تھے جنھیں بعد میں ضم کر دیا گیا۔

☆ چونکہ ذریعۂ تعلیم اردو تھا اس لیے جدید علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کالج کے پرنسپل مسٹر بترو کی کوششوں سے ''ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی کے زیرنگرانی پرنسپل، اساتذہ اور طلبا نے مل کر مختلف علوم وفنون کی سینکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

☆ دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبا حرف اول کا درجہ رکھتے تھے چنانچہ ان طلبا کا ملک کے مختلف حصوں میں تقرر ہوتا تھا اور وہ جہاں گئے کالج کا نام روشن کیا۔

☆ کالج کے رسائل ''قران السعدین'' اور ''خیر خواہِ ہند'' نے جدید اردو تنقید، سادہ اور عام فہم نثر، بامقصد شاعری اور اردو صحافت کی بنیاد رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

☆ کالج نے ایسے طلبا کی تربیت کی جنھوں نے اردو فکشن کا آغاز کیا۔ اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت کو فروغ بخشا، مشاعروں کی سرپرستی کی، جدید نظم نگاری کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ غالب کی مکتوب نگاری اور منفرد نثر کے لیے راہ ہموار کیا۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی کتابوں کو ترجمے کے ذریعے اردو میں منتقل کیا۔

☆ دہلی کالج نے اردو میں علمی مضامین کی بنیاد رکھی جو ذہنی بیداری کے آغاز کا سبب بنے نیز اردو والوں کو یوروپی ادب وفلسفے سے روشناس کرایا۔

☆ فکری اعتبار سے عالمگیر تہذیبی وحدت، سیاسی اعتبار سے لبرل ازم، سماجی اعتبار سے افادیت پسندی کا نقطۂ نظر دہلی کالج کے سامنے رہا جب کہ اساتذہ اور طلبا کے نزدیک تعلیم کا مقصد انفرادی معاشی فلاح اور ساتھ ہی ساتھ سماجی اصلاح تھا۔

☆ دہلی کالج نے سہ رخی مذہبی زاویہ پیش کیا چنانچہ دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ تحریک اور تحریک انجمن پنجاب کے ڈانڈے دہلی کالج میں آکر ملتے ہیں۔

17.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
افادیت پسندی	فائدہ	فکری تنوع	مختلف افکار
مساوی	برابر	زبوں حالی	بربادی
آگاہی	واقفیت	اطلاق	عمل
ضم کرنا	ملانا	دسترس	پہنچ
شغف	شوق	عبقری	عظیم، بڑا
شگفتگی	خوشگوار	ثقیل الفاظ	بھاری بھرکم الفاظ
مطمح نظر	پیش نظر	مطبع	اشاعت گھر

17.5 نمونہ امتحانی سوالات

17.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ دہلی کالج کب قائم ہوا؟

2۔ دہلی کالج کے پہلے پرنسپل کا نام بتائیں؟

3۔ مولوی مملوک علی نانوتوی کس شعبہ کے صدر تھے؟

4۔ ماسٹر رام چندر کی کسی ایک تصنیف کا نام بتائیں؟

5۔ ''قران السعدین'' رسالہ کس نے جاری کیا؟

6۔ انگریزی میں منشی ذکاءاللہ کی سوانح عمری کس نے لکھی؟

7۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ایک ناول کا نام بتائیں؟

17.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ دہلی کالج کے قیام اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالیے؟

2۔ دہلی کالج کے کسی ایک پرنسپل کا تعارف کرائیں؟

3۔ ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیے؟

4۔ مولوی محمد حسین آزاد کی ادبی زندگی کو اجاگر کیجیے؟

5۔ ماسٹر رام چندر کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیجیے؟

17.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ دہلی کالج سے وابستہ نمایاں اساتذہ کرام کی خدمات کا مجموعی جائزہ لیجیے؟

2۔ دہلی کالج سے فارغ التحصیل نمایاں طلبا کا تعارف پیش کیجیے؟

3۔ ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی سے ترجمہ شدہ کتابوں کا جائزہ لیجیے؟

17.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	مرحوم دہلی کالج	مولوی عبدالحق
2۔	قدیم دہلی کالج	مالک رام
3۔	ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمٰن قداوئی
4۔	ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار	شمس الہدیٰ

اکائی 18: جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

اکائی کے اجزا

18.0 تمہید

18.1 مقاصد

18.2 جامعہ عثمانیہ سے قبل

18.2.1 جامعہ عثمانیہ کی تحریک

18.2.2 جامعہ عثمانیہ کے قیام کا پس منظر

18.2.3 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں

18.3 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی تدریس اور عمارتیں

18.3.1 آرٹس کالج کی عمارت

18.3.2 جامعہ عثمانیہ کے شعبہ جات

18.3.3 آرٹس، سائنس اور قانون کے شعبہ جات

18.3.4 میڈیکل سائنس، انجینئرنگ اور تعلیمات کے شعبہ جات

18.3.5 یونیورسٹی سے کالجوں کا الحاق

18.4 نصابات کی تدوین

18.4.1 دارالترجمہ کی کارکردگی

18.4.2 دارالترجمہ کی اصطلاحات کمیٹی

18.4.3 دارالترجمہ کے ناظم اور مترجمین

18.5 ضمیمہ جات

الف: جامعہ عثمانیہ کے چانسلرس (پولیس ایکشن سے قبل) ج: دارالترجمہ کے نظماء (خاتمہ تک)

ب: جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلرس د: دارالترجمہ کے چند اہم مترجمین

18.5 اکتسابی نتائج

8.6 کلیدی الفاظ

18.7 نمونہ امتحانی سوالات

18.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

18.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
18.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
18.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

18.0 تمہید

کسی بھی ملک اور قوم کی ترقی کے سلسلے میں ایجادات اور اختراعات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر بڑی قوم کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ترقی کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو کر نئے نئے کارنامے انجام دیتی رہی ہے۔ ایک دور تھا جبکہ ساری دنیا میں ایجادات اور اختراعات کی وجہ سے ساری دنیا کے باشندے عربوں کی اقوام سے فیض اٹھاتے تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ تیز رفتاری کے ساتھ یوروپی ممالک کی ترقی ہونے لگے اور نئی ایجادات کا سلسلہ یوروپ کی قسمت بن گیا۔ یوروپی اقوام نے فولاد کی ایجاد کے ذریعے دنیا کی تاریخ میں بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ جس کی وجہ سے جدید سائنسی ترقیات اور ایجادات کے استعمال کی شدید ضرورت کا احساس ہونے لگا۔ مشینوں نے یہ ضرورت پوری کی۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف زبانوں کا رواج تھا۔ ایشیائی ممالک میں ہندوستان جیسے سب سے بڑی آبادی والے ملک کے لیے یہ مجبوری تھی کہ یوروپ کی جدید ترقیات اور ایجادات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے زبان بلاشبہ رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے اور یوروپ کی جدید ترقیات اور ایجادات کو ہندوستان کی سرزمین میں نمائندگی دینے کے لیے جس قسم کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس میں دہلی کالج کے کارنامے، انجمن پنجاب لاہور کی ترجمہ نگاری، سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی اور جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کی ترتیب و تدوین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی بے شمار علاقائی زبانوں میں ہی ایک ایسی زبان ہے، جس میں سب سے پہلے یوروپی زبانوں سے آنے والی ترقیات اور ایجادات کو منتقل کر کے کتابیں شائع کی گئیں۔ اس خصوص میں بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست حیدرآباد کے ساتویں فرماں رواں نواب میر عثمان علی خان کا اہم کارنامہ رہا کہ انہوں نے اپنی ریاست کی اردو زبان کو ترقی دیتے ہوئے پہلی اردو کی یونیورسٹی ''جامعہ عثمانیہ'' کا قیام عمل میں لایا۔ اس جامعہ میں تمام علوم وفنون کے علاوہ سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون کی تعلیم کے لیے اردو نصابات کا آغاز کیا گیا اور مقامی سطح پر مشہور طباعت کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزی کی سائنس وٹکنالوجی کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کا آغاز کیا گیا۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کے تمام نصابات کی تکمیل کے لیے ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذریعے عمدہ اور نایاب کتابیں ترجمہ کی گئیں جو جامعہ عثمانیہ کے معیاری نصاب کا ذریعہ بنتی رہیں۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی پہلی ہندوستانی زبان کی یونیورسٹی اور اردو ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کی وجہ سے ساری دنیا میں جامعہ عثمانیہ کا اپنا امتیاز قائم ہو گیا۔

18.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ جامعہ عثمانیہ سے قبل اور اس کے بعد کی تاریخ پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- ☆ جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کی ابتدائی جماعتوں کے بارے میں تفصیلات بیان کرسکیں گے۔
- ☆ جامعہ عثمانیہ کی تدریس اور اس کی مختلف عمارتوں کا حال بیان کرسکیں گے۔
- ☆ نصابات کی تدوین اور دارالترجمہ کے کارناموں کے علاوہ ناظم اور مترجمین کے کارناموں کا احاطہ کرسکیں گے۔

18.2 جامعہ عثمانیہ سے قبل

ریاست حیدرآباد اگرچہ ملکی ریاست تھی' جس کا اپنا ٹپہ، کرنسی، ریلوے، ٹرانسپورٹ اور ہوائی اڈے کے ساتھ ساتھ ڈاک و تار کے محکمہ قائم کر کے انتظامی صلاحیتوں اور باضابطہ عدالت اور مختلف محکمہ جات کے قیام پر توجہ دی گئی۔ حیدرآباد میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے قبل انگریز حکومت نے ہندوستان میں ممبئی، کولکاتا، اور مدراس میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اندرون ریاست مواقع فراہم نہیں تھے' اگر ریاست حیدرآباد کا کوئی باشندہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو وہ مدراس یونیورسٹی یا پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کے علاوہ دوسری ڈگریاں حاصل کرنے پر توجہ دیتا تھا۔ حیدرآباد میں صرف دو کالجوں کا رواج تھا۔ امیر و امراء اور جاگیرداروں کے خاندان کے فرزندان ''جاگیردار کالج (موجودہ بیگم پیٹ ہائی اسکول)'' میں شریک ہوتے تھے' جبکہ ''نظام کالج'' جیسے ادارے میں عام شہریوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کی تخت نشینی 1911ء سے قبل ریاست حیدرآباد کے بادشاہ کی حیثیت سے نواب میر محبوب علی خان نے ''محبوب یونیورسٹی'' کے قیام کے لیے کوشش کی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے' لیکن اپنی زندگی میں انہوں نے عوام کی بھلائی کے لیے مذہبی یونیورسٹی ''جامعہ نظامیہ'' کا 1872ء میں قیام عمل میں لایا اور عوام کو مذہبی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے باضابطہ وقیع لائبریری ''آصفیہ کتب خانہ'' کی بنیاد رکھی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل حیدرآباد میں تعلیمی سرگرمیاں جاری تھیں۔ مختلف تعلقوں اور اضلاع میں پرائمری اور ہائی اسکول قائم تھے۔ لیکن کسی بھی ضلع میں کالج کا تصور نہیں تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل باضابطہ تعلیمی سرگرمیاں ریاست حیدرآباد کا حصہ تھیں۔ لڑکوں کے لیے علاحدہ مدارس اور لڑکیوں کے لیے علاحدہ مدارس کا انتظام تھا۔ اور ان مدارس کو مدرسہ ذکور اور مدرسہ اُناث کی حیثیت سے اہمیت حاصل تھی۔ غرض جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل ہی حیدرآباد کا تعلیمی نظام مستحکم تھا، لیکن کسی بھی قسم کی جدید یونیورسٹی قائم نہ تھی۔ صرف دو کالجوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے اطراف و اکناف میں مدراس یونیورسٹی اور میسور یونیورسٹی کے ذریعے اعلیٰ تعلیمی نظام کا سلسلہ جاری تھا۔

18.2.1 جامعہ عثمانیہ کی تحریک

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے لیے شاہی حکمران کو اہمیت حاصل ہے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادارہ اچانک وجود میں نہیں آتا۔ ریاست حیدرآباد میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے لیے عوامی تحریک بھی جاری تھی۔ اس مقصد کو بادشاہِ وقت نے پورا کیا۔ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم حیدرآباد نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ریاست کے طلباء اور طالبات کے لیے ایک یونیورسٹی کا قیام لازمی ہے جس کے ذریعے اس علاقے کے باشندگان کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم ہوجائیں۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے 1884ء میں جب نواب میر محبوب علی خان اقتدار سے وابستہ تھے۔ نواب رفعت یار جنگ اور ان کے ہم عصر ساتھیوں میں سر سالار جنگ اول اور نواب مختار الملک نے 1292ھ مطابق 1875ء کو ایک محضر پیش کیا' جس میں ایسی یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا گیا جو اردو ذریعہ تعلیم سے جدید علوم کی تدریس پر توجہ دے۔ اس محضر کے 9 سال بعد علامہ جمال الدین افغانی جب حیدرآباد آئے تو انہوں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔ تاریخی کتابوں میں لکھا ہے کہ لارڈ رپن کی توجہ اس جانب مبذول کروانے کے لیے حکومت سے گذارش کی گئی۔ آصف سادس کی نگرانی میں باغ عامہ کے احاطے میں جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ''محبوب یونیورسٹی'' کے قیام کا خاکہ پیش کیا گیا۔ دارالعلوم حیدرآباد کے فارغ طلباء نے 1332ھ مطابق 1913ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تو ریاست میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ اِن تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی نمائندگی اور شاہی دلچسپی

کے نتیجے میں ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے حالات پیدا ہوئے۔جس میں نواب رفعت یار جنگ اور عوامی نمائندے ہی نہیں' بلکہ ایجوکیشن کانفرنس کی جستجو کو بھی بڑا دخل ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے سربراہوں میں مولوی محمد مرتضیٰ، مولوی ملا عبدالباسط، مولوی رضی الدین کیفی، سید بہاء الدین شطاری، جمال الدین مرحوم اور محمد مظہر مرحوم شامل تھے۔جنھوں نے ریاست کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا۔غرض ان تمام نمائندگیوں اور عوامی جستجو کی وجہ سے نواب میر محبوب علی خان کے دور میں جامعہ قائم نہ ہوسکی ،لیکن میر عثمان علی خان کے عہد میں نئی جدید علوم کی جامعہ عثمانیہ کا قیام ممکن ہوگیا۔

18.2.2 جامعہ عثمانیہ کے قیام کا پس منظر

ریاست حیدرآباد میں جدید علوم کی اردو ذریعہ تعلیم سے شروع کی جانے والی یونیورسٹی کے لیے پہلی عرض داشت 22/اپریل 1917ء کو پیش کی گئی۔جس میں سر اکبر حیدری معتمد تعلیمات نے میر عثمان علی خان بادشاہِ وقت کی خدمت میں معروضہ پیش کیا تھا کہ ریاست کی ضرورت کی تکمیل کے لیے نئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔اس معروضہ کو فخر الملک معین المہام عدالت وکوتوالی اور امور عامہ کی طرف سے منظوری دی گئی۔ ناظم تعلیمات اور اکابرین قوم وملت ہی نہیں' بلکہ ماہرین تعلیم سے تفصیلات دریافت کی گئیں۔اس عرض داشت پر فخر الملک کے علاوہ اکبر حیدری اور ناظم تعلیمات سر اس مسعود سرسید کے پوتے کے دستخط بھی موجود تھے۔اس نمائندگی کے باوجود وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے رائے دی تھی کہ غیر زبان کے ذریعے تعلیم کے نقصانات بہت زیادہ ہیں' اور شبہات ظاہر کیے گئے تھے؛ جس کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی قائم کرنے میں رکاوٹ درپیش ہوئی۔جس کے جواب میں نواب عماد الملک، پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر عربی آکسفورڈ یونیورسٹی مسٹر فشر لیڈس یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر بائیکل ووڈ واٹر،لیفٹننٹ گورنر پنجاب مسٹر گلانسی، معین المہام فینانس نے دوبارہ مجوزہ یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ غرض اس یادداشت اور عرضداشت کے جواب میں بادشاہِ وقت نے فرمان جاری کیا جس پر امین جنگ صدر المہام پیشی کے دستخط تھے۔ جو 1335ھ مطابق 1917ء کی یادگار ہے۔جس میں بادشاہِ وقت نے یونیورسٹی کے قیام کے احکامات جاری کیے تھے۔

> ''مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کہ مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید وقدیم مشرقی ومغربی علوم وفنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہوکر جس میں دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہوسکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلباء کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے''۔اس فرمان میں یہ بھی حکم صادر ہوا کہ ''حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کاروائی شروع کی جائے''۔

اس حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے باضابطہ ماحول تیار ہوگیا۔ بادشاہِ وقت کے فرمان کے توسط سے 1918ء میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل جامعہ کے نصابات کی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک نئے محکمہ کے قیام کی اجازت دی گئی۔جس کے تحت 14/اگست 1917ء کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذمہ جامعہ عثمانیہ کی تمام نصابی کتابوں کی ترتیب واشاعت اور اُنہیں نصاب میں شامل کرنا تھا۔اس طرح اردو ذریعہ تعلیم سے شروع کی جانے والی ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی میں اردو نصاب کو جاری رکھنے کے لیے بادشاہِ وقت کے فرمان کے ذریعے یونیورسٹی کا قیام اور اس کے نصابات کی تیاری کے لیے دارالترجمہ کا قیام اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔

18.2.3 جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں

عثمانیہ یونیورسٹی میں سب سے پہلے انٹرمیڈیٹ کی کلاسوں کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے دو شعبے یعنی فنون (Arts) اور دینیات (Theology) کی تعلیم شروع کی گئی۔ مختلف عرضداشت اور احکامات کے ذریعے یہ پتہ چلتا ہے کہ 15/اگست 1918ء کو ''عثمانیہ یونیورسٹی کا دستور العمل'' منظور کیا گیا۔ اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی صدر یار جنگ صدرالصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ جب کہ محمد اکبر نذر علی حیدری معتمد عدالت و کوتوال سرکار عالی نے بھی دستخط کیے۔ تاریخی پس منظر میں یہ بتایا ہے کہ یکم ذی الحجہ 1337ھ مطابق 28/اگست 1919ء کو باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اردو کے علاوہ انگریزی زبان بھی باضابطہ پڑھائی جانے لگی۔ یونیورسٹی کا نصاب بھی تیار کیا گیا اور اساتذہ کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ احکامات کے مطابق شوال 1337ھ مطابق 1918ء میں اساتذہ کا تقرر بھی ہوگیا۔ یونیورسٹی کے نصاب میں اردو، تلگو، مراٹھی، کنڑی اور تامل زبانوں کو شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ انگریزی کے دو پرچے، تاریخ و جغرافیہ کے دو پرچے، ریاضی کے دو پرچے، نیچرل سائنس کا ایک پرچہ، علوم السنہ میں کوئی ایک زبان جیسے عربی، سنسکرت، فارسی، تلگو، مراٹھی، کنڑی، تامل، فرانسیسی اور لاطینی کے علاوہ یونانی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ جامعہ عثمانیہ کی پہلی جماعت ایف اے (فیلو آف آرٹس) میں داخلہ لینے والے طلباء کے نام عبدالمجید صدیقی، احمد بن عبداللہ، عزیز الرحمٰن، ابوالفتح نصراللہ اور وینکٹیشور راؤ تھے۔ جبکہ اورنگ آباد سے شریک ہونے والے طلباء میں یوسف الدین، کلیم الدین انصاری اور انیس احمد شامل تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے دفتر، مسجل (رجسٹرار) پروفیسر اور مددگاروں کے نام اخبارات میں شائع کیے گئے۔

18.3.1 آرٹس کالج کی عمارت

ہندوستان گیر سطح پر ہی نہیں، بلکہ عالمی سطح پر ریاست حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی کے قیام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جبکہ بنگالی زبان کے عالمگیر شہرت یافتہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے حیدرآباد کے بادشاہ کی جانب سے ہندوستانی ذریعہ تعلیم کی پہلی یونیورسٹی کے قیام پر مبارک بادی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور اس کے توسط سے انجام دی جانے والی سرگرمیوں کا احاطہ بہت کم کتابوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس خصوص میں چند تفصیلات بطور نمونہ پیش ہیں:

> ''بادشاہِ وقت کی جانب سے 26/اپریل 1917ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی گئی۔ 22/ستمبر 1918ء تک یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلہ میں تمام بنیادی کام انجام دیئے گئے اور اسی 22/ستمبر 1918ء کو سرکاری طور پر عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا باقاعدہ اعلان کردیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کی باضابطہ جماعتوں کے آغاز کے لئے مقام اور عمارتوں کے لیے غور کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے عابد روڈ کے علاقہ میں موجود توپ کا سانچہ جسے آج ''گن فاؤنڈری'' کہا جاتا ہے، اس علاقہ میں کئی عمارتوں کو منتخب کیا گیا۔ ان تمام عمارتوں میں سب سے خوبصورت عمارت ''آغا منزل'' تھی۔ اس خوبصورت عمارت کے احاطہ میں 28/اگست 1919ء کو نواب صدر یار جنگ نے بحیثیت وائس چانسلر صبح 10 بجے عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ اس یادگار تقریب میں ملک کے امراء، علم و ادب کے چاہنے والے، اردو ادب کے جانثار اور مسٹر ولنکر موجود رہے۔ وائس چانسلر نے خطبہ افتتاحیہ پڑھا اور توپ کا سانچہ کے علاقہ میں جامعہ عثمانیہ کا آغاز ہوا۔''

اِن حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ تدریس کا آغاز 28/اگست 1919ء کو بمقام توپ کا سانچہ

(گن فاؤنڈری) کے احاطے میں ہوا۔ ابتداء میں آرٹس فیکلٹی کی بنیاد رکھی گئی اور اساتذہ کے تقررات کو قطعیت دینے کے بعد مختلف علوم وفنون کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی اور ان کی تدریس کا بھی انتظام کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کے تمام شعبہ جات کا تعلیمی سلسلہ عابد روڈ کے احاطہ میں جاری رہا۔ 1935ء میں اڈکمیٹ کے علاقہ میں جامعہ عثمانیہ کی نئی عمارتوں کی تعمیر کی منظوری دی گئی۔ چنانچہ مشہور زمانہ آرٹس کالج کی عمارت اور دیگر سائنس، انجینئرنگ، قانون، تعلیمات' شعبۂ امتحانات اور انتظامی امور کے شعبے 1938ء میں اڈکمیٹ منتقل ہوگئے۔ 1935ء سے 1938ء تک اس علاقے میں عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ ستمبر 1948ء تک جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم اردو رہا۔ 1948ء میں ''سقوط حیدرآباد'' اور ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام کی وجہ سے ریاست کے مشہور تعلیمی ادارے ''جامعہ عثمانیہ'' کے ذریعہ تعلیم کو اردو سے انگریزی میں منتقل کردیا گیا۔ اس خصوص میں نہ کوئی سینٹ کی میٹنگ ہوئی اور نہ ہی عوامی رائے کا لحاظ کیا گیا' بلکہ نئی حکومت کے اعلامیہ کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کے اردو ذریعہ تعلیم کو وقفہ وقفہ سے ختم کردیا گیا۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تھے۔

بادشاہِ وقت میر عثمان علی خان نے آرٹس کالج کی عمارت کے لیے عالمی سطح کے مقابلے منعقد کیے۔ اس مقابلے میں ولیم جاسپر کے نقشے کو پسند کیا گیا۔ اس نقشے پر آرٹس کالج کی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس عمارت کی خوبی یہ ہے کہ اس کی پہلی منزل کی تعمیر میں مندروں کے ستون کے طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری منزل کی عمارت کے ستون مسجد کے طرز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب کہ آرٹس کالج کا باب الداخلہ عیسائی چرچ کی تعمیر کا نمائندہ ہے۔ اس طرح آرٹس کالج کی عمارت میں بیک وقت تین بڑے مذاہب ہندو، مسلمان اور عیسائی کے اشتراک کا انداز واضح ہے۔ ہر فیکلٹی کی عمارت اس طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ آرٹس کالج کی عمارت کی تعمیر پر بادشاہِ وقت نے 30 لاکھ روپے منظور کیے۔ اس عمارت کی تعمیر میں مقامی پہاڑوں کا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ عمارتوں کی تعمیر کے لیے نواب زین یار جنگ اور سید علی رضا جیسے پی ڈبلیو ڈی کے انجینئرس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جنہوں نے اڈکمیٹ کے کیمپس کا انتخاب کرکے اس علاقے میں یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر کی اجازت دی۔ عمارتوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے بادشاہِ وقت نے اُس دور کی عالمی سیاحت کے لیے 6,146 پاؤنڈ کی رقم منظور کی تاکہ عالمی سطح پر مشہور اہم عمارتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ کی عمارتوں کا ڈیزائن تیار کیا جائے۔ غرض آرٹس کالج کی عمارت عالمی سطح پر منفرد انداز اور جمالیاتی حسن کی نمائندگی کرنے والی عمارتوں میں شامل کی جاتی ہے۔

18.3.2 جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبے جات

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے توسط سے نہ صرف جدید علوم فنون کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی' بلکہ مختلف شعبہ جات کے علاوہ فیکلٹیز کے قیام اور اس کی کتابوں کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ سب سے پہلا اور بڑا شعبہ ''فیکلٹی آف آرٹس'' قرار دیا گیا۔ جس کے پہلے حصے میں زبانوں کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔ فیکلٹی آف آرٹس کے دوسرے حصہ میں تاریخ اور جغرافیہ کی جانب توجہ دی گئی۔ جس میں اسلامی، یونانی، رومی اور ہندوستانی تاریخ اور جغرافیہ شامل تھے۔ یہ شعبہ بھی سب سے بڑا شعبہ تھا۔ اس کے بعد فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات، سماجیات، سیاسیات اور معاشیات کو بھی شعبہ آرٹس سے وابستہ کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کی ''فیکلٹی آف لاء'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس میں بین الاقوامی، آئینی، یونانی، ہندوستانی اور کریمنل قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فیکلٹی آف سائنس میں حساب اور سائنس شامل تھے' جب کہ فیکلٹی آف سائنس کے دوسرے شعبے میں طبیعیات اور کیمیاء کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فیکلٹی آف انجینئرنگ میں میکانیکل اور انجینئرنگ کے شعبہ جات شامل تھے۔ فیکلٹی آف میڈیسن میں معالجات اور آپریشن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں فیکلٹی آف ایجوکیشن بھی موجود تھا۔ یہی نہیں بلکہ زبانوں کے شعبہ جات کے علاوہ دو علاحدہ شعبے دینیات اور اخلاقیات کے شامل تھے۔ انہیں بھی فیکلٹی آف آرٹس کا درجہ حاصل تھا۔

اس کے علاوہ آرٹس فیکلٹی میں سوشیالوجی، سیاسیات اور معاشیات کا دخل بھی تھا۔غرض عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد آرٹس فیکلٹی کے تین شعبے' قانون کا شعبہ اور فیکلٹی آف سائنس کے تین شعبے' انجینئرنگ اور میڈیسن کے کئی شعبوں پر مشتمل عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔جس کے ذریعے طلبا اور طالبات کو باضابطہ تدریس کا اہتمام کیا گیا۔

18.3.3 آرٹس، سائنس اور قانون کے شعبے جات

جامعہ عثمانیہ میں آرٹس کے شعبے کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ علوم السنہ کا تعلق بھی شعبہ آرٹس سے تھا۔ چنانچہ آرٹس کے ذریعہ سب سے پہلے زبانوں کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔جس کے تحت مشرق وسطیٰ کی زبانوں میں عربی اور فارسی کو نصاب کا درجہ دیا گیا۔ ہندوستانی زبانوں میں شمالی ہند کی سب سے مقبول زبان یعنی سنسکرت کو نصاب کا موقف دیا گیا۔علوم السنہ میں جنوبی ہند کی تمام زبانوں کی تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا گیا' کیوں کہ جامعہ عثمانیہ کا تعلق جنوبی ہند سے تھا۔ یہی وجہ رہی کہ تلگو، مراٹھی، کنڑی اور تامل زبان کے شعبے قائم کیے گئے،جن کا تعلق آرٹس فیکلٹی سے تھا۔اس کے علاوہ بیرونی زبانوں میں فرانسیسی، لاطینی اور یونانی زبانوں کے شعبے قائم کیے گئے۔ان کا تعلق بھی آرٹس فیکلٹی میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ آرٹس فیکلٹی کے توسط سے باضابطہ السنہ کے بعد فلسفہ، مابعدالطبعیات، نفسیات، منطق اور اخلاق کو شمار کیا گیا۔فیکلٹی آف آرٹس کا تیسرا حصہ سماجیات، سیاسیات اور معاشیات سے وابستہ رہا۔ جب کہ فیکلٹی آف آرٹس کا چوتھا حصہ تاریخ وجغرافیہ سے وابستہ ہے جس کے تحت اِن شعبے جات میں اسلامی تاریخ، ہندوستانی تاریخ (قدیم وجدید)،عہد وسطیٰ کی تاریخ،عہد حاضر کی تاریخ، یونان کی تاریخ، روم اور یوروپ کی تاریخ کی تدریس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا۔اس طرح فیکلٹی آف آرٹس کا تعلق علوم السنہ اور دوسرے شعبے جات سے وابستہ رہا۔

جامعہ عثمانیہ کے سائنس کے شعبہ جات کا تعلق بھی تین مختلف عنوانات سے جاری وساری رہا۔ پہلا شعبہ حساب اور سائنس سے متعلق تھا جس کے تحت الجبرا، جامیٹری، ٹگنامٹری کی تعلیم دی جاتی تھی۔جس کے بعد سائنس کے دوسرے شعبے میں فزکس کو اہمیت حاصل تھی جس کے ذریعے آواز اور نور، الکٹری سٹی، مقناطیسیت، جنرل فزکس اور پریکٹیکل فزکس کے موضوعات کو درس وتدریس میں شامل کیا گیا تھا۔فیکلٹی آف سائنس کے تیسرے شعبے میں کیمسٹری یا کیمیا کو داخل کیا گیا تھا۔جس کے ذریعہ فزیکل کمیسٹری، آرگینک کیمسٹری، نامیاتی کیمسٹری، کیلکولس، اپلائیڈ میتھامیٹکس اور آسٹرانومی کے علاوہ پریکٹیکل کیمسٹری، جیالوجی، باٹنی اور زوالوجی کے شعبے بھی شامل تھے۔اِن تمام شعبے جات کو سائنس کی تعلیم سے وابستہ کیا گیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ میں باضابطہ قانون کا شعبہ قائم تھا۔اس قانون کے شعبے کو علاحدہ فیکلٹی کا درجہ حاصل تھا جس کی علاحدہ عمارت اور علاحدہ تقررات بھی جاری وساری تھے۔جس کے ذریعے اینشینٹ لاء، جورلیس پروڈنس، بین الاقوامی قانون، آئینی قانون، کریمنل قانون، پرسنل قانون، لاء آف ٹراٹس، لاء آف ایویڈنس، یونانی قانون، سنسکرت قانون، یوروپی قانون اور ایشیائی قانون کی درس وتدریس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس طرح شعبہ آرٹس، سائنس اور قانون کے توسط سے نہ صرف اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا گیا تھا' بلکہ ہر شعبے کی اہم عمارت کے علاوہ تدریس کے لیے جماعتوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔

18.3.4 میڈیکل سائنس، انجینئرنگ اور تعلیمات کے شعبے جات

جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں کو جدید انداز سے وابستہ کرنے کے لیے باضابطہ جماعتوں کا اہتمام اور اساتذہ کے تقرر کے علاوہ تجربہ گاہیں بھی قائم کی گئیں' جس کے ساتھ جماعتی تدریس کا طریقہ اختیار کیا گیا۔میڈیکل سائنس کی تعلیم کو جدید تقاضوں سے وابستہ کرکے عثمانیہ

یونیورسٹی میں باضابطہ فیکلٹی آف میڈیسن کے تحت جوریس پروڈنس، اناٹومی، ہسٹالوجی، فزیالوجی، سرجری، آپتھمالوجی اور ڈیسیز آف ویمنس کے شعبے قائم رہے۔ باضابطہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا اردو ذریعہ تعلیم سے میڈیکل کی تعلیم کو عام کیا گیا۔ غرض دارالترجمہ کی نصابی کتابوں کی وجہ سے میڈیسن کی تعلیم کو اردو میں فروغ حاصل ہوا۔ اسی طرح انجینئرنگ کی فیکلٹی کے ذریعے سیول اور میکانیکل انجینئرنگ کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ جس کے لیے باضابطہ علاحدہ عمارت اور اس کے مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔ اسی طرح اساتذہ کی فراہمی اور ان کی تربیت کے لیے باضابطہ کالج آف ایجوکیشن قائم کیا گیا' جس کے تحت علوم السنہ کی تدریس کے علاوہ سائنس کی تدریس کے مواقع فراہم کیے گئے۔ تدریسیات پر کتابوں کی فراہمی کے علاوہ مشرقی اور یوروپی طریقہ تدریس کے طریقوں پر مواد فراہم کیا گیا۔ چنانچہ فیکلٹی آف ایجوکیشن کے توسط سے اساتذہ کی تربیت اور ان کو عملی تدریسیات اور بچوں کی نفسیات سے وابستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ کے اِن شعبے جات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

18.3.5 یونیورسٹی سے کالجوں کا الحاق

جامعہ عثمانیہ کے قیام 1918ء کے بعد ہندوستان کی آزادی اور 1966ء تک اس یونیورسٹی سے 20 کالجوں کا الحاق تھا۔ جس کے مطابق آرٹس کالج کیمپس میں 6 کالجس، شہر میں 7 کالجس اور اضلاع میں 7 کالجوں کا الحاق تھا' جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا شہر میں 16 کالجس اور اضلاع میں 44 کالجس کے الحاق کا آغاز ہوا۔ 1966ء میں ریاست آندھراپردیش میں جملہ 91 کالجس موجود تھے۔ جن میں 68 کالجس شہر میں واقع تھے۔ جب کہ 31 کالجس اضلاع کی نمائندگی کرتے تھے۔ 2000ء تک جامعہ عثمانیہ کو دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی کا درجہ اس لیے حاصل تھا کہ اس یونیورسٹی سے ساری ریاست کی 1750 کالجس کا الحاق موجود تھا۔ 2000ء کے بعد ریاست آندھراپردیش نے اطراف واکناف میں کئی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا۔ جس کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کی صد سالہ تقاریب 1918ء میں اس یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں کی تعداد 950 تھی دنیا کی کسی بھی یونیورسٹی سے ملحق اتنی بڑی کالجوں کا تعداد وموجود نہیں ہے' اس لیے جامعہ عثمانیہ کو بے شمار کالجوں اور ریسرچ سنٹرس کے الحاق کا مقام ومرتبہ حاصل ہے۔

18.4 نصابات کی تدوین

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور اس کی ذریعہ تعلیم کو اردو میں تقویت پہنچانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ جدید علوم وفنون کی تعلیم وتدریس کے لیے معیاری اور اعلیٰ سطحی کتابوں کی فراہمی پر توجہ دی جائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے پہلے حیدرآباد کا نصاب تعلیم روایتی قسم کا تھا۔ اگرچہ ہائی اسکول درجہ تک کی تعلیم کے لیے 1911ء میں میر عثمان علی خان نے کمیٹی قائم کرکے ریاست کی تعلیمی ترقی پر توجہ دی تھی۔ جس کی وجہ سے دسویں جماعت تک علوم السنہ کے علاوہ سائنس اور صنعت وحرفت کی تعلیم کو فروغ دیا گیا تھا۔ ہندوستان کی سرزمین میں جامعاتی سطح پر نصابات کی تدوین اور یوروپی یونیورسٹیوں کے معیارات کو برقرار رکھتے ہوئے جامعہ عثمانیہ میں تدریس پر خصوصی توجہ دی گئی' اور ملک گیر سطح سے قابل اساتذہ کو اس جامعہ میں تدریس کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس خصوص میں ہر شعبہ جات اور فیکلٹی سے متعلقہ سینئر اور تجربہ کار اساتذہ پر مبنی باضابطہ کمیٹی کا اہتمام کیا گیا۔ ہر قسم کی کمیٹی کی تشکیل کے معاملے میں شعبہ جات کو اختیارات دیے گئے کہ وہ اپنی یونیورسٹی کے شعبے سے متعلق ہی نہیں بلکہ دوسری یونیورسٹی کے شعبہ جات کے اساتذہ کو بھی نصابات کمیٹی میں شامل کریں۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ میں پہلی مرتبہ جمہوری انداز سے نصابات کی تدوین کا آغاز ہوا۔ اگرچہ یونیورسٹی کو بادشاہِ وقت نے قائم کیا تھا لیکن یونیورسٹی کے تمام معاملات میں جمہوری انداز اختیار کیا جاتا تھا' چنانچہ ہر زبان، ہر علم اور ہر فیکلٹی کے علاوہ ہر شعبے سے متعلق نصابی کمیٹیوں کا آغاز ہوا۔ اِن نصابی کمیٹیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ عالمی معیار کی جامعات کے

نصابات کو پیش نظر رکھ کر یا پھر دنیا کی مشہور جامعات میں بطور نصاب رائج شدہ کتابوں کو نصاب میں شامل کریں اور اُن کتابوں کو عالمی زبانوں سے اردو میں منتقل کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ اس مقصد کے لیے نصابات کمیٹی کی طرف سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کو نمائندگی دی جاتی تھی۔ چنانچہ نصاب سے متعلق پیش کردہ کتاب کے ترجمے اور اس کی اشاعت پر خصوصی توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔ غرض دارالترجمہ کا شعبہ اور اس کے مختلف ذیلی شعبے کتابوں کے ترجمے اور اس کی کتابت کے علاوہ اشاعت کی ذمہ داری پوری طرح انجام دیتے تھے۔

18.4.1 دارالترجمہ کی کارکردگی

جامعہ عثمانیہ کے نصابی کتابوں کی تصنیف و تالیف سے وابستہ ادارہ کی حیثیت سے دارالترجمہ نے اپنی کارکردگی کا شاندار مظاہرہ کیا۔ اس ادارہ کے نام کے بارے میں بھی اختلافات ہیں۔ بیشتر ناقدین اور محققین نے ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' کی حیثیت سے اس کے وجود کو تسلیم کیا۔ بعض محققین نے اس ادارہ کا نام ''دارالتصنیف و تالیف و ترجمہ'' کی حیثیت سے پیش کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں موجود قدیم الماریوں اور میزوں پر ''دارالترجمہ'' کا نام لکھا ہوا ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالترجمہ ہی اس کا اہم نام ہے اور پہلی شائع ہونے والی کتاب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ''اراکین دارالترجمہ'' کے ذریعے اسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔

اس اکائی کے ابتدائی موضوعات میں واضح کیا گیا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل 14 راگست 1917ء کو جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موجودہ نامپلی ریلوے اسٹیشن کے روبرو سابق رائل ہوٹل کی عمارت کی جگہ ''دارالترجمہ'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بادشاہِ وقت نے فرمان کے ذریعے اس شعبے کے لیے ابتدائی طور پر 16 ہزار روپئے کی رقم منظور کی تھی۔ جو مختلف ادوار میں 80 لاکھ تک اضافہ ہوگئی۔ محتاط اندازے کے مطابق دارالترجمہ کی کتاب کے ایک صفحہ کے ترجمہ کے لیے اس دور میں 27 روپئے خرچ ہوتے تھے۔ دارالترجمہ ایک ایسا ادارہ تھا' جس میں بیک وقت ترجمے کے کام کے علاوہ اصطلاح سازی کا کام بھی انجام دیا جاتا تھا۔ 3 رستمبر 1917ء کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی خدمات انجام دینے کے لیے جن اشخاص کا انتخاب عمل میں لایا گیا، اس کے تحت برکت علی ایم اے، الیاس احمد برنی بی اے، عبدالماجد دریابادی بی اے، سرور حسین اور نذیر ہاشمی کا تقرر عمل میں آیا۔ اسی طرح دارالترجمہ کے دفتر کے لیے 150 روپئے ماہانہ کرایے کی منظوری دی گئی۔ اس ادارے کے ذریعے سائنس، کیمسٹری، انجینئرنگ، طبعیات، اقتصادیات، فزکس اور قانون کے علاوہ میڈیکل سائنس اور جدید علوم وفنون کی کتابوں کی ترجمہ نگاری اور اس کے ساتھ نئی اصطلاحات کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی گئی۔ موجودہ تحقیق کے اعتبار سے دارالترجمہ سے وابستہ 129 مترجمین نے جملہ 386 کتابوں کے ترجمے انجام دیے۔ اِن ترجموں میں زبان و بیان کا حسن ہی نہیں' بلکہ ترجمے کی عصری روایت بھی شامل رہیں۔ دارالترجمہ سے شائع شدہ ترجموں کو باضابطہ روایتی ترجمہ کی اہم کوشش کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ ترجمے خوبصورت کتابت اور طباعت کے علاوہ انتہائی عمدہ جلد سازی کی وجہ سے اشاعت کی دنیا میں یادگار کا درجہ رکھتی ہیں۔

18.4.2 دارالترجمہ کی اصطلاحات کمیٹی

عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعہ نصابی کتابوں کی اشاعت کا وقار قائم کیا۔ خوبصورت طباعت اور بہترین جلد اور اس کی خوبصورتی حد درجہ دیدہ زیب ہوتی تھی۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دارالترجمہ کی ترجمہ شدہ کتابیں موجود ہیں' جو آج بھی اپنے وقار کا پتہ دیتی ہیں۔ ترجمہ شدہ کتابوں کے علاوہ دارالترجمہ کے ذریعے نئی اصطلاحات بھی وضع کی گئیں۔ جس کے مطابق دارالترجمہ نے 80 ہزار نئی اصطلاحیں تیار کیں۔ جن کی اشاعت پاکستان کی سرزمین سے ''اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'' کے زیرعنوان دو جلدوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی۔ دارالترجمہ کی اشاعت

کے دور میں ہی ہر فیکلٹی کی اصطلاحات پر مبنی کتابیں اُسی ادارہ سے شائع کی جاچکی تھیں۔اس طرح جامعہ عثمانیہ کی کارکردگی میں جہاں کتابوں کے ترجمے کو اہمیت حاصل رہی ہے' وہیں نئی اصطلاحات پیش کرنے پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ جامعہ عثمانیہ میں ریڈیو کے لیے لاسلکی کی اصطلاح تیار کی گئی۔آپٹیکل کے لیے عینک کی اصطلاح وضع کی۔سائنس اور قانون کے علاوہ میڈیکل سائنس کی بے شمار اصطلاحات جو آج بھی رائج ہیں' جیسے استوانہ، نخز مایہ، جوہر وغیرہ۔ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں میں نئی اصطلاحات شامل کی گئی ہیں۔ ہر شعبے کی نصابی کمیٹی جس کتاب کو منتخب کرکے ترجمے کے لیے مترجم کے پاس بھیجتی ،اُسے مترجم ترجمہ کرنے کے بعد ''وضع اصطلاحات کمیٹی'' کو بھیجتا، جونئی اصطلاحات کی تیاری اوران کی جانچ پرکھ کرتی تھی۔ دارالترجمہ کے توسط سے شائع ہونے والی تمام کتابوں میں کسی بھی قسم کے قابل اعتراض مواد کو دور کرنے کے لیے دوشعبہ جات موجود تھے۔جنہیں ''ناظرادبی'' اور''ناظر مذہبی'' کی حیثیت حاصل تھی۔جن کے ذمے ترجمہ شدہ کتابوں میں کوئی ادبی اور مذہبی اختلاف راہ پاجائے تو اسے دور کرنا ہوتا تھا۔ابتداء میں علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی کو ناظرادبی اور حضرت علامہ عبداللہ عمادی کو ناظر مذہبی مقرر کیا گیا' جس کے بعد جوش ملیح آبادی دارالترجمہ کے ناظر ادبی و مذہبی مقرر کیے گئے۔اس طرح دارالترجمہ کی کارکردگی حد درجہ منصوبہ بند تھی۔علوم وفنون کی دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا اور نئی لفظیات کو اصطلاح کے طور پر استعمال کرکے اردو میں نئی اصطلاحات کو شامل کیا گیا۔اس طرح دارالترجمہ کی کارکردگی میں ترجمہ ہی نہیں' بلکہ اصطلاحات سازی کی خصوصیات کو حد درجہ اہمیت حاصل ہے۔دارالترجمہ سے شائع شدہ ہر کتاب کے آخر میں اصطلاحات کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے درج کی جاتی تھی۔

18.4.3 دارالترجمہ کے ناظم اور مترجمین

جامعہ عثمانیہ میں مختلف شعبہ جات کی تعلیم اور علوم وفنون کی نمائندگی کا سلسلہ جاری رہا۔اس کے طرز تعلیم کی عالمی شہرت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔اوراس یونیورسٹی کی نصابی کتابیں بھی نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی وقار سے زیادہ اہم دارالترجمہ کی ترجمہ شدہ کتابوں میں شامل مواد کو عالمی حیثیت سے آج بھی وقار حاصل ہے۔ دارالترجمہ کے قیام کے ساتھ ہی مغربی علوم وفنون کی اہم کتابوں کی اشاعت اور ترجمے کی روایت کو فروغ دیا گیا۔اس ادارہ سے جملہ 386 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔اس ادارہ کو مستحکم اور کارکرد بنانے کے لیے ہر فیکلٹی کے مترجمین کی طویل فہرست موجود ہے۔سب سے پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق کا دارالترجمہ کے اولین ناظم کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے سید محی الدین، حمید احمد انصاری، محمد عنایت اللہ دہلوی، محمد الیاس برنی، ڈاکٹر نظام الدین اور ایشورناتھ ٹوپا کو دارالترجمہ کے ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع فراہم کیا گیا۔ ایشورناتھ ٹوپا کے دور میں ہی دارالترجمہ کی مستقل حیثیت ختم ہوگئی۔ 1950ء سے اردو کتابوں کی اشاعت منسوخ ہوگئی۔جس کی وجہ سے ترجمے اور اشاعت کے سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا۔ 1955ء تک دارالترجمہ کی کسی بھی کتاب کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔ البتہ 18/اگست 1955ء کورات کے وقت دارالترجمہ کی عمارت میں آگ لگ گئی اور 80ہزار سے ایک لاکھ تک کی کتابیں جل کر خاکستر ہوگئیں، جب کہ آہنی الماریوں میں بند نایاب کتابیں محفوظ رہیں۔ 5 آتش فرو انجنوں کی مدد سے دو گھنٹے کے دوران آگ پر قابو پایا گیا۔اس طرح 18/اگست 1955ء کو دارالترجمہ کا خاتمہ ہوگیا۔جس کی اطلاع اُس دور کے مشہور روزنامہ 'رہنمائے دکن' میں شائع ہوئی تھی۔

دارالترجمہ سے وابستہ مترجمین تین قسم کے ہوتے تھے۔ بیشتر ہمہ وقتی مترجمین کی حیثیت سے کام انجام دیتے تھے۔اس کے علاوہ جزوقتی مترجمین اور پھر موقتی مترجمین بھی کام کرتے تھے۔سائنس، طب، قانون اور دیگر علوم وفنون کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، معاشیات، نفسیات، ریاضیات، طبعیات، انجینئرنگ، حیاتیات اور عمرانیات کی کتابوں کے ترجمہ کرنے والوں میں اہم مترجمین شامل تھے، جن کی فہرست

ضمیمہ میں شامل ہے۔غرض عصر حاضر میں جامعہ عثمانیہ کی اہمیت میں اس وجہ سے اضافہ ہوجاتا ہے کہ عالمی سطح پر اردو کا معیار قائم ہونے اور 1948ء کے بعد جامعہ عثمانیہ کا اردو ذریعہ تعلیم ختم کردیے جانے کے باوجود 1998ء میں ہندوستانی حکومت نے پارلیمانی قانون کے ذریعے دوبارہ حیدرآباد کی سرزمین میں اردو ذریعہ تعلیم کی نئی یونیورسٹی ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'' کا قیام عمل میں لایا اور ہندوستانی زبان اردو کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی تعلیم کی قدر افزائی کی۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دارالترجمہ کے توسط سے جامعہ عثمانیہ کے نصاب کا موقف حاصل کرنے والی ترجمہ شدہ اردو کتابیں عصر حاضر میں معلومات اور علوم کی ترقی کی وجہ سے قابل قبول نہیں رہیں۔اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں میں عام فہم اردو اور آسان زبان کے بجائے اس دور کے تقاضوں کے مطابق باضابطہ عربی اور فارسی تراکیب کے استعمال کی وجہ سے اس دور کی نصابی کتابوں کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔تاہم جامعہ عثمانیہ اور اس کے قیام سے لے کر اس کے توسط سے ترجمہ شدہ کتابیں اردو زبان وادب میں علوم وفنون کی ترویج کے ورثے کی حیثیت سے آج بھی اہمیت کی حامل ہیں اور اسے جامعاتی سطح کی اردو علوم وفنون کی کتابوں کے اہم ورثے کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔

18.5 ضمیمہ جات

(الف) جامعہ عثمانیہ کے چانسلرس (پولیس ایکشن تک)

(1)	سر سید علی امام	1920ء تا 1921ء
(2)	نواب فرید الملک بہادر	1922ء تا 1923ء
(3)	نواب ولی الدولہ بہادر	1924ء تا 1925ء
(4)	مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ	1926ء تا 1937ء
(5)	نواب حیدر نواز جنگ بہادر	1937ء تا 1941ء
(6)	کرنل نواب سر محمد احمد سعید خان	1941ء تا 1945ء
(7)	امین الملک سر مرزا محمد اسماعیل	1946ء تا 1947ء
(8)	میر لائق علی	1947ء تا 1948ء

(ب) جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلرس (پولیس ایکشن کے بعد)

(1)	نواب صدر یار جنگ	1918ء تا 1919ء
(2)	نواب ولی الدولہ بہادر	1920ء تا 1935ء
(3)	نواب مہدی یار جنگ بہادر	1936ء تا 1943ء
(4)	نواب اعظم جنگ بہادر	1943ء تا 1945ء
(5)	نواب علی یاور جنگ بہادر	1945ء تا 1946ء
(6)	ڈاکٹر ولی محمد	1946ء تا 1947ء
(7)	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	1947ء تا 1948ء

(ج) دارالترجمہ کے نظما:

(1)	مولوی عبدالحق بی اے	اولین ناظم	ستمبر 1917ء تا اگست 1919ء

(2)	مولوی احمد محی الدین ایم اے بار ایٹ لا	منصرم ناظم	اگست 1919ء تا فروری 1920ء	
(3)	مولوی حمید احمد انصاری بی اے	نگران ناظم	فروری 1920ء تا جنوری 1921ء	
(4)	مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی بی اے	ناظم	جنوری 1921ء تا جنوری 1935ء	
(5)	مولوی محمد الیاس برنی ایم اے، ایل ایل بی	ناظم	جنوری 1935ء تا جنوری 1945ء	
(6)	پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین	ناظم	جنوری 1945ء تا اکتوبر 1948ء	
(7)	پروفیسر محمود احمد خان	نگران ناظم (رجسٹرار)	اکتوبر 1948ء تا 23/دسمبر 1948ء	
(8)	ایشور ناتھ ٹوپا	ناظم شعبہ ترجمہ وطباعت	1948ء تا 1956ء کے بعد بھی ان کی خدمات جاری رہیں۔	

(د) دارالترجمہ کے چند اہم مترجمین

(2) مولانا عبدالحلیم شرر	(3) مولانا عبدالماجد دریابادی	(4) مولانا ظفر علی خان
(5) مولانا عبداللہ عمادی	(6) علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی	(7) شبیر حسین خان جوش ملیح آبادی
(8) قاضی تلمذ حسین	(9) ڈاکٹر یوسف حسین خان	(10) مولانا عنایت اللہ دہلوی
(11) پروفیسر ہارون خان شروانی	(12) رشید احمد صدیقی	(13) مولانا الیاس برنی
(14) محمد فداء علی طالب	(15) سید ہاشمی فرید آبادی	(16) سید ہاشم ندوی
(17) مولانا سید محمد ابراہیم ندوی	(18) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	(19) عبدالباری ندوی
(20) پروفیسر عبدالقدیر حسرت	(21) حکیم عبدالباقی شطاری	(22) مولانا محمد سبزواری
(23) ڈاکٹر محمد حمید اللہ	(24) محمد نذیر احمد	(25) محمد عبدالرحمٰن خان
(26) چودھری برکت علی	(27) پروفیسر فیروز الدین	(28) پروفیسر محمد سعید الدین
(29) ڈاکٹر خواجہ حبیب حسن	(30) ڈاکٹر مظفر الدین قریشی	(31) ڈاکٹر غلام دستگیر
(32) ڈاکٹر مفتی شاہ نواز	(33) ڈاکٹر حیدر علی خان	(34) ڈاکٹر خورشید حسین
(35) ڈاکٹر فضل کریم خان	(36) حکیم کبیر الدین	(37) ڈاکٹر خلیل الرحمٰن
(38) ڈاکٹر محمد حسین	(39) قاضی محمد حسین	(40) کشن چند
(41) پروفیسر حسین علی مرزا	(42) جئے تیرتھ سستورکر	(43) مرتنجے راؤ
(44) رائے بیج ناتھ	(45) پروفیسر محمد مجیب	(46) محمد عاقل
(47) محمد نصیر الدین خان	(48) محمد احمد محی الدین انصاری	(49) سید علی رضا
(50) عبدالمجید صدیقی		

18.5 اکتسابی نتائج

☆ جنوبی ہند کے علاقے حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم کی تدریس کا اہتمام بالکل نہیں تھا۔ ریاست حیدرآباد پر آصف جاہی سلطنت کے بادشاہ حکمران تھے۔ انگریز دورِ حکومت کی وجہ سے ہندوستان کے تین اہم مقامات جیسے ممبئی، کولکتہ اور مدراس میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا جا چکا تھا۔

☆ حیدرآباد کے طالب علم اگر اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تو انہیں مدراس یونیورسٹی سے امتحان دے کر کامیاب ہونا پڑتا یا پھر علی گڑھ سے امتحان دے کر اپنی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنا ضروری تھا۔ چھٹے نظام نواب میر محبوب علی خان کے دور میں حیدرآباد کے نامور اشخاص نے ''محبوب یونیورسٹی'' کی تحریک چلائی۔ ان کے انتقال کے بعد دارالعلوم حیدرآباد کے سابقہ طالب علموں کی تحریک سے حیدرآباد میں نئی یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ تیز ہوگیا۔

☆ نواب رفعت یار جنگ اور سر اکبر حیدری کی نمائندگی سے حیدرآباد کے ساتویں بادشاہ نواب میر عثمان علی خان نے شاہی فرمان کے ذریعہ ''جامعہ عثمانیہ'' کے قیام کی منظوری دے دی۔ اس یونیورسٹی کے تعلیمی نظام کو اردو زبان سے وابستہ کیا گیا۔ اس لیے آرٹس، سائنس اور میڈیکل سائنسز کے علاوہ انجینئرنگ اور قانون کی نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے جامعہ عثمانیہ کے قیام سے ایک سال قبل 14/اگست 1917ء کو اردو میں علوم فنون کی کتابوں کی فراہمی کے لیے ترجمہ اور اشاعت کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' کا آغاز شاہی فرمان کے ذریعہ ہوا۔

☆ جامعہ عثمانیہ کے آغاز کے لیے توپ کا سانچہ (گن فاؤنڈری) میں کرایہ کی عمارتیں حاصل کی گئیں اور ہر عمارت کو مختلف نام جیسے سائنس منزل، آرٹس منزل، قانون منزل اور میڈیسن منزل کے نام سے یاد کیا گیا۔ جماعتوں کے آغاز کے لیے مرکزی عمارت ''آغا منزل'' قرار دی گئی جہاں پر افتتاحی جلسے کے ساتھ 28/اگست 1919 سے باضابطہ ایف اے کی جماعتوں کا آغاز ہوا۔

☆ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کے لیے تقررات کا عمل 1918ء میں مکمل ہوا۔ سرکاری خزانہ سے بھاری رقم یونیورسٹی کے انتظامیہ اور مختلف محکمہ جات کے قیام کے لیے منظور کی گئی۔ ابتداء میں جامعہ عثمانیہ کے ذریعے تین شعبہ جات کا آغاز ہوا۔ جس کے تحت یونیورسٹی کے مجوزہ نصاب کے تحت میٹری کولیشن اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ اِن امتحانات کے لیے انگریزی لازمی مضمون رکھا جب کہ اختیاری مضامین میں اردو، تلگو، مراٹھی، کنڑی، سنسکرت اور تامل کے علاوہ بیرونی زبانیں عربی، فارسی، فرانسیسی، لاطینی اور یونانی کو بھی اہمیت دی گئی۔ انٹرمیڈیٹ میں آرٹس اور سائنس گروپ کو علاحدہ کیا گیا۔ جس کے بعد دینیات اور غیر مسلموں کے لیے اخلاقیات کو بھی مضمون کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔

☆ سب سے پہلے علوم السنہ، علوم عمرانیات جیسے تاریخ، فلسفہ، قانون اور دینیات کی جماعتوں سے جامعہ کا آغاز ہوا۔ ابتدائی جماعت FA کے طالب علموں میں حیدرآباد سے پانچ طلباء اور شہر اورنگ آباد سے سات طلبہ شامل رہے۔

☆ عثمانیہ یونیورسٹی کا انتظام چلانے کے لیے کیبنٹ قائم کی گئی۔ جو وقفہ وقفہ سے میٹنگ کے ذریعے اپنی ضروریات کی تکمیل کرتی تھی۔ ہر شعبے میں کارگذار اساتذہ اور ان کے مددگار اپنے شعبے کا نصاب مرتب کر کے کتابوں کی فہرست دارالترجمہ کے حوالے کر دیتے تھے۔

☆ دارالترجمہ سے وابستہ ہمہ وقتی اور جز وقتی مترجمین نصاب کی کتابوں کا ترجمہ کیا کرتے اور اس میں نئی اصطلاحات کے بارے میں وضاحتی نوٹ پر اصطلاحات کی کمیٹی ان پر غور کرتی اور مناسب اصطلاح ہو تو قبول کی جاتی یا پھر نئی اصطلاح وضع کی جاتی تھی۔ دارالترجمہ کے توسط سے سائنس، قانون، طب اور آرٹس کی 386 کتابیں شائع کی گئیں اور 80 ہزار اصطلاحات تیار کی گئیں۔ غرض یہ کہ جامعہ عثمانیہ کے معیاری نصاب کو برقرار رکھنے اور طلبہ میں اردو ذریعہ تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے سلسلے میں دارالترجمہ کے مترجمین کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

☆ دارالترجمہ میں نہ صرف ترجمہ کرنے والے ماہرین موجود ہوتے تھے' بلکہ اصطلاحات بنانے والی کمیٹی کے علاوہ ناظر ادبی اور ناظر مذہبی کے توسط سے شائع ہونے والی کتاب میں کوئی بھی ادبی اور مذہبی نقص کو شامل ہونے سے روکا جاتا تھا۔ یہی وجہ رہی کہ جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں پر کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا۔

☆ دارالترجمہ سے وابستہ 8 ناظم اور 129 مترجمین نصابی کام انجام دیتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارت کے لیے نواب میر عثمان علی خان نے شہر سے دور اڈکمیٹ کے علاقہ میں 1600 ایکر زمین پر تعمیر کا نقشہ منظور کیا۔ اور وہاں عمارتوں کی تعمیر اور اساتذہ کے قیام کے علاوہ طلبہ کی رہائش گاہوں کو آراستہ کیا گیا۔

☆ 1935ء سے 1938ء تک اڈکمیٹ میں یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر ہوتی رہی۔ اور پھر تمام سرگرمیوں کو گن فاؤنڈری سے اڈکمیٹ منتقل کر دیا گیا۔ 1921ء تک جامعہ عثمانیہ کے اسٹاف اراکین میں 25 افراد اور باقاعدہ طلبہ کی تعداد 225 تھی۔ سائنس کے طلبہ کو سہولت فراہم کرنے کے لیے نظامیہ رصدگاہ قائم کی گئی۔ پہلے سال کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ دوسری ہندوستانی جامعات سے گیارہ طلبہ نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔

☆ طلبہ کی تین انجمنیں قائم ہوئیں۔ کالج میں گیمس اور کھیل کود کو اہمیت دی گئی۔ بورڈنگ ہاؤس اور طلبہ کی فلاح کے لئے بزم مباحثہ اور کتب خانے کے علاوہ مطالعہ گھر کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کا پہلا بی اے کا امتحان جون 1923ء میں ہوا اور پھر 1924ء میں ایم اے کے امتحانات کا آغاز ہوا۔

☆ طلبہ کو یونیورسٹی کی طرف سے اسکالرشپ دی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو یورپ سے استفادہ کی غرض سے سرکاری امداد فراہم کیا جاتی تھی۔ 1918ء سے لے کر 1948ء تک جامعہ عثمانیہ کے تمام فیکلٹیز میں اردو ذریعہ تعلیم کا رواج تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد نئی حکومت نے سینیٹ کی منظوری کے بغیر، یونیورسٹی کے اردو ذریعہ تعلیم کو تبدیل کر دیا۔ انگریزی کو یونیورسٹی کی زبان کا موقف حاصل ہو گیا۔

☆ تمام طلبہ کو مزید تین سال تک اردو ذریعہ تعلیم سے امتحان دینے کی سہولت فراہم کی گئی۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ کا ایک سنہری دور ختم ہو گیا۔ جس کے ذریعے اردو میں سائنس، میڈیکل سائنس، انجینئرنگ، قانون اور آرٹس کے علاوہ شعبہ تعلیمات میں تدریسی سہولتوں کی فراہمی کے لیے دارالترجمہ کی کتابیں امدادی کتب کی حامل ہو گئیں۔ غرض جامعہ عثمانیہ کا خوشگوار ماضی اردو ذریعہ تعلیم سے وابستہ ہے۔ جب کہ اس یونیورسٹی نے اپنے آغاز کے 100 سال مکمل کر لیے ہیں۔ جب کہ اس یونیورسٹی سے فارغ لاتعداد طلباء اور طالبات برصغیر ہی نہیں' بلکہ خلیجی ممالک اور یوروپی ممالک میں اپنی خدمات انجام دے کر یونیورسٹی کا نام روشن کرنے کے اہم کارنامے انجام دے رہے ہیں۔

☆ اس یونیورسٹی کی سلور جوبلی' گولڈن جوبلی، ڈائمنڈ جوبلی' پلاٹینم جوبلی اور صد سالہ تقاریب بڑی شان وشوکت سے منائی گئیں۔ خلیجی ممالک اور یوروپی ممالک میں برسرروزگار جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں نے جامعہ عثمانیہ کے یادگار خوبصورت مجلّے شائع کیے، جس سے جامعہ عثمانیہ کی عظمت رفتہ کا ثبوت ملتا ہے۔

18.6 کلیدی الفاظ

ڈائریکٹر	:	ناظم	باب الداخلہ	:	داخل ہونے کا دروازہ' مین گیٹ

اختراع	:	نئی بات نکالنا، ایجاد	معروضہ	:	عرضی، عریضہ
عرضداشت	:	درخواست، گذارش	فرمان	:	شاہی حکم نامہ
سینیٹ	:	یونیورسٹی کے اساطین کی مجلس	طباعت	:	پرنٹنگ
عصری	:	زمانے کی ضرورت کے مطابق	اصطلاح	:	مشترکہ طور پر لفظ کے معنی مقرر کرنا
مدارالمہام	:	وزیراعظم کا عہدہ، منتظم	معین المہام	:	مددگار وزیر۔ نائب منتظم
انضمام	:	ضم ہونا، شرکت، الحاق	علوم السنہ	:	زبانوں کا علم
عمرانیات	:	معاشرہ سے متعلق علوم	رصدگاہ	:	اجرام فلکی کا دوربین سے مشاہدہ کا مقام

18.7 نمونۂ امتحانی سوالات

18.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی منظوری کس بادشاہ کے ذریعہ حاصل ہوئی؟

2۔ جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں کس مقام پر شروع ہوئیں؟

3۔ جامعہ عثمانیہ میں نصابات کی ترتیب کے ذمہ دار کون تھے؟

4۔ جامعہ عثمانیہ کی کتابوں کی اشاعت کس ادارہ کے سپرد کی گئی تھی؟

5۔ جامعہ عثمانیہ کے ادارے دارالترجمہ کے دو مترجمین کے کسی نام اور کام لکھیے؟

18.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تحریک کا جائزہ لیجیے؟

2۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے حیدرآباد کے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کن یونیورسٹیوں سے رجوع ہونا پڑتا تھا؟

3۔ جامعہ عثمانیہ کی ابتدائی جماعتیں اور موجودہ کیمپس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

18.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ محبوب یونیورسٹی سے عثمانیہ یونیورسٹی تک کے سفر کی تفصیلات بیان کیجیے؟

2۔ دارالترجمہ کے قیام اور اس کے اختتام کی تفصیلات بیان کیجیے؟

18.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ جامعہ عثمانیہ — از محمد عبدالحیٔ

2۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد — پروفیسر مجید بیدار

3۔ دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی و ادبی خدمات — ڈاکٹر مجیب الاسلام

اکائی 19 : علی گڑھ تحریک

اکائی کے اجزا

19.0 تمہید
19.1 مقاصد
19.2 پس منظر
19.3 سرسید احمد خاں کی خدمات
19.3.1 سماجی خدمات
19.3.2 تعلیمی خدمات
19.3.3 ادبی خدمات
19.4 سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات
19.4.1 الطاف حسین حالی
19.4.2 علامہ شبلی نعمانی
19.4.3 ڈپٹی نذیر احمد
19.4.4 نواب محسن الملک
19.4.5 دیگر رفقا
19.5 اکتسابی نتائج
19.6 کلیدی الفاظ
19.7 نمونہ امتحانی سوالات
19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
19.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

19.0 تمہید

انسانی زندگی مسلسل حرکت میں ہے پھر بھی زندگی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جس میں نقل درنقل اور رواج در رواج عمل کرتے رہنے سے

جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔اس جمود کو توڑنے کے لیے افراد یا جماعتیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں' ان کے اس کام کو تحریک کہتے ہیں۔دنیا میں فنون لطیفہ اور ادب کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ادب میں بھی جمود اور سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔انیسویں صدی میں انقلاب 1857ء کا واقعہ اردو ادب کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔کیوں کہ ہمارا ادب گذشتہ سے پیوستہ رہتے ہوئے نئی توانائی اور جدید اصناف کے ساتھ سفر کرتا ہے۔اس کو وقت کے تقاضے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور با مقصد بنانے میں سرسید یا علی گڑھ تحریک کا بڑا اہم کردار ہے، اس کا تفصیلی جائزہ آپ اس اکائی میں پڑھیں گے۔

19.1 مقاصد

اس اکائی میں آپ علی گڑھ تحریک' اس کے پس منظر' سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ علی گڑھ تحریک کے پس منظر کو سمجھ سکیں۔

☆ علی گڑھ تحریک کے مقصد کو سمجھ سکیں۔

☆ سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات سے واقف ہو سکیں۔

19.2 پس منظر

1757ء کی جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان جدید دور میں داخل ہوتا ہے۔یہ پہلا موقعہ تھا جب یوروپی تجارتی قوم نے ہندوستان کی سیاست میں ریشہ دوانیوں کا فائدہ حاصل کر کے، اپنا استبدادی پنجہ گاڑ دیا۔بنگال کی بے شمار دولت ہاتھ لگنے کے بعد انگریزوں کی نیت خراب ہو گئی۔پھر 1764ء کی بکسر کی لڑائی میں مغل، اودھ اور بنگال کی متحدہ افواج کو انگریزوں نے شکست دے کر اپنی فوجی برتری کو ثابت کر دیا۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کو بھی رفتہ رفتہ انگریزوں نے شکست دے کر یا کمزور کر کے لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔آخر یہ ظلم و بربریت کب تک؟ ہندوستانیوں کے ذہنوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکنے لگی۔چنانچہ جنگ پلاسی کے ٹھیک سو سال بعد 1857ء میں انگریزوں کے خلاف پورے ہندوستان میں جنگ لڑ کر انھیں بے دخل کرنے کی آخری کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش دیرپا ثابت نہ ہوئی جس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً اتحاد و اتفاق کی کمی، بہتر اور منظم فوج کا نہ ہونا، انگریزوں کے مقابلے میں ناقص ہتھیار اور اسلحہ، ترسیل و رابطہ کی عدم موجودگی، انگریزی خفیہ محکمہ کی چابکدستی اور خود ہندوستانیوں کے ذریعہ مخبری اور غداری کرنا وغیرہ وغیرہ ایسے حقائق تھے جس کی بنا پر چند مہینوں میں انگریزوں نے پورے انقلاب کو کچل ڈالا اور صدیوں سے قائم مغل شہنشاہیت کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بھی ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔

انقلاب 1857ء ہندوستانی تاریخ کے سب سے اہم واقعات میں سے ایک ہے' جس نے ایک نئے ہندوستان کو جنم دیا۔انگریزوں اور پہلے کی دیگر فاتح قوموں میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ موخرالذکر نے ہندوستان کو غلام نہیں بنایا بلکہ وہ خود اس کے غلام ہو گئے جب کہ اس کے برعکس انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنایا۔نسلی تفوق، علمی برتری اور عسکری قوت کا زعم ان میں موجود تھا نتیجتاً ہندوستانی عوام ذہنی کشمکش میں

مبتلا ہو کر احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ انھیں اس مصیبت سے نکالنے کے لیے بہت سارے مصلح قوم اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے مختلف انداز سے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ذریعہ مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ ایسے ہی ایک مصلح قوم کا نام سرسید احمد خان ہے جن کی تحریک علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

انیسویں صدی کی ان تحریکات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک کی بنیاد انگریزوں سے مفاہمت پر ہے جو مغربی علوم، سائنسی طرز فکر، منطقی استدلال اور عقلیت پرستی کی روشنی میں تجدیدی کام کرنا چاہتا تھا تاکہ کھویا ہوا وقار بحال ہو سکے ساتھ ہی انگریزوں کے ذہنوں میں ہندوستانیوں کے تئیں جو شکوک وشبہات ہیں اس کا ازالہ بھی ہو جائے۔ دوسری طرح کی تحریکات کی بنیاد انگریزوں سے نفرت پر ہے جو مغربی ثقافتی یلغار کے سامنے اپنی مشرقی روایات، تشخص، تہذیب وثقافت کو مٹنے دینا نہیں چاہتا۔ اس نے عقلیت کے بجائے عقائد اور تجدید کے بجائے احیا پر زور دیا۔ اول الذکر میں برہمو سماج، پرارتھنا سماج اور علی گڑھ تحریک وغیرہ جب کہ دوسری طرح کی تحریکات میں آریہ سماج، رام کرشن مشن اور دیوبند تحریک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1857ء کے انقلاب میں چوں کہ مسلمانوں کا بڑا اہم رول رہا اور انگریز اس بات سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھیں ہر پہلو سے نظرانداز کرنا ضروری سمجھا۔ سرسید نے اپنی انتھک کوششوں سے ایک طرف انگریزوں کے ذہنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف مختلف انجمنوں اور علی گڑھ کالج کے قیام، تصنیف، تالیف، مضامین، صحافت اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی، سیاسی اور سماجی انحطاط کو دور کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا۔ علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کے تنزل کے سدباب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جس کا ذکر آئندہ اکائی میں کیا جائے گا۔ اس اکائی میں سرسید اور ان کے رفقا کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

19.3 سرسید احمد خاں کی خدمات

19.3.1 سماجی خدمات:

یکم اپریل 1869ء کو سرسید انگلینڈ روانہ ہوئے۔ گرچہ اس سے پہلے اپنی تصنیفات اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھے گئے اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے ذریعہ انھوں نے اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر اکتوبر 1870ء میں انگلینڈ سے واپس ہوئے تو ان کے ذہن میں سماجی اصلاح اور تعلیمی تصور کا ایک واضح خاکہ موجود تھا۔ انھوں نے ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ'' قائم کر کے تعلیمی مشن کو عملی جامہ پہنایا بلکہ ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ جاری کر کے سماجی اصلاح کا کام انجام دیا۔

تہذیب الاخلاق جسے ''محمڈن سوشل رفارمر'' بھی کہتے تھے' کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں جدید زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے نیز ان تمام خرابیوں کو دور کیا جائے جو سماج کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی ایک اشاعت میں سماجی اصلاح سے متعلق 29 نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا جن میں چند نکات درج ذیل ہیں:۔

سب سے پہلے ''آزادیٔ رائے'' کو سرسید ضرور سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ انسان کو آزادانہ رائے دینے کا حق ہو تو دنیا کی آدھی برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ ''دین اور دنیا'' کی تفریق کو وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔ دین اور دنیا کے بارے میں سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے میں جدید علوم

اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔ سرسید قوم میں ''خود اعتمادی'' پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ تھا کہ دوسروں کے دستِ نگر نہ ہوں اور اپنے مسائل آپ حل کرنا سیکھیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ''اپنی مدد آپ'' کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اپنی مدد آپ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ترقی کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق خود کسی بیرونی امداد کا انتظار کیے بغیر کوشش کیے۔

یہی جذبہ ترقی کی بنیاد ہے۔ ''ناامیدی اور مایوسی'' کو وہ قوم کے لیے انتہائی مضر سمجھتے تھے۔ سرسید نے اپنے مشن میں بار بار ناکام ہونے کے باوجود اپنا کام جاری رکھا اور آخر ایک دن اپنی منزل کو پالیا۔ اپنے مضمون ''امید کی خوشی'' میں بڑی خوب صورتی سے انہوں نے مثالوں کے ذریعہ اس بات کو سمجھایا ہے۔ ''رسم و رواج'' کی پابندی کو سرسید نے بندر کی نقل سے تشبیہ دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نقل کے بجائے عقل سے کام لے کر اچھی رسموں کو اختیار کرے اور بری رسموں کو رد کرے۔ کاہلی اور سستی کسی کے نزدیک بھی اچھی چیز نہیں ہے۔ مگر سرسید نے ''کاہلی و سستی'' کو جسمانی محنت کے بجائے قلبی اور عقلی محنت کی کمی کو سمجھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں دل، دماغ اور عقل کو قوم کے مفید کاموں میں استعمال کرے۔ ''خوشامد'' سرسید کے نزدیک دل کی بیماریوں میں سب سے زیادہ مہلک ہے۔ اس کی وجہ سے انسان خودغرضی اور مطلب پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''ریاکاری'' کو انہوں نے تہذیب اور معاشرت کا دشمن بتایا ہے۔ ریاکاری ظاہر و باطن کو الگ کرتی ہے۔ ریاکار آدمی آسانی سے اپنے دوست کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ ''بحث و تکرار'' بھی سرسید کے نزدیک ایک اچھی چیز نہیں۔ اس سے دلوں میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے اور ''تعصب'' کو سرسید بدترین خصلتوں میں سے ایک خصلت بتاتے ہیں۔ یہ نیکیوں کو برباد اور خوبیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ عدل و انصاف اس کی وجہ سے جاتا رہتا ہے۔

ان چند انتہائی اہم اور قابلِ غور معاشرتی خرابیوں کی طرف سرسید نے توجہ مبذول کرائی ہے جن کو دور کر کے قوم ترقی کر سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ برائیاں ہمارے سماج میں پنپ رہی تھیں اور پنپ رہی ہیں جس کو سرسید نے محسوس کر کے بلا خوف لکھا، بتایا اور دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ 1857ء کے واقعہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ سرسید کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

19.3.2 تعلیمی خدمات؛

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا ہے۔ وہ قوم کے سارے امراض کا علاج مغربی تعلیم میں تلاش کرتے ہیں۔ 1857ء کے بعد ملک کے حالات تیزی سے بدل گئے۔ اندازِ فکر، رہن سہن، تعلیمی نظام اور نصاب کے علاوہ ہر چیز پر اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اب اگر ملازمتوں کو حاصل کرنا ہے، سماج میں بہتر زندگی گذارنا ہے، حکومت میں اپنی رسائی حاصل کرنا ہے، تجارت، صنعت و حرفت کے شعبوں میں ترقی کرنا ہے تو جدید تعلیم سے منہ موڑ نہیں سکتے۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ صدیوں تک حکومت ان کے پاس تھی ان کے علوم اور زبان کو دیگر اقوام سیکھ اور پڑھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اپنی زبان اور علوم کو ترک کر کے دوسرے علوم اور زبان کو سیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس کے لیے اتنی جلدی سے یہ آمادہ نہیں تھے۔ سرسید نے وقت کے تقاضہ کو سمجھا اور لاکھ مخالفتوں کے باوجود اپنے مشن میں لگے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب مسلمانوں کو بھی جدید علوم پڑھنے پڑیں گے۔ ابتدا میں سرسید ہندو اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے یکساں کوشش کرتے رہے مگر راجہ رام موہن رائے نے بہت پہلے ہی ہندوؤں میں بیداری پیدا کر دی تھی اور ان کے سامنے مسلمانوں کی طرح کوئی

مسئلہ بھی نہیں تھا۔ وہ پہلے عربی اور فارسی پڑھتے تھے اب انگریزی پڑھنے میں انہیں کیوں کر جھجک محسوس ہوگی۔ البتہ سرسید نے اپنے تعلیمی ادارے کے دروازے غیر مسلموں پر بھی اسی طرح کھلے رکھے جس طرح مسلمانوں پر۔

سرسید اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمان انگریزی سیکھنے پر راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے وہ جدید علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔ گرچہ دہلی کالج کی ''ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' نے یہ کام انجام دیا تھا لیکن بے وقت کالج بند ہوجانے سے یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔ اس مقصد کے تحت سرسید نے غازی پور میں اپنے قیام کے دوران 9 جنوری 1869ء کو ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی بعد میں ان کے تبادلہ کے ساتھ یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے۔

آغاز میں سرسید مادری زبان یعنی اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا چاہتے تھے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو پہلے گذر چکی یعنی مسلمان انگریزی کی طرف مائل نہیں ہو رہے تھے۔ دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان کی کہ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے تو دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک تو اصل مضمون پر دوسرے زبان سیکھنے پر مزید یہ کہ یہ علم دیرپا نہیں ہوتا اس لیے ان کے ذہن میں ایک ورناکلر یونیورسٹی کا خاکہ موجود تھا۔ مگر برطانیہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد ان کی فکر میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے اور وہ اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنانے کی پرزور دعوت دیتے ہیں۔ اپنے اس موقف کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ ''تمام علوم کو اردو میں منتقل نہیں کیا جاسکتا جب کہ جدید علوم کو حاصل کرنا ناگزیر ہوگیا ہے دوسرے یہ کہ حکمرانوں کی زبان انگریزی ہے۔ تیسرے یہ کہ راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں برادرانِ وطن انگریزی زبان کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے آگے بڑھ چکے ہیں''۔ بہرحال سرسید نے برطانیہ سے لوٹ کر دو بڑے کام انجام دیے۔ ایک مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے تہذیب الاخلاق پرچہ کا اجرا' دوسرے تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام۔

24 مئی 1875 کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید کا قائم کردہ یہ کالج آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی کا بڑا اہم کردار ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حالاں کہ ان کے اس تعلیمی مشن میں رکاوٹیں بھی پیدا کی گئیں۔ مولوی امداد علی اور مولوی علی بخش کٹر مخالفین میں تھے۔ شبلی نعمانی نے بھی بعض چیزوں میں سرسید کی مخالفت کی۔ اکبرالہ آبادی شروع میں اپنی شاعری کے ذریعہ سرسید پر چوٹیں کسیں مگر بعد میں مداح ہوگئے۔ سرسید کا ساتھ دینے والوں میں الطاف حسین حالی' ڈپٹی نذیر احمد' منشی ذکاء اللہ' محسن الملک' وقار الملک' مولوی سمیع اللہ وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ سرسید کے ان رفقا نے بھی تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں۔

سرسید تعلیم کو سبھی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مگر تعلیم حاصل کرنے والوں کو وہ چھ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے تعلیم کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو تجارت یا صنعت وحرفت کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتے ہیں۔ تیسری طرح کے لوگوں میں زمین دار اور جاگیردار آتے ہیں (یہ آزادی سے قبل کا طبقہ ہے)۔ چوتھی قسم میں ایسے لوگ آتے ہیں جو مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کر کے تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پانچواں طبقہ علم دین حاصل کرنے والوں کا ہے۔ چھٹا گروہ عام لوگوں کا ہے جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے اپنے روزمرہ کے کاموں میں معمول کے مطابق لگا رہنا چاہتا ہے۔ اگر ان تمام پر غور

کیا جائے تو سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں پہلی قسم کے لوگ یعنی سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند ہی متوجہ ہوئے۔ یہاں کے طلبا نے ملازمت ہی کو ترجیح دی اور کالج کے ارباب حل وعقد کا مقصد بھی یہی تھا کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کو اطمینان بخش بنایا جائے۔

عورتوں کی تعلیم کی طرف سرسید نے خاطرخواہ توجہ نہیں دی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے مخالف تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ مرد جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کی بات ہے اس کا خاکہ بھی سرسید کے ذہن میں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کے ادارے قائم ہوں اس مقصد کے لیے انہوں نے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ بہرحال سرسید کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان بالآخر تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ سرسید نے تعلیم کے لیے کون کون سے اقدامات کیے؟

2۔ سرسید کے تعلیمی تصور کو بیان کیجیے۔

3۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام کے پس منظر بتایئے۔

19.3.3 ادبی خدمات؛

سرسید بے انتہا مصروف انسان تھے پھر بھی انہوں نے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تصنیف و تالیف میں جیسا میرا جی لگتا ہے ویسا کسی اور کام میں نہیں لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیاسی' سماجی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے ہوئے لکھنے پڑھنے کے مشغلہ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک بڑی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ سرسید کے تمام کاموں سے کچھ نہ کچھ اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اردو زبان وادب کی جو خدمات انہوں نے انجام دیں ان کا اعتراف دوست دشمن سبھی کرتے ہیں۔

سرسید نے کم عمری میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ وفات کے نو دن پہلے تک چلتا رہا۔ آخری مضمون انہوں نے تہذیب الاخلاق میں اردو کی حمایت میں لکھا تھا جب کہ آغاز اپنے بڑے بھائی کے اخبار ''سید الاخبار'' سے کیا۔ ان کی پہلی کتاب 'رسالہ القلوب بذکر محبوب'' ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ تاریخ کی تین اہم کتابوں ''آئین اکبری'' ''تاریخ فیروز شاہی'' اور ''تزک جہانگیری'' کو مرتب کیا۔ دہلی کی عمارتوں کا تفصیلی جائزہ ''آثار الصنادید'' میں لیا ہے۔ انقلاب 1857ء کے تعلق سے ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کی۔ مذہب پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں ''تفسیر قرآن''، ''تفسیر انجیل'' (تبئین الکلام)، ''خطبات احمدیہ''، ''ابطال غلامی اور'' احکام طعام اہل کتاب'' وغیرہ اہم ہیں۔ کل ملا کر چالیس سے زائد کتابیں سرسید نے تحریر کیں۔ جہاں تک ادب کی بات ہے اس پر باضابطہ کتاب تو نہیں لکھی البتہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی (بعد کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) اور تہذیب الاخلاق میں شائع ان کے انشائیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان' اسلوب اور نثر کو خود سرسید اور ان کی تحریک نے کس قدر متاثر کیا ہے۔ انہوں نے آسان اور سادہ نثر نگاری کو فروغ دیا۔ گرچہ فورٹ ولیم کالج اور خطوطِ غالب کے ذریعہ اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی مگر ابھی یہ رجحان عام نہیں ہوا تھا۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک نے اردو ادب

کی یہ بڑی خدمت کی کہ پُر تکلف نثر کو ترک کر کے سلیس و سادہ نثر کو ترقی دی۔ دوسرا کام یہ کیا کہ تحریر کو با مقصد اور افادیت کا حامل بنایا۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کے جو ادبی مضامین یا انشائیے شائع ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں: بحث و تکرار، امید کی خوشی، گزرا ہوا زمانہ، جاڑہ، تعلیم، رسم و رواج کی پابندی، آزادیٔ رائے، سمجھ، دنیا بہ امید قائم ہے، اخلاق، ریاکاری، خوشامد، اپنی مدد آپ وغیرہ۔

سرسید نے اپنے ان تمام مضامین میں انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ فطرت کی سچی تصویر کشی، دردانگیزی، اثر پذیری، حقیقت نگاری، افادیت پسندی وغیرہ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک بڑا وصف ان کی تحریروں کا یہ بھی ہے کہ علمی اصطلاحات، الفاظ اور تعلیمات کو بڑی سادگی، صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

''مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات سمجھتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں کہتا کہ واہ تم کیا جانو؟ وہ بولتا ہے تم کیا جانو؟ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہوجاتی ہیں، باچھیں چڑھ جاتی ہیں۔ لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک اُدھر۔'' (بحث و تکرار)

اسے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آسان الفاظ میں انسانی فطرت کی کتنی سچی تصویر کھینچی ہے۔ یہ اثر ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ شوخی و ظرافت کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔

شاعری سے سرسید کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی۔ البتہ ان نقائص کی نشاندہی کی ہے جو ہماری شاعری میں راہ پا گئے۔ شاعروں کو مفید مشورے بھی دیے۔ انجمنِ پنجاب لاہور کی زیر نگرانی جب نئی طرز کی شاعری کو رواج دیا گیا تو محمد حسین آزاد کو جو اس انجمن کے روح رواں تھے، سرسید نے مبارک باد دی۔ سرسید کی یہ بڑی تمنا تھی کہ شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جائے چنانچہ الطاف حسین حالؔی سے انہوں نے مسدس، مدوجزر اسلام لکھوائی جو آج تک اپنی اثر انگیزی، مضمون آفرینی، سادگی اور خلوص کی وجہ سے اتنی ہی مقبول ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو سرسید کی کوششوں سے ادب کی دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا اور کچھ ہی دنوں میں نثر و نظم کا ایسا سرمایہ فراہم ہوگیا جس پر فخر کیا جاسکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ سرسید کی چند اہم کتابوں کے نام بتایئے؟

2۔ سرسید سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچا؟

3۔ آپ نے سرسید کے کتنے مضامین پڑھے ہیں کسی ایک کا خلاصہ لکھیے؟

19.4 سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات

17.4.1 الطاف حسین حالؔی:

حالؔی کا وطن پانی پت (ہریانہ) ہے۔ 1854ء میں جس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی، دہلی آئے اور ادبی شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ خصوصاً غالبؔ سے وہ بڑے متاثر ہوئے اور ان سے گہرا رشتہ وابستہ ہوگیا۔ 1857ء کی بغاوت میں وہ دہلی سے چلے گئے پھر 1863ء میں

دہلی واپس ہوگئے۔اس سفر میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملاقات ہوئی۔ بغاوت کے بعد وہ دہلی زیادہ دنوں نہ رہ سکے اور لاہور چلے گئے۔اسی زمانے میں انجمنِ پنجاب لاہور نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ یہ اس سے وابستہ ہوگئے۔سکریٹری بھی بنائے گئے۔انہوں نے انجمن کے لیے چار نظمیں ''برکھارُت''، ''نشاطِ امید''، ''مناظرہ رحم وانصاف'' اور ''حبِ وطن'' لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔چند سال لاہور رہ کر وہ پھر دہلی چلے آئے۔

دہلی آکر اردو نثر نگاری کی طرف توجہ دی کیوں کہ اب وہ سرسید کی صحبت میں آگئے تھے۔ان کی نثر میں سرسید کی چھاپ بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ مثلاً سادگی' منطقی استدلال اور بے تکلف اظہار وغیرہ سرسید کے اثرات کا نتیجہ ہے۔سادگی میں لطافت' منطقیت میں شاعرانہ انداز' تمثیلی پیرایہ' فطری اور بول چال کا لہجہ' عربی اور فارسی الفاظ سے احتراز مگر بعض جگہ انگریزی کا بے جا استعمال حالؔی کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ حالؔی کی نثر نگاری کو دیکھنا ہے تو ان کی سوانحی تصانیف کو پڑھنا چاہیے۔اردو میں سوانح نگاری کو سرسید تحریک نے ہی جلا بخشی۔ حالؔی نے تین اہم سوانح عمریاں لکھی ہیں۔خود سرسید کی سوانح ''حیاتِ جاوید'' نام سے لکھی۔اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کی زندگی کے کسی پہلو پر لکھی جانے والی کوئی تحریر اس کے استفادے سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔اسی طرح غالبؔ کی سوانح ''یادگارِ غالب'' کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ 'حیاتِ جاوید'۔تیسری کتاب ''حیاتِ سعدی'' ہے جو کہ فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی سوانح عمری ہے۔

سرسید نے حالؔی سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی چنانچہ مدوجزر اسلام (اسلام کا عروج وزوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بعد میں ''مسدس حالؔی'' نام سے مشہور ہوئی۔نظم میں حالؔی نے سب سے پہلے اسلام کے عروج وزوال پر روشنی ڈالی۔ پھر مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم کی کمی پر اظہار خیال کیا ہے۔ایک سچی اور دل سوز آواز کو لوگوں نے سنا۔سرسید اس نظم کو پڑھ کر سر دھنتے تھے۔زبان سادہ' سلیس اور دل نشیں ہے۔روانی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔1879ء میں یہ نظم شائع ہوئی۔ ہندوستان میں خواتین کی حالتِ زار کو بھی حالؔی نے سمجھا۔راشد الخیری کو دنیا مصورِ غم کے نام سے جانتی ہے۔ حالیؔ نے بھی عورتوں کے دکھ درد' بیوگی و بے چارگی کو سمجھنے اور اپنی نظموں میں ان حالات کو پیش کرنے میں جو تصویر کشی کی ہے' وہ مصورِ غم سے کسی طرح کم نہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے 1874ء میں ''مناجاتِ بیوہ'' اور 1906ء میں ''چپ کی داد' نام سے طویل نظمیں لکھیں۔حالؔی اس معاملہ میں سرسید سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے چنانچہ ''تعلیم نسواں'' کے بارے میں ان کا ایک واضح تصور تھا۔ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی خواتین کے لیے ناول ''مجالس النسا'' تحریر کی۔

اردو تنقید کی تاریخ میں الطاف حسین حالؔی کا بڑا مقام ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں بحیثیت فن' تنقید کی ابتدا حالؔی کے مقدمہ شعروشاعری سے ہوتی ہے۔1893ء میں انہوں نے یہ فکر انگیز مقدمہ اپنے مجموعہِ کلام کے ساتھ شائع کیا تھا۔اس کے شائع ہوتے ہی پوری ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اردو تنقید کو اس سے نئی راہ ملی۔اس طرح حالؔی پہلے شخص ہیں جنہوں نے شعر کو کسوٹی پر پرکھا اور تنقیدی مسائل سے بحث کی۔بحیثیت مجموعی سرسید کے اہم رفیق حالؔی سے اردو ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ان پر آپ تفصیل سے مطالعہ کرسکتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ الطاف حسین حالؔی کی چند کتابوں کے نام بتائیے۔

2۔ مقدمہ شعر وشاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ واضح کیجیے۔

3۔ انجمنِ پنجاب لاہور کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

19.4.2 علامہ شبلی نعمانی؛

شبلی نعمانی (1914-1857) اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اپنے وقت کے علما سے حاصل کی۔ 1872ء میں وہ علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے آئے۔ یہاں پر سر سید کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا اور ان ہی کی توجہ سے سوانح نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ حالاں کہ اس وقت تک وہ نظمیں لکھتے تھے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ آرنلڈ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ان کے ہمراہ مصر، شام و دیگر اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ سر سید کے آخری دور میں کچھ اختلافات کی بنا پر شبلی علی گڑھ سے علاحدہ ہوگئے۔ 1897ء میں وہ وہاں سے اپنے وطن اعظم گڑھ آگئے اور ایک نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی۔ کچھ عرصہ وہ حیدرآباد میں رہے جہاں انھیں تصنیف و تالیف کا اچھا موقعہ ملا۔ لکھنؤ میں جب دارالعلوم ندوۃ العلما قائم ہوا تو شبلی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہاں رہ کر مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ سید سلیمان ندوی جیسے صاحبِ طرز ادیبوں کی تربیت کرتے رہے۔ آخر میں پھر اعظم گڑھ آگئے اور ایک تحقیقی ادارہ ''دارالمصنفین'' نام سے قائم کیا جو آج تک اپنا کام کر رہا ہے۔

سر سید کے رفقا میں علامہ شبلی بڑی عبقریت کی حامل شخصیت تھی۔ علم الکلام اور فلسفہ میں کامل دست رس رکھتے تھے۔ سوانح نگاری، تاریخ نویسی، ادب، انشا اور شاعری کے ساتھ اردو تنقید میں بھی ان کا ایک بلند مقام ہے۔ ''سیرۃ النبی''، ''المامون''، ''الفاروق''، ''الغزالی''، ''سیرۃ النعمان'' اور ''سوانح مولانا روم'' ان کی سوانح عمریاں ہیں جب کہ ''شعرالعجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مختصر کلیات بھی شائع ہوا ہے جس میں مثنوی، مسدس، قصیدے اور اخلاقی و سیاسی نظمیں ملتی ہیں۔ برطانوی سامراج کے واقعات پر بڑی ولولہ انگیز نظمیں لکھی ہیں جنھیں پڑھ کر شبلی خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔

شبلی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قوت اور جوشِ بیان کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار بھی ہے۔ چوں کہ شبلی جمالیاتی تنقیدی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے نثر میں شاعرانہ فضا پیدا کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ وہ برمحل اشعار کا استعمال کر کے معانی و مطالب کو دل کش انداز میں ادا کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نثر کی سادگی میں فن کاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ ادب کے طالب علم کو شبلی کی موازنۂ انیسؔ و دبیر اور شعرالعجم کی چوتھی جلد ضرور پڑھنی چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ شبلی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ اردو ادب کو شبلی سے کیا فائدہ پہنچا، نشان دہی کیجیے؟

19.4.3 ڈپٹی نذیر احمد؛

ڈپٹی نذیر احمد کا وطن بجنور ہے۔ بچپن میں دہلی آگئے اور قدیم دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ انگریزی حکومت کی ملازمت کی اس لیے ان کی حمایت کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی کچھ وقت حیدرآباد میں گذارا، بقیہ زندگی دہلی میں رہ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ''شمس

العلما'' کے خطاب سے نوازے گئے۔

سرسید سے ان کے روابط تھے۔ عموماً تقاریر کے لیے سرسید انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے کیوں کہ آواز بلند اور بھاری بھرکم تھی۔ بڑے بڑے اجتماعات میں تقریر کرتے تو سناٹا چھا جاتا۔ ان کی تقریروں کے مجموعے خطبات نذیر احمد کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جسے پڑھ کر ان کے وسیع علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر بھی انہوں نے لکھی۔ قانون کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں ''تعزیراتِ ہند'' اور ''قانونِ شہادت'' مشہور ہیں۔ نذیر احمد کی اصل شہرت ان کے ناولوں سے ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ بحیثیت ناول انہوں نے نہیں لکھا۔ ان کے سامنے پہلے سے ناول کا خاکہ یا نمونہ اردو میں موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے ان کے ناول فکری اور فنی اعتبار سے کمزور ہیں البتہ ناول کے عناصر ترکیبی ہونے کی بنا پر ان کی تصانیف کو ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات ناول لکھے۔ پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' 1869ء میں لکھا جو کہ اپنی لڑکی کی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے لیے لکھا تھا۔ لیکن ایک انگریز کلکٹر کی فرمائش پر اسے شائع کیا جو مقبول ہوگیا۔ دوسرا ناول ''بنات النعش'' بھی اسی مقصد سے لکھا۔ تیسرا ناول ''توبۃ النصوح'' سب سے زیادہ مشہور اور دلچسپ ہے۔ اس کو پڑھ کر دلی کے اجڑتے ہوئے مسلم خاندانوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس ناول کا ایک زندہ جاوید کردار ''مرزا ظاہر دار بیگ'' ہے۔ ان کے دیگر ناولوں کے نام ''ابن الوقت''، ''فسانۂ مبتلا''، ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' ہیں۔

نذیر احمد کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ فن کے اعتبار سے ان کے ناول، ناول کے بجائے خطبات نظر آتے ہیں جس میں اصلاح معاشرت کی بات کہی گئی ہے۔ مگر اعتراض کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس وقت سماجی مسائل مسلمانوں کے درمیان سب سے اہم مسئلہ بنا ہوا تھا اور سرسید تحریک کے زیر اثر نذیر احمد بھی ناولوں کے ذریعہ لوگوں کو نئی راہ دکھانا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی تمام خوبیاں تلاش کرنا بے کار ہے۔ مگر انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کی بہترین تصویریں ان ناولوں میں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر ناول کے نہ جانے کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں بلکہ دیگر کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ نذیر احمد زبان کے بادشاہ ہیں۔ دلی کی عام بول چال، محاورے، کنایے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ علمی زبان کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ کبھی کبھی عربی کے نامانوس لفظ اور بے جا محاورے لکھ دیتے ہیں۔ دو رخی زبان ہونے کے باوجود یہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور بقول سید عبداللہ نذیر احمد کا منفرد اسلوبِ بیان دلوں پر اپنا سکہ جماتا چلا جاتا ہے۔ یہ خاص رنگ سرسید کے رفقا میں سے کسی کو حاصل نہ ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ نذیر احمد کے ناولوں کے نام لکھیے۔

2۔ نذیر احمد کا کوئی ایک ناول پڑھیے اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات لکھیے۔

19.4.4 نواب محسن الملک:

نواب محسن الملک کا سرسید کے خاص رفقا میں شمار ہوتا ہے۔ اٹاوہ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ انگریزی حکومت میں معمولی ملازمت کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر تک پہنچے۔ اٹاوہ میں ملازمت کے دوران سرسید سے ملاقات، تعارف اور پھر زندگی بھر گہری دوستی و رفاقت قائم

ہوگئی۔ کچھ عرصہ حیدر آباد میں رہے۔ 1893ء میں علی گڑھ آ گئے اور سرسید کے سچے معاون بن کر رہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور سرسید کے انتقال کے بعد 1899ء میں کالج کے سکریٹری بنائے گئے۔

نواب محسن الملک فکری اعتبار سے اپنے رفقا میں سرسید کے زیادہ قریب تھے اور ان کی کتابیں بھی دراصل ان ہی خیالات کی ترجمان ہیں۔ اس لیے تمام کتابیں مذہبی اور تہذیبی موضوعات پر ہیں۔ ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ میں سرسید کے بعد سب سے زیادہ مضامین انہوں نے لکھے۔ ان کے ذریعہ محسن الملک کی ادبی رجحان کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان سادہ اور شیریں ہے۔ تمثیل سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کا ایک مضمون تعلیم و تربیت ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کا ایک اقتباس دیکھیے۔

> ''ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا .... جب میں عالمِ مثال (وہاں) سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے ہیں۔ صرف یہ کہہ کہ باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا ہے وہ علوم وفنون جدیدہ کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پر ہمارا اپنا دل بہلانے والا کوئی وہاں نہیں جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے وہ پتھر جو سر چشمہ پر آ گیا ہے۔ جہالت ہے، وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم رواج کی پابندی ''سیلی'' نما تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا زہر، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقلید، عامیانہ علامی، ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں جانتے۔''

یہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ فکر کے ساتھ ساتھ کہنے کا انداز بھی بالکل سرسید جیسا ہے اور مقصدیت غالب ہے۔ لیکن ایسی عمدہ تصویر کشی کی ہے کہ محسن الملک کے اندر کہانی لکھنے کی پوری صلاحیت نظر آتی ہے ان کے دیگر مضامین ''تدبیر و امید'' اور ''عزت'' وغیرہ اہم ہیں جس میں ادبیت بھرپور نمایاں ہے۔ محسن الملک کا مقام اردو ادب میں گرچہ وہ نہیں ہے جو حالؔی اور شبلؔی کا ہے مگر ادب کو نئی جہت اور جدت ادا کرنے میں وہ ان کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں۔

19.4.5 دیگر رفقا:

سرسید کے دیگر رفقا بھی ہیں جنھوں نے بہت کچھ لکھا مثلاً منشی ذکاء اللہ اور مولوی چراغ علی وغیرہ مگر ان کے موضوعات ادب سے ہٹ کر ہیں۔ منشی ذکاء اللہ مشہور ریاضی داں اور تاریخ نگار تھے۔ یہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح دہلی کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں انہوں نے لکھی ہیں۔ تاریخ اور ریاضی سے ہٹ کر مضامین تہذیب الاخلاق میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید کی مجوزہ ورناکلر یونیورسٹی کے معاون و موئید تھے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے حامی منشی ذکاء اللہ نے اپنی زندگی میں محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار صفحات لکھے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اگر انہوں نے ادب کو بھی اپنا موضوع بنایا ہوتا تو یقیناً اردو کے نامور ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا۔ چراغ علی نے علمی اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر انہیں زبردست عبور حاصل تھا۔ متعدد کتابیں انگریزی میں بھی ہیں۔ یہ بھی محسن الملک کی طرح فکری اعتبار سے سرسید سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ اپنی کتابوں میں سرسید کے مذہبی افکار کی ترجمانی کی ہے۔

اردو کے ایک اور بڑے ادیب ہیں جن کا تعلق براہ راست سرسید تحریک سے نہ تھا مگر ادبی اور فکری پہلو سے اس تحریک کا ساتھ دیتے

نظر آتے ہیں۔ یہ ہیں مولوی محمد حسین آزاد۔ انہوں نے نظم اور نثر دونوں میں خدمات انجام دیں۔''انجمن پنجاب لاہور'' کے روح رواں یہی تھے۔اردو شاعری کو فطری اور موضوعاتی بنانے میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالی بھی اس سے وابستہ تھے۔محمد حسین آزاد کی مشہور کتابوں میں قصصِ ہند' آبِ حیات' نیرنگِ خیال' دربارِ اکبری' سخندان فارس' کلام نظم آزاد وغیرہ ہیں۔آبِ حیات کو زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی۔اردو شعرا کا تذکرہ پہلی مرتبہ اس میں سماجی پس منظر' تاریخی ارتقا اور ادبی شعور کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔

19.5 اکتسابی نتائج

☆ ہندوستان کی تاریخ میں 1857ء کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ اس سال ہندوستان کے تمام طبقوں اور قوموں نے مل کر ایک ساتھ انگریزوں کو ملک سے بھگانے کی آخری کوشش کی جو کہ ناکام ہوئی مگر اس کے بعد ہندوستان کی صدیوں پرانی روایات' سیاست' تعلیم' معاشرت' مذہب اور تہذیب وثقافت سب کچھ متاثر ہوئیں۔

☆ قدیم وجدید کی کشمکش کھل کر سامنے آگئی اور یہ کشاکش ہر میدان میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ عمل اور ردعمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی بات ہے۔اب ہر میدان میں پسپا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

☆ رہنمایانِ قوم نے اصلاحی کوششیں تیز کردیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام یقیناً سرسید کا ہے جنہوں نے اپنے ساتھ بہترین اور باصلاحیت افراد کو لے کر قومی' ملی' تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دیں۔

☆ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قائم کرنا ہے۔ یہ کالج آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی نے بڑا کام کیا۔

☆ سرسید نے دوسرا بڑا کام تہذیب الاخلاق پرچہ کے ذریعہ معاشرتی اصلاح کا کیا۔ اس میں مسلسل مضامین لکھ کر اور اہلِ قلم حضرات سے لکھوا کر ذہنی اور فکری جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انہوں نے ایک پرچہ میں 29 نکات کا پروگرام دیا۔

☆ تیسرا کام یہ کیا کہ سرسید نے اردو ادب کو ایک رجحان اور تخلیقی ادب سے مالا مال کردیا۔ اپنے مضامین کے ذریعہ موضوع' اسلوب' فکر اور فن تمام چیزوں میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔ ادب کے لیے یہ ایک بڑی خدمت ہے۔شاعری سے دلچسپی نہیں تھی البتہ نثر نگاری میں سرسید کی بڑی خدمات ہیں۔

☆ سرسید کے رفقا نے وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے اردو ادب کی ہر اصناف میں جو جو کام کیے ہیں وہ ہمیشہ اہمیت کے حامل رہیں گے۔ الطاف حسین حالی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اردو نظم کو انہوں نے ایک نئی سمت دی اور مسدس حالی لکھ کر قوم کو بیدار کیا۔مقدمہ شعرو شاعری کے ذریعہ اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔

☆ سرسید' غالب اور شیخ سعدی کی سوانح عمریاں لکھیں۔شبلی نعمانی علی گڑھ کالج میں استاد تھے۔ سرسید کو قریب سے دیکھنے اور ان کے کتاب خانے سے استفادے کا موقعہ ملا۔ زبردست عالم تھے۔

☆ علم الکلام اور فلسفہ کے علاوہ تنقید سوانح نگاری' مضامین' مقالات' تنقید اور شاعری میں کامل دست رس تھی۔ مختلف شخصیات کی متعدد

سوانح عمریاں لکھیں۔ سیرۃ النبی بڑی تحقیقی اور مدلل کتاب ہے۔

☆ شعرالعجم میں اپنے تنقیدی نظریات پیش کیے۔ سیاسی اور اخلاقی نظمیں بھی کہیں۔

☆ ڈپٹی نذیر احمد ناولوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں اردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کل سات ناول لکھے۔ پہلا ناول مراۃ العروس ہے۔ توبۃ النصوح اور ابن الوقت اپنے نفس مضمون کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

☆ نذیر احمد بڑے اچھے خطیب بھی تھے۔ دہلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ سرسید کے دو رفقا ایسے تھے جو فکری اعتبار سے ان کی ترجمانی کررہے تھے۔ ایک محسن الملک دوسرے چراغ علی۔ ان دونوں نے ادبی سے زیادہ مذہبی میدان میں کام انجام دیا ہے۔

☆ اس طرح اگر دیکھا جائے تو سرسید تحریک نے اردو ادب کو جتنا مالا مال کیا ہے شاید ہی کسی اور تحریک نے کیا۔ اس تحریک کی سب سے بڑی اہمیت اس لیے ہے کہ اس نے تاریخ ساز افراد ادب کو دیے۔ چنانچہ ان تاریخ ساز افراد کے تاریخی کارنامے کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے ہیں۔

19.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
ریشہ دوانیاں	سازش، جوڑتوڑ
استبداد	ظلم وجور
مؤخرالذکر	آخر میں کہی گئی بات
عسکری	فوجی
زعم	غرور، تکبر
استدلال	دلیل، ثبوت
ثقافت	تہذیب، رہن سہن
استطاعت	طاقت، قدرت
بیرونی	باہری
مہلک	ہلاک کرنے والی
خصلت	عادت
حتی المقدور	جہاں تک ہوسکے، ممکن حدتک
فراموش	بھلانا
پیہم	مسلسل

فروغ	ترقی دینا
افادیت	فائدہ پہنچنا
تلمیحات	اشعار میں کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا
استفادہ	فائدہ اٹھانا
اختصار	مختصر کرنا
مجوزہ	تجویز کی ہوئی چیز
صدیوں	سینکڑوں
کشاکش	رسّہ کشی، کھینچا تانی
رفقا	ساتھ رہنے والے افراد
حامل	بوجھ اٹھانے والا، کسی چیز کو لے جانے والا

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کس نے جاری کیا؟

2۔ ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کا قیام کب عمل میں آیا۔

3۔ ''اسباب بغاوت ہند'' کا مصنف کون ہے؟

4۔ ''حیات جاوید'' اور ''حیات سعدی'' کا مصنف کون ہے؟

5۔ ناول ''مجالس النساء'' کس نے تحریر کی؟

6۔ ''المامون'' اور ''الفاروق'' کا خالق کون ہے؟

7۔ اردو کو پہلا ناول نگار کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

8۔ سرسید کے کسی دو رفقا کے نام لکھیے؟

9۔ موازنہ انیس و دبیر کب شائع ہوئی؟

10۔ مولانا حالی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا تعارف کرائیے۔

2۔ سرسید کے ادبی رفقا کی خدمات بتائیے۔

3۔ اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت کیوں ہے؟ بیان کیجیے۔

4۔ شبلی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ اردو ادب کو شبلی سے کیا فائدہ پہنچا' نشان دہی کیجیے؟

19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات ؛

1۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ سرسید کی تعلیمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ حالی و شبلی میں سے کسی ایک کے ادبی مقام کی نشان دہی کیجیے۔

19.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	حیاتِ جاوید	الطاف حسین حالی
2۔	سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی
3۔	سرسید اور ان کے نام و رفقا	سید عبداللہ
4۔	میر امن سے عبدالحق تک	سید عبداللہ
5۔	مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق
6۔	سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی
7۔	الطاف حسین حالی	صالحہ عابد حسین
8۔	حیاتِ شبلی	سید سلیمان ندوی
9۔	بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست
10۔	سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین

اکائی 20: اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

اکائی کے اجزا

20.0 تمہید
20.1 مقاصد
20.2 سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورت حال
20.3 سرسید کا اثر اردو ادب پر
20.3.1 فکری اثرات
20.3.2 عملی اثرات
20.4 اصنافِ ادب پر اثرات
20.4.1 تاریخ نگاری
20.4.2 سوانح نگاری
20.4.3 ناول نگاری
20.4.4 مضمون نگاری و مقالہ نگاری
20.4.5 اردو شاعری
20.4.6 اردو تنقید نگاری
20.4.7 اردو صحافت
20.5 اکتسابی نتائج
20.6 کلیدی الفاظ
20.7 نمونہ امتحانی سوالات
20.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
20.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
20.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
20.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

20.0 تمہید

اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ یہ اثرات اتنے وسیع اور دور رس ہیں کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی تازہ دم لگتے ہیں۔ اردو ادب کا وہ کون سا گوشہ ہے جو اس کے اثر سے چھوٹ گیا ہو۔ علی گڑھ تحریک سے قبل اردو کی شناخت شاعری سے تھی۔ نثری ادب پر توجہ اس تحریک نے دی۔ سوانح نگاری، تاریخ نویسی، مضمون نگاری، مقالہ نگاری اور ناول نگاری میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کے اصول مرتب ہوئے۔ تنقید کی ابتدا ہوئی، صحافت کو فروغ بخشا، ردِعمل کے طور پر طنز و مزاح کی بنیاد پڑ گئی اور رومانوی تحریک نے اپنے بال و پر نکالے۔ ادب کا سائنٹفک و جمالیاتی پہلو سامنے آیا۔ غرض رنگا رنگی کا ایک حسین نمونہ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس اکائی میں ان تمام اثرات کا جائزہ لیا جائے گا جس کے نتیجہ میں آپ آسانی سے یہ سمجھ جائیں گے کہ علی گڑھ تحریک کے اردو ادب پر کیا احسانات ہیں۔

20.1 مقاصد

اس اکائی میں آپ اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

- ☆ سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورت حال پر گفتگو کر سکیں گے۔
- ☆ سرسید کی ادبی خدمات پر گفتگو کر سکیں گے۔
- ☆ سرسید اور ان کے رفقا سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- ☆ علی گڑھ تحریک کے فکری و عملی اثرات پر گفتگو کر سکیں گے۔
- ☆ اردو اصناف ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔
- ☆ اردو شاعری، ناول، تنقید اور صحافت پر اس کے اثرات کی نشاندہی کر سکیں۔

20.2 سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورت حال

برصغیر ہندوپاک میں سرسید سے قبل اردو ادب (شاعری کو چھوڑ کر) کا دائرہ تصوف، مذہب، تاریخ اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا۔ مذہبیات میں بھی منقولات اور روایات سے ہی مواد فراہم کیا جاتا تھا۔ مذہب کے صرف ان پہلوؤں پر زور دیا جاتا تھا جو اثباتی زندگی کے بجائے فانی زندگی کی طرف متوجہ کرے۔ یہ ضرور ہے کہ تحریک ولی اللہی نے اقتصادیات اور سیاسیات کے بڑے کارآمد اصول پیش کیے۔ مگر ان کی آواز پر اس وقت توجہ نہیں دی گئی۔ تاریخ بھی سرسری واقعہ نگاری کا دوسرا نام تھا۔ اردو میں تذکرہ نگاری کا بڑا رواج تھا۔ بعض کامیاب تذکرے بھی لکھے گئے۔ مگر تنقیدی اصول سے وہ خالی تھے۔ اردو شاعری میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کی بڑی مستحکم روایت چلی آ رہی تھی مگر یہ شاعری فطری اور افادی کے بجائے صرف شاعرانہ تخیل و کمالات کی محض مظہر تھی اور جہاں تک اردو کی ادبی نثر کا تعلق ہے وہ بھی تصنع، تکلف اور مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی پر قلم توڑنے کو ادیب اپنی شان سمجھتا تھا۔ زندگی کے حقائق اور کائنات کے مسائل کی ترجمانی بننے کی صلاحیت اردو نثر میں موجود نہیں تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی سلیس نثر، قدیم دہلی کالج کی علمی نثر اور مرزا غالب کی شخصی ادبی نثر نے کچھ کام کیا مگر اس کا دائرہ اثر محدود تھا۔ وہ تو سرسید کی ذات تھی جس نے اردو زبان و ادب کے تنگ دامنی کی شکایت کو دور کر کے نہ صرف اصنافِ ادب میں اضافہ کیا بلکہ ہر زاویہ سے اردو ادب کو متاثر کیا۔

20.3 سرسید کا اثر اردو ادب پر

20.3.1 فکری اثرات؛

ہمارے اردو ادب میں سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تقلید کے بجائے آزادیٔ رائے کی بنیاد ڈالی جس میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو اہمیت دی گئی۔ سرسید کی فکر کے یہ عناصر ترکیبی حقیقت نگاری، اجتماعیت، عقلیت اور مادیت وغیرہ وہ رجحانات ہیں جن سے اردو کا سارا ادب متاثر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک اپنی بیشتر خصوصیات کی بنا پر سرسید کی مادیت، عقلیت اور حقائق نگاری کی ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتی ہے۔

سرسید کا یہ فکری رویہ اردو ادب میں تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔ مذہبی تصنیفات ہوں کہ تاریخ نگاری یا سوانح نویسی، مضامین مقالے، تنقید اور شاعری، سبھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر لوگ تقلیدی کم اور تحقیقی زیادہ ثابت ہوئے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا میلان پیدا ہوا۔ یہیں سے سائنٹفک تنقید نگاری کی بھی بنیاد پڑتی ہے۔

20.3.2 عملی اثرات؛

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سرسید سے قبل اردو ادب دنیا کے عمدہ ادب کی صف میں شامل ہونے کے لائق نہیں تھا۔ بلکہ تخلیقی اور صنفی اعتبار سے ادھورا ادب تھا۔ سرسید کی کوششوں سے اردو کے نثری اصناف پر توجہ دی گئی اور شاعری کے رخ کو بدلا گیا۔ ناول، سوانح، خاکہ، مضامین، مقالے، تاریخ نگاری اور تنقید نگاری کا ایک طرح سے آغاز ہوا۔ جدید نظم نگاری کا چرچا ہوا۔ شاعری کے موضوعات بدلے گئے۔ سرسید نے اپنی بیش قیمت تصانیف کے ذریعہ دیگر مصنفوں اور ادیبوں کو وہ خیالات دیے جس سے ادب کی توانا روایت قائم ہوئی۔ ایسا ادب جس میں حقیقت، مقصدیت اور افادیت کا پہلو نمایاں ہو اور جو معاشرے کے لیے سود مند ہو۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق پرچہ اسی مقصد سے جاری کیا تھا۔ اس رسالہ میں شائع بیشتر مضامین کے ذریعہ سرسید کی فکر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو ادب کو کیا دینا چاہتے ہیں۔ اور ایسا ہوا بھی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ سرسید سے قبل اردو ادب کا جائزہ لیجیے؟

2۔ سرسید نے ادب کو کس زاویہ سے دیکھا؟

20.4 اصنافِ ادب پر اثرات

20.4.1 تاریخ نگاری؛

سرسید احمد خان نئی تعلیم کے حامی اور جدیدیت کے علمبردار تھے انہوں نے حضور نبی کریم کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے کے لیے اخلاقیات کی خالص قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک نے تو کی گئی، لیکن اس تحریک نے تاریخ کو سپاٹ بیانیہ نہیں بنایا بلکہ اس فلسفے کو جنم دیا کہ تاریخ کے اوراق میں قوم اور معاشرے کا دھڑکتا ہوا دل محفوظ ہوتا ہے۔ جس کا آہنگ دریافت کر لینے سے مستقبل کو سنوارا اور ارتقاء کے تسلسل کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے سرسید احمد خان نے ''آئین اکبری''، ''تزک جہانگیری'' اور تاریخ فیروز شاہی دوبارہ مرتب

کیں۔شبلی نعمانی نے ''الفاروق''، ''المامون'' اور اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر لکھیں۔ جبکہ مولوی ذکا اللہ نے ''تاریخ ہندوستان'' مرتب کی۔

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کی قصیدہ خوانی نہیں کی اور نہ ہی اسلاف کی عظمت سے قوم کو مسحور کیا بلکہ سرسید احمد خان کا ایمان تھا کہ بزرگوں کے یادگار کارناموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے۔ چنانچہ اس تحریک نے تاریخ کے برے پھل سے عوام کو بچانے کی کوشش کی اور ماضی کے تذکرہ جمیل سے صرف اتنی توانائی حاصل کی کہ قوم مستقبل کی مایوسی ختم کرنے کے لیے ایک معیار مقرر کر سکے۔علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری کے ایک الگ اسلوب کی بنیاد رکھی بقول سرسید:

> ''ہر فن کے لیے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔''

اس لیے علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری میں غیر شخصی اسلوب کو مروج کیا اور اسے غیر جانبداری سے تاریخ نگاری میں استعمال کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ کا بیانیہ انداز نثر کی بیشتر رعنائیوں کو زائل کر دیتا ہے۔تاہم سرسید احمد خان تاریخ کو افسانہ یا ناول بنانے کے حق میں ہرگز نہیں تھے اور وہ شخصی تعصّبات سے الگ رہ کر واقعات کی سچی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ کے لیے سادہ اور بیانیہ نثر استعمال کرنے پر زور دیا اور اس نقطہ نظر کے تحت آثار الصنادید کی بوجھل نثر کو سادہ بنایا۔

سرسید کو تاریخ نگاری سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور یہ ذوق موروثی تھا، کیونکہ ان کے اسلاف کا تعلق قلعۂ معلیٰ سے تھا۔اس بنا پر انہوں نے قدیم تاریخی کتابوں کی تصحیح و اشاعت پر توجہ دی۔ آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی کو شائع کرایا۔ دہلی کی یادگاروں اور عمارتوں پر بڑی جانفشانی سے آثار الصنادید نام سے کتاب لکھی۔اور اس وقت معنی خیز جملہ کہا کہ ''بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے۔'' انہوں نے اردو تاریخ نگاری کو متاثر کیا چنانچہ ان کے رفقا میں دو بڑے مورخ شبلی اور منشی ذکا اللہ کو تاریخ لکھنے کا فن بتایا۔علی گڑھ تحریک نے ہی تاریخ کو اجتماعیت کی روشنی میں پیش کرنے پر اور واقعات کے تاریخی اسباب تلاش کرنے پر زور دیا۔ دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ دلائی وہ یہ کہ تاریخ لکھنے کا اپنا اسلوب ہونا چاہیے جو سادگی پر مبنی ہو۔ ہر فن کا اسلوب اور طرز بیان جداگانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ناول میں تاریخ اور تاریخ لکھتے وقت ناول والا اندازِ بیان دونوں پر غلط تاثر چھوڑتا ہے۔تیسری بات یہ کہ تاریخ کا ایک مادی وجود ہوتا ہے اگر یہ کٹ جائے تو حقیقت افسانے میں بدل جائے گی اور تاریخ، تاریخ نہ رہ کر علم الاساطیر کا درجہ حاصل کر لے گی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ کی بحث میں اس اصول کو واضح کیا ہے، مگر یہ احساس جاتا رہا جس کی بازیافت علی گڑھ تحریک نے کی۔ محسن الملک نے تہذیب الاخلاق میں مقدمہ ابن خلدون پر دو تبصرے لکھ کر اس کو مزید واضح کیا تھا۔شبلی، جنہیں اس تحریک نے فن تاریخ کا شعور عطا کیا، اپنے وطن اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔اس ادارہ سے وابستہ افراد نے تاریخ پر بیش قیمت کتابیں تحریر کیں۔ چنانچہ دارالمصنفین کے کارنامے بھی بالواسطہ علی گڑھ تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ ''الفاروق''، ''المامون'' کا مصنف کون ہے؟

2۔ سرسید کی کسی دو کتابوں کے نام بتایئے؟

20.4.2 سوانح نگاری؛

سرسید کے رفقائے خاص شبلی اور حالی نے سوانح نگاری کی صنف کو وہ ترقی دی کہ شاید ہی کوئی اسے فراموش کر سکے مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ سرسید کو سوانح سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیوں کہ وہ شخصیت سے زیادہ قومی مسائل اور تحریکوں پر توجہ دیتے تھے۔ سرسید روایات کی اتباع کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے اندر ایک انقلابی ذہن اور سخت گیر طبیعت کارفرما تھی۔ جب کہ سوانح نگاری کے لیے کچھ نہ کچھ عقیدت ضروری ہے۔ اس کے باوجود اردو کی سوانح عمری سرسید کی تحریروں سے متاثر رہی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور کی سوانح نگاری قومی ترقی کے مقصد سے فروغ پاتی رہی اور قومی ترقی ہی سرسید کی تحریک کا بنیادی عنصر ہے۔ اب مولانا حالی کو دیکھیے ان کی سوانح عمریاں سادہ اور ادبی ہیں مگر قومی خدمت کا جذبہ پوری طرح موجود ہے۔ قوم کے لیے انھوں نے ظرافت، خوش طبعی اور زندہ دلی کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ شبلی کا مرتبہ سوانح نگار کی حیثیت سے حالی سے بڑھا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی عہد ساز شخصیتوں کی سوانح لکھ کر شبلی نے قوم کو اسے مشعل راہ بنانے کی اپیل کی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل زندگی سیرت النبی کے نام سے قلم بند کرنا شروع کیا مگر زندگی نے وفا نہ کی اور اس کو سید سلیمان ندوی نے تکمیل تک پہنچایا۔

سوانح نگاری میں بھی علی گڑھ تحریک کا دیا ہوا اصول یعنی قومی ترقی اور اصلاح پیش نظر تھا۔ اسی کے زیر اثر عبدالحلیم شرر اور عبدالرزاق کانپوری نے بھی سوانح کی صنف میں اضافہ کیا۔ بہر حال سرسید نے اردو سوانح نگاری کو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر انداز نظر تو ضرور دیا۔ اس کے سبب اردو سوانح نگاری ادب کی دوسری اصناف کی مانند اپنی شناخت قائم کر سکی۔

اردو ادب میں دیگر اصناب کے مقابلے میں سوانح نگاری کی عمر بہت کم ہے۔ اردو میں سوانح نگاری کی ابتدا 1857 سے پہلے ہو چکی تھی، لیکن اس میں خامیاں ہونے کی سب ان کو ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اردو میں مولانا حالی کو پہلے سوانح نگار ہونے شرف حاصل ہے۔ پہلی بار انھوں نے ہی فنی بالیدگی کے ساتھ سوانح نگاری اردو میں متعارف کرایا۔ مولانا حالی کی تین سوانح عمریاں ''حیات جاوید''، ''حیات سعدی'' اور ''یادگار غالب'' اردو میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

20.4.3 ناول نگاری؛

علی گڑھ تحریک میں اصلاحی اور منطقی نقطہ نظر کو تمثیل میں بیان کرنے کا رجحان سرسید احمد خان، مولانا حالی اور محسن الملک کے ہاں نمایاں ہے۔ تاہم مولوی نذیر احمد نے اسے فن کا درجہ دیا اور تحریک کے عقلی زاویے اور فکری نظریے کے گرد جیتے جاگتے اور سوچتے ہوئے کرداروں کا جمگھٹا کھڑا کر دیا۔ چنانچہ وہ تمام باتیں جنہیں سرسید احمد خان نسبتاً بے رنگ ناصحانہ لہجے میں کہتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انہیں کرداروں کی زبان میں کہلوایا ہے اور ان میں زندگی کی حقیقی رمق پیدا کر دی ہے۔

اگرچہ زندگی کی یہ تصویریں بلاشبہ یک رخی ہیں اور نذیر احمد نے اپنا سارا زور بیان کرداروں کے مثالی نمونے کی تخلیق میں صرف کیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ سکوت دہلی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر اس وقت مثالی کرداروں کو پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ صاف اور واضح نظر آتا ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا حالی نے جو قوت اسلاف کے تذکروں سے حاصل کی تھی وہی قوت نذیر احمد مثالی کرداروں کی تخلیق سے حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے ناول چونکہ داستانوں کے تخیلی اسلوب سے ہٹ کر لکھے گئے

تھے اوران میں حقیقی زندگی کی جھلکیاں بھی موجود تھیں اس لیے انہیں وسیع طبقے میں قبولیت حاصل ہوئی اوران ناولوں کے ذریعے علی گڑھ تحریک کی معتدل اور متوازن عقلیت کو زیادہ فروغ حاصل ہوا اس طرح نذیر احمد کی کاوشوں سے نہ صرف تحریک کے مقاصد حاصل ہوئے بلکہ ناول کی صنف کو بے پایاں ترقی ملی۔نظیر احمد کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر عبدالحلیم شرر،پنڈت رتن ناتھ سرشار پھر آگے مرزا ہادی رسؔوا نے ناول کے فن کو عروج بخشا۔

نذیر احمد کا شمار سرسید کے نامور رفقا میں ہوتا ہے۔ان کی تخلیقات میں علی گڑھ تحریک کا گہرا اثر دکھائی پڑتا ہے۔نذیر احمد اعلیٰ درجے کے زبان داں تھے۔وہ عمدہ مقرر اور بہترین ادیب تھے۔انہوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور ساتھ ہی ناول بھی لکھے ہیں۔ یہاں پر ان کے تمام ناول کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے، جو پہلی مرتبہ 1869 میں شائع ہوا۔اسی ناول کو اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ نذیر احمد نے چھ ناول ''بناۃ النعش''،توبتہ النصوح''،''ابن الوقت''،''محسنات''،''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' بھی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ اردو کا پہلا ناول نگار کون ہے؟

2۔ اردو کا پہلا ناول کب شائع ہوا؟

20.4.4 مضمون نگاری و مقالہ نگاری؛

علی گڑھ تحریک کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ اس نے مضمون نگاری کی ہمت افزائی اور اس کے اولین نمونے اس تحریک نے ہی فراہم کیے۔''تہذیب الاخلاق'' نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔لندن میں قیام کے دوران سرسید وہاں اسٹیل اور ایڈیسن کے رسائل ''سپیکٹیٹر'' اور ''ٹیٹلر'' سے متعارف بلکہ متاثر ہوئے۔سرسید نے ان رسالوں سے بہت اثر قبول کیا اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا اور ادبی مضمون شائع کرنے لگے۔سرسید نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر علمی و ادبی مضامین تحریر کیے۔تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس،معیشت ومعاشرت،تہذیب وتمدن کو بھی موضوع بنا کر مضمون لکھے۔ سرسید کے بعض مضامین میں انگریزی ''ایسے'' Essay کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ سرسید کی اس روایت کو مولوی چراغ علی،محسن الملک،نذیر احمد،حالی اور شبلی نے آگے بڑھایا۔

ان حضرات نے زندگی کے تمام مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور فرحت بخش وسنجیدہ انداز میں پیش کیا۔کچھ عرصہ بعد رومانی نثر کو عروج حاصل ہوا تو مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، وحیدالدین سلیم، عنایت اللہ دہلوی، مقتدیٰ خاں شیروانی محفوظ علی بدایونی اور میر ناصر علی نے مضمون نگاری کو فروغ دیا۔مضمون کے ساتھ ساتھ تحقیقی مقالات لکھنے کا رواج بھی عام ہوا۔شبلی، سرسید اور نذیر احمد نے بڑے سنجیدہ اور تحقیقی مقالے لکھے۔

20.4.5 اردو شاعری؛

اردو شاعری پر علی گڑھ تحریک نے جو احسان کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اس تحریک کی بدولت آزؔاد اور حاؔلی جیسے علماء نے اردو ادب کو نیچرل شاعری کا تحفہ عطا کیا۔اس سے قبل شاعری کے میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامہ دکھائی نہیں دیتا۔اگر چہ شاعری میں کلاسیکی شعرا نے اپنے تئیں آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش کی ،لیکن اس سے عوام کی فلاح کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا۔وؔلی سے میؔر اور مرؔزا کی شاعری نے

صرف دربار سے انعام و اکرام لے کر اردو شاعری کو طاق نسیاں پر سجا دیا،لیکن علی گڑھ تحریک نے اسے اصلاحی پیرہن میں ملبوس کر کے فلاح و بہبود کا ذریعہ بنایا۔

علی گڑھ تحریک کا ہی فیضان ہے کہ اردو شاعری کے دامن میں آج وہ وسعت آ گئی ہے کہ وہ اپنے اندر ہر طرح کے مضامین ادا کرنے کے قابل ہوگئی۔اس تحریک سے قبل جو شعری سرمایہ ملتا ہے اس میں عاشق،معشوق،ہجر،وصال سے زیادہ کوئی اور مضمون دکھائی نہیں دیتا۔سرسید نے اپنے اجداد کی تاریخ کو پڑھا تھا اور وہ جانتے تھے کہ شاعری سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں،لیکن اردو شاعری کے مزاج میں جس طرح عشق و عاشقی رچ بس گئی تھی اس میں اصلاح کا پہلو تلاش کرنا مشکل تھا۔چونکہ مسلمان انگریزوں کے عتاب سے دو چار تھے اور انہیں اس دلدل سے نکالنے کے لیے اصلاحی مضامین کے ساتھ معاشرے کو سنوارنے اور ترتیب دینے والی شاعری کی بھی ضرورت تھی۔لہٰذا انہوں نے اپنے رفقا میں ایسے لوگوں کو اس بات کی ذمے داری دی،جو ایک زمانے سے شعر و شاعری اور مرصع نگاری کے دلدادہ رہے تھے۔ان میں شبلی،آزاد اور حالی کا نام پیش پیش ہے،لیکن شبلی نے سرسید سے اختلاف کی وجہ سے اس میدان میں کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔البتہ آزاد نے انجمن پنجاب میں اردو نظم کو فروغ دیا اور حالی نے مسدس لکھ کر قوم کو بیدار کیا،جسے سرسید نے اپنے لیے توشۂ آخرت شمار کیا۔

سرسید،حالی اور آزاد کی نیچرل شاعری کی تحریک یا نظم جدید پوری طرح سے مغرب زدہ تھی۔ایک قوم کے اثرات دوسری قوم پر مرتب ہونا ایک فطری اور ناگزیر عمل ہے۔قوموں کے باہمی ربط و تعلق سے نئی زبانیں اور تہذیبیں وجود میں آتی ہیں۔جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے قدم جمائے تو انگری ادب نے اردو شعر و ادب پر اپنے نقوش ثبت کیے اور سب سے پہلے براہ راست انگریزی شاعری کی اتباع میں جدید نظم کی تحریک کا آغاز ہوا۔

اردو میں جدید شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کی انجمن پنجاب میں پڑھی جانے والی نظموں سے ہوتا ہے۔حالی اور آزاد سرسید تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں انگریزی طرز شاعری کو رواج دے رہے تھے۔جدید نظم کی تحریک کے سرسید کے نظریات کے زیر اثر اور حکومت کی ایما پر منظر عام پر آئی تھی اور بدلتے ہوئے اس ادبی رجحان میں افادی اور فطری شاعری اپنا وجود قائم کر رہی تھی۔

علی گڑھ تحریک کے فکری زاویوں اور ادبی اثرات کا سب سے گہرا اثر حالی کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں، غزلوں اور نایاب تصانیف کے ذریعے علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقصد اور اساسی پہلوؤں کو تقویت بخشی۔

حالی کا شمار ان مؤرخوں، نقادوں اور شاعروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے سرسید کی افادی ادب اور نیچری شاعری پر خاص توجہ مرکوز کی۔ اردو ادب اور تنقید میں ادب کے سماجی مقصد اور اس کی افادیت پر زور دے کر ادب کو مغربی تصورات سے روشناس کیا۔''نیچر'' وہ لفظ ہے کہ جس پر سرسید اور حالی دونوں نے بار بار اصرار کیا ہے اور اسی اصرار نے حالی کو مسدس ''مدو جزر اسلام'' لکھنے پر آمادہ کیا۔1879ء میں جب یہ نظم شائع ہوئی تو سرسید نے اپنے ایک خط میں اس کی تعریف اس طرح کی:

> ''اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔کسی صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے۔......آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرستہ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کروادی

جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور جوان کی تاریخ کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔جس قدر چھپے اور جس قدر مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گایا کریں اور رنڈیاں مجلسوں میں سارنگی پر گاویں،قوال درگاہوں میں گاویں،حال لانے والے سچے حال پر حال لاویں۔اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں،مگر وہ رنڈیاں یہی مسدس گاتی ہوں۔میں اس کُل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔''

(حالی کا ذہنی ارتقا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان،ص 67-66)

یہ تحریر اس بات کی غماز ہے کہ حالی کا یہ فن پارہ ان کی امید پر کھرا اترا، کیوں کہ سرسید نے سادگی، بے تکلفی اور مطلب نگاری کو ہی نیچر قرار دیا تھا۔یہ تمام خصوصیات حالی کے اس مسدس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔سرسید کے اثرات ان کے اکثر معاصرین ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں پر صاف نظر آتے ہیں۔حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سرسید کا کتنا اثر قبول کیا۔کیونکہ حالی کے خیالات میں سرسید کے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔مثلاً نظم کے لیے بول چال کی زبان اور فطری جذبات کو ترجیح دی۔

حالی بھی سرسید کی طرح مسلم قوم کی زبوں حالی کو بیان کرکے انہیں ذلت و رسوائی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے کوشاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کی وہ نظمیں جو انہوں نے انجمن پنجاب کے موضوعی مشاعروں میں پڑھی تھیں،سرسید کو بہت پسند آئیں۔حالی کی شاعری کی بنیاد ان نایاب مشہور نظموں پر ہے۔(1) برکھارت (2) نشاط امید (3) حب الوطنی اور (4) مناظرۂ رحم وانصاف وغیرہ۔ان نظموں کی اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں حقیقت نگاری ہے، مبالغہ سے پاک ہیں۔تشبیہ واستعارہ کے بھنور سے آزاد ہیں اور یہی علی گڑھ تحریک کے تحت اردو شاعری کا بدلتا ہوا منظر نامہ بھی ہے۔

اردو شاعری کی پہچان اب تک غزلوں سے تھی۔نظم نگاری اس وقت تک پورے طور پر ابھر کر سامنے نہیں آئی جب تک سرسید نے اس کی طرف توجہ نہیں دلائی۔ بعد میں مولوی محمد حسین آزاد کی کاوشوں سے ''انجمن پنجاب لاہور'' نے نظم نگاری کی باضابطہ تحریک چلائی۔ سرسید ہر چیز کو اجتماعی اور افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔چنانچہ شاعری کے بارے میں بھی ان کا خیال تھا کہ مروجہ شاعری میں فطری جذبات کی کمی ہے۔اسی لیے محمد حسین آزادؔ کی مثنوی ''خوابِ امن'' اور حالی کی نظم ''برکھارت'' کی خوب تعریف کی۔سرسید شاعری میں ردیف وقافیہ کے التزام کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔اس تحریک کا اثر عبدالحلیم شررؔ کے یہاں پوری طرح عیاں ہے۔انہوں نے رسالہ ''دلگداز'' میں متعدد ایسی نظمیں شائع کیں جن میں مروجہ قواعد وضوابط سے انحراف ہے۔

علی گڑھ تحریک نے غزل کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی کوشش کی۔اس کا سبب خود سرسید احمد خان یہ بتاتے ہیں کہ:

''ہماری زبان کے علم وادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔''

اس بناء پر سرسید احمد خان نے غزل کی ریزہ خیالی کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی سعی کی۔نظم کے فروغ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی سے ''مسدس حالی'' لکھوائی اور پھر اُسے اپنے اعمال حسنہ میں شمار کیا۔سرسید احمد خان

شاعری کے مخالف نہ تھے لیکن وہ شاعری کو نیچرل شاعری کے قریب لانا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے محمد حسین آزاد کے نیچر مشاعرے کی داد دی اور ان کی مثنوی ''خواب امن'' کو دل کھول کر سراہا۔ سرسید احمد خان کی جدیدیت نے اس حقیقت کو بھی پالیا تھا کہ قافیہ اور ردیف کی پابندی خیالات کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ ہے۔ چنانچہ انہوں نے بے قافیہ نظم کی حمایت کی اور لکھا کہ:

''ردیف اور قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔''

چنانچہ سرسید احمد خان کے ان نظریات کا اثر یہ ہوا کہ اردو نظم میں فطرت نگاری کی ایک موثر تحریک پیدا ہوئی۔ نظم جدید کے تشکیلی دور میں علی گڑھ تحریک کے ایک رکن عبدالحلیم شرر نے سرگرم حصہ لیا اور ''رسالہ دلگداز'' میں کئی ایسی نظمیں شائع کیں جن میں جامد قواعد وضوابط سے انحراف برت کر تخلیقی رو کو اظہار کی آزادی عطا کی گئی تھی۔

سرسید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولوی الطاف حسین حالؔی سے ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھوائی۔ اس نظم نے مسلم معاشرہ کی اصلاح میں غیر معمولی کام انجام دیا۔ اس کے تعلق سے مولوی عبدالحق نے ایک دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں کسی شادی میں شرکت کی غرض سے ان کا جانا ہوا۔ اس تقریب میں انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک شخص مسدس مولانا حالی پڑھتا جاتا ہے اور خود بھی رو رہا ہے دوسروں کو بھی رلا رہا ہے۔ مسدس کی سادگی، سلاست، روانی، قوم کو بیدار کرنے والا مضمون اور شاعر کا خلوص آج بھی دلوں کو گرماتا اور لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ شبلؔی کی قومی اور سیاسی شاعری میں بھی یقیناً سرسید کا ذہن کارفرما ہے۔ بعد کے اکثر قومی شاعروں نے انہیں بنیادوں پر شاعری کر کے نام کمایا۔ شروع میں اکبر الہ آبادی نے علی گڑھ تحریک کی پرزور مخالفت کی اور اس کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ایک طرح سے ان کے ذہن اور شاعری دونوں کو علی گڑھ تحریک ہی سے جلا اور روشنی حاصل ہوئی۔ ''مخزن'' میں لکھنے والے اکثر شاعروں کے کلام میں اس تحریک کا اثر نظر آتا ہے اور آگے چل کر اقبالؔ نے سرسید کی سخت کلاسیکیت کے خلاف رومانوی احتجاج کا جھنڈا بلند کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ مولانا حالی کی کسی دو نظموں کے نام بتائیے۔

2۔ ''برکھارت'' اور ''نشاط امید'' کا خالق کون ہے؟

20.4.6 اردو تنقید نگاری؛

علی گڑھ تحریک نے زندگی کے جمال کو اجاگر کرنے کے بجائے مادی قدروں کو اہمیت دی۔ چنانچہ ادب کو بے غرضانہ مسرت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسا مفید وسیلہ قرار دیا گیا جو مادی زندگی کو بدلنے اور اسے مائل بہ ارتقاء رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ادب کا یہ افادی پہلو بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تاہم یہ اعزاز علی گڑھ تحریک کو حاصل ہے کہ اردو زبان کے بالکل ابتدائی دور میں ہی اس کی عملی حیثیت کو اس تحریک نے قبول کیا اور ادب کو عین زندگی بنا دیا۔ اس اعتبار سے بقول سید عبداللہ سرسید سب پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے۔ اول الذکر حیثیت سے سرسید احمد خان نے ادب کو تنقید حیات کا فریضہ سرانجام دینے پر آمادہ کیا اور موخر الذکر حیثیت سے ادب کی تنقید کے موقر اصول وضع کر کے اپنے رفقاء کو ان پر عمل کرنے کی تلقین کی۔

اگرچہ سرسید احمد خان نے خودفن تنقید کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی، لیکن اُن کے خیالات نے تنقیدی رجحانات پر بڑا اثر ڈالا۔ان کا یہ بنیادی تصور کہ اعلیٰ تحریر وہی ہے جس میں سچائی ہو، جو دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے، بعد میں آنے والے تمام تنقیدی تصورات کی اساس ہے۔سرسید احمد خان نے قبل عبات آرائی اور قافیہ پیمائی کو اعلیٰ نثر کی ضروری شرط خیال کیا جاتا تھا لیکن سرسید احمد خان نے مضمون کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔انہوں نے انداز بیان کے بجائے مضمون کو مرکزی اہمیت دی اور طریق ادا کو اس کے تابع کر دیا۔سرسید احمد خان کے یہ تنقیدی نظریات ان کے متعدد مضامین میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں اور ان سے سرسید احمد خان کا جامع نقطہ نظر مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک نے ایک ان لکھی کتاب پر عمل کیا۔

علی گڑھ تحریک سے اگر پہلے کی تنقیدی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے قبل کی تنقید صرف ذاتی تاثرات کے اظہار تک محدود تھی۔لیکن سرسید احمد خان نے ادب کو بھی زندگی کے مماثل قرار دیا۔اور اس پر نظری اور عملی زاویوں سے تنقیدی کی۔گو کہ سرسید احمد خان نے خود تنقید کی کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی۔تاہم ان کے رفقاء میں سے الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' جیسی اردو تنقید کی باقاعدہ کتاب لکھی اور اس کا عملی اطلاق ''یادگار غالب'' میں کیا۔مولانا حالی کے علاوہ شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات ان کی متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔ ان نظریات کی عملی تقلید ''شعر العجم'' ہے۔

سرسید نے صرف ادب اور اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ انہوں نے قاری کو اساسی حیثیت کو بھی تسلیم کیا۔انہوں نے مضمون کو طرز ادا پر فوقیت دی، لیکن انشاء کے بنیادی تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ طرز ادا میں مناسب لطف پیدا کر کے قاری کو سحر اسلوب میں لینے کی تلقین بھی کی۔ چنانچہ ان کے رفقاء میں سے مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں مضمون اور اسلوب کی ہم آہنگی فطری طور پر عمل میں آتی ہے اور اثر و تاثیر کی ضامن بن جاتی ہے۔اگرچہ ان کے مقابلے میں حالی کے ہاں تشبیہ اور استعارے کی شیرینی کم ہے تاہم وہ موضوع کا فکری زاویہ ابھارتے ہیں اور قاری ان کے دلائل میں کھو جاتا ہے۔اس طرح مولوی ذکاء اللہ کا بیانیہ سادہ ہے لیکن خلوص سے عاری نہیں جبکہ نواب محسن الملک کا اسلوب تمثیلی ہے اور ان کی سادگی میں بھی حلاوت موجود ہے۔

اردو ادب میں اب تک جانچنے اور پرکھنے کا کوئی متعین اصول نہیں تھا۔اس تحریک نے پہلی مرتبہ ادب کی ماہیت' ساخت' مقصد اور قاری کی اہمیت کے سلسلے میں آواز بلند کی۔ پہلی مرتبہ ادب میں قاری کے وجود کو تسلیم کیا گیا۔سرسید کے تنقیدی نظریات ان کے متعدد مضامین میں بکھرے ہوئے ہیں۔انہوں نے باضابطہ تنقید کی کوئی کتاب نہیں لکھی البتہ ان کے رفقا میں سے حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔''مقدمۂ شعر و شاعری'' حالی کے دیوان کے ساتھ 1893ء میں شائع ہوا جو اردو تنقید نگاری میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔اس نے تنقیدی روایت کا رُخ بدل دیا اور جدید تنقید کی بنیاد رکھی۔اس کتاب میں شاعری کے حوالہ سے ظاہر کیے گئے خیالات، مغربی تنقیدی اصولوں کی اشاعت کے باوجود اب بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

شبلی نے بھی ''شعر العجم'' کے ذریعہ تنقید کو فروغ بخشا۔علی گڑھ تحریک نے تنقید کے جس نظریے کو فروغ دیا اس میں طرز ادا کے بجائے مرکزی موضوع اور بنیادی مضمون کو اہمیت حاصل ہے۔یعنی بات کا مفہوم الفاظ میں گم ہونے کے بجائے قاری تک آسانی سے پہنچ جائے۔اس طرح اس تحریک نے قاری کی اساسی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ بھی دھیان میں رہے کہ سرسید نے مضمون کے ساتھ انشا کے بنیادی تقاضوں کو بھی مدِنظر

رکھا ہے۔ جسے شبلی اور نذیر احمد نے خوب صورتی سے برتا ہے۔

موجودہ دور میں تنقیدی ادب کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے مختلف دبستان قائم ہو چکے ہیں مگر شعر و ادب کے تعلق سے علی گڑھ تحریک نے جو کچھ نظریات اور خیالات دیے آج بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور یہی کیا کم ہے کہ تنقیدی شعور کی داغ بیل اسی نے ڈالی۔ تقابلی مطالعہ کا راستہ بھی شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر دکھایا۔

''موازنہ انیس و دبیر'' کو اردو کی پہلی تقابلی کتاب کہی جاتی ہے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ موازنہ اور تقابل دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں اور ماہرین لسانیات کا متفقہ خیال ہے کہ ایک ہی زبان کے دو لفظ ہم معنی نہیں ہو سکتے، ہاں قریب المعنی ضرور ہو سکتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک مترادف لفظ ہوتے ہی نہیں ہیں۔ اس تناظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شبلی کی مذکورہ کتاب کو تقابلی کتاب تسلیم کیا جانا چاہیے یا نہیں؟ راقم الحروف کے نزدیک اس کتاب کو تقابلی نہیں بلکہ موازنہ کی کتاب کہا جانا چاہیے۔ میری تفہیم کے مطابق موازنہ اور تقابل میں ایک باریک سا فرق ہے وہ یہ کہ تقابل میں موازنہ شامل ہے جبکہ موازنہ میں تقابل شامل نہیں ہے۔ یعنی محض ہم وزن چیزوں کا تقابل کرنا موازنہ ہوگا اور قدر مشترک چیزوں کا تقابل کرنا تقابلی مطالعہ ہوگا۔ اس کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ موازنہ کے مقابلے میں تقابل میں زیادہ وسعت ہے۔ اس لحاظ سے موازنہ انیس و دبیر تقابلی کتاب نہیں ہوگی۔ پھر بھی موازنہ انیس و دبیر کی اہمیت اور شبلی نعمانی کی علمیت پر کوئی کلام نہیں ہے۔ یہ تسلیم شدہ تقابلی کتاب ہے۔ اسی موازنے سے اردو میں عملی تقابلی طریقۂ کار کی ابتدا ہوئی۔

موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تین کتابیں ''ردالموازنہ از میر افضل علی''، ''تردید موازنہ از حسن رضا و محمد جان عروج'' اور ''المیزان از نظیر الحسن فوق'' لکھی گئیں۔ یہ کتابیں تقابلی مطالعے ہی کی ایک کڑی ہیں۔ اس کے بعد سے اردو میں تقابلی مطالعے کا رواج عام ہوا اور اس پر متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کی پہلی اشاعت کب ہوئی؟

2۔ ''شعر العجم'' کا مصنف کون ہے؟

20.4.7 اردو صحافت:

اردو صحافت نگاری کا آغاز سرسید کے بچپن میں ہو چکا تھا مگر سرسید کے زمانے میں اخباروں کا پیشہ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ سرسید کے بھائی سید محمد خان دہلی سے ''سید الاخبار'' نکالتے تھے۔ سرسید نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا اسی اخبار سے کی۔ غازی پور میں جب انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تو اس کے نام سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی بھی جاری کیا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اس کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ ''تہذیب الاخلاق'' کو بھی صحافتی خدمات میں شمار کیا جاسکتا ہے اگر چہ اس میں سنجیدہ اور علمی مضامین ہوتے تھے۔

سرسید کی صحافت میں دو باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ ایک اخبار کی دیدہ زیبی' کاغذ کی عمدگی' حروف کی خوب صورتی وغیرہ جو انہوں نے یورپ کے اخباروں سے لی تھی۔ دوسرے اخبارات میں بے خوف آزادیٔ رائے جس میں تعمیری پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جو بعد میں ذرائع ابلاغ سے رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ بعد میں ملک کے حالات بدل گئے۔ تحریک آزادی جڑ پکڑ چکی تھی تو ''الھلال''، ''البلاغ''، ''زمیندار''،

''دبدبہ سکندری'' وغیرہ اخباروں نے اردو کی صحافتی دنیا کو مالا مال کیا۔

الہلال: یہ ہفتہ وار اخبار تھا، جس کو سرسید احمد خان نے کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ 13/ جولائی 1912 کو شائع ہوا۔ الہلال نے اردو صحافت کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔اس اخبار سے نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت ملی بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شامل ہونے کی تلقین کی۔ یہ اخبار 1914 کے پریس ایکٹ کے تحت بند کر دیا گیا تھا۔

البلاغ: جب برطانوی نوآبادیاتی حکومت نے الہلال کو 1914 میں بند کر دیا تو اس کے نتیجے میں آزاد نے اسی سال یعنی 1914 میں ایک اور ہفتہ وار اخبار ''البلاغ'' کا آغاز کیا، جو 1916 میں رانچی میں آزاد کے قید خانہ کے بعد تک جاری رہا۔

مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک ایک بہت بڑی فکری اور ادبی تحریک تھی۔ خصوصاً ادبی لحاظ سے اس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ثابت ہوا۔ اس تحریک کی بدولت نہ صرف اسلوب بیان اور روح مضمون میں بلکہ ادبی انواع کے معاملے میں بھی ناموران علی گڑھ کی توسیعی کوششوں نے بڑا کام کیا۔ اور بعض ایسی اصناف ادب کو رواج دیا جو مغرب سے حاصل کردہ تھیں۔ ان میں سے بعض رجحانات خاص توجہ کے لائق ہیں۔ مثلاً نیچرل شاعری کی تحریک جس میں محمد حسین آزاد کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی بھی برابر کے شریک تھے۔ قدیم طرز شاعری سے انحراف بھی اسی تحریک کا ایک جزو ہے۔ اردو تنقید جدید کا آغاز بھی سرسید احمد خان اور اُن کے رفقاء سے ہوتا ہے۔ سوانح نگار، سیرت نگاری، ناول اردو نظم اور مضمون نگاری سب کچھ ہی سرسید تحریک کے زیر اثر پروان چڑھا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ ''سید الاخبار'' کس نے جاری کیا؟

2۔ ''الہلال'' کا پہلا شمارہ کب جاری ہوا؟

20.5 اکتسابی نتائج

☆ علی گڑھ تحریک اردو نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی اس سے پہلے صرف زبان کی ساخت و پرداخت پر زور دیا جاتا تھا۔ اس نے لفظ کے حسن کو اجاگر کرنے کے بجائے روح اور معنی کو اہمیت دی۔

☆ علی گڑھ تحریک سے قبل اردو ادب کا بیشتر تخلیقی ادب صرف شاعری کے اصناف کا احاطہ کرتا تھا۔

☆ علی گڑھ تحریک نے نثر کی اصناف کو بھی فروغ بخشا۔ اس نے مشرق و مغرب کے فکری سرچشموں کو ملا کر اردو ادب کو مغرب کے برابر لانے کی کوشش کی۔ اس طرح سرسید نے جدید مغربی خیالات کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ کیا۔

☆ اردو میں کئی اصناف سے متعارف اسی تحریک نے کرایا اور پہلے سے موجود اصناف کی اصلاح کی۔ اس کا تصور بالکل واضح تھا۔ ابہام نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اردو ادب کو اس نے مالا مال کر دیا۔

☆ اردو شاعری پر علی گڑھ تحریک نے جو احسان کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک کی بدولت آزؔاد اور حاؔلی جیسے علماء نے اردو ادب کو نیچرل شاعری کا تحفہ عطا کیا۔ اس سے قبل شاعری کے میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامہ دکھائی نہیں دیتا۔

☆ ادب کا کون سا وہ شعبہ ہے جو اس سے متاثر نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو کی بعد کی تمام تحریکیں علی گڑھ تحریک کا

عکس لیے ہوئے ہیں۔

☆ سرسید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولوی الطاف حسین حالؔی سے ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھوائی۔ اس نظم نے مسلم معاشرہ کی اصلاح میں غیر معمولی کام انجام دیا۔

☆ اردو کیا کسی اور زبان کی شاید ہی کوئی ایسی تحریک ہو، جس نے ادب اور زندگی دونوں کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا کہ علی گڑھ تحریک نے کیا۔

☆ علی گڑھ تحریک میں اصلاحی اور منطقی نقطہ نظر کو تمثیل میں بیان کرنے کا رجحان سرسید احمد خان، مولانا حالی اور محسن الملک کے ہاں نمایاں ہے۔ تاہم مولوی نذیر احمد نے اسے فن کا درجہ دیا اور تحریک کے عقلی زاویے اور فکری نظریے کے گرد جیتے جاگتے اور سوچتے ہوئے کرداروں کا جمگھٹا کھڑا کر دیا۔

☆ نظیر احمد کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار پھر آگے مرزا ہادی رسؔوا نے ناول کے فن کو عروج بخشا۔

☆ موجودہ دور میں تنقیدی ادب کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے مختلف دبستان قائم ہو چکے ہیں مگر شعر و ادب کے تعلق سے علی گڑھ تحریک نے جو کچھ نظریات اور خیالات دیے آج بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور یہی کیا کم ہے کہ تنقیدی شعور کی داغ بیل اسی نے ڈالی۔ تقابلی مطالعہ کا راستہ بھی شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر دکھایا۔

☆ موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تین کتابیں ''ردالموازنہ از میر افضل علی''، ''تردید موازنہ از حسن رضا و محمد جان عروج'' اور ''المیزان از نظیر الحسن فوق''، لکھی گئیں۔ یہ کتابیں تقابلی مطالعے ہی کی ایک کڑی ہیں۔ اس کے بعد سے اردو میں تقابلی مطالعے کا رواج عام ہوا اور اس پر متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔

☆ الہلال ہفتہ وار اخبار تھا، جس کو سرسید احمد خان نے کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ 13/جولائی 1912 کو شائع ہوا۔ الہلال نے اردو صحافت کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس اخبار سے نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت ملی بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شامل ہونے کی تلقین کی۔ یہ اخبار 1914 کے پریس ایکٹ کے تحت بند کر دیا گیا تھا۔

☆ جب برطانوی نوآبادیاتی حکومت نے الہلال کو 1914 میں بند کر دیا تو اس کے نتیجے میں آزاد نے اسی سال یعنی 1914 میں ایک اور ہفتہ وار اخبار ''البلاغ'' کا آغاز کیا، جو 1916 میں رانچی میں آزاد کے قید خانہ کے بعد تک جاری رہا۔

☆ اردو نثر کی بیشتر اصناف مثلاً تاریخ نگاری، سوانح نگاری، سیرت نگاری، ناول نگاری، مضمون نگاری سب کچھ ہی سرسید تحریک کے زیر اثر پروان چڑھی۔

20.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
مظہر	عکس
توانا	مستحکم

افادیت	سود مند، فائدہ مند
موروثی	خاندانی
بازیافت	تلاش
واضح	کھلا ہوا
وابستہ	منسلک
اتباع	کسی کے طریقہ کو اپنانا
بیرونی	باہری
مہلک	ہلاک کرنے والی
خصلت	عادت
تمثیل	مثالیں
مروّجہ	رائج شدہ
التزام	ضرور برتا گیا
ماہیت	شکل وصورت
داغ بیل	بنیاد
ابہام	غیر واضح
استدلال	دلیل، ثبوت
ثقافت	تہذیب، رہن سہن
استطاعت	طاقت، قدرت

20.7 نمونہ امتحانی سوالات

20.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات :

1۔ سرسید کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی ؟

2۔ اخبار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کس نے جاری کیا؟

3۔ ''آثار الصنادید'' کا مصنف کون ہے؟

4۔ اردو میں تقابلی مطالعے کی ابتدا کس کتاب سے ہوتی ہے؟

5۔ رسالہ ''دلگداز'' کس نے جاری کیا؟

6۔ اردو تنقید کی کون سی کتاب حالؔی نے لکھی ہے؟

7۔ شعرالعجم کے مصنف کا نام بتائیے؟

8۔ سائنٹفک سوسائٹی کہاں قائم ہوئی؟

9۔ سرسید کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

10۔ ''سرسیداوران کے ناموررفقا'' کا مصنف کون ہے؟

20.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ اردو ادب پر سرسید کے فکری اور عملی اثرات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ مختلف اصناف ادب پر علی گڑھ تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ بیان کیجیے۔

3۔ اردو کے پہلے ناول نگار کون ہیں ان کے ناولوں کی کیا خصوصیات ہیں؟

4۔ اردو مضمون نگاری کے آغاز میں سرسید تحریک کا کون سا رسالہ ہے؟

5۔ سرسید سے قبل اردو ادب کا جائزہ لیجیے۔

20.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورتحال کیا تھی؟

2۔ اردو شاعری کو علی گڑھ تحریک نے کس طرح متاثر کیا؟

3۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو تنقید میں کیا تبدیلی رونما ہوئی؟

20.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	اردو ادب کی تحریکیں	انورسدید
2۔	سرسیداوران کے ناموررفقا	سیدعبداللہ
3۔	سیداحمد خان	خلیق احمد نظامی
4۔	مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالؔی
5۔	افاداتِ سلیم	وحیدالدین سلیم

اکائی 21 : رومانی تحریک

اکائی کے اجزا

21.0 تمہید
21.1 مقاصد
21.2 رومانی تحریک: ایک تعارف
21.2.1 مغرب میں رومانی تحریک
21.2.2 ارو میں رومانی تحریک کا آغاز وارتقا
21.2.3 اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات
21.3 اکتسابی نتائج
21.4 کلیدی الفاظ
21.5 نمونۂ امتحانی سوالات
21.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
21.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
21.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
21.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

21.0 تمہید

رومانی تحریک نے اردو ادب کو ایک نئی سوچ اور فکر دی، جس میں عقل کے بجائے احساسات و جذبات کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کے لیے جدو جہد شروع ہوئی۔ رومانی تحریک بھی دوسری تحریکوں کی طرح صنعتی انقلاب کی دین ہے اور بدلتے ہوئے حالات میں ایک نئی کائنات کی تلاش سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں نئی قدروں کی آمد اور پرانی قدروں اور اصولوں سے انحراف ہی نہیں بلکہ ان کے رد کی تجاویز بھی سامنے آنا شروع ہوئیں۔ اس اکائی میں ہم یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ رومانی تحریک نے برصغیر میں اردو ادب پر کب اور کس طرح اثر انداز ہونا شروع کیا۔ کلاسیکی اور مقصدی ادب سے اس تحریک نے ادب کے مزاج اور اسلوب کے رجحان کو یکسر بدل دیا اور نئی روایات کو جنم دیا۔ رومانی تحریک نے پرانے ادبی فلسفے کے ساتھ ساتھ ادب میں تخیل، جذبات اور فطرت کے عمل کو بھی داخل کیا۔

21.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ اردو ادب میں رومانی تحریک کے فروغ اور عروج و زوال کے بارے میں بھرپور جانکاری حاصل کرسکیں گے۔

☆ اردو ادب کے علاوہ یورپی ادب میں رومانی تحریک کے آغاز کے اسباب اور اغراض و مقاصد کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے۔

☆ انگریزی ادب رومانی تحریک سے کس حد تک متاثر ہوا اور اس کی بنیادی وجہ کیا تھی۔اس سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

☆ مغرب و مشرق میں ایسی کون سی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں، جن سے متاثر ہوکر مغربی ادبا کے ہمراہ مشرقی ادبا بھی پرانی ادبی روایات سے ہٹ کر رومانی فکروفن کی طرف مائل ہوئے۔یہ بھی جان سکیں گے۔

☆ انگریزی ادب کے مفکرین کے علاوہ اردو ادب کے ان مفکرین، ادبا و شعرا کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کریں گے، جنہوں نے برصغیر میں رومانی تحریک کی داغ بیل ڈالی اور جن کے ہاں رومانی طرز و فکر کے اولین نقوش ملتے ہیں۔

21.2 رومانی تحریک: ایک تعارف

رومانیت کو انگریزی میں Romanticism کہتے ہیں یہ اصطلاح Romance یا Romana سے لی گئی ہے۔ رومانا جنوبی علاقے کی لاطینی زبان کا نام ہے اور Romance ان زبانوں کو کہا جاتا ہے جو یوروپ کے جنوبی علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ یہ قدیم رومن لاطینی زبان کی کوکھ سے نکلی ہوئی زبانیں ہیں۔ انہوں نے بھی دوسری زبانوں کی طرح مقامی زبانوں کے اثرات قبول کرنے کی وجہ سے مختلف شکلیں اختیار کیں، ان میں اطالوی، ہسپانوی اور پرتگالی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بقول بکسن اور آرتھر Romantic لفظ کو جس شخص نے پہلی مرتبہ استعمال کیا وہ جرمن نقاد Friedrich Schlegal تھا اور جرمنی سے ہی یہ اصطلاح فرانس اور انگلینڈ تک پہنچی۔ مورخین کا خیال ہے کہ رومانیت کی تحریک پہلے پہل چوتھی صدی قبل مسیح میں یونان سے شروع ہوئی اور قدیم یونانی دیومالاؤں میں جو تخلیقی لچک ہے اسے رومانی یا رومانیت کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ پرانی اساطیری روایات و توہمات اور مافوق الفطرت عناصر کے خلاف بغاوت سے سرکشی اور جنسی افسانے جیسی روایات سے رومانیت میں انحراف کی مثالیں ملتی ہیں۔

رومانوی تحریک سے متعلق مختلف نظریات سامنے آتے ہیں۔ رومانیت کو زندگی سے فرار کا نام بھی دیا جاتا رہا ہے۔ شروع میں کولرج، ورڈزورتھ اور ان کے ہم عصروں کے لیے جن کے دل میں انسانی جذبات کا درد اور قدریں تھیں ان کے لیے یہ تحریک ایک عظیم مشعل راہ تھی لیکن ان کے عزائم منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی متزلزل ہوکر زمین بوس ہوگئے۔ لیکن جس راستے پر یہ تحریک چل نکلی تھی اگر صحیح سلامت منزل تک پہنچ جاتی تو آج اس کی صورت حال یہ نہیں بلکہ دوسری ہوتی اور رومانیت کے پیروکاروں نے جو خواب دیکھے تھے وہ حقیقت میں تبدیل ہوجاتے تو یہ رومانی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی لیکن آگے چل کر اس میں جو بدگمانیاں اور خرابیاں آئیں ان کو دیکھ کر رومانیت کی شان میں قصیدے پڑھنے والے بھی ششدر رہ گئے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی ادب میں شیلے، کیٹس اور بائرن کو اپنے پیشروؤں یعنی ورڈزورتھ اور کولرج وغیرہ کے خلاف یہ کہنا پڑا کہ وہ ''جس عظیم مقصد کو لے کر چلے تھے آخر میں انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ بزدلوں کی طرح انسانی زندگی

سے فرار اختیار کر کے فطرت کی گود میں سو گئے''۔

21.2.1 مغرب میں رومانی تحریک

جرمنی اور انگلستان میں رومانی تحریک کو روسو کے نظریات اور انقلاب فرانس کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس سے متعلق بھی مختلف آرا ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ تحریک انگلستان کی تہذیبی، معاشرتی زندگی پر زیادہ گہرے نقوش نہیں چھوڑ سکی۔اس کے برعکس ادبا و شعرا کو اس نے ضرور کسی حد تک متاثر کیا۔یوروپ کی رومانی تحریک کی بنیادی وجہ انقاب فرانس تھا لیکن انقلاب نے جن ارمانوں کو پروان چڑھایا تھا انقلاب کی کامیابی نے انہیں ٹھنڈا کر دیا کیونکہ انقلاب نے حکام کے چند مہروں کو ہی پکڑا تھا کہ جس کی وجہ سے کوئی مثبت ردعمل سامنے نہیں آیا بلکہ اس نے پرانے جاگیرداری نظام کو ہی مستحکم کیا۔مغربی دنیا میں اس تحریک کا عمل دخل سب سے پہلے ہرڈر کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے شاعری کو انسانیت کی زبان قرار دیا اور اپنے ہم عصر ادیبوں کو قومی اور ملی مزاج کے مطابق ادب تخلیق کرنے کی تلقین کی۔ان میں ایک اہم نام جیمز میکفرسن کا ہے جنہوں نے اس نئی تبدیلی کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں کوئی زیادہ اپنی پہچان نہیں بنا سکے۔اس کے بعد جو نوجوان اس میدان میں ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں لینز، کلینگر، ملر اور ویگنر کے نام قابل ذکر ہیں۔انہوں نے اس فکر کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اسی قطار میں جرمن کا مشہور شاعر گوئٹے بھی شامل تھے۔ان کی تصنیف ''ورتھر کا غم'' رومانیت کے حیوانی زاویئے کی اور فاوسٹ فکر زاویے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

جرمنی میں رومانی ادب کے آخری مفکر شلر کا نام آتا ہے۔ان کا ڈرامہ ''Robbers'' کو اس تحریک کا روح رواں بھی کہا جاتا ہے۔ جرمنی میں اس تحریک نے اپنا رابطہ اور رشتہ مابعد الطبعیات کے ساتھ جوڑا۔ جرمن میں ان ہی ادیبوں نے انسانی ذہن کو جھنجھوڑا اور عروج عطا کیا اور ادب پر بھی اپنی فکر کے اثرات چھوڑے بلکہ بیسویں صدی نے ان ہی کے متعین کردہ اصولوں کو مطمع نظر بنایا۔اس طرح یہ تحریک ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے انگلستان پہنچتی ہے اور انگلستان کے رومانی شاعر کالرج نے مشیلنگ کے نظریات کو بہت پسند کیا۔ان کے نظریات کے اثرات ان کی تصنیف لٹریریا بیا گرافیکا میں نظر آتی ہیں۔اس طرح یہ رومانی تحریک معجزاتی انداز میں انگلستان میں داخل ہوتی ہے اور یہاں پر رومانی شعراء میں بلیک کو اولین شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔لیکن اس کے معاصرین نے انہیں رومانیت کا شاعر تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔رومانی ادب کے شعراء میں ورڈز ورتھ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کے نظریات نے انقلاب فرانس سے راہ پائی تھی اور نیچر میں حسن کے تلاش کی جستجو شروع کی اور شاعری کے لیے عام فہم اور دیہاتی زبان کا استعمال کیا۔ ورڈز ورتھ کے ہمعصر کالرج کا شمار بھی رومانی ادب کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔انہوں نے رومانیت کو ایک نئی روح اور تازگی عطا کی۔وہ بیک وقت شاعر، نقاد اور مفکر بھی تھے۔انہوں نے '' The Rime of Ancient Marinor'' اور ''قبیلائی خان، کرسٹابل'' میں رومانیت کو تخلیقی جادو سے بھرپور زندگی عطا کی اس تحریک کے آخری شاعر Keats نے بھی رومانیت کے پرخار دروں میں سفر کیا۔وہ مافوق الفطرت عناصر کے اشعاروں کے بجائے حقیقی دنیا کی ارضی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس کی عمدہ مثال ان کی نظم ''Labelle Dame Sans Merci'' ہے اور نثری ادب میں والپول، ولیم بیکفرڈ، جیمز وائٹ وغیرہ جیسے متعدد ادبا سامنے آئے۔ان میں چارلس مالیمب، ولیم ہزلٹ اور ڈی کوئینسی نے بھی نثری ادب میں رومانیت کی داغ بیل ڈالی۔انگلستان اور جرمنی میں رومانی تحریک کو روسو کی فکری جہت اور انقلاب فرانس سے رونما ہونے والے حالات کی وجہ قرار دیا جاتا ہے

لیکن محققین کی آرا سے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ قدر مختلف ہیں۔ امین کے رحمٰن کے مطابق ''رومانی تحریک کا آغاز Chaterabriand سے ہوتا ہے۔''

اٹھارہویں صدی کے نصف میں رومانی تحریک کو شکسپیر نے بھی بے پناہ مقبولیت عطا کی۔ دراصل رومانی تحریک کے خدوخال کے اثرات چوتھی صدی قبل مسیح میں قدیم یونانی دیومالاؤں میں بھی ملتا ہے۔ بہرحال یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ کسی بھی تحریک کو ان کے روحانی رشتوں کو زمان و مکان کی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ تحریکیں راتوں رات جنم نہیں لیتی اور نہ ہی پروان نہیں چڑھتی ہیں بلکہ ان کا تانا بانا تیار کرنے میں صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ انور سدید رومانی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:-

''رومانیت کی اساسی روح افلاطون کے نظریات میں موجود ہے۔ چنانچہ جب افلاطون نے انسانوں کو ایک ایسا پرندہ قرار دیا جو بے پر ہونے کے باوجود قوت پرواز رکھتا ہے۔ تو درحقیقت انسان کے مخیلہ پر بالواسطہ مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ چنانچہ رومانیت اس کیفیت کو پالینے کا نام ہے، جب انسان کا مادی وجود ہمہ تن جذبے میں تحلیل ہو کر جسم کو پر لگا دیتا ہے۔ ولیم بلیک (William Blake) نے تخیل کو رومانی عمل کا مخرج قرار دیا ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ تخیل خدا کا وہ عمل ہے جس سے وہ اپنی مخلوق کے ساتھ وابستہ ہے۔ کالرج فطری شاعر تھا اس لیے اس نے اپنے داخل کی آواز کو بگوش ہوش سنا اور عینی دنیا کو اعلیٰ ترین قوت والے انسان کا آشیانہ قرار دیا۔ کالرج تخیل کو زندہ طاقت تصور کرتا ہے اور اسے انسانی دانش کا محرک قرار دیتا ہے۔''

دراصل نویں صدی عیسوی میں رومانی زبان تحریری شکل میں سامنے آئی۔ چنانچہ ایک لمبے عرصے تک اس زبان میں صرف عشق و محبت کی کہانیاں لکھی جاتی رہیں اور اصطلاحی معنوں میں خیالی قصے کہانیوں کو رومانس کہا جاتا تھا۔ انگریزی ادب میں ان خیالی قصوں، مبالغہ آرائی، تخیلی دنیا میں محل تعمیر کرنا عقل کے خلاف باتیں کرنے کو ہی رومان کہا جاتا تھا۔ بہرحال ورڈز ورتھ اور کولرج کے خیال میں شاعری صرف آلہ اظہار ہی نہیں بلکہ اظہار فکر بھی ہے۔ رومانوی ادب کا اصل مقصد حیات و کائنات اور ان کے روحانی رشتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی ایک کوشش ہے۔ انگریزی ادب میں رومانی تحریک کا رجحان اور رومانوی فکر کس طرح داخل ہوتی ہے اس کے متعلق ساقی جاوید لکھتے ہیں:

''چنانچہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یہی کچھ ہوا اور انگریزی ادب میں ورڈز ورتھ اور کولرج کی مشترکہ کاوش LYRICAL BALLARDS بن کر سامنے آئی۔ یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رومانیت کی یہ نئی تحریک شعر و ادب میں کن قدروں کی حامل تھی اور وہ زندگی کی کیا اور کس طرح تعبیر کرنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ رومانیت کی تحریک کے علمبرداروں نے اپنے انداز فکر میں تعقل سے زیادہ تخیل اور تصور کو مشعل راہ بنایا۔''

دراصل کیٹس بائرن اور شیلے بھی رومانی نظام فکر کے حامی تھے اور اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ورڈز ورتھ اور کولرج وغیرہ میں جو بنیادی نظریاتی فرق پایا جاتا ہے وہ ورڈز ورتھ اور کولرج کی طرح انسانی معاشرے سے فرار کے حق میں نہیں۔ انسانی معاشرے کی تعمیر پر اپنا سارا زور صرف کر دینا چاہتے تھے اور ارض و سماء کی ساری کائنات کے حسن کو جمع کر کے ایک حسین و جمیل کائنات کی تخلیق کرنا چاہتے تھے اور ایک ایسے نظام فکر اور معاشرے کی تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں، جس کی بنیاد انسانی جذبات اور تخیل پر مبنی ہو۔

انقلاب فرانس نے پرانے اصول و نظریات کو یکسر مسترد کر دیا اور نئے اصول و ضوابط واضح کیے۔ ان نئے اصولوں نے ایسے معاشرے کو

جنم دیا جس نے پرانے اور کلاسیکیت کے اصولوں کو انسانیت کے خلاف قرار دیا۔ اس انقلاب نے امرا و رؤسا کی اجارہ داری کو ختم کر کے مساوات اور آزادی کا نیا تصور دیا۔ کیونکہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اسے آزادی سے رہنے اور جینے کا حق حاصل ہے۔ انقلاب فرانس سے اس طبقے کو بھی کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا جو صدیوں سے امرا و رؤسا کے واضح کردہ تہذیب کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ روسو نے تہذیب کے مقابلے میں نیچر کو ترجیح دی تاکہ انسان نیچر کے قریب رہ کر مساوات اور آزادی کے تصورات کو اپنا سکے اور یہی تصورات دراصل عام انسان کی ترجمانی کرتے تھے۔ اسی لیے عام آدمی نے ان تصورات کو اپنی آواز سمجھا۔ معاشرے پر بھی تیزی سے اس کے اثرات پڑنے شروع ہوئے اور ان تصورات سے فکر کے انداز بدلنا شروع ہوئے۔ کیونکہ کلاسیکیت کے نافذ کردہ اصول و نظریات صرف امرا و روسا کے لیے تھے اور خواص کی زندگی کی ترجمانی کرتے تھے۔ انقلاب فرانس دراصل پرانے اصول و نظریات اور اسی طبقے کے خلاف جدوجہد کی تحریک تھی۔

انقلاب کے بعد جب عوام کی اپنی حکومت تشکیل پاتی ہے تب عام انسانوں کا ادب اور ان کے تصورات نے شرف قبولیت حاصل کیا۔ خواص کی جگہ عوام اور قدما کی جگہ دیہاتیوں نے لی اور عقل کی جگہ جذبات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ کیونکہ عوام کے نزدیک جذبات عقل سے زیادہ اہمیت کے حامل ہے۔ کیوں کہ عوام عقل کے بجائے زیادہ تر کاموں کو جذبات کی رو میں آ کر انجام دیتی ہے اور بعد میں اسے عقلی دریچوں کے سانچے میں ڈھال کر اس کے لیے خیر اور شر کے راستے متعین کرتی ہے۔

ارسطو کے مطابق ''انسان عقلی حیوان ہے'' لیکن روسو کی آرا اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان ''جذباتی حیوان ہے''۔ اس لیے اس دور میں عقل کے بجائے جذبات اور حقیقت پسندی کے بجائے تخیلات اور امرا و رؤسا کے بجائے عام عوام اور شہری زندگی کے بجائے دیہاتی زندگی ادب کا موضوع بننا شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ادب قدما کے معیار پر پرکھا جاتا تھا اور انفرادیت کا اس میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ لیکن رومانیت میں انفرادیت ادب کے لیے شرط اول ہے۔ اس طرح عام انسانوں کی زبان ادب کا معیار بنی۔ ان کے گیتوں، کہانیوں سے ایک نئی دنیا ابھر کر سامنے آئی۔ اس طرح ان بدلتے ہوئے حالات کے اثرات نہ صرف انسانی زندگی اور ادب پر پڑے بلکہ زندگی کے ہر شعبے یعنی سیاست، فلسفہ، معاشرت اور اقتصادیات پر بھی اثر انداز ہوئے اور جرمنی میں ان ہی بدلتے ہوئے رجحانات نے انگلستان اور فرانس میں بھی رومانیت کو فروغ دیا۔

جمیل جالبی کے مطابق ''ادب کی رومانی تحریک انگریزی قوم کے مزاج کے مطابق تھی''۔ جب روسو نے اس روایت کو اپنایا تو یہ تحریک انگلستان میں بھی مشہور ہوئی اور بڑی کم مدت میں انگریزی ادب میں دو بڑے نام ورڈزورتھ اور کولرج سامنے آئے۔ کیونکہ ورڈزورتھ انقلاب فرانس کے موقع پر فرانس میں موجود تھے اور اس انقلاب نے ان کی سوچ کو بدل دیا اور یہ انقلابیوں کے قافلے میں شریک ہوگئے، لیکن بہت جلد ان کو انگلستان جانا پڑا۔ اسی دوران ان کی ملاقات کولرج سے ہوئی اور ان دونوں نے مل کر نئی شعری روایات کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ انگریزی ادب میں اس سے پہلے اس طرح کی کوئی روایات موجود نہیں تھی۔ ساری ادبی روایات پرانے ادبی مذاق پر قائم تھیں اس کے بعد ورڈزورتھ نے شاعری کے لیے نئے اصول مرتب کیے اس کے بعد شاعری امراء و نوابین کے دربار اور قلعوں سے باہر نکل کر عام انسانوں کی زندگی کے احساسات سے موضوع تلاش کرنے لگی۔ عام انسانوں اور دیہاتیوں کی زندگی سے موضوعات حاصل کر کے اس کو شعری زبان میں پیش کرتے ہیں اور ان کے مسائل پر اپنی ادبی دنیا کی بنیاد قائم کرتے ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے نشیب و فراز کو شاعری میں پیش کرنے کی

پیشکش کرتے ہیں، شہری زندگی کے برعکس دیہاتی زندگی سے دلچسپی اور ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ احساس اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ دیہات میں بسنے والے نیچر سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ان کی زبان میں تصنع و بناوٹ نہیں بلکہ مناظر قدرت کا فطری نمونہ ہوتی ہے۔ اس لیے ورڈز ورتھ دیہاتیوں کی زبان کو شاعری کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری عقل کی حدود سے باہر تخیل کی دنیا میں پرورش پاتی ہے اور تخیل کے اصولوں کے تحت تخلیقی شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہی اصل میں جذبات کا اظہار ہے۔ جذبات ہی اصل شے ہے اور شاعر کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ ان جذبات کو قارئین تک اسی انداز سے پہنچائے کہ وہ بھی ان کو اسی طرح محسوس کر سکیں۔ لیکن ورڈز ورتھ کے ہم عصر شاعر کولرج نے اپنی تصنیف ''بایوگرافیا لٹریریٔ'' میں ورڈز وتھ کے نظریے سے بعض جگہوں پر اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک دیہاتیوں کی زبان معیاری نہیں ہوتی جس میں شاعری کی جا سکے بلکہ وہ بہت میکانکی ہوتی ہے اور اس کو تراش خراش کر اس کی نوک پلک کو سنوار کر کے شاعری کے قابل بنائی جا سکتی ہے۔ کولرج مفکروں کی زبان کو شاعری اور ادب کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں۔ محمد ہادی حسن رومانیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جو عشقیہ داستانیں ازمنہ وسطی میں 'رومان' کے نام سے لکھی گئیں اگر کوئی منظر ان کے ماحول یا فضا کی طرف ذہن کو منتقل کرتا تھا تو اسے اس لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ ان داستانوں میں تخیل واقعیت پر غالب ہوتا تھا۔ یعنی فرضی باتیں اصلی واقعات سے زیادہ اہم ہوتی تھیں۔''

21.2.2 اردو میں رومانی تحریک کا آغاز وارتقا

جہاں تک اردو ادب میں رومانی تحریک کی آمد اور آغاز وارتقا کا تعلق ہے اس کے لیے کلیتاً کوئی سال وسن مقرر تو نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کسی بھی تحریک کے اثرات اور اس کے خدوخال اور آثار ونقوش غیر محسوس انداز میں سامنے آنا شروع ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو کسی بھی تحریک کے وجود اور انفرادیت کو قائم کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیسویں صدی کے ابتداء سے ہی رومانوی تحریک کے اثرات اردو ادب میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو ایک طرف تو سرسید کی مفاہمتی تحریک کے رد کی شکل میں اور دوسری طرف نئے رنگ وبو کے جہاں کی تلاش میں سامنے آرہے تھے۔ لیکن یہ ان ادیبوں کی انفرادی افتاد طبع تھیں کیونکہ سرسید کے عہد میں واضح طور پر رومانوی تحریک اجتماعی شکل میں سامنے نہیں آئی۔ لیکن یہ تمام انفرادی کاوشیں اسے تحریک کی شکل فراہم کرنے میں مناسب وقت کے انتظار میں تھیں۔ برصغیر میں سیاسی، سماجی اور فکری انقلاب نے نئی کروٹ لی تو اس نے ادب کو نئے موضوعات اور نئے فنی زاویوں سے روشناس کرایا جس کے نتیجے میں ان نئے زاویوں نے رومانوی تحریک کو جنم دیا۔ اس نئے تصور نے اردو ادب میں جدید ذہنوں کے منتشر رجحانات کو یکجا کرنے اور تحریک کی شکل دینے میں سر عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' نے صحیح سمت عطا کی اور اس تحریک کی رہنمائی بھی کی۔ اس ادبی مجلّے میں سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے اور ان ہی کے مضامین نے اردو ادب میں رومانوی تحریک کے اسلوب کو باقاعدہ اپنی تحریروں میں جگہ دی۔

رومانوی تحریک کا باقاعدہ آغاز اجتماعی طور پر رسالہ مخزن میں یلدرم کے مضامین سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد جن ادبا اور شعرا نے رومانوی رجحان اور فکر کے تحت اپنی تحریروں سے مخزن کے مشن کو آگے بڑھایا ان میں علامہ اقبال، مولانا آزاد، ظفر علی خان، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، مہدی افادی، لطیف الدین احمد، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر اور سجاد حسین کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے سرسید کے عہد کے

علمبردار ہوتے ہوئے بھی اپنی تحریروں میں نئے اور بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کو جگہ دی ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے مطابق ''اس جدید ذہن کی 'مخزن' اور 'نقاد' نے ایک سمت کی طرف رہنمائی کی۔ 'مخزن' اور 'نقاد' نے اردو ادب میں وکٹورین انگلستان کی تہذیب کو آدرش تسلیم کیا اور صاف ستھرے مذاق کی روایت استوار کی''۔ جذباتی سطح پر پہل پہلے اس کے ابتدائی نقوش محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مخزن کے لکھنے والوں کے علاوہ جن ادبا کی تخلیقات نے رومانوی تحریک کو جلا بخشی ان میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، خان احمد حسین خان، حسرت موہانی، فانی بدایونی، اختر شیرانی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، معین احسن جذبی، فراق گورکھپوری، عظیم بیگ چغتائی اور امتیاز علی تاج وغیرہ نے نثری اور شعری ادب کے ذریعے اردو ادب میں رومانوی تحریک کے رجحانات کو برتا اور اس تحریک کو فروغ بخشا۔

عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں میں رومانی رجحان نمایاں ہے۔ اگرچہ ان کے تاریخی ناول مسلمانوں کے اصلاحی پس منظر میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں رومانی عنصر کی فراوانی بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے معاشرتی ناولوں میں بھی تخیل اور جذباتیت کے رجحان کو بخوبی برتا ہے۔ جس کی زندہ مثالیں ''بدرالنساء کی مصیبت'' میں تخیلی اور جذباتی فروانیاں نمایاں ہیں۔ بدرالنسا کی شادی، اس کا خضر کے ساتھ سفر کرنا اور راستہ میں ایک شریف النفس نوجوان سے ملاقات وغیرہ ان سارے واقعات میں حقیقت نگاری کا کہیں بھی شائبہ نہیں ہوتا۔ شرر کے یہاں رومانوی انداز فکر کا غلبہ ''یوسف و نجمہ'' میں نمایاں ہے۔ اس ناول کا مواد ہندوستان کی سرزمین میں تیار کیا گیا ہے۔ اس لیے اس میں ہندوستانیت کی خوبیاں اور خامیاں ملی جلی نظر آتی ہیں۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''ناول کی سب سے بڑی خوبی اس کی رومانی فضا ہے جس کو شرر نے بڑی دلچسپ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ چونکہ ناول کی کہانی ہیرو کی زبانی کہلوائی گئی ہے۔ اس وجہ سے کہانی میں ایک کشش بھی ہے اور نیا پن بھی۔ الغرض یوسف نجمہ خالص رومانی داستان ہے۔''

سجاد حیدر یلدرم کے مضامین ایک مدت تک باقاعدہ مخزن کی زینت بنتے رہے۔ اردو ادب میں یلدرم کے مضامین نے رومانی فکر اور رومانی اسلوب کا آغاز کیا۔ ان کے مضامین ابوالکلام کی طرح خطیبانہ اور مقصدی نہ تھے۔ ان کے ہاں رومانی فکر کے اثرات ابتداء سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یلدرم کو ترکی سے بے حد محبت تھی جس کے بارے میں۔ انور سدید لکھتے ہیں ''یلدرم نے ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا''۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اردو ادب کے نابغہ روزگار شخصیت رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں ''ترک نہ کبھی غلام رہے نہ کبھی کسی کو غلام رکھا''۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دونوں تخلیقات ''خارستان و گلستان'' اور ''سودائے سنگین'' ترکی سے ماخذ ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے دوسرے افسانوں میں بھی تخیل کی بلندی اور جذبے کی فراوانی کی وجہ سے رومانی ادب کی پرچھائیاں نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں کی رومانوی انانیت کے بارے میں محمد حسن لکھتے ہیں:

''دراصل یلدرم کے افسانوں میں رومانوی تحریک کے مخصوص محاسن اور معائب دونوں ملتے ہیں وہی جذباتیت اور ماورائی حسن کی تلاش رومان اور حسن کو سماجی پس منظر سے فرار کا ذریعہ بنانا اور اسے زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے خیالستان کی تعمیر میں صرف کرنا ان کے ہاں واضع طور پر ملتے ہیں''۔

یلدرم کے ہاں فطری انفرادیت ہے۔ وہ ایک خوش وخرم البیلے نوجوان کی شکل میں اپنی تحریروں میں کرداروں کے ذریعے رنگ بھرتے

ہیں، لیکن ان کے ہاں گھن گرج اور انقلابی جوش نظر نہیں آتا بلکہ اس رنگ رنگی دنیا میں ایک تازگی اور شادابی بکھیرتے نظر آتے ہیں اور اپنی تحریروں میں ایک خوش مذاق نوجوان کی صورت میں تخیلاتی دنیا میں ایک الگ جہاں آراستہ کرتے ہیں اور ان میں مشرقی واضعداری اور مغربی آزادی کے امتزاج سے رنگ بھرتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنی تخلیقات میں کرداروں کے ذریعے فطرت کے پراسرار منظر کو پیش کیا ہے۔ جس نے اردو ادب بلکہ ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی فکر سے روشناس کیا ہے۔ جس میں حسن ارضی میں رومانی سرور و انبساط سے مرغوب ہونے کا رجحان نمایاں ہے۔ یلدرم کے ہاں تخیل پرستی اور ماورائیت میں مغربی طرز فکر ہے، لیکن وہ مغربی انداز فکر سے زیادہ مشرقی تمدن کے پروردہ نظر آتے ہیں۔ یلدرم نے اپنے افسانوں میں عورت کے کردار کو نئے روپ میں پیش کیا ہے، جس میں وہ تعلیم یافتہ، خوددار، انانیت پسند اور پوری انفرادی ذمہ داری کے ساتھ معاشرے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ان کے افسانے اردو ادب میں رومانی فکر، تخیل کی بلندی اور شدت جذبات کی فراوانی کا اہم ترین نمونے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری نے بھی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ادبی شہ پارے کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ کیونکہ مجنوں نیاز فتح پوری سے بہت متاثر تھے۔ یہ وہ عہد تھا جب اردو ادب کے ادیب مغربی انشاء پردازوں چیخوف، موپاساں ہارڈ، جیمس وغیرہ سے متاثر ہو رہے تھے بلکہ ان کے اثرات قبول کر رہے تھے اور اسی دور میں ادب لطیف کے زیر اثر نثری ادب میں رومانیت سر اٹھا رہی تھی اور یہ فکری رجحان اردو نثری ادب میں ٹیگور کے توسط سے داخل ہو رہا تھا اور نیاز فتح پوری اس طرز فکر اور رجحان کے برتنے میں بخوبی ماہر تھے اور ان ہی کے زیر اثر مجنوں افسانہ نگاری کا آغاز کرتے ہیں۔ انہوں نے پہلا افسانہ ''زیدی کا حشر'' نیاز کے افسانہ شہاب کی سرگزشت سے متاثر ہو کر لکھا، جس کو ناولٹ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں مغرب کا رنگ جھلکتا ہے۔ مغربی ادب کا وسیع تر مطالعہ اس کی بنیادی وجہ تھی۔ ان کے بعض افسانے طبعزاد تھے۔ انہوں نے خالص طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان میں ''سبز ہری''، ''محبت کا جوگ'' اور ''تم میرے ہو''، وغیرہ میں رومانی جذباتیت کی فراوانی ہے اور وہ ایک سلجھے ہوئے ذہن کے قلم کا کرشمہ معلوم ہوتی ہے۔ ان میں محبت کے المناکیوں سے نقاب کشائی کی ہے۔ ان میں مشرقی فضا اور معاشرے میں مغربی خیالات اور رجحان کا ایسا غیر متوقع سنگم تیار کیا ہے جن کا ایک دوسرے میں آسانی سے مدغم ہونا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے ہاں مشرق و مغرب کا بڑا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ بقول فرمان فتح پوری ''ان کا ذہن اپنے سائنٹفک انداز فکر کے لحاظ سے مغربی اور ان کا دل اپنے طرز احساس کے اعتبار سے خالص مشرقی ہے''۔

مجنوں کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کے سبب ان کی تحریروں میں توازن و اعتدال کی ایک خوشگوار لہر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں رومانی جذباتیت ہے اور رومانیت میں ایک ٹھہراؤ ہے اور سنبھلی ہوئی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ تشکیک کی جھلکیوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات جو ان کے افسانوں میں ملتی ہے وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے جو اثرات قبول کرتے ہیں اس کا احساس ان کے افسانوں میں ہوتا ہے۔ ان کے سارے افسانے خواب و خیال، شکست بے صدا، محبت کی قربانیاں، ''ایک نکمے کی سرگزشت''، سراب، محبت کی فریب کاریاں، سوگوار سباب، گردش اور مراد میں رومانوی اور تخیلی جذبات کا احساس نمایاں ہے اور عشق و محبت کی تخیلی دنیا میں خوبصورت محل تعمیر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عشق و محبت کا انداز انوکھا اور نرالہ ہے۔ وہ رومانی افکار و اقدار کی اعلیٰ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں وصل کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر وصال ہو بھی جائے تو یہ محبت کی ناکامی اور موت ہے۔ اس سے محبت کے

ساز وسوز کم ہوتے ہیں اور اس سے بدمزگی بھی پیدا ہوتی ہے بلکہ محبت کی تکمیل یہ ہے کہ اس میں تڑپ کر جان دینا ہی اصل زندگی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

''مجنوں کی کہانیوں میں محبت ناکامی کا دوسرا نام ہے جس کی سزا اور پاداش سوائے گھل گھل کر مرنے اور خود کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اس کے مختلف طریقے ہیں۔ خواب وخیال میں حسن اور محبت بیماری کی نظر ہوجاتے ہیں اور ''محبت کی قربانیاں'' اور ''مدفن تمنا'' میں یہ خودشکستگی سیاسی زندگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے''۔

اردو رومانی ادب میں مہدی افادی کا شمار ان چند اہم رومانی ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس نئے ادبی مذاق کو جذباتیت کے طور پر اپنایا اور مہدی افادی کے جذبے میں ٹھہراؤ کم ہے بلکہ ترقی پسندوں کی طرح ان کے ہاں جذبہ آتش فشاں کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مہدی افادی عربی، فارسی اور یونانی علوم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی ادب میں رومانیت بدرجہ اولیٰ موجود ہے۔ اس لیے ان کے ہاں خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ نمایاں ہے۔ بقول محمد حسن:-

''تلاش حسن کا تکملہ مہدی افادی اور سجاد حسین کے ہاتھوں ہوا۔ مہدی افادی کے مضامین ادب اور زندگی میں اول درجہ کی چیزوں کی تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے مضامین مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھے ہیں۔ لیکن ہر جگہ یونانی نقطۂ نظر کی پرچھائیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مہدی نے جمالیات کو فلسفے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جمالیات کے جذبے اور احساس حسن سے پوری طرح لطف اندوز ہوئے۔

مہدی افادی کے مضامین میں جمالیاتی جذبہ اور احساس حسن کا پلڑا مادیت پرستی کی جانب جھکا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کہیں کہیں تو فحاشی اور عریانیت کا شائبہ بھی ہونے لگتا ہے۔ اس کا احساس ان کے افسانوں کے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ مہدی افادی لکھتے ہیں:

''سینہ کا حصہ افقی بالکل کھلا ہوا ہے اور اودی اودی رگوں کے پیچ وخم اور اعصاب کی کھینچ تان بتا رہی ہے کہ سرکشی لباس کی ممنوع نہیں بلکہ لباس خود سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ نہایت باریک ریشم کی ساڑی آج کل کے مروجہ چست زیر سایہ زیر کمر ہے۔ نرم اور لچکدار جسم کے ساتھ قلدکار ساق بلوریں سات پردوں میں بھی پاکباز شوہر کے تار نظر کا مرکز بنی ہوئی ہے''۔

بہرحال ان کے ہاں انفرادیت ہے، جذباتیت اور تخیل کی بلند آفرینی ہے۔ اس لیے جہاں کہیں مشرقی اور مغربی تہذیب کے امتزاج کو پیش کرتے ہیں وہاں سماجی سطح کی حقیقتوں سے بھی پردہ سرکاتے ہیں۔ ایسا وہ جنسی لذتیت کے لیے نہیں بلکہ اان کے اس انداز سے یوٹوپیا کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

قاضی عبدالغفار کی تخلیقات میں بھی رومانی طرز فکر کی رعنائیاں ہیں۔ خاص طور سے ان کے مختصر ناولوں میں اس فکری انفرادیت کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے یہاں جذبات کا وفور ہے اور رومانیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس میں رنگینی کے ساتھ ساتھ زندگی سے بے راہ روی اور بغاوت بھی ہے۔ بلکہ انہوں نے رومانوی تحریک کو ایک نئے حسن سے آراستہ کیا ہے۔ ان کی تصنیف ''لیلیٰ کے خطوط'' رومانی فکر وفن کے اعتبار سے اہم ہے۔ محققین اس کو لے کر تضاد کا شکار ہیں کہ اس کو ناول تسلیم کیا جائے یا نہیں ۔ یہ الگ موضوع ہے لیکن جہاں تک اس میں رومانوی رجحانات کا تعلق ہے۔ انہوں نے رومانوی انداز بیاں تخیلی اور جذباتی قدروں کو اس میں سمویا ہے۔ اس ناولٹ کے کردار فنی اعتبار سے کمزور ہیں کیونکہ ان کے خطابی انداز اور جذباتی گفتگو سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ عبارت قاضی عبدالغفار کی ہے اور آواز لیلیٰ کی ہے۔ اسی وجہ سے

لیلیٰ کے مقالموں سے یہ نہیں لگتا کہ ان میں کوئی عاجزی وانکساری ہے بلکہ آواز میں کھنک اور جوش ہے۔ ان کے دونوں ناولوں ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' کی ادبی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔ لیلیٰ کے خطوط میں انہوں نے ایک طوائف کے ذہنی ارتعاش کو موضوع بنایا ہے جس میں وہ مردوں کے تعمیر کردہ سماج سے ناخوش نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس نام نہاد سماج نے عورتوں پر ہر دور میں ظلم ڈھائے ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے لیلیٰ کے خطوط مجنوں کی ڈائری سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن رومانوی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو دونوں رومانوی اصول وضوابط کی پاس داری کرتے نظر آتے ہیں جس کا اظہار محمد حسن نے اس طرح کیا ہے:

''لیلیٰ کے خطوط'' میں جذباتیت کی فراوانی اور خطابت کا جوش ہے اور اس لحاظ سے وہ مکمل رومانوی تخلیق ہے۔ لیکن عشق جنسی زندگی اور سماجی رفاقت کا جو رویہ قاضی عبدالغفار نے پیش کیا وہ بڑا تعمیری اور صحت مند ہے۔ اس میں محض جذباتی ابال ہی نہیں بلکہ سماجی ذمہ داری اور اجتماعی آہنگ کا پورا احساس ملتا ہے''۔

قاضی عبدالغفار نے رومانی تحریک میں نئی وسعتوں اور نئی جہتوں کو جنم دیا ہے اور رومانی فکر میں نئی قدروں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور توازن کو بھی برقرار رکھا ہے۔ لیلیٰ کے خطوط میں لیلیٰ کا کردار جنسی تسکین کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ خیالی دنیا میں تصورات کا محل تعمیر کرتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے والد کے ساتھ سفر کرتی ہے اور منگیتر بھی ساتھ ہے اور دونوں دوران سفر ہی آناً فاناً کسی دوسرے کی ہوجاتی ہے۔ والد اور منگیتر دونوں ایک دوسرے کا منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں کوئی دوسرا نوجوان اس سے جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ اس میں تکنیک کا رنگ نمایاں ہے کہ تینوں کی موجودگی میں اسے گلے کا ہار بنایا اور مسل کر پھینک دیا۔ یہ محض خیالی دنیا کی پروازیاں ہیں جو حقیقت سے دور اور بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔

نیاز فتح پوری بھی اسی عہد کے پروردہ ہیں۔ جب نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش جاری تھی کچھ ادیب ان میں سے بعض قدروں کو باقی رکھنے اور بعض کو حذف کرنے کے حق میں تھے اور اسی عہد میں ان قدروں سے بغاوت وتصادم کا رجحان بھی پرورش پا رہا تھا۔ مغربی ممالک کے اثرات یہاں کے ادبی اور فکری رجحان پر اثر انداز ہورہے تھے۔ حقیقی دنیا کی تعمیر کو چھوڑ کر تخیلی اور جذباتی دنیا کا رجحان عام ہورہا تھا۔ انہی فکری جذباتیت رومانی ماورائیت اور تخیلی رجحانات کا احساس نیاز فتح پوری کے ہاں ملتا ہے۔ ان کے ناول ''شاعر کا انجام'' اور ''شہاب کی سرگزاشت'' اسی نظریۂ عمل کی پیداوار ہیں جن میں تخیلی بلندی اور جذباتیت کی بہتات ہے لیکن اول الذکر ناول کے مقابلے میں ''شہاب کی سرگزاشت'' میں جذبات پر عقل کی گرفت بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے بھی دوسرے ادیبوں کی طرح یونانی اور ترکی ادب سے متاثر ہوکر انگریزی ادب کے اثرات قبول کیے ہیں جس کا ذکر انہوں نے خود بھی کیا ہے۔

''آسکر وائلڈ کا منطقی قول محال (Paradox) مجھے بہت پسند تھا۔ شہاب کی سرگزشت میں آسکر وائلڈ چھپا ہوا ہے''۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں ناولوں کا انداز بیاں، احساس فکر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ شاعر کا انجام میں صرف وفور جذبات ہے اور یہی جذباتی ارتعاشات اس کو حقیقت پسندی سے دور کرتا ہے جو اس ناولٹ کے کرداروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے جس کی عمدہ مثال افضال کا کردار ہے۔ شہاب کی سرگزشت میں ان کا پہلے ناول کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ اسلوب نگارش میں نکھرا ہوا انداز بیاں ہے، ایک ٹھہراؤ ہے، جذباتیت کے ساتھ ساتھ عقلیت پسندی اور انفرادیت پسندی کا امتزاج بھی ہے۔ اس ناول کے کردار حقیقی دنیا کے کردار ہوتے ہوئے بھی تخیلی اور جذباتی آمیزش

سے لبریز ہیں، جس سے اس ناول میں جمالیاتی حسن کے ساتھ رومانوی فکر بھی کارفرما ہے۔ دراصل نیاز اس رجحان کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ وصل موت کی علامت ہے۔ ہجر میں وصل کا احساس، تڑپ اور بے چینی سے جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ وصل میں کہاں ملتا ہے۔ یہی احساس ان کے اس ناول کو رومانیت کی بیزارگی میں شامل کرتا ہے۔ نیاز فتح پوری کے مطابق ''کیا تمہیں یقین ہے کسی سے مل جانا ملنے کی آواز سے زیادہ پرلطف ہے۔ کیا تم واقف نہیں کہ آرزو کا حصول آرزو کی موت ہے۔ یاد رکھو لطف کا حقیقی راز صرف خلش ہے''۔

رومانی ادیبوں کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم نام ہیں، جن کے شعری اور نثری تخلیقات میں رومانوی فکر وفن کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں رومانی ادبا کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ فراق گورکھپوری گرچہ ترقی پسندیت سے وابستہ تھے لیکن ان کی شاعری میں رومانوی عنصر نمایاں ہے۔ انہوں نے بت شکنی کو جنم دیا۔ ان کے خوابوں اور جذبوں کے پس منظر میں ایک دوسری دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ خلیق دہلوی کے ہاں بھی رومانیت کا جذبہ اور فکر کی ماورائیت نمایاں ہے اور اسی طرح مرزا ادیب نے رومانی تخیل کو داستان گوئی کے فن میں سمویا ہے۔ ''صحرا نورد کے خطوط'' ان کی ایسی داستانیں ہیں جن میں رومانوی عنصر پائے جاتے ہیں کیونکہ پرانے زمانے میں خیالی داستانوں سے ہی امرا اور وسا لطف اندوز ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں عظیم بیگ چغتائی کی تحریروں میں بھی رومانی تخیل پذیری اور جذبات کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔

کشن پرساد کول کا شمار بھی رومانی ادبا میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں مذہب اور سماج سے بیزارگی پائی جاتی ہے۔ خاص کر ان کے ناول ''شاما'' کا انداز بیاں رومانی ادبی مذاق کے زمرے میں آتا ہے۔ ''شاما'' میں مذہب اور سماج سے بغاوت صرف ذہنی کیفیت تک محدود رہتی ہے عملی صورت اختیار نہیں کرتی بلکہ صرف ایک جذباتی احساس اور تمنا ہے۔ اس کے علاوہ ناول نگار علی عباس حسینی کے ناول ''سرسید احمد پاشا یا قاف کی پری'' بھی رومانی فکر وفن کی ترجمانی کرتے ہیں۔ علی عباس حسینی کی رومانی فکر کشن پرساد کول اور نیاز فتح پوری سے قدر مختلف راستے اختیار کیے ہوئے ہے۔ انہوں نے صرف حسن وعشق کے قصوں کو تخیلی اور جذباتی انداز میں پیش کیا ہے اور اپنے اردگرد میں رونما ہونے والے حقیقی مسائل سے فراریت کا راستہ اختیار کیا اور خیالی دنیا میں محل تعمیر کر کے اس میں پناہ لیتے ہیں۔

اسی طرح اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اردو شاعری میں رومانیت کا ذوق شروع سے ہی پایا جاتا ہے۔ حالی اور اقبال کے علاوہ جن شعراء کے ہاں رومانوی عنصر نمایاں ہیں ان میں حفیظ جالندھری کا نام سرفہرست ہے انھوں نے زندگی کی مادیت پرستی سے نقاب کشائی کی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ عظمت اللہ خان اور جوش ملیح آبادی کے ہاں رومانی جذبہ فکر کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح اختر شیرانی رومانیت کی ایک توانا آواز ہے۔ ان کے یہاں رومانیت وطن سے محبت کے جذبے کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ رومانی مکتبہ فکر سے متاثر ساغر نظامی اور احسان دانش بھی نظر آتے ہیں۔ ساغر نظامی نے تینوں کے اثرات قبول کیے ہیں بلکہ اقبال کی حب الوطنی کی روایت حفیظ کی نغمگی اور اختر شیرانی کی لاابالی محبت کو مدغم کر کے رومانیت کو ایک ایسا زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے جس میں جذبہ فکر اور انفرادیت دونوں موجود ہیں۔ احسان دانش کی رومانیت اپنی مٹی کی دین ہے۔ ان کے ہاں مغربی اثرات نظر نہیں آتے۔ ان کی رومانوی تخیل پسندی اور جذبے کے وفور کے نقوش ان کی نظموں 'سولن کی ایک شام'، 'شام اودھ'، 'بیتے ہوئے دن'، 'صبح بنارس میں' رومانی انداز بدرجہ اولیٰ موجود ہے۔

اس طرح سے ساڑھے تین دہائیوں پر مشتمل رومانوی تحریک نے اردو ادب کو بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھال کر ایک ایسا

تغیر پذیر اسلوب فراہم کیا اور ایسے اثرات مرتب کیے جنہیں اردو ادب کی تاریخ فراموش نہیں کرسکتی، لیکن اپنی زندگی کے مختصر عرصہ لگ بھگ پینتیس برسوں میں ہی رومانوی تحریک نے اردو ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اس کے بعد 1935ء میں برصغیر میں ایک دوسری ادبی تحریک ابھر کر سامنے آئی اور اس کے بعد رومانوی تحریک پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اس طرح 1901ء میں اردو ادب میں داخل ہونے والی رومانوی تحریک 1935ء میں پس منظر کی جانب پیش قدمی کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رومانوی تحریک اردو ادب کی ایک فعال اور متحرک تھی جس نے اس عہد کے لکھنے والوں پر گہرے اور وسیع اثرات مرتب کیے۔ آخر میں اس تحریک کے ساتھ بھی وہی ہوا جو اکثر دوسری ادبی، سیاسی اور سماجی تحریک کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس تحریک میں بھی دھیرے دھیرے خامیاں آنا شروع ہوئیں اور متعین کردہ اصول وضوابط سے انحراف نے اس تحریک کو بھی زوال کی راہ دکھائی۔ رومانی ادب یا رومانی تحریک کی جڑوں کو ہمیں دوسری زبانوں یعنی سنسکرت اور عربی، فارسی میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

21.2.3 اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل کی تحریکوں کا رجحان اصلاحی اور حقیقت پسندی کا تھا۔ تحریک علی گڑھ کے علاوہ انجمن پنجاب بھی بڑی اہم ادبی تحریک ہے۔ اس تحریک نے بھی مشرقی علوم کے علاوہ مغربی علوم کو بھی اپنی ادبی اور علمی حلقوں میں جگہ دی۔ بیسویں صدی میں عالمی سطح پر جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے اثرات سے ہندوستان کا ادب داخلی اور خارجی سطحوں پر کسی حد تک متاثر ضرور ہوا اس میں ہیئتی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ فکری اور موضوعاتی سطح پر بھی اس طرح کی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سب سے پہلے اس نئے اندازِ فکر کے اثرات مولانا حالی کے یہاں ملتے ہیں۔ انہوں نے جدید اردو شاعری کو نئی سمت عطا کی اور انجمن پنجاب کے سرگرم کارکن محمد حسین آزاد نے اردو نظم میں ردیف اور قافیہ کے تجربات کو ترک کرنے کا مشورہ دیا جس نے صنف مثنوی کے لیے راستے ہموار کیے اور ان نئے تجربات اور مغربی علوم کی پیروی میں آزاد اور حالی بعض جگہوں پر ایک ساتھ نظر آتے ہیں اور اس ضمن میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے کے علاوہ اسی طرز پر اردو میں نظمیں لکھنے کی کوشش کی اور مغربی فکر کی جھلکیاں عبدالحلیم شرر اور طباطبائی کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں۔ انہوں نے آزاد نظم اور نظم معرا جیسی صنف کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ لیکن یہ مخصوص اندازِ فکر اردو ادب کے لیے کتنا بارآور ثابت ہوا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مقامی سطح کی ان تبدیلیوں کے علاوہ بین الاقوامی سطح کی تبدیلیوں کے اثرات کا عمل دخل بھی شروع ہو رہا تھا۔ مقامی سطح پر علی گڑھ تحریک اس کی بڑی وجہ رہی ہے۔ کیونکہ سرسید کے عہد میں ہی ایسے عناصر متحرک ہو چکے تھے جو سرسید تحریک کی حد سے تجاوز کردہ عقلیت پسندی سے انحراف بالواسطہ طور پر کر رہے تھے۔ ان کی تحریروں سے اس کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اختلافات کی سطحیں ہر ایک کی الگ الگ درجے کی ہوتی ہیں۔ اس کے ابتدائی نقوش ''اودھ پنچ'' میں لکھنے والوں کے یہاں ملتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ اودھ پنچ کے مدیر منشی سجاد حسین سرسید کے کٹر مخالف تھے۔ ان کے ساتھ ہی اودھ پنچ میں مخالف سمت میں ابھرنے والی بڑی اور مضبوط آواز اکبرالہ آبادی کی تھی۔ کیونکہ اکبر کی اپنی ایک فکر تھی جو حالات کی تند و تیز آندھیوں میں بھی ڈگمگائی نہیں۔

اکبرالہ آبادی کی مذہب سے وابستگی اور مذہبی نظام فکر کے حق میں احتجاج اس وقت کارگر ثابت ہوتا دکھائی دیتا ہے جب بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں علامہ اقبال، حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر جیسے بڑے بڑے مفکروں کی ذہنی اور فکری آواز ان کی حمایت کرتے دکھائی

دیتے ہیں۔انہوں نے مغرب سے چلی آ رہی تند و تیز تبدیلیوں سے مفاہمت کے بجائے مشرقی اور مغربی سوچ میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔اس بدلتے ہوئے نظام فکر میں ادبا و شعرا اپنی اپنی سوچ اور نئی ادبی فکر کے ساتھ سامنے آ رہے تھے۔اس سلسلے میں مولانا شبلی بھی سرسید کے نظریات کے رد میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔گرچہ علامہ شبلی بھی علی گڑھ تحریک کے پروردہ تھے لیکن ان کا تخلیقی انداز بیاں سرسید کے مزاج سے مختلف تھا اور ان کے یہاں روانی اور سادہ اسلوب بیان ہے۔ان کے اسلوب میں رومانیت کی فکر بھی موجود ہے جس کا ذکر ڈاکٹر محمد خان اشرف نے بھی کیا ہے ''ایک اور رومانی مزاج ادیب اور مفکر جو سرسید کی مقصدی تحریک کا آلہ کار بنا وہ شبلی تھے۔شبلی ایک جامع الصفات شخصیت تھے جن کی طبع زاد رومانیت زیادہ عرصہ سرسید تحریک کے مقصدی اور عقلی بوجھ تلے نہ دب سکی''۔

برصغیر کی پچھلی کئی سو سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان مدتوں غیر ملکی حملہ آوروں کا شکار رہا ہے۔کبھی غزنوی اور غوری کے حملوں اور کبھی شیر شاہ سوری اور احمد شاہ ابدالی سے اپنے تحفظ کی جنگ لڑتا رہا ہے اور شمال و جنوب سے ہونے والے ان حملوں کی یلغار یہاں کے سیاسی، معاشرتی، سماجی اور ادبی ماحول پر بھی اثر انداز ہوتی رہی ہے۔لیکن ان تمام ہلچل اور نشیب و فراز کے باوجود برصغیر کی یہ سرزمین اپنی تہذیبی شناخت کو کسی نہ کسی صورت میں بچائے رکھنے میں کامیاب رہی۔لیکن جب انگریز ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کی آمد سے ملک ایک نئے تاریخی دور میں سانس لینے لگا۔وہ اپنے ہمراہ صنعتی انقلاب کے علاوہ غیر شخصی راج کے نظام فکر کو لے کر داخل ہوئے اور ان کا یہی نظام فکر یہاں کے تجارتی، صنعتی، سماجی و معاشرتی نظام پر اثر انداز ہوا۔

عبدالحلیم شرر اگرچہ علی گڑھ تحریک کے معاون و محسن تھے لیکن انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے رسالہ ''تہذیب'' اور ''دل گداز'' میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا ہے۔لیکن ان کے ناولوں میں رومانوی اثرات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ان کے علاوہ میر ناظر علی، مہدی افادی اور سجاد انصاری کا شمار بھی ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کے ہاں انفرادی سطح پر ہی سہی اسلوبیاتی اعتبار سے سرسید تحریک سے اختلافات نمایاں ہیں۔علاوہ ازیں محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال میں بھی رومانوی طرز فکر کے رعنائیاں ہیں۔اس دور میں نئے فکری جہت کی بنیاد مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کے نتیجے میں جو مسائل سامنے آئے انہوں نے ہندوستانی ادیبوں میں ایک نیا شعور اور جذبہ پیدا کیا۔ان علمی ادبی اور سماجی تبدیلیوں نے ملک کو دور جدید میں داخل کیا۔ان تبدیلیوں سے ادب کا متاثر ہونا بھی لازمی امر تھا۔اس سیاسی اور ادبی زندگی کے نقل و عمل کے نتیجے میں ہندوستان میں رومانوی تحریک کے نقوش ابھرنا شروع ہوئے۔

رومانوی ادب کے آغاز کے عہد میں مخزن میں شائع ہونے والے مضامین میں مقصدی ادب اور حقیقت نگاری کی بازگشت باقی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ علی گڑھ تحریک کے اثرات تھے۔بیسویں صدی کی دوسری دہائی رومانوی تحریک کے فروغ کے لیے زیادہ اہم رہی۔کیونکہ اس وقت علی گڑھ تحریک کی اثرات بھی مدھم پڑھ رہے تھے اور دوسری جانب عالمی سطح پر رونما ہونے والی سیاسی افراتفری نے برصغیر کے سیاسی سماجی حالات کو اس موڑ پر لا کھڑا کر دیا تھا جہاں سے جذباتیت کی شدت قدرتی امر تھا اور ان حالات میں رومانوی تحریک کا پوری شدت اور معقولیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آنا بھی لازمی تھا۔کیونکہ پہلی جنگ کے خاتمے کے بعد برصغیر میں ایک اضطرابی کیفیت طاری تھی۔حصول آزادی کے لیے مختلف ہتھکنڈے اپنائے جا رہے تھے اور نئے نئے رجحانات جنم لے رہے تھے جن میں فہم و ادراک کے بجائے جذبات کی شدت تھی۔ان ہی جذباتی لہروں میں رومانوی تحریک فروغ کے راستے تلاش کر رہی تھی۔ان حالات میں ادیبوں نے قومی اور ملکی حالات کے بجائے داخلی زندگی کو

توجہ کا مرکز بنایا۔ معاشرے کی جگہ فرد توجہ کا مرکز بنا۔ رومانوی تحریک کے فروغ کی دوسری اہم اور بنیادی وجہ یہ بھی رہی کہ اس وقت اعلیٰ تعلیمی اداروں میں انگریزی نصاب میں جن شعرا کو شامل کیا گیا ان میں سے زیادہ تر کا تعلق رومانوی مکتب فکر سے تھا۔ اس طرح ان کی اس فکر سے پڑھے لکھے افراد تو متاثر ہو ہی رہے تھے لیکن نیم تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی ان شعرا کے کلام کی دلفریبی نے متاثر کیا۔ اس وقت پورے برصغیر میں افراتفری اور انتشار کا ماحول سرگرم تھا۔ تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت حصول آزادی کے لیے زوروں پر تھی۔ اس طرح کے حالات میں ایک حسین تصوراتی دنیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تمام حالات بالواسطہ طور سے ادب پر اثر انداز ہو رہے تھے اور ان حالات سے راہ پا کر رومانوی تحریک اردو ادب میں اپنی ساخت مضبوط کر رہی تھی۔

21.3 اکتسابی نتائج

اس کائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ رومانی تحریک کے خد وخال کے اثرات چوتھی صدی قبل مسیح میں قدیم یونانی دیومالاؤں میں ملتا ہے۔

☆ نویں صدی عیسوی میں رومانی زبان تحریری شکل میں سامنے آئی اور ایک لمبے عرصے تک اس زبان میں صرف عشق ومحبت کی کہانیاں لکھ جاتی رہیں اور اصطلاحی معنوں میں خیالی قصے کہانیوں کو ہی رومانس کہا جاتا تھا۔

☆ اٹھارویں صدی کے نصف میں رومانی تحریک کو شیکسپیئر نے بھی بے پناہ مقبولیت عطا کی۔

☆ ورڈز ورتھ کے ہم عصر کالرج کا شمار رومانی ادب کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے رومانیت کو نئی روح اور تازگی بخشی۔

☆ بیسویں صدی میں عالمی سطح پر جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور ہندوستانی ادب بھی داخلی اور خارجی سطحوں پر کسی حد تک متاثر ہوا۔ ہیئتی، فکری اور موضوعاتی سطح پر بھی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ اس نئے انداز فکر کے اثرات مولانا حالی کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے جدید اردو شاعری کو نئی سمت عطا کی۔

☆ رومانی تحریک کا باقاعدہ آغاز رسالہ ''مخزن'' میں سجاد حیدر یلدرم کے مضامین سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد جن ادبا و شعرا نے رومانی رجحان اور فکر کے ساتھ مخزن کے مشن کو آگے بڑھایا ان میں علامہ اقبال، مولانا آزاد، ظفر علی خان، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، مہدی افادی، لطیف الدین احمد، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر اور سجاد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

☆ رومانی تحریک کے فروغ کی دوسری اہم اور بنیادی وجہ یہ رہی کہ اس وقت اعلیٰ تعلیمی اداروں میں انگریزی نصاب میں جن شعرا کو شامل کیا گیا ان میں سے زیادہ تر کا تعلق رومانی مکتبۂ فکر سے تھا۔ ان کی اس فکر سے پڑھا لکھا طبقہ تو متاثر ہو ہی رہا تھا، لیکن نیم تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان شعرا کی دل فریبی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

21.4 کلیدی الفاظ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
مستحکم	مضبوط، اٹل، پکا	امرا و روسا	دولت مند، رئیس، مالدار
نیچر	فطرت، خلقت، موجودات	مساوات	برابری، ہمسری، باہم برابر کرنا

تہذیب	آراستگی، شائستگی، خوش اخلاقی	کلاسیک	قدیم، اعلیٰ درجہ کا، مستند، ادبیات عالیہ
تشکیل	شکل بنانا، ساخت، ترکیب	اقتصادی	اقتصاد سے متعلق، مالی، معاشی
نوابین	نواب کی جمع	تصنع	بناوٹ، دکھاوا، فریب، مکر
جدید	نیا، تازہ	حقائق	حقیقت کی جمع، سچائی، راستی، صداقت
عریض	بڑا، وسیع، لمبا، چوڑا	خودمختار	آزاد، جس کے ہاتھ میں اختیار ہو

21.5 نمونہ امتحانی سوالات

21.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ یورپ میں رومانی تحریک کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

2۔ مغرب میں رومانی ادب کا موجد کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

3۔ رسالہ ''مخزن'' کو کس نے جاری کیا؟

4۔ ''یلدرم نے ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔'' یہ قول کس کا ہے؟

5۔ ''خارستان وگلستان'' اور ''سوائے سنگین'' کس کی تصنیف ہے؟

21.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ رومانی تحریک کے باقاعدہ آغاز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ اردو شاعری کو رومانی تحریک نے کس طرح متاثر کیا؟ مثالوں سے سمجھائیے۔

3۔ اردو ادب میں رومانی تحریک کے فروغ کے اسباب بیان کیجیے؟

4۔ رومانی ادب اور کلاسیکی ادب کا فرق مثالوں کے ذریعے بیان کیجیے۔

21.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ رومانی تحریک کے آغاز وارتقا پر مفصل روشنی ڈالیے۔

2۔ اردو زبان وادب میں رومانی تحریک کی اہمیت وافادیت پر حوالوں کے ساتھ تفصیلی بحث کیجیے۔

3۔ رومانی تحریک کے اولین نقوش کس ادب میں پائے جاتے ہیں اور عالمی سطح پر اس کے فروغ کے کیا اسباب تھے؟

21.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	اردو ادب میں رومانی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن
2۔	کلاسیکیت اور رومانویت	علی جاوید
3۔	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید
4۔	بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست

اکائی 22: اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات

اکائی کے اجزا

22.0 تمہید

22.1 مقاصد

22. 2 رومانیت کا مفہوم

22.2.1 مغرب میں رومانیت

22.2.2 اردو ادب میں رومانیت کا آغاز

22.2.3 اردو شاعری پر رومانی تحریک کے اثرات

22.2.4 اردو فکشن پر رومانی تحریک کے اثرات

22.2.5 اردو تنقید پر رومانی تحریک کے اثرات

22.3 اکتسابی نتائج

22.4 کلیدی الفاظ

22.5 نمونہ امتحانی سوالات

22.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

22.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

22.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

22.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

22.0 تمہید

عموماً رومانوی تحریک کو علی گڑھ تحریک کا ردعمل کہا جاتا ہے۔علی گڑھ تحریک سرسید احمد کی ایک اصلاحی تحریک تھی۔اس تحریک کے زیر اثر رسالہ تہذیب الاخلاق نکلتا تھا جس کی نثر عقلیت،منطقیت،معنویت اور استدلال کی حامل تھی۔اس میں شائع ہونے والا ادب مذہبی، اخلاقی،تہذیبی اور تمدنی قدروں کا حامل تھا۔اس جذبے اور احساس کے خلاف رومانی نوعیت کا ردعمل شروع ہوااور اس طرح جذبے اور تخیل کی وہ رو جو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ماند پڑنے لگی تھی وہ پھر سے ابھر کر سامنے آنے لگی۔رومانی (Romanticism) اردو ادب میں یہ لفظ انگریزی کے وسیلے سے آیا ہے جب کہ انگریزی میں یہ فرانس کے توسط سے آیا۔رومانیت سے مراد عشق ومحبت،تخیل اور جوش و جذبے کی باتیں کرنا ہے۔

یورپ میں اس تحریک کا بانی روسو تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ

"Man is born free and everywhere he is in chains.".

''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔''

یعنی انسان آزاد پیدا ہوا لیکن زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس قول کے بعد بڑا انقلاب برپا ہوا۔ اردو ادب میں رومانی تحریک سرسید کی علی گڑھ تحریک کے ردعمل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ سرسید احمد کی تحریک علمی و ادبی ہونے کی وجہ سے جمود کا شکار ہوگئی تھی جس کے نتیجے کے طور پر رومانیت کا آغاز ہوا۔ رومانیت کی تعریف میں سید عبداللہ لکھتے ہیں

''اس میں فکر کے مقابلے میں تخیل کی گرفت مضبوط ہے۔''

اور ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:۔

''رومان کا لفظ 'رومانس' سے نکلا ہے اور رومانوی زبانوں میں اس قسم کی کہانیوں پر اس کا اطلاق ہوتا جو انتہائی آراستہ اور پُرشکوہ پس منظر کے ساتھ عشق و محبت کی ایسی داستانیں سناتی تھیں جو عام طور پر دور وسطیٰ کے جنگ جو اور خطر پسند نوجوانوں کی مہمات سے متعلق ہوتی تھیں اور اس طرح اس لفظ سے تین خاص مفہوم وابستہ ہوگئے۔

1۔ عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔

2۔ غیر معمولی آراستگی، شان و شکوہ، آرائش، فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانی کہنے لگے اور

3۔ عہد وسطیٰ سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانوی کا لقب دیا۔''

(ادبی تحریکات و رجحانات، مرتب انور پاشا، ص99-98)

22.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ؛

- ☆ رومانیت کے مفہوم سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔
- ☆ اردو ادب پر رومانیت کے اثرات سے مکمل آگاہی ہوگی۔
- ☆ نظم اور نثر کے حوالے سے رومانی ادیبوں کا تعارف کرسکیں گے۔
- ☆ اردو ادب پر رومانی تحریک کے اثرات کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔

22.2 رومانیت کا مفہوم

رومانیت پر بحث کرتے ہوئے اس کے مفہوم کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ

''رومانیت کا ایک ڈھیلا سا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے اسلوب اظہار یا انداز احساس کا اظہار کرتی ہے جسم میں فکر کے مقابلے تخیل کی گرفت مضبوط ہو۔ رسم و روایت کی تقلید سے آزادی خیالات کو سیلاب کی

طرح جدھران کا رخ ہو آزادی سے بہنے دیا جائے۔"

" رومانیت کی اصطلاح "رومانس" یا "رومانہ" سے مشتق ہے۔"رومانہ" جنوبی یورپ کی لاطینی زبان کو کہا جاتا ہے اور رومانس وہ زبانیں ہیں جو جنوبی یورپ کے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ رومانیت کا ابتدائی ادب عشق و محبت کی قدیم داستانوں پر مبنی تھا، جس میں خیالی واقعات کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔جس ادب کی بنیاد خیال آرائیوں پر ہو، رومانی ادب کہلاتا ہے۔اس طرح رومانیت کے کئی مفہوم نکل کر سامنے آئے جیسے عشق محبت سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں کو رومانی کہا جانے لگا۔ زبان کی آراستگی، محاکاتی تفصیل پسندی، بناوٹ، سجاوٹ کو رومانی کہا جانے لگا۔عہد وسطہ سے تمام چیزوں سے لگاؤ، ماضی پرستی، قدامت پسندی کو رومانی کا لقب دیا گیا۔

22.2.1 مغرب میں رومانیت

مغرب میں یہ تحریک کب سامنے آئی اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں اس تحریک کو عروج حاصل ہوا۔ اس تحریک کو سب سے زیادہ مقبولیت جرمنی، فرانس اور انگلستان میں ملی۔ان ملکوں کے سیاسی وسماجی حالات نے رومانی تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جس سے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی رونما ہوئی۔

ادب میں اس لفظ کا سب سے پہلے استعمال تھامس وارٹن(Thomas Warton) اور رابرٹ برن(Robert Burns) نے 1781 میں کیا۔اس کے بعد 1820 میں گوئٹے اور شلر نے ادب میں رومانیت کا اطلاق کرنا شروع کیا۔لیکن بطور اصطلاح اسے رائج مادام ڈی سٹال اور شیگل نے کیا۔یوروپ میں روسو کو رومانیت کا علمبردار کہا جاتا ہے کیونکہ فرد کی آزادی کا نعرہ سب سے پہلے روسو نے بلند کیا تھا۔ روسو کا کہنا تھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔" روسو کا ماننا تھا کہ انسان کی بے سکونی سب سے بڑا سبب 'تہذیب و تمدن' ہے۔اہل یورپ روسو کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے،لیکن روسو کا میدان سیاست اور عمرانیات تھا اس لیے ادب میں اس رجحان کی ابتداء بعد کے ادیبوں نے باقاعدہ اصول وضوابط کے ساتھ کی۔

22.2.2 اردو ادب میں رومانیت کا آغاز

انیسویں صدی کے آخری دہائی میں رومانیت کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن اس کو عروج بیسویں صدی کی پہلی جنگ عظیم کے بعد حاصل ہوا۔رومانی تحریک کا آغاز علی گڑھ تحریک کے ردعمل کے طور پر ہوا۔ چونکہ سرسید نے اپنی تحریک میں فرد کی زندگی کے جذباتی اور رومانی پہلو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے عقلیت، مادیت اور حقائق نگاری پر زور دیا ہے۔کچھ وقت تک اس کو عروج بھی حاصل ہوا،لیکن بالآخر رومانوی ادیبوں نے سرسید کے مقصدی اور عقلی ادب کے خلاف شدید احتجاج بلند کیا۔اس طرح شعر و ادب کی دنیا میں ایک نئی روشنی اور بڑے تغیر وتبدل کا آغاز ہوا ساتھ ہی اس وقت کے حالات اور مغربی علوم نے اسے آگے بڑھنے میں مدد کی۔

> اردو ادب میں رومانی تحریک چونکہ سرسید کی عقلیت پسند اور مقصدی تحریک کا ردعمل تھی۔اس تحریک نے اردو ادب میں حقیقت نگاری اور مقصدیت کو اتنی ترجیح دی کہ جذبات کھو سے گئے۔اس ضمن میں سید عبداللہ لکھتے ہیں۔"سرسید کی ادبی ادبی تحریک نے جہاں پرانے ادب کے بہت سے خلاء پر کیے، وہاں خود بہت سے شگاف ڈال دیے۔ چونکہ بنیادی طور پر ادب بہر حال جذبات وتخیل کا محتاج

ہوتا ہے۔ برصغیر میں رومانی تحریک کو سیاسی حالات نے بھی فروغ دیا۔انگریزوں کے قبضے نے لوگوں کے دلوں میں جذبۂ حریت کو ابھارا اور ان میں آزادی کے لیے تڑپ پیدا کی جنگ عظیم کی خوں ریزی اور تباہ کاری نے زندگی اجیرن کر دی۔محرومی، غم وغصہ اور رنج وافسردگی ہندوستان کا مقدر بن گئے۔ان حالات میں سکون کی تلاش شروع ہوئی اور انسان ایسے جہان کی تلاش کرنے لگا، جواس کی خواہشات کی تسکین کر سکے۔اردو ادب میں یہی وہ رجحان تھے جو رومانیت کے فروغ کا سبب بنے۔''

ترکی تراجم سے اردو نثر میں رومانیت کی ابتداء ہوئی۔ترکی میں رومانیت کا خاصا ذخیرہ موجود تھا، جسے اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔سجاد حیدر یلدرم اس میں پیش پیش رہے۔مولانا محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شرر نے جذباتی سطح پر رومانیت کو فروغ دینے کی کوشش کی اور ان اسالیب کو آگے بڑھایا جن میں ادیب کا تخیل جذبات کی رو کے ساتھ چلتا ہے اور قلم اس کے وجدان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔شیخ عبدالقادر کے رسالہ 'مخزن' نے رومانی تحریک کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔جس کے ذریعہ رومانی تصورات کو فروغ دینے والے بہت سے ادیب ابھر کر سامنے آئے۔ان میں علامہ اقبال، سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری قابل ذکر ہیں۔کم وبیش چالیس سال تک رومانی تحریک نے ہر صنف سخن کے ادباء کو اپنے داخلی جادو اور وجدانی کیفیت سے اسیر کیے رکھا، لیکن آگے چل کر رومانی تحریک کو بھی شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔داخلی تجربے کی لگن اور جذبات کی رو نے مل کر اپنے لیے دو راستے بنا لیے۔ایک حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہو گیا تو دوسرا ترقی پسند مصنفین کی صف میں شامل ہو گیا۔اس طرح رومانی تحریک کا بھی عروج کے بعد زوال ہوا۔سرسید کی تحریک کی مادیت اور عقلیت پسندی کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں سب سے پہلے محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی، عبدالحلیم شرر تھے۔بلکہ میر ناصر علی کو رومانی تحریک کا مطلع اول کہا جا سکتا ہے۔ان ادیبوں نے ان اسالیب کو فروغ دینے کی کوشش کی جن میں ادیب کا تخیل جذبے کی جوئے تیز کے ساتھ چلتا رہے۔محمد حسین آزاد کی رومانیت کسی ردعمل کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کی افتادِ طبع کی نقیب تھی۔جب کہ ناصر علی کا رومانی عمل شعوری جان پڑتا ہے۔میر ناصر علی نے سرسید کے علمی وادبی کارناموں کی نہ صرف تنقید کی بلکہ انھوں نے سرسید احمد خان کی سنجیدہ نثر کا رائج خول توڑنے کے لیے انشا پردازی کے شگفتہ اسلوب رائج کرنے کوشش بھی کی۔انور سدید لکھتے ہیں:

''انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے مقابلے میں ''تیرہویں صدی'' ''فسانۂ ایام'' اور ''صلائے عام'' وغیرہ رسائل جاری کیے اور ان میں زبان کی خوبی کو خیال کی خوبی پر ترجیح دینے کی کوشش کی ۔ چنانچہ انھوں نے علی گڑھ تحریک کی خشک کلاسیکیت کو نثر کی شاعری میں تبدیل کیا اور ادب کی خارجی مادیت کا رخ داخل کی رومانیت کی طرف موڑ دیا۔میر ناصر علی انشا میں آزاد کا جمالیاتی اسلوب اور شبلی کا استدلال دونوں کیمیائی صورت میں مدغم ہیں۔انھوں نے ادب میں آسمانی صحیفوں جیسا تمثیلی انداز اور وجدانی جملہ لکھنے کی طرح ڈالی اور یوں قاری کو جملے کی داخلی صداقت سے ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔''

(بحوالہ، اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، ص439)

عہد سرسید میں شدید جذباتی لگاؤ اور رومانی طرز احساس کی ایک بے حد عمدہ مثال عبدالحلیم شرر کی ہے۔ وہ مسلمانوں کے اجتماعی اور قومی صدمے اور اضمحلال کے خلاف ردعمل پیش کرتے ہیں اور اس کے شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ شرر نے اپنے شاندار ماضی سے آسودگی تلاش کرنے کی سعی کی، جس میں مسلمانوں کے جاہ وجلال، ہیبت وقدرت نے مشرق ومغرب کے درمیان جنگ کی سی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔

اردو ادب میں جن رومان پسندوں کا نام لیا جاتا ہے ان میں عبدالرحمٰن بجنوری، جوش ملسیانی، فراق گورکھپوری، مہدی افادی، مجنوں گورکھ پوری وغیرہ کے نام اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اردو ادب میں بہت سے رومان پسند ادیب ہیں جو رسالہ مخزن میں لکھتے تھے۔ سر عبدالقادر نے رسالہ'ماہنامہ مخزن' بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یعنی اپریل 1901 میں لاہور سے جاری کیا۔ جسے اردو کے عملی و ادبی رسائل میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس رسالے کی اشاعت سے نہ صرف یہ کہ رومانیت کی تحریک کو تقویت ملی بلکہ بعد میں آنے والی تحریکوں کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ 'مخزن' میں اس دور کے تمام رومانیت پسند ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اپریل 1901 میں جب مخزن کا اجرا ہوا تو اس میں عام روش سے ہٹ کر تخیل اور جذبے کی کارفرمائی کو جادوئی زبان میں پیش کیا گیا۔ مخزن کے نمایاں لکھنے والے وہ ادبا جنہوں نے اردو زبان کو ایک خاص قسم کی لطافت سے روشناس کیا اور اپنے تخیل کے بل بوتے پر رومانی تصورات کو فروغ دینے کی کوشش کی ان میں علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، آغا شاعر قزلباش، ظفر علی خاں، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ، مہدی افادی، لطیف الدین احمد (ل۔ احمد اکبرآبادی)، خواجہ حسن نظامی اور شیخ عبدالقادر کے نام اہم ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب میں نثر کے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی۔

22.2.3 اردو شاعری پر رومانی تحریک کے اثرات

رومانی فکر کا اثر شاعری پر بھی پوری طرح غالب آچکا تھا۔ اس دور کے بیشتر شعرا نے اس کو بخوبی برتا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ جب رومانیت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تو یہی لوگ رومانیت سے انقلاب اور حقیقت پسندی کی طرف مائل ہونے لگے۔ آگے ہم کچھ اہم رومانی طرز فکر رکھنے والے شعراء کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

علامہ اقبال؛

رسالہ مخزن میں لکھنے والوں میں سر فہرست نام شاعر مشرق علامہ اقبال کا ہے۔ اکثر ناقدین کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری میں رومانوی اثرات نمایاں ہیں۔ ان کے یہاں وجدان و جذبات اس قدر حاوی ہیں کہ انہیں رومانی شاعر کہنا غلط نہ ہوگا۔ علامہ اقبال نے عقل وعشق کو لفظوں کے جادو میں باندھ کر ایک نیا جہان آباد کیا اور ان کے اس جہان کی تعمیر میں جذبہ ووجدان کی اہمیت بنیادی ہے۔ اقبال عقل پر عشق کو فوقیت دیتے ہیں۔ مثلاً

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال کی رومانیت پسندی کا ذکر انور سدید اپنے مضمون ''رومانی تحریک'' میں اس طرح کرتے ہیں۔

''اقبال کی رومانیت کا اولین زاویہ حسن ازل کی طلب وجستجو میں ظاہر ہوا۔ اقبال کے یہاں فطرت

کے پراسرار جمال کی تصویر کشی کرنے کے بجائے اس کے داخل میں جھانکنے اوراس جہان معنی کو دریافت کرنے کا رجحان موجود ہے۔اقبال کے اس دور کی نظموں میں والہانہ سرمستی، کیف دوام ۔سرخوشی اور سرشاری کی کیفیت نمایاں ہے اور وہ شاہدِ رعنائے فطرت نظر آتے ہیں۔اقبال کی رومانیت کا دوسرازاویہ ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کرتا ہے۔اقبال کی رومانیت جو پہلے فطرت کے جمال بے کراں کی نغمہ خواں تھی۔اب ماضی سے جوہر حیات کشید کرتی ہےاورسرزمین عرب کے ان شہسواروں کو ذہنی سطح پر زندہ کرتی ہے۔''

(اردوادب کی تحریکیں،ڈاکٹر انور سدید،ص445)

اختر شیرانی:

اردوادب کے رومانی شعرامیں ایک اہم نام اختر شیرانی کا ہے۔اختر شیرانی کی شاعری میں ایک مخصوص رومانی نقطہ نظر ملتا ہے۔ان کے یہاں حال سے گریز اورفرار کا رجحان نمایاں ہے۔اختر شیرانی زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے بجائے تخیلی زندگی میں پناہ لیتے ہیں۔

اختر شیرانی کی شاعری میں عورت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔انہوں نے اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار اپنی محبوباؤں کے نام شاعری میں کھلم کھلا، بے دھڑک، پر جوش جذبات کے ساتھ محبت ادا کرتے ہیں اوراپنی محبت کو اصل حیات قرار دیتے ہیں۔اختر شیرانی نے متوسط طبقے کی دوشیزہ کو معشوقہ بنا کراس کا نام لے کرشعر کہنے کی روایت ڈالی۔چنانچہ وہ کبھی سلمٰی کے رومانی حسن کا تذکرہ کرتے ہیں تو کبھی عذرا کے عشق کے افسانے، پروین کی مرگِ عاشقی اورشمسہ کے زہر آلودہ ہونٹوں کا ذکر کرتے ہیں،لیکن انہوں نے ماورائی لطافت اور سرمستی کی جس طرح پرستش کی ہےاس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص محبوبہ کے غمزوں کا شکار ہونے سے زیادہ سرمستی وعشق پر عاشق ہیں۔ اختر شیرانی کی گوشت پوست کی عورت پربھی تخیل کا شبہ ہوتا ہے۔

کبھی سلمٰی کے رومانِ حسیں کے تذکرے کیجے کبھی عذرا کے افسانے کوعشق رائیگاں لکھیے
کبھی پروین کی مرگِ عاشقی پر فاتحہ پڑھیے کبھی شمسہ کے زہر آلود ہونٹوں کا بیاں لکھیے

اختر شیرانی کی بعض نظموں میں وطن پرستی کے جذبات بھی ادا ہوئے ہیں۔تاہم وطن کا یہ روپ بھی نسائیت کا حامل ہے۔لیکن اختر کے یہاں وطن ایک ایسی محبوبہ ہے جسے اختر نے ٹوٹ کر چاہا ہےاوراس کی جدائی ان کے دل کوغموں اور دکھوں سے ہمکنار کر دیتی ہے مختصر یہ کہ اختر شیرانی متنوع جہات کے شاعرنہیں۔ان کی شاعری کی سطحی جذباتیت نے انہیں صرف نو جوانوں کا شاعر بنا دیا، لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اختر شیرانی رومانیت کی ایک توانا آواز ہیں۔

محبت کے لیے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں محبت خون بن کرلہلہاتی ہے میرے دل میں
ہراک شاعرمقدر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے محبت کا جنوں تنہا مرے حصے میں آیا

اختر شیرانی کے حوالے سے انور سدید لکھتے ہیں کہ

''زندگی کوایک ماورائی خواب بنانے اور اس میں تخیل کی آزادہ روی سے رنگ و رعنائی سمونے میں اختر شیرانی نے سب سے زیادہ شگفتگی کا ثبوت دیا ہے۔ چناچہ وہ رومانیت کی اولین اہم آوازوں میں شمار ہوئے۔اختر شیرانی کے یہاں زندگی ایک ایسا عمل ہے جسے صرف نسوانی حسن کی کروٹ دے سکتا ہے۔''
(اردو ادب کی تحریکیں،ڈاکٹر انور سدید،ص467)

حفیظ جالندھری؛

حفیظ جالندھری کا شمار رومانوی شعرا میں ہوتا ہے ان کے یہاں ماضی پرستی کا رجحان غالب ہے۔ وہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کی ایک طویل نظم ''شاہنامۂ اسلام'' بے حد اہم اور قابل ذکر ہے۔حفیظ جالندھری کے یہاں ماضی پرستی کے علاوہ فطرت پسندی کا بھی رجحان غالب ہے۔انہوں نے بہت سی نظمیں لکھیں۔حفیظ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان نظموں میں فطرت کوتشبیہہ اور استعارے کی مدد سے مجسم کیا گیا ہے۔ان کے یہاں فطرت ایک خاص انداز اور جسمانی پیکر کے ساتھ نمودار ہوتی ہے ''اٹھی حسینہ سحر'' میں یہ عمل کامیاب ہے۔حفیظ جالندھری نے اپنی شاعری میں نرم و نازک ہندی کے الفاظ کا استعمال بڑی حسن وخوبی کے ساتھ کیا ہے۔ترنم اور موسیقیت کی طرف بھی انہوں نے خصوصی توجہ دی ہے اور بحروں کے انتخاب، الفاظ کی ترتیب سے نغمہ و آہنگ پیدا کیا ہے۔نظموں کی ظاہری شکل وصورت میں بھی انہوں نے انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔

جوش ملیح آبادی؛

جوش ملیح آبادی کے یہاں جذبات کی بڑی شدت ہے۔ بلکہ وہ جذبات ہی کی بدولت اپنی انقلابی آن بان اور شان قائم رکھے ہوئے ہیں ۔ان کے یہاں فکر کی گہرائی و گیرائی نہیں بلکہ جذبات کی وسعت ہے۔اور ایک عجیب سی بے نیازی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔جس کا کوئی نام نہیں۔جیلانی کامران، جوش ملیح آبادی کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ' جوش بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں لیکن ان کی رومانیت پیکر اور اجسام کی خوبصورتی ہی کا ذکر کرتی ہے۔' ڈاکٹر محمد حسن جوش کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''جوش کی پوری شاعری شبابیات کی شاعری ہے۔ وہ جذبے کی بے باک سرکشی کے قائل ہیں۔اس کی تڑپ کے پرستار ہیں اور اسی تڑپ ،اس جذباتی احساس کو ادراک کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ورڈز ورتھ کی طرح انہوں نے سحر کے جلوں سے خدا کے وجود کا ثبوت حاصل کیا ہے اور موسم بہار سے حسن پر ایمان لائے ہیں۔عشقیہ شاعری میں یہ سرکشی پرانی اخلاقی اور سماجی بندشوں کے خلاف ہے۔ جس کی ایک صورت جامن والیاں ، مالن ، مہترانی، کوہستان دکن کی عورت ، جنگل کی شہزادی میں ظاہر ہوتی ہے یعنی عشق جہاں بھی اپنے لیے راستہ پاتا ہے، ذات پات، سماجی ترتیب سے بے پروا ہو کر وہیں فردوس گم گشتہ کی بازیافتگی کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں گویا ایک سماجی انقلاب کی ضرورت کا خالص رومانوی احساس ملتا ہے۔''

(اردو ادب میں رومانی تحریک۔محمد حسن بحوالہ ادبی تحریکات ورجحانات، مرتب انور پاشا،ص43-142)

احسان دانش؛

احسان دانش کی رومانیت غربت کے داخلی احساس سے جنم لیتی ہے۔نوائے کارگر، آتش خاموش، چراغاں، شیرازہ، مقامات، زخم و مرہم اور فصل سلاسل، احسان دانش کے شعری مجموعے ہیں۔ان کی شاعری میں درد و سوزِ غم روزگار اور زندگی کے نشیب و فراز کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ان کی شاعری میں مسرت کا لمحہ نایاب اور زندہ دلی کا شدید فقدان ہے۔ان کے یہاں آنسوؤں اور آہوں کی کمی نہیں۔احسان دانش کے آنسو انسانی دردمندی کے وفور سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس وقت بہتے ہیں جب انسانیت پر زوال آجاتا ہے اور پست و بلند میں امتیاز پیدا کردیا جاتا ہے۔احسان دانش کی رومانیت میں ماضی کی یادوں اور فطرت پرستی کو اہمیت حاصل ہے۔اس رومانیت کے نقوش ان کی نظموں ''شام اودھ'، 'بیتے ہوئے دن'، 'صبح بنارس'' وغیرہ میں جا بجا ہیں۔احسان دانش اپنی شاعری میں حالات و حقائق کو جوش و خروش اور جذبات کی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کی نظم ''گورستان'' کا ایک ٹکڑا ان کی فکر اور جذبے کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔مثلاً

وہ کھلا عقدہ جہاں ہنگامہ زارِ مرگ ہے — عرش سے تا فرش بحر بے کنارِ مرگ ہے
شمع محفل کے لیے ہے موت دامانِ نسیم — روح گل کو موت کا پیغام پروازِ شمیم
بے قراری چھین لی جائے تو ہے پارے کی موت — چھوڑ کر گردش کو رک جائے تو سیارے کی موت
ذرے ذرے میں نمایاں موت کی تصویر ہے — لیکن اس تصویر میں گنجائش تقریر ہے
موت ہی جب تیرگی ہے موت تابندگی — زندگی ہے نام کس شے کا کہاں ہے زندگی؟

حامداللہ افسر؛

حامداللہ افسر کے دو شعری مجموعے 'پیام روح' اور 'جوئے رواں' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔حامداللہ افسر کی رومانیت بچپن کے خوبصورت معصوم خوابوں سے عبارت ہے۔ان کے یہاں جیسے کوئی معصوم بچہ ندی کی لہروں میں ڈولتے چاند کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے دل میں مسرت کی چاندنی پھوٹنے لگتی ہیں۔

تم ندی پر جا کر دیکھو — جب ندی میں نہائے چاند
کیسی لگائی ڈبکی اس نے — ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی اک سیڑھی لے کر — چھم چھم اترا جائے چاند
جب تم اسے پکڑنے جاؤ — پانی میں چھپ جائے چاند
اب پانی میں چپ بیٹھا ہے — کیا کیا روپ دکھائے چاند

حامداللہ افسر کے بارے میں انور سدید لکھتے ہیں:

''افسر آرزوؤں کی گھمبیرتا کا شاعر نہیں بلکہ یہ میٹھے خوابوں اور رس بھری مسکراہٹوں کا شاعر ہے۔''

(اردو ادب کی تحریکیں، انور سدید، ص470)

ساغر نظامی؛

ساغر نظامی کی شاعری نے خود پسندی میں ایک قدر کی حیثیت اختیار کر لی تھی ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ذات میں کائنات کا جلوہ دیکھا اور رومانی کرنیں بکھیرنے کے بجائے انہیں اپنی شخصیت کے نقطے پر مرتکز کرنے کی شعوری کاوش کی ۔ ساغر نظامی اپنی شاعری میں خود پسندی اور انائے ذات کا زاویہ بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے وجود کا احساس کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کی آواز بن کر بھی ابھرتے ہیں۔ ساغر کی شاعری میں رومانیت خود ان کی ذات کے گرد ہی رقص کرتی ہے۔

تیرے نغموں سے ہے رگ رگ میں ترنم پیدا
عشرتِ روح ہے ظالم تری آواز نہیں
ساقی بنے ہوئے ہیں وہ ساغر شبِ وصال
اس وقت کوئی میری قسم دیکھتا مجھے!

22.3.4 اردو فکشن پر رومانی تحریک کے اثرات

پریم چند کے بعد اردو میں جو فکشن نگار سامنے آئے ہیں ان میں سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری، قاضی عبدالغفار، نیاز فتح پوری ل۔احمد (لطیف الدین احمد)، حجاب امتیاز علی وغیرہ کے نام بے حد اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ رومانی ادیبوں کے یہاں ماضی سے عقیدت، حسن کی تلاش و جستجو، مرکزیت سے گریز، پر فریب زبان و بیان، عورتوں کا ذکر، خوشبو، پھول اور بہار وغیرہ کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ کچھ رومانی رجحان رکھنے والے فکشن نگاروں کی تحریروں کا ذکر آگے آئے گا۔

اردو ادب میں افسانے کا آغاز ہی رومانی تحریک سے ہوتا ہے۔اردو افسانے میں دو رجحانات غالب رہے ہیں۔ ایک رومانی رجحان دوسرا ترقی پسند تحریک کا رجحان ۔ترقی پسندی یا حقیقت پسند رجحان کی طرح رومانی رجحان کا بھی اپنا ایک مضبوط ڈھانچا ہے جس کا اثر ہر عہد کے ناول اور افسانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔اردو ادب میں رومانوی ناول اور افسانے کی جو بھی اہمیت ہو لیکن ہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اردو میں فکشن کی ابتداء ہی رومانیت پسند ادیبوں کے ہاتھوں ہوئی۔اب ہم آگے چند اہم افسانہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

سجاد حیدر یلدرم؛

سجاد حیدر یلدرم اردو کے پہلے رومانی فکشن نگار ہیں۔رومانیت ان کے یہاں اسلوب فن بھی ہے اور شخصیت بھی۔ رومانیت شروع سے ہی ان کے مزاج کا حصہ رہی ہے۔ وہ اپنے ماحول سے مطمئن نہیں تھے۔رسالہ مخزن میں سجاد حیدر یلدرم کے مضامین سب سے پہلے شائع ہونے شروع ہوئے اور ان کے مضامین سے اردو میں رومانوی تحریک کے باقاعدہ اسلوب کا آغاز ہوا۔ یلدرم کی نثر ساحری ہے نہ پیغمبری وہ تخئیل کی ایک موج خوش آب ہے۔سجاد حیدر نے لطافت اور کیفیت کو نثر میں ان کی اصل جگہ بخشی۔ان کی نثر ابوالکلام آزاد کی طرح خطیبانہ اور مقصدی نہیں بلکہ تخیلی اور رومانی ہے۔زبان و بیان میں بھی لطافت و نزاکت ہے۔سجاد حیدر یلدرم ترکی ادب سے متاثر ہیں۔ان کے نزدیک زندگی میں

صرف محبت ایک ایسا عنصر ہے جو افسانے جیسی صنف لطیف کا موضوع بن سکتا ہے۔ان کا خیال تھا کہ ادب اور ادیب کو زندگی کے ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے جس میں پھنس کر ادیب و مصلح اور ادب کو پند و وعظ کا پلندہ بننا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو عورت اور فطرت کے حسن اور ان دونوں کے فطری رومان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ان کا موضوع عورت اور مرد کی وہ محبت تھی جو فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور قسم کی رسوم و قیود کی پابند نہ تھی۔اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے افسانوں میں کھلے طور پر کیا ہے۔مثلاً خارستان و گلستان میں لکھتے ہیں:

1۔ ''عورت! عورت! عورت! ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کر اسے تازگی، اسے زینت بخش دیتی ہے۔''

2۔ ''عورت میں حسن نہ ہوتا تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی۔مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوبصورتی اور دلبری رائیگاں جاتی۔''

سجاد حیدر یلدرم کے ناول' ثالث بخیر، مطلوب حسیناں، زہرہ اور آسیب الفت ترکی زبان سے اردو میں اور ہما خانم فارسی سے ترجمہ ہوئے ہیں۔ان ناولوں میں ہئیت و تکنیک کے کوئی نئے تجربے نہیں ملتے ہیں۔زبان و بیان سادہ اور مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی ان کی تحریروں میں ملتی ہے۔

نیاز فتح پوری؛

نیاز فتح پوری کے افسانے اس بناوٹی وجود اور غیر حقیقی زندگی کی بڑی مثالیں ہیں' شاعر کا انجام' 'شہاب کی سرگشت' کے طرز تحریر اور اسلوب فکر میں '' گیتانجلی'' جیسی روحانی ہم آہنگی ملتی جو اس کی بہترین مثال ہے۔وہی شکل وہی انداز بیان اور تمنا پسندی، وہی بات سے بات پر وجد کرنے اور ہر چیز کو اس طرح دیکھنے کی کوشش جیسے اس کا ماورائی وجود ہے اور وہی حسن و عشق کے بارے میں فلسفیانہ طرز خیال بھی ملتا ہے۔ان سب عناصر نے اردو افسانہ کو بڑی مدت تک متاثر رکھا ہے۔ان کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ارضی نہیں، ماورائی چیزیں ملتی ہیں۔کردار نگاری میں بھی ماورائی یکسانیت ملتی ہے۔ان میں عام انسانی کرداروں کی نوک پلک انداز و ادا اور ارتقاء نہیں ملتا۔شروع سے لے کر آخر تک ایک نغمہ ہے جو شخصیت پر حاوی ہے۔ان کا اپنا کوئی لہجہ زبان اور اندازِ گفتگو نہیں۔یہ سب نیاز کی سجی سجائی بے حد ادبی زبان ہے۔انداز بیان کا اندازہ مکالموں کی عبارت سے ہوتا ہے۔یہ نثر غالب، بیدل کی شاعری کے مماثل ہے۔مناظر فطرت کا بے حد جذباتی بیان، وفور شوق، تشبیہہ و استعارے کی بہتات کے ساتھ ملتا ہے۔

نیاز فتح پوری کا ناول' شہاب کی سرگزشت اور ایک شاعر کا انجام بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ناول ہے۔وہ اپنے ناولوں میں شاعرانہ انشاپردازی اور تخیل کے سہارے ایک پُر فریب دنیا خلق کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں فن و تکنیک کے جو ماڈل قائم کرنے کی سعی کی وہ تادیر قائم نہ رہ سکے۔

آغا شاعر قزلباش؛

آغا شاعر قزلباش بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن وہ چار ناول' ہیرے کی کنی'،' ناہید'،' ارمان' اور' نقلی تاج دار' لکھ کر اپنی بعض انفرادی خوبیوں کی وجہ سے رومانی ناولوں میں اضافے کا سبب بنتے ہیں جو ان کے ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ان کے

ناولوں کے پلاٹ روایتی نہیں ہوتے۔ دلی کی ٹکسالی اور ٹھیٹ زبان کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔وہ مکالموں کے ذریعے نسوانی کرداروں کی سیرت اس طرح ابھارتے ہیں کہ ناول میں حقیقت پسندی کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔

ل۔احمد اکبر آبادی؛

ل۔احمد اکبر آبادی کا نام رومانی قلم کاروں میں بے حد اہم ہے۔ان کی تحریروں میں منظر نگاری، تخیل کی بلند پروازی، جذبات نگاری اورخوبصورت تشبیہات واستعارات کا استعمال ان کے ناول 'محبت کا افسانہ' میں بخوبی ملتا ہے۔

قاضی عبدالغفار؛

قاضی عبدالغفار کا ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' میں ہئیت وتکنیک کے نئے تجربے سے اردو ناول کا قاری آشنا ہوتا ہے۔ وہ خطوط اور ڈائری کی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔وہ رومان پرست اور انشا پرداز ناول نگار تھے۔

حجاب امتیاز علی؛

رومانی افسانہ نگاروں کی فہرست میں حجاب امتیاز علی کی شعریت سب سے زیادہ آراستہ اور ماورائی ہے۔ان کے یہاں جذبات کی فراوانی اور حسن معصوم کی دلکشی ہے۔ان کے یہاں تحیر کا عنصر زیادہ ہے۔زیادہ تر افسانے واحد متکلم کے صیغے میں لکھے گئے اور کردار جانی پہچانی شخصیتیں ہیں۔ان کے کرداروں میں روحی ان کا اپنا نام ہے جسے وہ ارضی سر زمین کی خوشگوار سیاحت میں اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر یزدانی، شہزادہ مشہدی ایسے نام ہیں جو ان کے قاری کے دوست اور آشنا ہوں۔

مجنوں گورکھپوری؛

مجنوں گورکھپوری نے نیاز فتح پوری سے متاثر ہوکر افسانہ نگاری شروع کی۔ان کا سب سے پہلا افسانہ ''زیدی کا حشر'' ہے جو نیاز فتح پوری کی تحریر ''شہاب کی سرگزشت'' سے متاثر ہوکر لکھا گیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مجنوں کے یہاں رومانیت کی ایک عمدہ مثال ملتی ہے۔ان کی شاعری میں اعتدال قائم ہے۔اس میں جذبے کے وفور کے ساتھ ساتھ تشکیک کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔دوسرے رومانوی ادیبوں کی طرح مجنوں گورکھپوری کے کردار بھی غیر دلچسپ کاروباری دنیا میں گھری ہوئی اجنبیت اور تصور پرست روحیں ہیں، جو یہاں خواب دیکھنے آتی ہیں۔ان کے یہاں ایسے جذبے کی کارفرمائی ہے جو ناکامیوں سے تھک کر خود کو تباہ و برباد کر لیتا ہے۔مجنوں کی کہانیوں میں محبت، ناکامی کا دوسرا نام ہے جس کی سزا سوائے گھل گھل کر مرنے کے کچھ نہیں۔مجنوں گورکھپوری کا انداز بیان نیاز فتح پوری سے زیادہ سلجھا ہوا ہے۔اس میں مشکل شاعرانہ نثر کی فراوانی نہیں ہے۔وہ افسانہ بیان کرنے کے انداز میں لکھتے ہیں لیکن بات بات میں شعر پڑھنا اور موقع بے موقع اشعار نقل کرنا ان کے رومانی طرز تحریر کی خصوصیت ہے۔اکثر ان کے کردار اشعار میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے افسانے جذباتی سپردگی کے آئینہ دار ہیں، جنھوں نے اردو افسانہ نگاری پر بڑا اثر ڈالا ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے افسانوی ادب 'صید زبوں، سوگوار شباب، سراب اور زیدی کا حشر، گردش ہیں۔ان کے ناولوں میں پلاٹ تو ملتے ہیں، لیکن کردار نگاری کمزور رہتی ہے۔

رومانیت کے حوالے سے زمینی سطح پر کام کرنے والوں میں قاضی عبدالغفار کا نام سرفہرست ہے۔قاضی اس عبدالغفار نے اس وقت

رومانی نثر لکھنا شروع کیا۔ جب پریم چند، سدرشن اور حامد اللہ افسر حقیقت نگاری کے عروج دور میں شامل ہو چکے تھے تب قاضی صاحب نے ''لیلیٰ کے خطوط'' اور'' مجنوں کی ڈائری'' کی شکل میں رومانیت کے بہترین نمونے پیش کیے جو مشرق ومغرب کا امتزاج معلوم ہوتے ہیں۔ سبطِ حسن شہر نگاراں صفحہ نمبر 40 میں لکھتے ہیں کہ'' قاضی صاحب کا ذہن مغربی لیکن دل مشرقی تھا۔''

اردو کے رومانی ناولوں یا افسانوں کا معیار مغربی ناولوں کی طرح معیاری نہیں ہے۔ اس لیے رومانی ناولوں کی چمک دمک جلد ہی مدھم پڑ گئی تاہم یہ ہمارے ادب کا ایک غیر معمولی حصہ ہیں۔ رومانی تحریک کے زیر اثر جن افسانہ نگاروں نے اچھی تخلیقات پیش کیں ان میں مہدی افادی، خلیق دہلوی، ل۔ اکبر آبادی، خان احمد حسین خاں، حکیم احمد شجاع، عابد علی عابد، مسز عبدالقادر، عظیم بیگ چغتائی اور امتیاز علی تاج وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

22.2.5 اردو تنقید پر رومانی تحریک کے اثرات

اردو میں رومانی تنقید کی صورت حال کا جائزہ لینے سے قبل دو ایک اقتباس پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو بے حد دلچسپ بھی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب 'تنقیدی دبستان' میں لکھتے ہیں:

> ''اردو میں رومانی تحریک کی بے بضاعتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے رومانی تنقید پر 24 صفحات کا مقالہ مشمولہ تنقید اور اردو تنقید میں اردو کے ایک بھی رومانی نقاد کا نام درج نہیں کیا''۔ (ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی دبستان، ص 101)

عبادت بریلوی کے کسی رومانی نقاد کا نام درج نہ کیے جانے کی شاید وجہ یہ بھی رہی ہو کہ اردو میں تنقید کی ابتدا یا روایت ہی بہت دیر میں یعنی الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعروشاعری سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اس سے قبل تذکروں میں یا مشاعروں کی واہ واہ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر آگے لکھتے ہیں؛

> ''اردو ادب کو جس سماج نے پیدا کیا وہ تہذیب یافتہ اور نفاست پسند تھا اس کا نظام اخلاق منظّم اور معیار انسانیت واضح تھا۔ ایسے افراد کا تنقیدی شعور بھی بیدار ہوتا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی دبستان، ص 100)

اردو ادب کا قاری اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ الطاف حسین حالی پہلے ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اردو تنقید کے اصول و معیار مقرر کیے۔ اصول و معیار سے گریز ہی رومانیت کا امتیاز ہے۔ تنقید میں حالی کے ان معیاروں کے خلاف پہلا ردِ عمل مہدی افادی کی طرف سے ہی ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں

> '' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تنقید میں ان (حالی) کی اولیت قائم ہے۔ تاہم ان کی تنقیدوں کے پیمانے خاصے تنگ تھے اور اس کے خلاف اولین ردّ عمل رومانی تحریک کے ہراول کے ادیب مہدی افادی کی طرف سے ہوا۔ مہدی افادی نے تنقیدی عمل سے اس مسرت کو تلاش کرنے کی سعی کی جسے ادبا نے اپنے تخلیقی ادب پاروں میں چھپ رکھا تھا اور فیصلے میں انشاپردازی کو یوں استعمال کیا کہ ان کا فرمایا ہوا ضرب

المثل کی طرح مشہور ہو گیا ہے۔'' (ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص 474)

مہدی افادی، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، عبدالرحمٰن بجنوری، ل۔احمد، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری کے ساتھ ہی آل احمد سرور کا نام بھی رومانی نقادوں میں لیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر سیّد عبداللہ اپنی کتاب 'اشاراتِ تنقید' میں مہدی افادی کے حوالے سے لکھتے ہیں

''مہدی الافادی الاقتصادی بھی ایک رومانی نقاد ہیں۔مگر ان کا انداز بجنوری سے مختلف ہے۔ان کے مضامین (افادات) میں مبالغہ کی وہ شدت نہیں جس کا اظہار مقدمہ بجنوری میں ہوا ہے۔''

(ڈاکٹر سیّد عبداللہ، اشاراتِ تنقید، ص، 180)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مہدی افادی کے تنقیدی رویوں کو''اشارات تنقید'' میں ترتیب وار اس طرح بیان کیا ہے:

''1۔ اس میں (افادات مہدی) میں مبالغہ نہ سہی مگر ہیجان انگیزی کی صورتیں موجود ہیں۔

2۔ تنقید میں ان کا ادبی اسلوب نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

3۔ افادات مہدی میں تخلیقی ادب کی شان پائی جاتی ہے۔'' (ڈاکٹر سیّد عبداللہ، اشاراتِ تنقید، ص، 180)

رومانی تنقید کا ایک اہم اور معتبر نام عبدالرحمٰن بجنوری کا ہے۔ان کا اہم تنقیدی کارنامہ 'محاسن کلام غالب' ہے، جو غالب کے دیوان نسخہ حمیدیہ کا مقدمہ ہے۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں

''وہ (بجنوری) اردو کے اہم ترین رومانی نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی آواز برصغیر کے طول وعرض میں سنی گئی اور ان کا وجدانی جملہ کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں : ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب'' شائع ہوتے ہی زبان زد خاص و عام ہو گیا اور اس نے بجنوری کو بقائے دوام عطا کر دی۔''

(ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص 476)

رومانی تنقید کا اہم نام امداد امام اثر کا بھی ہے۔ان کی کتاب 'کاشف الحقائق' کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔اس کتاب میں انہوں نے اہم ترین اقوام عالم کی شاعری کے علاوہ ادب کی مختلف اصناف پر گفتگو کی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ

''اثر کے نزدیک شاعری ایک فطری چیز ہے اور اس کی تخلیق سلسلہ الہام سے تعلق رکھتی ہے''

(ڈاکٹر سید عبداللہ، اشارات تنقید، ص 167)

نیاز فتح پوری کا شمار بھی اردو کے اہم رومانی نقادوں میں ہوتا ہے۔ان کے یہاں رومانی اور تاثراتی انداز کی تنقیدیں ملتی ہیں۔ 'انتقادیات' اور 'مالہ وماعلیہ' نیاز کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ان کے نزدیک یہی سب کچھ ہے کہ 'شاعری ہمارے فرصت کے لمحوں کو رنگین اور دلکش بنا دے اور ذرا دیر کے لیے ہمارے بے چین دل کو اس کی آغوش میں سکون مل جائے۔'

عبدالماجد دریا آبادی بھی رومانی انداز کی تنقید کے لیے مشہور ہیں۔ان کی تنقیدی تحریروں میں جذبات کی شدت ملتی ہے جو ان کی تنقید کے توازن کو درہم کر دیتی ہے۔

22.3 اکتسابی نتائج

- ☆ رومانی تحریک نے ہر صنف سخن کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو تقریباً چالیس برس تک اپنے سحر میں قید رکھا۔
- ☆ علی گڑھ تحریک نے سادگی، عقلیت، روشن خیالی اور پیغامبری کو فروغ دیا اور رومانی تحریک نے اسی خول سے باہر نکلنے پر زور لگایا۔
- ☆ رومانی تحریک کو فروغ دینے میں 'رسالہ مخزن' نے اہم کردار ادا کیا۔
- ☆ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر میں رومانی نقوش بہ آسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔
- ☆ میر ناصر علی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، مہدی افادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اور نیاز فتح پوری نے رومانی تحریک کو بام عروج تک پہنچایا۔
- ☆ مولانا محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر کی تحریروں میں تخیل کا ایسا بہاؤ دیکھنے کو ملتا ہے، جس پر علی گڑھ تحریک نے قدغن لگانے کی سعی کی۔
- ☆ بقول محمد حسن ''رومانوی ادیب کی دنیا علامتوں، اشاروں، اور آراستہ پیرایوں سے سجی ہوئی ہونے کے باوجود بناوٹی معلوم ہوتی ہے۔''

22.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
وجدان	پالینا، حاصل کرنا، جذبہ، ضمیر	عشرت	خوشی، عیش ونشاط، مزہ، مباشرت
محاسن	حُسن کی جمع	مصلح	اصلاح کرنے والا، درست کرنے والا
الہام	خدا کی طرف سے دل میں آئی ہوئی بات	معتبر	ٹھیک، درست، اعتبا کیا گیا، بھروسے کے قابل
طول	لمبائی، وسعت، پھیلاؤ	عرض	وہ چیز جو دوسری چیز کی وجہ سے قائم ہو، بیان،
ہیجان	جوش، ابال، تیزی	تشکیک	شک میں ڈالنا
اعتدال	نہ کمی نہ زیادتی، درمیانی درجہ، میانہ روی	نشیب	پستی، گہرائی
فراز	بلندی، اونچائی	متکلم	کلام کرنے والا، بات کرنے والا
وفور	افراط، زیادتی، کثرت	انشاپردازی	مضمون نویسی، عبارت نویسی
بقائے دوام	ہمیشہ کی زندگی، حیات جاودانی		

22.5 نمونۂ امتحانی سوالات

22.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ کیا علامہ اقبال رومانی شاعر تھے؟

2۔ نیاز فتح پوری کے ناول کا نام بتائیں۔

3۔ 'لیلیٰ کے خطوط' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

4۔ 'گل نغمہ' کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟

5۔ دو رومانی نقاد کے نام بتائیں۔

6۔ کسی پانچ رومانی شاعر کے نام بتائیے۔

7۔ پانچ رومانی افسانہ نگار کے نام بتائیں۔

8۔ آغا شاعر قزلباش کے دو ناولوں کے نام بتائیں۔

9۔ قاضی عبدالغفار کی دو مشہور تصنیف کے نام کیا ہیں؟

10۔ کسی پانچ رومانی ناولوں کے نام لکھیے۔

22.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اختر شیرانی کی نظموں کے بارے میں چار جملے لکھیے۔

2۔ جوش ملیح آبادی کی کون سی نظم آپ کو پسند ہے؟ اور کیوں؟

3۔ رسالہ 'مخزن' میں کس طرح کے مضامیں شائع ہوتے تھے؟

4۔ سجاد حیدر یلدرم نے کن زبانوں سے اردو میں ناول اور افسانے ترجمہ کیے؟

5۔ کیا مہدی افادی رومانی نقاد ہیں؟ چار جملے لکھیے۔

22.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ رومانی تحریک کے حوالے سے ایک مضمون قلمبند کیجیے۔

2۔ کون سا رومانی ادیب وشاعر آپ کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے؟ تحریر کیجیے۔

3۔ اردو ادب پر رومانی تحریک نے کس طرح اپنے اثرات مرتب کیے؟ تفصیل سے لکھیے۔

22.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک : پروفیسر محمد حسن

2۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ : ڈاکٹر منظر اعظمی

3۔ جدید اردو تنقید اصول ونظریات : پروفیسر شارب ردولوی

4۔ اردو ادب کی تحریکیں : ڈاکٹر انور سدید

5۔ مشرقی شعریات اور اردو تنقید کا ارتقا : عتیق اللہ

اکائی 23: ترقی پسند تحریک

اکائی کے اجزا

23.0	مقصد
23.1	تمہید
23.2	ترقی پسند تحریک کیا ہے؟
23.3	ترقی پسند تحریک کا پس منظر
23.4	ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا
23.5	افتتاحی کانفرنس کی اہم تقریریں
23.6	اہم مصنفین
23.7	اکتسابی نتائج
23.8	کلیدی الفاظ
23.9	نمونہ امتحانی سوالات
23.9.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
23.9.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
23.9.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
23.10	مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

23.0 تمہید

اردو ادب میں جو چند ادبی تحریکیں رونما ہوئی ہیں ان میں سب سے کامیاب تحریک ترقی پسند تحریک سمجھی جاتی ہے جس نے ادب کو زندگی کے حقائق سے قریب کیا۔ 1936ء میں اس تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔اردو کے معروف شاعروں، ادیبوں نے اس تحریک کی سرپرستی کی۔اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آخر یہ تحریک کیا ہے؟ اس تحریک کا پس منظر کیا ہے؟ اوراس کے آغاز وارتقا کے مراحل کیا رہے ہیں؟

23.1 مقاصد

اس اکائی میں آپ ترقی پسند تحریک کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔یہ مطالعہ آپ کو ترقی پسند تحریک سے متعارف کرائے گا اور ساتھ ہی اس کے پس منظر اور آغاز وارتقا سے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔اس مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ :

☆ ترقی پسند تحریک سے اپنی واقفیت کا اظہار کرسکیں۔

☆ اس کے پس منظر کے بارے میں بیان کرسکیں۔

☆ اس کے آغاز وارتقا کے تعلق سے گفتگو کرسکیں۔

23.2 ترقی پسند تحریک کیا ہے؟

تحریک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''کسی بات کو شروع کرنے'' کے ہیں۔ اصطلاحاً کسی مقصد کے حصول کے لیے جب افراد کا گروہ کوشش کرتا ہے تو اسے تحریک کہتے ہیں، خواہ اسے کسی بھی حد تک کامیابی حاصل ہو۔ ترقی پسند تحریک بھی ظاہر ہے کہ ایک تحریک ہے اور اس تحریک کے مخصوص مقاصد میں غریبوں کو ان کا حق دلانا، عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرنا، انسان دوستی اور آزادیٔ ہند کی کوشش شامل تھی۔ گویا ادب کو گل وبلبل اور کنگھی چوٹی سے بالاتر کر کے اسے مقصدیت سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد لندن میں رکھی گئی۔ 1930ء میں لندن میں چند ہندوستانی طالب علموں نے اپنے ملک کے سیاسی وسماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی وجستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لے کر ہندوستانیوں کو پستی، غلامی، مظلومی اور استحصال سے آزاد کرانے کا عزم کیا۔ اس تحریک سے متعلق اور اس کے نظریوں سے اتفاق رکھنے والے ادیبوں نے اپنی اپنی زبان کے ادب میں ترقی پسند خیالات کی تبلیغ وتشہیر کی اور اس طرح اس تحریک نے پورے ہندوستان میں اور ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کے وسیلے سے ''انسانیت کا نشاۃ ثانیہ'' تھا۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں منعقدہ اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت شہرہ آفاق ادیب منشی پریم چند نے کی تھی۔ اردو کے معروف ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کی سرپرستی کی جن میں منشی پریم چند' مولوی عبدالحق' مولانا حسرت موہانی' جوش ملیح آبادی' فراق گورکھپوری' سید سجاد ظہیر' فیض احمد فیض' ملک راج آنند' عزیز احمد وغیرہ شامل تھے۔ اس کانفرنس کے بعد ہی اس تحریک نے اپنی منظّم صورت اختیار کی اور مختلف زبان کے ادیبوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی۔ یہ تحریک اس دور میں اس حد تک اثر انداز ہوئی کہ پرانے اور تجربہ کار قلم کاروں کے ساتھ ساتھ ہر نیا لکھنے والا اس تحریک سے خود کو وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے بعد یعنی بیسویں صدی کی چوتھی پانچویں دہائی میں ترقی پسندی نے فیشن کی صورت اختیار کر لی تھی لیکن 1950ء کے بعد تحریک میں ایک طرح کا جمود آ گیا جو کہ آزادی ہند اور تقسیم ہند کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحریک میں ازسرنو زندگی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن اسے عروج نو حاصل نہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدیدیت سر اُبھارنے لگی تھی۔ جدیدیت کی تحریک کو بھی اُردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

23.3 ترقی پسند تحریک کا پس منظر

ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قطع نظر اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اس تحریک کا خمیر بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا۔ لندن میں ہندوستان کے کافی طلبہ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ ان طلبہ کا گرچہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق تھا اور ان کی مادری زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن نظریاتی طور پر ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں غریبوں اور مجبوروں پر ہونے والے مظالم کی خبریں ان تک پہنچتی رہتی تھیں اور ان میں برطانوی حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کے خلاف غم وغصہ بڑھتا جاتا تھا۔ لہٰذا ہندوستانی نوجوانوں نے جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر اور پرمود سین گپتا وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ''انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن'' قائم کی۔ پھر اس کا اعلان نامہ تیار کیا گیا جس میں کہا گیا کہ ''ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا

چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا' بدحالی کا' ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال''۔

(یعقوب یاور' ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ص۔55-54)

اس کے علاوہ اسی اسوسی ایشن نے ایسی تجاویز بھی پیش کیں جن کی بنیاد پر ادیبوں کو اور اس اسوسی ایشن کو آگے کی کارروائی کرنی تھی۔مثلاً ''ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا' ان انجمنوں کے درمیان جلسوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعے ربط وتعاون پیدا کرنا۔صوبوں کی' مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان تعلق پیدا کرنا' ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں' ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحتمند اور توانا ہو' جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹاسکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں' فکر ونظر اور اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا' ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا' عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہوں'' وغیرہ۔(رسالہ ہنس' بنارس۔اکتوبر 1935ء)۔اس گروپ نے اپنی پہلی باقاعدہ میٹنگ لندن کے ایک چینی ریستوران'' نان کنگ ریستوران'' میں کی جس میں ملک راج آنند کو صدر منتخب کیا گیا۔یہ لوگ پیرس میں منعقدہ World congress of the writers for the defence of culture سے بھی کافی متاثر ہوئے۔اس کانفرنس میں میکسم گورکی' ویلڈو فرینک' آندرے مارلو' برتول بریخت' ای ایم فاسٹر' لوئی آراگان' بورس پاسترنک اور رومین رولاں جیسے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی اور انہوں نے جو تجاویز منظور کی تھیں ان میں انسانیت کی بالادستی اور مظالم کی سرکوبی کے عزائم کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔پوری دنیا کے ادیبوں کو متحد کرنے کی یہ ایک بہت بڑی اور کامیاب کوشش تھی۔اس کانگریس سے انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن کے ارکان کو اپنے مقاصد کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کی ترغیب ملی اور انہوں نے اپنی کوشش لندن کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شروع کردی۔اُنہوں نے اپنے ''اعلان نامے'' کو ہندوستان کے اہم ادیبوں تک پہنچایا۔پریم چند نے اس کی زبردست حمایت کرتے ہوئے اسے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کردیا۔مجموعی طور پر پورے ملک میں اس اعلان نامے کا خیر مقدم کیا گیا۔1935ء کے آخر میں سجاد ظہیر ہندوستان واپس آگئے۔انہوں نے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔اس سے پہلے'' انگارے'' کے افسانوں نے ماحول کو کافی گرم کردیا تھا جس کے مصنفین میں سجاد ظہیر' احمد علی' محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں شامل تھے۔ان میں سے موخرالذکر تین ادیبوں نے ہندوستان میں ترقی پسند نظریات کی تبلیغ سجاد ظہیر کی آمد سے پہلے ہی شروع کردی تھی۔اندرون ہندوستان اور لندن میں کی گئی تمام جدوجہد کا نقطہ عروج اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صورت میں سامنے آیا' جہاں ہندوستان کی تعمیر وتشکیل اور صحت مند معاشرے کی رہنمائی کے لیے ادیبوں کی ذمہ داریوں پر کھل کر گفتگو ہوئی۔

اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا خمیر دو عوامل سے تیار ہوا۔اول تو لندن میں زیرِ تعلیم ہندوستانی نوجوانوں کی فکر اور دوم ہندوستان میں ''انگارے'' کی اشاعت۔یہ دو ایسے عوامل تھے جس نے ترقی پسند تحریک کی راہیں ہموار کیں۔اِن کے علاوہ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ ہندوستان میں بیداری کی تحریکیں ایک زمانے سے جاری تھیں۔شاہ محدث دہلوی کی تحریک' وہابی تحریک' راجہ رام موہن رائے کی تحریک اور پھر سرسید کی علی گڑھ تحریک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اِسی درمیان آزادی کی تحریک بھی شروع ہوگئی اور نہ صرف اندرون ہندوستان بلکہ پوری دُنیا سے اس کی حمایت کی جانے لگی۔دراصل ہندوستانی عوام میں ایک نئی صبح کی تلاش کی جستجو تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔گرچہ ہندوستان میں انگریزوں نے ایسے کئی کام کیے جو ہندوستانیوں کے حق میں تھے اور سماجی سطح پر اُن کی اصلاح ہوئی۔اُنہوں نے مقامی حکومتوں کے تسلط کو کمزور

کرایا‘ ستی اور اُس طرح کی اندھی عقیدت والی کئی رسومات کا خاتمہ کیا‘ جوٹ کے مل اور سوت کا کارخانے لگائے جہاں ہزاروں مزدوروں کو روزی روٹی کا سہارا ملنے لگا مگر غلامی سے نجات کا لاوا پکتا گیا اور وہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ قومی بیداری کا جذبہ تیز ہوتا چلا گیا۔

ترقی پسند تحریک کے پس منظر کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہونے والی تمام سرگرمیوں اور پیش رفت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ 1880ء کے آس پاس ہندوستان کے ہر طبقے میں یہ احساس شدید ہو گیا تھا کہ برطانی حکومت ہندوستان میں اپنا تسلط اور رعب و دبدبہ برقرار رکھنے کے لیے یہاں کے عوام کا استحصال کر رہی ہے۔ اُنہیں ہندوستانیوں سے یا ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے کسی بھی طرح کی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ یہاں خالصتاً بیرونی حکمراں کے طور پر مقیم رہنا چاہتے ہیں اور اپنی معیشت اور اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان کی کسی بھی چیز کو داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے گرچہ ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے اور اپنی حکومت قائم کر لی ہے‘ لیکن اِس ملک کو اپنایا نہیں ہے۔ اُنہیں یہاں کے افراد یا سماج سے کسی طرح کی ہمدردی نہیں ہے۔ اِسے اپنا ملک نہیں بلکہ اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا غلام جس سے صرف کام لیا جاتا ہے‘ فائدہ اُٹھایا جاتا ہے‘ اُس کے جذبات یا اُس کے بہتر مستقبل کی کوئی فکر نہیں کی جاتی ہے۔ کام لیتے ہوئے غلام کو جتنی بھی اذیت پہنچے‘ اُسے جذباتی‘ نفسیاتی‘ تہذیبی یا سماجی سطح پر جو بھی نقصان پہنچے‘ اُس کے بارے میں سوچنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں مختلف سطح پر ردِ عمل ظاہر ہونے لگا۔ ابتدا میں لوگ آپس میں باتیں کرتے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات پر تشویش کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُنہیں یہ احساس ہو چلا کہ اُنہیں اپنی لڑائی اب خود لڑنی ہے۔ گاؤں گاؤں‘ قریہ قریہ انقلابی جذبات بیدار ہونے لگے۔ لوگ ذہنی طور پر کسی نامعلوم اور ناگہانی صورتِ حال کی تیاری کرنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ شروع کے دنوں میں ''انقلاب'' اور ''مکمل آزادی'' کے تصور کے بغیر ہی برطانی حکومت کے خلاف لوگ متحد ہونے لگے تھے۔ سبھوں کو اندیشہ تھا کہ آنے والا وقت بہت برا ثابت ہوگا۔ اُن پر مظالم ڈھائے جائیں گے اور کسی طرح کی نرمی یا مروت نہیں کی جائے گی۔ لوگوں نے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں متحد ہو کر اپنی اپنی سطح پر اور اپنے اپنے انداز میں اُن خطرات سے نپٹنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ منصوبہ بندی ہونے لگی۔ لاٹھی‘ بھالے‘ تلوار اور بندوقیں بھی جمع کی جانے لگیں۔

دوسری طرف انگریز حکمرانوں اور اُن کے حامیوں کی اِس کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اُن کے مخبر اور افسران ڈائریوں اور رپورٹس کی شکل میں اپنے اربابِ بالا کو صورتحال سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اُنہیں یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ ہندوستانیوں کو آزادی کا خیال آنے لگا ہے۔ وہ لوگ ہندوستان کی آزادی‘ یعنی برطانی حکومت کے اخراج کا خواب دیکھنے لگے ہیں۔ اسی دوران ایک بہت تاریخی واقعہ پیش آیا جب 1885ء ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ایلن اوکٹیوین ہیوم (Allan Octavian Hume) نے ممبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ گرچہ اس کانگریس کے قیام میں زیادہ تر ہندوستانی ہی شامل تھے جن کا تعلق ممبئی‘ مدراس اور کلکتے سے تھا مگر کہا یہ جاتا ہے کہ اس کانگریس کے قیام کے پس پشت انگریزوں ہی کا دماغ تھا۔ اُن کا مقصد ہندوستانیوں کے دلوں میں ملک کے ساتھ ملک کے موجودہ حکمرانوں کے لیے ہمدردی پیدا کرنا تھا۔ شروع میں جب آنند موہن بوس‘ حسرت موہانی اور دیگر لیڈروں نے ''مکمل آزادی'' کی تحریک چلانی چاہی تو مہاتما گاندھی نے ان کی مخالفت کی اور یہ کہتے رہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ کانگریس میں موجود رہنماؤں نے اکثر موقع پر انگریزوں کے ساتھ تعاون کا رویہ اختیار کیا۔ پہلی جنگ عظیم 1914ء میں بھی کانگریس برطانی حکومت کی تائید کرتی رہی بلکہ اُس کی حمایت میں قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔ 1918ء میں جب جنگ کا اختتام ہوا تو گاندھی جی نے وائسرائے کو خط لکھ کر برطانی حکومت کو مبارکباد دی۔ اُنہیں لگتا تھا کہ ایسے خوش اخلاقانہ رویوں سے برطانی

پگھل جائیں گے اور وہ ہندوستانیوں کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اُن کی سخت گیری اور جابرانہ رویے میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نتیجے کے طور پر پورے ہندوستان، خاص طور پر بڑے شہروں میں احتجاج اور انقلاب کا بازار گرم ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اِس لہر نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں شروع ہی سے دو طرح کے نظریے کام کررہے تھے۔ ایک گرم رویہ تھا اور دوسرا نرم۔ گرم رویے والوں کا ماننا تھا کہ آزادی کسی بھی طرح سے حاصل کرلینی ہے۔ اس کے لیے خون دینا بھی پڑسکتا ہے اور خون بہانا بھی پڑسکتا ہے۔ اس گروپ کے مشہور نام آربندو گھوش، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور بال گنگادھر تلک وغیرہ تھے۔ نرم رویے والوں کا خیال تھا کہ آزادی ستیہ گرہ اور بھوک ہڑتال وغیرہ کے ذریعہ یعنی امن و امان سے تحریک چلاتے ہوئے حاصل کی جائے۔ اس کا سب سے مضبوط طریقہ بات چیت اور افہام و تفہیم کو قرار دیا گیا۔ گاندھی جی اس میں پیش پیش تھے۔ بہرحال دونوں ہی نظریوں کا مقصد حصول آزادی تھا لہٰذا پورے ملک میں آزادی کی تمنا جاگ اُٹھی اور گاؤں گاؤں سے آزادی کی مانگ ہونے لگی۔ کہیں ہندوستانی جھنڈے لگادیے جاتے تو کہیں برطانی جھنڈے جلادیے جاتے۔ کہیں نعرے لگائے جاتے تو کہیں قومی گیت گائے جاتے۔ غرض یہ کہ پورا ملک عملی یا نظری طور پر تحریک آزادی میں شریک ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم 1914ء کا بھی اثر ہوا۔ اِس تعلق سے ایک مضمون لکھنے پر بال گنگادھر تلک کو چھ سال کی جیل ہوگئی۔ ملک کے سوت کارخانوں میں ہڑتالیں ہونے لگیں۔ اسی دوران جلیانوالہ باغ کا واقعہ پیش آگیا جو ہندوستانیوں کو بہت گراں گزرا۔ جنرل ڈائر نے ہزاروں نہتے ہندوستانیوں پر گولی چلوادی۔ 1917ء میں انقلاب روس نے بھی ہندوستانیوں کے جذبے کو مہمیز کیا اور لوگ ایک آزاد ملک کا خواب دیکھنے لگے۔ قومی اور عالمی دونوں ہی سطحوں پر یہ دور شکست و ریخت اور کش مکش کا دور تھا۔ ہندوستان کا ہر طبقہ اس سے متاثر تھا۔ دانشور طبقہ اور ادیب حضرات بھی اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ اور پھر جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ لندن میں موجود ہندوستانی طلبہ نے میٹنگ کی اور بتدریج اُس آگ نے پورے ہندوستان کے ادیبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک کا مطالعہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس کی محرک وہ قوتیں ہیں جنھوں نے اُردو بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا اثر دنیا کی چھوٹی بڑی تمام زبانوں پر پڑا ہے۔ تاریخ کے کسی زمانے میں کم ایسی عالمگیر قوتیں برسرِکار آئی ہوں گی جن سے انسانی سرگرمی اور کارکردگی اتنی متاثر ہوئی ہو جتنی کہ اس ترقی پسند تحریک سے جو بحیثیت مجموعی اشترا کی نقطہ نظر کی تائید اور ترجمانی کرتی ہے۔
>
> اُردو ہندوستان کی سب سے نوعمر زبانوں میں ہے، اس اعتبار سے اس کا ترقی پسند ہونا فطری ہے لیکن اس کا ربط اور رشتہ بڑی قدیم اور وقیع زبانوں اور روایات سے بھی ہے اس لیے یہ قدیم کی بھی اتنی ہی گرفت میں ہے۔ ایسی زبان پر ایک ایسی عالمگیر تحریک کا کیا اثر ہوگا اور اس کے کیا نتائج ہوں گے بڑا اہم مطالعہ ہے۔''
>
> (تعارف' اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)

ہندوستانی تناظر میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک بیک وقت ادبی اور سماجی دونوں سطحوں پر کام کررہی تھی۔ ادیبوں نے ادب کی ادبیت کو ہمیشہ اولیت دی ہے تاہم پہلے ادیب حضرات ادب کے ذریعے اخلاقی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر

قلمکاروں نے سماجی انصاف اور مساوات کے پیغام کو بھی عام کرنا شروع کر دیا۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی معروف کتاب اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے ''مقدمہ'' کا آغاز اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک دوسری شعوری تحریک تھی جس کے زیر اثر ہمارے ادب کو بعض بڑی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا۔جن لوگوں نے اُردو ادب کے مختلف شعبوں کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے اور زمانۂ حال کے ادبی رجحانات کو اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا ہے' ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہماری زبان میں شعروادب کا ایک متعدبہ ذخیرہ اس تحریک کی پیداوار ہے۔ترقی پسند مصنفین کے نام سے ہمارے ملک میں جو تحریک 1935ء میں شروع ہوئی اس کی یہ خصوصیت نظر میں رکھنے کی ہے کہ یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس نے نہ صرف یہ کہ پورے ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اتحاد واشتراک کا ایک وسیلہ بن گئی۔اُردو زبان میں اس تحریک کے نظریاتی ارتقا اور اس کے ادبی سرمائے کے تحقیقی وتنقیدی مطالعے کو اپنا موضوع بنانا اُردو ادب کے ایک اہم دور کی تاریخ مرتب کرنا ہے۔''

ترقی پسند تحریک کے پس منظر کے بیان کے دوران آپ کو ''انگارے'' کے بارے میں بھی علم ہوا۔آیئے ہم یہ جانتے ہیں کہ ''انگارے'' میں وہ کیا بات تھی کہ اُس نے اُس عہد کے ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔لوگوں نے اُسے ایک انتہائی بے خوف آواز قرار دیا اور اُس نے بعد کے اُردو فکشن کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔''انگارے'' کی اشاعت 1932ء میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں عمل میں آئی۔اس میں چار افسانہ نگاروں کی 9 کہانیاں شامل تھیں۔پانچ کہانیاں سجاد ظہیر کی' دو احمد علی کی' ایک رشید جہاں اور ایک محمود الظفر کی۔آخر میں رشید جہاں کا ایک ڈرامہ بھی شامل کتاب تھا یعنی کتاب دس تخلیقات پر مشتمل تھی جس کے محرک' مرتب اور ناشر خود سجاد ظہیر تھے۔ممتاز ترقی پسند ادیب پروفیسر قمر رئیس نے اپنے مضمون ''اُردو افسانہ میں انگارے کی روایت'' (مشمولہ تلاش وتوازن) میں لکھا ہے کہ:

''اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ ''انگارے'' کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ تھی۔بوسیدہ عقیدوں' فرسودہ اداروں' سماج دشمن طاقتوں اور مجہول سماجی واخلاقی قوانین کے خلاف اس کی بغاوت ایک نئی انقلابی فکر کے طلوع کا پیغام تھی۔امیروں' حاکموں اور اہل اقتدار کے مقابلے میں زیردستوں' ناداروں' مجبوروں اور محکوموں کی حمایت ادب میں ایک ایسے دور کی آمد کا اعلان تھی جب تخلیقی ادب کی بنیاد طبقاتی شعور اور اشتراکی انسان دوستی پر رکھی جانی تھی۔موضوع' مواد اور فن کے نئے تجربے تخلیقی اظہار کے ان بے شمار نئے سانچوں کی جستجو کی علامت تھے جسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاتھوں نقطہ کمال تک پہنچنا تھا۔''

قمر رئیس نے انگارے کو ترقی پسند تحریک کی بشارت قرار دیا ہے یعنی اس مجموعے نے تحریک کے لیے پس منظر اور ماحول تیار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔یہ الگ بات ہے کہ ''انگارے'' کی زبان' بے باکانہ انداز' مواد' حاکم طبقے پر راست حملے اور مذہب کے تعلق سے کھل کر بات کرنے کے سبب اِس پر کافی اعتراضات کیے گئے۔اس کے خلاف بے شمار مضامین لکھے گئے اور اسے ضبط کر لینے کی مانگ کی گئی۔نتیجے کے طور پر اگلے ہی سال کتاب پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔جہاں جہاں کتاب پہنچی تھی' حتی الامکان وہاں سے اُٹھا لی گئی اور جہاں اس کا اسٹاک تھا وہاں اُسے نذر آتش کر دیا گیا۔

انگارے سے کافی قبل جون 1908ء میں ایک اور کتاب شائع ہوئی تھی جس نے کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ وہ کتاب پریم چند کا افسانوی مجموعہ ''سوزِ وطن'' تھا۔ اس مجموعے میں پانچ کہانیاں شامل تھیں۔ دُنیا کا سب سے انمول رتن، شیخ مخمور، یہی میرا وطن ہے، صلہ ماتم اورعشق دُنیا اور حُبِ وطن۔ اِن کہانیوں کے ذریعے وہی پیغام دینے کی کوشش کی گئی تھی جس کو بعد میں منظم شدہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے اپنا لائحہ عمل بنایا۔ اس مجموعے کے تعلق سے ایک اشتہار ملاحظہ کیجیے جو اُن دنوں منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں شائع ہونے والے اُردو کے ماہانہ رسالے ''زمانہ'' میں شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ اشتہار خود پریم چند کا تیار کردہ تھا:

> ''اُردو زبان میں حسن وعشق، وصل وفراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل وغیرہ کی بہت سی داستانیں موجود ہیں۔ ان میں بعض بہت دلچسپ ہیں۔ مگر ایسے قصے جن میں سوزِ وطن کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے اس وقت تک معدوم ہیں۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے ہیں اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں۔ ممکن نہیں کہ انہیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کا پاک جذبہ موجزن نہ ہو جائے۔''

اِس اشتہار سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ ان پانچ کہانیوں کے مجموعے میں کس طرح کے موضوعات قلم بند کیے گئے تھے۔ انجام یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں بعد اُنہیں انگریزی حکومت کی طرف سے بلایا گیا۔ کتاب کے مواد پر اعتراض کیا گیا اور حکم ہوا کہ ساری کتابیں حکومت کے پاس جمع کروادیں۔ سرکار نے جمع شدہ کتابوں کو نذر آتش کر دیا۔ اور اس کی مزید اشاعت پر پابندی عائد کردی۔ گرچہ ''سوزِ وطن'' کی اشاعت کے وقت ترقی پسند تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا لیکن اس میں اُسی طرح کا مواد پیش کیا گیا تھا جنہیں بعد میں تحریک نے بھی اختیار کیا۔ لہٰذا اِس کتاب کو بھی ترقی پسندی کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے جو طلبا کے لیے جاننا بہت ضروری ہے کہ اِس کتاب پر پابندی کے ساتھ پریم چند پر یہ شرط بھی لگائی گئی تھی کہ اب وہ جو کچھ بھی لکھیں گے اُسے حکومت سے اجازت لینے کے بعد ہی اشاعت کے لیے بھیجیں گے۔ ہر تحریر کی منظوری پریم چند کے لیے ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا اُنہوں نے اپنا نام بدل لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ کتاب پریم چند کے پہلے نام ''نواب رائے'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اب اُنہوں نے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ یعنی سوزِ وطن ہی کے سبب نواب رائے، پریم چند بن گئے۔ یہ نام دیا نرائن نگم نے تجویز کی تھی۔

اُمید ہے کہ اب آپ ترقی پسند تحریک کے پس منظر سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ اب آگے آپ سے اس تحریک کے آغاز وارتقا کے تعلق سے باتیں ہوں گی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' کے مصنف کا نام بتایئے؟

2۔ ''انگارے'' کی اشاعت کب اور کہاں عمل میں آئی؟

23.4 ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا

ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل 1936ء کی اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض وغایت بیان کی، ادیبوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس جلسے کو ''ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ'' قرار دیا۔ اس خطبے میں انہوں نے کہا کہ ''ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم

اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے اور ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہترین زندگی کی راہ دکھائے۔''

پریم چند نے ادیبوں اور فنکاروں کے لیے حسن و جمال کی بدلتی ہوئی معنویت، بدلتے ہوئے حالات اور عصری حسیت کے تناظر میں ادب کی تعریف بھی پیش کی ہے۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں پریم چند کے علاوہ چودھری محمد علی ردولوی، سید سجاد ظہیر، احمد علی، فراق گورکھپوری، محمود الظفر، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور بنگال، مہاراشٹر، گجرات اور مدراس وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔ اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے۔

ترقی پسند نظریات کے ادیبوں کی اس کانفرنس میں ایک اعلان نامہ بھی پیش کیا گیا تھا جس میں اِن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہمارے ادیب زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چراتے ہیں لہٰذا ہمارے ادب میں روحانیت، تخیل کی پروازوں اور تصورات کی دُنیا نے اپنی جگہ بنا لی ہے۔ ہماری تحریروں میں استدلالی اور عقلی باتیں کم اور خیالی دُنیا کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جبکہ ادیبوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ادب کو قدامت پسندی، فرسودگی، خیال آرائی اور عبارت آرائی سے آزادی دلا کر اُس میں مفید اور سودمند باتیں شامل کریں۔ اعلان نامے میں یہ بھی کہا گیا کہ ہم لوگ نہ صرف آرٹ اور لٹریچر میں اعلیٰ قدروں، ہندوستانی تہذیب وتمدن اور صحت مند موضوعات کا احاطہ کریں گے بلکہ اس کے برخلاف جو لوگ بھی تخلیقات پیش کریں گے، ہم اُن کی مخالفت کریں گے۔ اُنھیں ایسا ادب پیش کرنے کی ترغیب دیں گے جو ہم وطنوں کو نئی روشنی اور بہتر زندگی عطا کرنے میں معاون ثابت ہو۔ بے بسی، بے عملی اور فرسودہ خیالات کی دُنیا سے باہر نکلنے کی راہیں ہموار کرے۔ اِس اعلان نامے کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا:

> ''ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے اس لیے ہندوستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات اُبھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں۔'' (نیا ادب، جنوری فروری 1941ء)

لکھنؤ کانفرنس کی خاطر خواہ کامیابی کے بعد مختلف شہروں میں انجمن کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور اس کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔ دہلی، ممبئی، کلکتہ، بھیمڑی، حیدرآباد، الہ آباد، لکھنؤ، جے پور، رانچی وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیں اور سمینار ہوتے رہے۔ بے شمار شاعر و ادیب اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ جس کے سبب اس تحریک نے تنظیمی و علمی سطح پر ارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک بن گئی۔

لیکن جس طرح دن کے بعد رات اور شام کے بعد صبح ہونا فطری امر ہے اسی طرح عروج کے بعد زوال بھی لازمی ہے۔ اس تحریک کا آغاز ہوا، عروج ہوا۔ اس نے نسلوں کو متاثر کیا۔ ادب کی فضا پر آسمان کی طرح سایہ فگن ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہوگئی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ 1947ء کے بعد جو تحریکیں، جو ادارے تعطل اور انتشار کے شکار ہوئے ان میں ترقی پسند تحریک بھی کافی اہم ہے۔ اس تحریک کے روحِ رواں سید سجاد ظہیر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ بعض ادیب و شاعر نہیں رہے اور اسی طرح چھٹے دہے میں ہی نظریاتی اعتبار سے اس تحریک

میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے۔1948ء کے بعد کمیونسٹ پارٹی جس دارو گیر کا شکار ہوئی اس کی وجہ سے بہت سے ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہوگئے۔آزادی کے بعد خود ترقی پسند مصنفین نے ایک نئے قرارداد کے ذریعے غیر کمیونسٹ ادیبوں پر انجمن کے دروازے بند کر دیے۔انجمن اور تحریک کو نقصان پہنچانے میں اس واقعہ نے سب سے اہم رول ادا کیا۔اس تحریک کو پروپگنڈہ اور نعرے کا نام بھی دیا گیا ۔بعض ادیب وشاعروں نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ تحریک پروپگنڈہ بن گئی ہے اور اس سے ادب مجروح ہورہا ہے تو انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔اس طرح آٹھویں دہائی کے آتے آتے ترقی پسند تحریک تحلیل ہوچکی تھی اور جدیدیت پوری طرح سے سر ابھار چکی تھی۔واضح رہے کہ یہاں تحلیل کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ تحلیل ہونے والے مادے کا وجود گرچہ بظاہر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی کوئی نہ کوئی صورت اور اس کی اثر انگیزی باقی رہتی ہے۔یہ تحریک آج بھی زندہ ہے اور اس سے نظریاتی طور پر وابستہ ادیبوں کی خاصی تعداد بھی موجود ہے۔یوں بھی انسان دوستی کا نظریہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔مظلوم و بے کس کی حمایت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ظالموں اور استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز ہمیشہ اُٹھتی رہے گی۔شاعر اور ادیب ہمارے سماج کا سب سے حساس طبقہ ہے۔معاشرے میں ہونے والی کوئی ناانصافی اُنہیں پریشان کردیتی ہے اور اپنی پریشانی اور بے چینی کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعے کرتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ گرچہ آج ترقی پسند تحریک کی پہلے جیسی باقاعدہ شکل باقی نہیں ہے لیکن اُس کے پیغامات کو پھیلانے والے ادیب ہر دور میں موجود رہیں گے۔

23.5 افتتاحی کانفرنس کی اہم تقریریں

ترقی پسند تحریک کو سمجھنے کے لیے اپریل 1936ء میں منعقدہ افتتاحی کانفرنس میں پریم چند کی صدارتی تقریر کا مطالعہ بہت ضروری ہے ۔اُسی موقع پر مولانا حسرت موہانی نے جو تقریر کی تھی اُسے بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ان دو خطابات سے ہمیں اس تحریک کی روح تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ذیل میں ان دونوں ادیبوں کی تقریریں آپ کے مطالعے کے لیے پیش کی جارہی ہیں:

پریم چند کا صدارتی خطبہ:

حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی تھی یہاں تک کہ اُردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشا خیالات وجذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ زبان کی تعمیر تھا۔وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔وہی زبان جس میں ابتدا باغ و بہار اور بیتال پچیسی کی تصنیف معراج کمال تھی اب اس قابل ہوگئی ہے کہ علم وحکمت کے مسائل بھی ادا کرے اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ہم جس دور سے گزرے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندر کانتا

ستونتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے اس میں کلام ہی نہ تھا بلکہ وہ مسلم تھا۔ قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی۔ دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انہیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لیے کافی تھا چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔

لیکن انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اوران سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو ہماری ذہنی اور جسمانی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے؟ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانے کے لیے فخر کا باعث نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے مذاق صحیح کی شہادت دے سکتا ہے۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود وانحطاط کا شکار ہو چکی ہے اور اس میں سعی واجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجات عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور مشاہدے کی قوت غائب ہوگئی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں تعامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔ بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی ،معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے لیکن اگر اساڑھ میں آسمان پر شفق چھاجائے تو وہ خوشی کا باعث نہیں ہوسکتی کیوں کہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔

ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قایم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا تو اسے اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آورا ے ہمت مردانہ

یا

چوموج ساز وجودم زسیل بے پرداست — گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم''

یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہوجائے گی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آجائے گی۔ وہ کسی

خاص طبقہ تک محدود نہ ہوگا۔اس کی پرواز کے لیے محض باغ کی چار دیواری نہ ہوگی بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہو۔ تب ہم بدمذاقی کے متحمل نہ ہوں گے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لیے سینہ سپر ہوجائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کرسکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔ تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش نہ ہوجائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق، خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ایسا کوئی علمی، معاشی، تاریخی، اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر ان میں تبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس ہم اپنے مبلغ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبعیت اور رواں قلم ہی ادب کے لیے کافی ہے۔ ہماری ادبی پستی کا باعث یہی خیال ہے۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑے گا تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابل قدر خدمت کر سکے۔ تاکہ جماعت میں اسے وہ درجہ ملے جو اس کا حق ہے۔ تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے بحث کر سکے۔ ہم دوسری زبانوں اور ادبوں کے دسترخوان کے جھوٹے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیے اور اس موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہیے۔

ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشوونما پا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں جب بھی وہ فضا تیار ہوگی، جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوگا۔ ہم ہر صوبے میں، ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔

یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں۔ ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالات روزگار نے پہلے سے کر رکھی ہے۔ جا بجا اس کے انکھوے بھی نکلنے لگے ہیں۔ اس کی آبیاری کرنا، اس کے آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔

ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

(نیا ادب جنوری فروری 1941ء)

حسرت موہانی کی تقریر:

ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہیے۔ اسے مزدوروں، کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنا چاہیے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار اس طرح کرنا چاہیے، جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد و منظّم ہو کر اپنی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔

محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشترا کی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔ چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انہیں خیالات کی ترویج کرنا چاہیے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ جب میں ادیبوں کے سامنے یہ نصب العین پیش کر رہا ہوں تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی لیکن آپ کو اس کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کے ان مقاصد کی طرفداری اور حمایت کا اعلان کروں جو آپ نے اپنے اعلان نامے میں لکھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اسی قسم کے ادب کی تخلیق ہو۔ پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری طرح مدد کروں گا۔ (روشنائی - سجاد ظہیر ص 112)

23.6 اہم مصنفین

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کے ادبی سرمائے سے واقفیت کے لیے اُن سے متعارف ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اہم شعرا اور فکشن نگاروں کے تعلق سے آپ آئندہ اکائی میں مطالعہ کریں گے مگر چند نام ابھی سے ذہن نشین کر لیجیے۔ ترقی پسند شعرا میں سلام مچھلی شہری، اختر انصاری، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری اور اختر الایمان شامل ہیں۔ فکشن نگاروں میں پریم چند، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی، دیوندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، کنہیا لال کپور اور بلونت سنگھ وغیرہ اہم نام ہیں۔ آیئے یہاں ہم بعض دیگر ادیبوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سجاد ظہیر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ناقد، ڈرامہ نگار یا ناول نگار سے کہیں زیادہ ایک جہد کار تھے۔ اُن کے بارے میں آپ یہ جان چکے ہیں کہ وہ لندن میں زیر تعلیم اُن طلبا میں شامل تھے جنہوں نے وہیں سے ہندوستان کے لیے ترقی پسند تحریک کا خواب دیکھا تھا۔ سجاد ظہیر کو ترقی پسند تحریک کے روح رواں بلکہ میر کارواں کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اپنے بالکل ابتدائی دور ہی سے اشترا کی نظریے کے قائل تھے اور جیسے ہی اُنہیں موقع ملا عملی طور پر اُس میں حصہ لینے لگے۔ اُن کا ناول ''لندن کی ایک رات'' بہت ہی اہم ناول تسلیم کیا جاتا ہے جس میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے اور اُن نوجوانوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو ہندوستان سے بغرض تعلیم لندن جاتے ہیں اور وہاں کی ترقی و خوشحالی اُن کی آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔ ساتھ ہی ان طالب علموں کو سرمایہ دارانہ نظام سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ چونکہ طلبا میں ہر طرح کے نوجوان ہوتے ہیں جن کے عادات و اطوار اور فکری میلان مختلف ہوتے ہیں لہٰذا ناول میں بھی ایسے ہی مختلف النوع طلبا موجود ہیں۔ سجاد ظہیر کے ادبی سرمایے میں رپورتاژ ''یادیں'' اور ایک کتاب ''ذکر حافظ'' مشہور ہے۔ اُنہوں نے کئی تنقیدی مضامین بھی لکھے لیکن اُن کی بنیادی شناخت ترقی پسند تحریک کے میر کارواں کی حیثیت سے قائم ہے۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کے رُکن بنے۔ وہیں 1973ء میں 73 برس کی عمر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

''ادب اور زندگی'' کے مصنف مجنوں گورکھپوری نے ترجمے کیے اور افسانے بھی لکھے لیکن وہ ایک ممتاز ناقد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔نظریاتی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن اُن کی تنقید ابتدا میں تاثراتی نوعیت کی تھی اور بالکل آخری دور میں اُنہوں نے سائنٹفک تنقید کی۔ وہ ترقی پسندی میں ضرورت سے زیادہ نعرے بازی اور پروپیگنڈے کو ناپسند کرتے تھے۔اُنہوں نے ادب میں ہمیشہ ادبی شان کی تلاش کی کوشش کی۔اُن کی دیگر معروف کتابوں میں غالب شخص اور شاعر' نکات مجنوں اور تنقیدی حاشیے شامل ہیں۔مجنوں گورکھپوری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے لیکن وہ بھی بعد میں پاکستان منتقل ہوگئے جہاں84 سال کی عمر میں1988ء میں کراچی میں انتقال کر گئے۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سید احتشام حسین ایک انتہائی اہم نام ہے۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر تھے۔وہ تاعمر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے' تنقیدیں لکھتے رہے اور جہاں کہیں تحریک' انجمن یا اُس سے جڑی ہوئی کسی شخصیت پر کوئی سوال کھڑے کرتا' اُس کے جواب دیتے رہے۔ مارکسزم اُن کی زندگی کا حصہ تھا جس سے اُنہوں نے ذرہ بھر بھی روگردانی نہیں کی۔اُن کی باوقار شخصیت اور تحریر' دونوں ہی نرمی ومروت' اخلاص و ہمدردی اور اعتدال سے عبارت تھی۔اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔گرچہ وہ اُردو کے اُستاد تھے لیکن فلسفہ' تاریخ' معاشیات اور عالمی شکست وریخت پر بھی اُن کی گہری نظر تھی۔اُنہیں فنونِ لطیفہ اور تہذیب وتمدن سے خصوصی لگاؤ تھا۔اُن کی تحریروں میں ان تمام شعبہ ہائے علم سے استفادہ ہوتا ہے۔پروفیسر احتشام حسین کے ادبی نظریے کو سمجھنے کے لیے اُن کے پہلے مجموعہ مضامین''تنقیدی جائزے'' سے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

> ''آج کل ادب تعبیروں کی کثرت سے خواب پریشاں بن رہا ہے۔غور وفکر کا زمانہ ہے۔آزادی رائے کو اہمیت دی جا رہی ہے۔علوم وفنون چند لوگوں کے ملک سمجھے جاتے تھے۔اب اس اجارہ داری کا دور ختم ہو رہا ہے اور ہر شخص سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔۔۔۔۔اصول اور بے اصولی' ترقی پسندی' مقصدیت اور لذت اندوزی کے تصورات میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔افسوس یہ ہے کہ یہ جنگ حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز سے ہٹ کر بعض حالتوں میں بالکل غیرعلمی اور جذباتی بن گئی ہے۔۔۔۔ میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر پراثر انداز ہوتے ہیں۔۔۔۔اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تنقید کی پہچان یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حسن اور توانائی کو سمجھنے اور اسے اُبھارنے میں مدد ملتی ہے۔اس طرح عوام کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں سے مضبوط ہوتا ہے۔۔۔۔نہ قدیم ادب میں سب کچھ اچھا ہے اور نہ جدید میں سب کچھ برا۔نہ پرانے ادب میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں اور نہ نئے ادب کا ہر لفظ قابل تعریف بلکہ جس طرح پرانے ادب میں مواد اور صورت کے میل سے پرانے مرقعے تیار ہوئے ہیں اسی طرح نئے ادب میں بھی الفاظ اور خیالات کی مدد سے دل کی بات کہی جاتی ہے۔''

پروفیسر احتشام حسین کی بیشتر تحریروں میں اُن کے درج بالا خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔تنقیدی جائزے کے علاوہ اُن کی دیگر معروف کتابوں میں روایت اور بغاوت' ادب اور سماج' تنقید اور عملی تنقید' ذوقِ ادب اور شعور' افکار ومسائل' عکس اور آئینے' اعتبارِ نظر اور اُردو ادب کی تنقیدی تعریف شامل ہیں۔احتشام حسین 1912ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ 1972ء میں الہ آباد میں اُن کا انتقال ہوا۔

23.7 اکتسابی نتائج

☆ ترقی پسند تحریک کی بنیادلندن میں رکھی گئی۔ یہ 1930ء کی بات ہے۔اس وقت ہندوستان کے چندنوجوان تعلیم حاصل کرنے کی غرض سےلندن گئے ہوئے تھے۔ان نوجوانوں میں سجادظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، پرمودسین گپتا، جیوتی گھوش تھے۔انہوں نے پہلی بار ملک کے سیاسی وسماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی وجستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر اور تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لے کر ہندوستانیوں کو پستی غلامی، مظلومی اور استحصال سے آزاد کرانے کا ارادہ کیا اوراس کے لیے کوشش کی۔

☆ اس گروہ نے انڈین پروگریسیورائٹرز ایسوسی ایشن بنائی، بعد میں مینی فیسٹو بنایا اور ہندوستان میں باقاعدہ ماحول تیار کیا۔اِس ماحول کا خمیر عالمی سطح پر ہونے والی شکست وریخت سے بھی تیار ہوا جن میں انقلاب روس اور پہلی جنگ عظیم شامل ہیں۔

☆ ہندوستان میں انگریزوں کی ظلم وزیادتی اور ملک کی تحریک آزادی نے بھی ترقی پسند ذہن کوفروغ دیا۔

☆ 1932ء میں سجادظہیر کے شائع کردہ دس تخلیقات پر مشتمل اُس مجموعے نے بھی ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھ دی تھی جس کا نام ’’انگارے‘‘ تھا۔اُس میں شامل 9افسانے اورایک ڈرامے نے ادیبوں کی ذہن سازی کی۔

☆ البتہ اپریل1936ء میں اس تحریک کا باقاعدہ آغازایک یادگاراور تاریخی کانفرنس سے ہوا جس میں پریم چند نے صدارتی خطبہ دیا۔ اس کانفرنس کے بعد ہی اس تحریک نے اپنی منظّم صورت اختیار کی اور معروف شاعروں، ادیبوں نے اس کی سرپرستی کی۔ان میں پریم چند، مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، جوش، فراق، فیض، سجادظہیر، محمدحسن، قمررئیس وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

☆ الہٰ آباد، حیدرآباد، لکھنؤ، جے پور رانچی وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیں اورسمینار ہوتے رہے۔اوراس طرح اس تحریک نے تنظیمی وعلمی سطح پرارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک بن گئی، لیکن 1947 کے بعد یہ تحریک تعطل اور انتشار کی شکار ہوگئی اور آٹھویں دہائی کے آتے آتے یہ تحریک تحلیل ہوچکی تھی۔البتہ تحریک کے اثرات اوراُس کے پیغامات اب بھی باقی ہیں اور مختلف شعراوادبا کے توسط سے اُن کا اظہار ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

23.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
تحریک	کسی بات کوشروع کرنا
تحلیل	اپنی شکل کھودینا، گھل جانا
محاسبہ	حساب، تجزیہ
حقائق	حق کی جمع
اجتماعی	مل جل کر
عدم	نہیں

منظّم	انتظام کے ساتھ، باقاعدہ
ازسرنو	نئے سرے سے
تخلیق	خلق کی گئی، پیدا کی گئی
خمیر	مزاج، فطرت
توانا	طاقتور، مضبوط

23.9 نمونہ امتحانی سوالات

23.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' کے مصنف کا نام بتایئے؟

2۔ ''انگارے'' کی اشاعت کب اور کہاں عمل میں آئی؟

3۔ روس میں انقلاب کب آیا؟

4۔ پہلی جنگ عظیم کب ہوئی؟

5۔ ''ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں۔'' کس نے کہا؟

23.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ آزادیٔ ہند کے بعد ترقی پسند تحریک کا محاسبہ کیجیے۔

3۔ ''انگارے'' کا تعارف کرایئے اور ترقی پسند تحریک پر اس کے اثرات کے تعلق سے گفتگو کیجیے۔

4۔ انقلاب روس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔

23.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ تحریک کی تعریف کیجیے اور بتایئے کہ ترقی پسند تحریک کیا ہے؟

2۔ ترقی پسند تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔

3۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔

23.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
2۔	ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری	یعقوب یاور
3۔	نیاز حیدر، شخصیت اور شاعری	ظفرالدین

اکائی 24:   اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

اکائی کے اجزا

24.0		تمہید
24.1		مقاصد
24.2		اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات
24.3		ترقی پسند تحریک سے متاثر شعرا
24.4		ترقی پسند تحریک سے متاثر ادبا
24.5		اکتسابی نتائج
24.6		کلیدی الفاظ
24.7		نمونہ امتحانی سوالات
	24.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	24.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	24.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
24.8		مزید مطالعے کے لیے کردہ کتابیں

24.0 تمہید

اردو ادب کو جن چند ادبی تحریکوں نے متاثر کیا ہے ان میں سب سے کامیاب تحریک ترقی پسند تحریک سمجھی جاتی ہے جس نے ادب کو زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس تحریک نے ادیبوں کو اِس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ ادب کو محض تفریح کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اس سے سماجی و معاشرتی اصلاح کا کام کریں۔ اس سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کو جگانے کا کام کیا اور جہاں جہاں ظلم و زیادتی اور استحصال نظر آیا اُس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس تحریک نے پورے عہد کو متاثر کیا اور ہندوستان میں صرف اُردو ہی نہیں بلکہ یہاں کی بیشتر زبانوں کے ادیب اس سے متاثر ہوئے اور سبھی زبانوں میں ترقی پسند ادب تخلیق کیا گیا۔

اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس تحریک کے اُردو ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اس سے متاثر اہم شعرا کون تھے اور اُنہوں نے کس طرح کی شاعری کی؟ ترقی پسند ادیبوں نے کس طرح کے افسانے اور ناول لکھے؟ غرضیکہ ترقی پسند شعرا اور ادبا سے آپ کو واقف کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

24.1 مقاصد

اس اکائی میں آپ اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔ یہ مطالعہ آپ کو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والے کئی شعرا اور ادیبوں سے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔ اس مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات سے اپنی واقفیت کا اظہار کر سکیں۔

☆ اس سے متاثر شعرا کے بارے میں بیان کر سکیں۔

☆ اس سے متاثر نثر نگاروں کے تعلق سے گفتگو کر سکیں۔

24.2 اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

آپ تحریک کے معنی و مفہوم سے واقف ہیں اور ترقی پسند تحریک کیا ہے یہ بھی جانتے ہیں۔ اس تحریک کے ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہمیں اس پر غور کرنا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے اور شاعر و ادیب معاشرے کے سب سے زیادہ حساس افراد ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر و ادیب کے ذریعے جو ادب وجود میں آیا اس پر اس عہد، اس تحریک اور تحریک سے وابستہ نظریے کے واضح اثرات تھے۔ اس تحریک سے متعلق اور اس نظریے سے اتفاق رکھنے والے ادیبوں نے اپنی اپنی زبان کے ادب میں ترقی پسند خیالات کی تبلیغ اور تشہیر کی اور اس طرح اس تحریک نے پورے ہندوستان میں اور ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ پریم چند نے لکھنو میں اپنے خطبے میں کہا تھا کہ:

> ’’ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھر پور اظہار کریں.......... ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں........ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کردے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔‘‘

اس کی پیروی نظم و نثر دونوں میں ملتی ہے۔ ایک طرف پریم چند، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ فکشن میں اپنے کمالات دکھا رہے تھے تو دوسری طرف فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی اور نیاز حیدر وغیرہ اپنی شاعری کے ذریعے اس تحریک کے رگ و ریشے میں گرم لہو دوڑا رہے تھے۔ اختر حسین رائے پوری، خلیل الرحمٰن اعظمی، احتشام حسین، علی سردار جعفری، ممتاز حسین، مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر قمر رئیس وغیرہ ایسے ناقدین ہیں جن کے تنقیدی افکار اس تحریک کے مقاصد سے ہم آہنگ رہے ہیں۔ اس تحریک کے نظریے کے حامیوں نے آزادی سے قبل اپنا رول ادا کیا اور آزادیٔ ہندوستان کے بعد اپنی ذمہ داری ایک الگ طرح سے نبھائی۔ دونوں صورتوں میں اس کا مقصد انسان دوستی کے جذبے کا فروغ، سامراجی قوتوں کے شکنجے سے نجات، عدم مساوات کے خلاف احتجاج اور مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کو ان کے حقوق دلانے کی جدو جہد تھا۔ بلاشبہ اس جدو جہد میں بڑی قوت تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک بیسویں صدی کی سب سے مقبول اور موثر ادبی تحریک بن گئی۔

24.3 ترقی پسند تحریک سے متاثر شعرا

ترقی پسند تحریک کے علم بردار شاعروں میں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مجروح سلطانپوری، اختر الایمان، کیفی اعظمی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔فیض احمد فیض کو ترقی پسند شعرا میں اہم مقام حاصل ہے۔فیض غزل کی کلاسیکی روایت سے بھی مستفید ہوئے اور انقلابی فکر سے بھی استفادہ کیا۔دونوں کو ہم آہنگ کر کے ایک نئی کیفیت پیدا کی۔انہوں نے ''انقلابیت کی خاطر تغزل اور تغزل کی خاطر انقلابیت کو کبھی قربان نہیں کیا۔'' ن۔م۔راشد نے فیض کے پہلے مجموعہ کلام کے تعلق سے کہا کہ ''یہ ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔''

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید — ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے — خلوت کو سجایا کرتے تھے
ناداری، دفتر، بھوک اور غم — ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ — یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

(فیض۔شیشوں کا مسیحا)

فیض غیر منقسم ہندوستان میں 1911ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا حصہ بن گیا۔فیض نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور معلم کے عہدے پر فائز ہوئے۔وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔انگریزی، فارسی، اُردو، عربی زبان پر اُنہیں قدرت تھی۔اُنہوں نے مولوی میر حسن جیسے مثالی استاد سے تعلیم حاصل کی تھی۔یہ وہی میر حسن ہیں جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بھی استاد تھے۔وہ امرتسر کے ایم اے او کالج میں انگریزی کے لکچرر رہوئے۔1940ء میں لاہور چلے گئے اور وہاں ہیلی کالج سے وابستہ ہوگئے۔اُنہوں نے شاعری کی ابتدا کالج کے زمانے سے ہی کردی تھی۔کالج کے میگزین میں ان کی کئی نظمیں شائع ہوئیں۔وہ نظمیں اُن کے پہلے مجموعے میں شامل ہیں۔موضوعاتی سطح پر ان کی ابتدائی نظمیں رومانی تھیں۔ترقی پسند تحریک کے دورِ آغاز سے ہی فیض اس میں دلچسپی لینے لگے اور عملی طور پر اس تحریک کی ترقی کے لیے کوششیں کیں۔تحریک سے وابستگی کے بعد فیض کی شاعری کا موضوع رومانی کے بجائے اشترا کی بن گیا۔انہیں عشق ومحبت کی بجائے معاشرے کے مسائل اور کمزور طبقے کے لوگوں کے دِگرگوں حالات زیادہ اہم محسوس ہوئے۔اس احساس کی ترجمانی اُن کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' سے ہوتی ہے۔نظم کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مخدوم محی الدین کا شمار صف اول کے ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔وہ حیدرآباد کے قریب میدک میں 1908 ء میں پیدا ہوئے ۔ اُنہوں نے حیدرآباد میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں کے ایک کالج میں اُنہیں لکچرشپ بھی ملی لیکن اُنھوں نے جلد ہی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور تنظیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔

مخدوم بہت ہی ذہین اور کھلے ذہن کے انسان تھے۔اُنہیں بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا۔دورانِ طالب علمی اُنھوں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے قائل ہوتے چلے گئے۔ان کی نوجوانی کے زمانے میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔تحریک سے نظریاتی ہم آہنگی کے سبب مخدوم اِس سے وابستہ ہوگئے۔اُنھوں نے حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی۔

مخدوم کی ابتدائی دنوں کی شاعری میں جمالیاتی اور خوشگوار احساس موجود ہے۔اُنھوں نے عشقیہ اور رومانی نظمیں پورے جوش و جذبے کے ساتھ لکھی ہیں۔محبت کی چھاؤں، نالہ حبیب، انتظار، سجدہ، نورس وغیرہ اسی کیفیت کے اظہار کی مثالیں ہیں۔اُن کی عشقیہ نظم ''طور'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے

نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم اُلفت کا بھرتے تھے

نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وقت کے ساتھ ساتھ مخدوم کے ذہن اور موضوعات میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ان کی نظمیں رومان سے انقلاب کی طرف کوچ کرنے لگیں۔انہوں نے اپنے نظریے کو عام کرنے اور عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے انقلابی نظموں کا سہارا لیا جو پورے جوش و خروش کے ساتھ جلسوں اور جلوسوں میں پڑھی اور گائی جاتی تھیں۔آتش کدہ، قمر، سپاہی وغیرہ اُن کی ایسی ہی نظمیں ہیں:

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا

ہو رہا ہے مری جاں سویرا

او وطن چھوڑ کر جانے والے

کھل گیا انقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو

وہ کہاں جارہا ہے (نظم سپاہی)

مخدوم نے عام روش کے مطابق ابتدائی دنوں میں رومانی شاعری کی لیکن جلد ہی انقلابی شاعری کرنے لگے۔مخدوم بنیادی طور پر سیاسی آدمی تھے۔ ملازمت ترک کرکے کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔''اعتدال اور سنجیدگی'' مخدوم کے کلام کی خصوصیت ہے۔ان کی نظموں

کے موضوعات میں عموماً مزدور کی زبوں حالی' نچلے اور دبے کچلے طبقے پر مظالم و بربریت اور ان کا استحصال وغیرہ شامل ہوتا ہے۔اُن کا پہلا مجموعہ ''سرخ سویرا'' اور دوسرا مجموعہ ''گل تر'' ہے۔ ان کا کلیات ''بساط رقص'' کے عنوان سے 1966ء میں شائع ہوا۔ 1969ء میں یہ انقلابی شاعر ہندوستان کی راجدھانی دلّی میں انتقال کر گیا۔ اُن کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے جو آپ کو بھی یاد ہونا چاہیے:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

علی سردار جعفری بلرام پور کے زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ گئے۔ زمیندار گھرانے سے نکل کر انہیں یونیورسٹی کی آب و ہوا سے واسطہ پڑا اور اُنہیں وہاں کا مخصوص ماحول ملا۔ اُس زمانے میں علی گڑھ کا ماحول ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر و ادیب کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ سردار جعفری پر بھی اس کا راست اثر پڑا۔ انہیں علم کے ساتھ ساتھ آزادی' شعور اور دُنیا کو دیکھنے سمجھنے کا فہم و ادراک حاصل ہوا۔ وہ مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ انیس کے مراثی کا مطالعہ اور اسے محرم کے مہینے میں سننے سنانے میں اُنہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں انہیں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ سردار جعفری کی شاعری میں طمطراق اور گھن گرج ملتا ہے۔ ان کی تقریر کی طرح نظموں میں بھی بے باکانہ خطابیہ انداز ملتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ''آنکھ کھلی تو علم اور تعزیے دیکھے۔'' سردار جعفری افسانہ نگار' ڈراما نویس اور ہدایت کار بھی تھے لیکن ان سب سے زیادہ ان کی شاعری مشہور ہوئی۔

سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں سے ہی اس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ پریم چند نے تحریک کے باقاعدہ آغاز پر جو صدارتی خطبہ دیا تھا اُس سے متاثر ہو کر سردار جعفری نے دو نظمیں ''سرمایہ دار لڑکیاں'' اور ''دیہاتی لڑکیاں'' لکھیں۔ یہ دونوں نظمیں اُن کے پہلے مجموعے ''پرواز'' میں شامل ہیں۔ ان نظموں سے ان کا منشا واضح ہو جاتا ہے۔ وہ صنعتوں' ذومعنویت' پیچیدگی اور صناعی کی بجائے راست بات کرنے کے قائل تھے۔ ان کے یہاں سختی اور جارحانہ رویہ نہیں ملتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی بات دلائل سے ثابت کرنے کے قائل تھے۔ جن باتوں پر ان کا یقین ہو جاتا تھا وہ انہیں بلا جھجک اور قطعیت سے کہتے تھے۔ وہ ایک بہترین مقرر تھے۔ ان کا خطیبانہ انداز لوگوں کو بہت پسند آتا تھا۔ جعفری کا یہی لہجہ' یہی ڈکشن اور انداز اُن کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔ اُنہوں نے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ بعد میں شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ ان کا شمار اس تحریک کے قافلہ سالاروں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ''ہنگامی اور موضوعاتی'' شاعری کی۔ تنقیدی مضامین بھی لکھے جسے ادبی دنیا میں کافی سراہا گیا۔ سردار جعفری' جوش ملیح آبادی سے کافی متاثر تھے۔ اس لیے ان کی نظموں میں جوش کا رنگ ملتا ہے۔ نئی دنیا کو سلام' ایشیا جاگ اٹھا' اور زنداں نامہ' ان کی اہم نظمیں ہیں۔ اُن کی مشہور نظم ''بغاوت'' کا ایک شعر دیکھیے جو سردارؔ کے فکر کی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے:

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر' بغاوت ہے خدا میرا

اُن کی ایک اور مشہور نظم ''ایشیا جاگ اُٹھا'' سے ایک اقتباس دیکھیے:

ناگہاں شور ہوا
لو شبِ تار قیامت کی سحر آ پہنچی

انگلیاں جاگ اُٹھیں

بربط وطاؤس نے انگڑائی لی

اورمطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں

کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول

لوگ چلاّئے کہ فریاد کے دن بیت گئے

راہزن ہار گئے

راہرو جیت گئے

اسرارالحق مجازترقی پسند شاعر کی حیثیت سے بلند و بالا مقام کے حامل ہیں۔ان کا نام اسرارالحق اور مجاز تخلص ہے۔ان کا آبائی وطن اُتر پردیش کا ضلع بارہ بنکی ہے۔اُنہوں نے ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور بی اے کی ڈگری کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔اس وقت تک ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی اس تحریک سے ذہنی ہم آہنگی رکھنے والے لوگ موجود تھے۔اسی ماحول کے اثر سے مجاز کے ذہن میں پختگی اور دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوئی۔اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجاز نے بی اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس تحریک سے متعلق تربیت بھی حاصل کی۔

مجاز نے جس زمانے میں شاعری کی ابتدا کی اس وقت ہندوستان دوہری غلامی سے دوچار تھا۔طبقاتی کشمکش' فرسودہ روایات اور انسانیت کا فقدان وغیرہ معاشرے کا عام مسئلہ بنا ہوا تھا۔مجاز کو ترقی پسند تحریک میں ان تمام مسائل کے روشن امکانات نظر آئے۔ان کی نظموں میں پرُ زور طریقے سے ان نظریات کی وکالت ملتی ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ''آہنگ'' ہے جس نے مجاز کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔اس مجموعے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا تعارف ترقی پسند تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر نے تحریر کیا ہے۔اس کے دوسرے ایڈیشن پر فیض احمد فیض نے دیباچہ لکھا۔فیض لکھتے ہیں:

''مجاز کی غنائیت عام غنائی شعرا سے مختلف ہے۔عام غنائی شعرا محض عنفوان شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک' ان کی شدت اور قوت نمو ختم ہو جاتی ہے۔ مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع' زیادہ گہرے' زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے۔'' (فیض احمد فیض۔دیباچہ آہنگ)

مجاز انقلابی اور رومانوی شاعری کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔مجاز نے جوش و جذبہ اور عقیدت و محبت سے لبریز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ بھی قلم بند کیا ہے۔یہ ترانہ اس یونیورسٹی کی عظمت کا پتہ دیتا ہے جسے وہاں کے طالب علم خواہ وہ دُنیا کے کسی بھی خطے میں موجود ہوں' بڑے ذوق وشوق سے گاتے اور گنگناتے ہیں۔اور اِسی بہانے اپنی درسگاہ کے ساتھ ساتھ مجاز کو بھی یاد کرتے ہیں۔1955ء میں مجاز کا انتقال ہو گیا۔

مجاز کا شمار ترقی پسند تحریک کے اولین دور کے شاعروں میں ہوتا ہے۔وہ بیک وقت نظم و غزل دونوں پر قدرت رکھتے تھے لیکن شہرت کا سبب نظم ہی بنی۔ان کی شاعری میں انقلابیت کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور رومانی فضا بھی چھائی رہتی ہے لیکن یہ رومانیت' محبت آمیز باتیں' شوخی اور بےباکی پاکیزہ نوعیت کی ہے۔ان کی شاعری کو عزیز احمد نے' انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج'' قرار دیا ہے۔آوارہ' اندھیری رات کا مسافر' رات اور ریل' نذرِ علی گڑھ ان کی مشہور و معروف نظمیں ہیں۔اُن کے متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے ذوق نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجیے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

سب کا تو مداوا کرڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تواس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

معین احسن جذبی ترقی پسندی دور کے منفرد لب و لہجے کے شاعر گزرے ہیں۔ وہ 1912ء میں اعظم گڑھ کے قصبہ مبارکپور میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ درس وتدریس کے سبب وہ ایک زمانے تک علی گڑھ میں رہے اور سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہیں کے ہو رہے۔ ترقی پسند تحریک جب عروج پر تھی، شعرا عام طور پر نظم کی طرف مائل تھے۔ جذبی نے اپنے خیالات ونظریات کی عمدہ عکاسی غزلوں میں کی ہے۔ جذبی کے نظریے کا مطلع بالکل صاف تھا۔ وہ کارل مارکس کے نظریے سے متفق تھے۔ کمزور طبقے سے ہمدردی اور اُن کے حقوق کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔ جذبی بلاشبہ ترقی پسندی کے قائل تھے لیکن اس کے لیے اُنھوں نے کبھی فن سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ جذبی کی شاعری میں موضوع اور فن دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے جہاں دونوں ہی سے انصاف کیا جاتا رہا ہے۔ اپنے شعری مجموعے ''فروزاں'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں لیکن کوئی تجربہ اُس وقت تک موضوع سخن نہیں بن سکتا جب تک اس میں شاعر کے جذبے کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جائے۔''

جذبی ہمیشہ اپنے اس نظریے کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُنھیں جب تک جذبے کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جاتا وہ شعر نہ کہتے تھے۔ غالباً اسی لیے ان کا ادبی سرمایہ اپنے معاصرین کے مقابلے کم ہے۔ اُن کا پہلا مجموعہ ''فروزاں'' اور دوسرا ''سخن مختصر'' ہے۔

جذبی کی بنیادی شناخت ترقی پسند غزل گو شاعر کی ہے۔ مزدوروں کی حمایت اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں جذبی کا نام قابل ذکر ہے۔ سماج کی برائیوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھنے والے جذبی کی شاعری میں درد وغم کا عنصر نمایاں ہے لیکن یہ غم محض ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ جذبی کا خیال تھا کہ ''سیاست میں مصلحت کا بہت کچھ دخل ہے لیکن مصلحت پر شعر کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی'' لہٰذا انہوں نے ہمیشہ

شاعری کے تقاضے کو اہمیت دی اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہش دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت وسالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھ کو کس طرح سنوارا کرتے ہیں

ساحر لدھیانوی رومانی طرز پر شاعری کرنے والے نوجوان نسل کے پسندیدہ شاعر تھے۔ زبان سادہ اور سلیس تھی۔ ابتدائی نظموں میں محبت اور جذبات واحساسات، نوجوان دلوں کی آرزوئیں، ناکامی ومحرومی ان کے عزائم اور ارادے کو مختلف زاویے سے پیش کیا ہے لیکن ان کے یہاں رفتہ رفتہ موضوع میں تبدیلی ہوئی اور طبقاتی شعور، انقلابی آہنگ اور اہل اقتدار کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ پرچھائیاں ان کی طویل نظم ہے۔

خلوت وجلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مسکرا سکتا نہیں
میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہوگئی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں

ساحر لدھیانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ بعد میں پھر وہ دہلی آئے اور ''شاہراہ'' سے منسلک ہوگئے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ وہ روزگار کے لیے ممبئی گئے اور فلمی دُنیا سے وابستہ ہوگئے۔ یہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ ممبئی میں ساحر ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگے۔ دراصل وہ مزاجاً ترقی پسند تھے۔ وہ جہاں بھی رہے اپنے اس مخصوص نظریے کے ساتھ رہے۔ اُنہوں نے رومانی اور عشقیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ سماجی برابری، طبقاتی کشمکش اور انسانیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کے عشقیہ اشعار بہت مشہور ہوئے مثلاً:

تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کردیا ترے دو دن کے پیار نے

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے

یہ اشعار بھی رنگینی، دلکشی اور ادبی چاشنی سے پُر ہیں اور تجربات و مشاہدات کی بنا پر زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ 1955ء میں ساحر کی ''تلخیاں'' شائع ہوئی۔ یہ اس وقت کے نوجوانوں کی پسندیدہ کتاب تھی۔ ساحر نوجوانوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ تلخیاں، پرچھائیاں اور تنہائیاں کے علاوہ اُن کا ایک مجموعہ کلام ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' بھی ہے۔ ساحر کی مقبولیت کی ایک وجہ اُن کی نظموں کا اسلوب بھی ہے۔ آسان اور روزمرہ کی زبان میں وہ تہذیبی و تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کردیتے تھے۔ ساحر بنیادی طور پر ایک دردمند شاعر تھے۔ ان کا خوشحال معاشرے کا خواب تھا۔ وہ امیروں اور غریبوں کے درمیان خلیج کو پاٹنا چاہتے تھے۔ اُن کے دو مزید مشہور اشعار دیکھیے:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر لدھیانوی نے فلموں سے وابستگی کے بعد شاعری سے کسی حد تک کنارہ کشی اختیار کرلی تھی لیکن اُن کی تحریر کردہ فلمی نغموں میں بھی ترقی پسندی کا نظریہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اُن کا مشہور گانا تو آپ نے سنا ہی ہوگا:

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

جاں نثار اختر بیسویں صدی کے ترقی پسند شعرا میں ایک معتبر نام ہے۔ جاں نثار اختر نے گرچہ رومانی نظموں سے اپنی شاعری کی ابتدا کی لیکن جلد ہی سماجی حقیقتوں کی عکاسی کرنے لگے اور ہمیشہ اس تحریک کے نظریے کے حامل رہے۔ جاں نثار اختر نے اپنے اطراف واکناف میں ہونے والے واقعات کو دیکھا، محسوس کیا اور انہیں تجربات و مشاہدات کی بنا پر اسے اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اُن کی شاعری پر جوش، جذبی، سردار جعفری، فیض اور اقبال کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے کہ ''جاں نثار اختر دراصل ایک انتخابی ذہن رکھتے ہیں۔ اپنا راستہ نکالنے کے بجائے وہ دوسروں کے راستے پر فوراً چل پڑتے ہیں۔''

(اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ ص73-172)

جاں نثار اختر کی اُس شاعری میں فنی چابکدستی اور تہہ داری زیادہ ہے جو اُنہوں نے اپنی بیگم صفیہ اختر کی یاد میں کی ہے۔ صفیہ جاں نثار اختر کی پہلی بیوی تھیں اور اسرارالحق مجاز کی بہن تھیں۔ وہ بہت ہی خوش اخلاق اور مہذب خاتون تھیں۔ شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔ جاں نثار اختر کے بعض اشعار ملاحظہ کیجیے:

بجھ چکی ہے آسماں پہ ڈوبتے سورج کی آگ
ہر بگولہ گا رہا ہے خانہ ویرانی کا راگ
بھوک کے مارے مویشی ہڈیوں کے ڈھانچ سے
ذرے ذرے میں تپش دن کی سلگتی آنچ سے

اختر الایمان بیسویں صدی کے مقبول ترقی پسند شاعر گزرے ہیں جو اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ایک غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کا بچپن پریشانیوں میں گزرا۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی اور ملازمت کی تلاش میں نکل پڑے۔ چھوٹی چھوٹی کئی نوکریاں کرنے کے بعد ممبئی پہنچے۔ وہاں فلمی دُنیا سے وابستہ ہو گئے اور گیت' مکالمے لکھنے لگے جس کے بعد اُنہیں دولت اور شہرت دونوں ہی حاصل ہوئی۔ ان کی شاعری ان کے اپنے تجربات و مشاہدات کا حاصل ہے ان کی نظموں میں فرد اور سماج کا ٹکراؤ اور انسانی رشتوں کی پامالی کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں غموں کا احساس' انسانی بے حسی' کمزور طبقے کا درد صاف عیاں ہے۔ اُن کے مجموعہ کلام کے نام 'سب رنگ' 'تاریک سیارہ' اور 'یادیں' ہیں۔ ''ایک لڑکا'' ان کی نمائندہ نظم ہے جس میں ''ایک لڑکا'' مٹتی ہوئی تہذیب کی علامت بن کر سامنے آیا ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے اور خیالات کے ساتھ زبان کی روانی ور برجستگی کا لطف لیجیے:

سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو
یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

اپنی معلومات کی جانچ:

1۔ جذبی کا پورا نام کیا تھا؟

2۔ ''پرچھائیاں'' کس شاعر کی نظم ہے؟

24.4 ترقی پسند تحریک سے متاثر ادبا

ابھی آپ نے ترقی پسند شعرا اور ان کے کلام کا جائزہ لیا۔ اب ہم اس تحریک سے وابستہ ادیبوں کا بھی مختصر جائزہ لیں گے۔ ترقی پسند

ادیبوں میں فکشن نگار کی حیثیت سے پریم چند کے علاوہ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت کے نام کافی اہم ہیں۔جبکہ ناقد کی حیثیت سے سجاد ظہیر، احتشام حسین، ممتاز حسین، محمد حسن اور قمر رئیس وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

پریم چند اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی دنوں سے ہی ترقی پسند تحریک سے نظریاتی طور پر اتفاق کرتے تھے۔اُنہوں نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہی نثری ادب میں بیش قیمت اضافے شروع کر دیے تھے۔اُنہوں نے ہیئت سے زیادہ مواد پر زور دیا ہے اور اصلاح معاشرہ کے لیے ادب کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کے نظریے کے حامی رہے ہیں۔تقریباً ایک صدی قبل جب پریم چند نے لکھنا شروع کیا اُس وقت معاشرہ طبقاتی کشمکش، ذات پات، امیر غریب کے فرق، تعلیم اور تعلیمی سہولتوں کے فقدان، بچپن کی شادی اور ستی جیسے مسائل سے دوچار تھا۔پریم چند نے اپنی کہانیوں میں انہیں مسائل کو پیش کیا ہے۔اگر آپ غور کریں تو ان تمام مسائل کا حل کسی نہ کسی شکل میں پریم چند کی کہانیوں میں موجود ہے۔افسانہ کفن، سوا سیر گیہوں، نئی بیوی، گھاس والی، بڑے گھر کی بیٹی، عیدگاہ، حج اکبر، نجات وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں ترقی پسند نظریات واضح طور پر عیاں ہیں۔عیدگاہ افسانے کا مرکزی کردار ایک چھوٹا بچہ حامد ہے اور ایک بوڑھی عورت امینہ ہے جو حامد کی دادی ہے۔پریم چند نے حامد کی داخلی کیفیات اور نفسیات کو پیش کیا ہے۔حامد کے دوست عیدگاہ میں کھلونے اور مٹھائیاں خریدتے ہیں مگر حامد لوہے کا چمٹا خریدتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی دادی کے ہاتھ روٹیاں پکاتے ہوئے جل جاتے ہیں۔یہاں شوق اور تفریح پر ضرورت حاوی ہے۔پریم چند نے حامد کے توسط سے معاشرے کے ان تمام کمزور طبقے کی عکاسی کی ہے جن کے ارمان کبھی پورے نہیں ہو پاتے ہیں۔اس کہانی کے ذریعے پریم چند نے یہ پیغام بھی دیا ہے کہ ادب کو محض شوق کی تکمیل اور تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ مسائل حل کرنے کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے۔

کرشن چندر عملی طور پر ترقی پسند تحریک سے جڑے رہے ہیں۔ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں وہ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔اُنہوں نے مجموعی طور پر بہت لکھا ہے۔کرشن چندر نے ناول اور افسانے دونوں لکھے لیکن بنیادی شناخت افسانے کی وجہ سے ہے۔مزاجاً یہ جذباتی اور رومان پسند تھے۔ان کے افسانے میں بھی اس کی جھلک نمایاں ہے لیکن یہ جذباتیت اور رومانیت بھی سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال بن گئی ہے۔انہوں نے انسان دوستی اور بہتر سماج کی آرزومندی بھی کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔اُنہوں نے ایک خوشحال اور مطمئن سماج کا تصور کیا۔ان کے یہاں معمولی معمولی افراد مرکزی کردار کی حیثیت سے موجود ہیں جن کی بھرپور عکاسی اور ترجمانی کرتے ہوئے سماج کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اِن افراد کی بھی اپنی عزت اور شناخت ہوتی ہے۔ان کے پاس بھی دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے۔اُن کے بھی اپنے جذبات ہوتے ہیں جن کی قدر کی جانی چاہیے۔مہالکشمی کا پل، کالو بھنگی وغیرہ اسی نوعیت کے افسانے ہیں۔کالو بھنگی ایک اسپتال میں کام کرتا ہے جہاں وہ مریضوں کی غلاظت صاف کرتا ہے۔اُن کے دُکھوں کو محسوس کرتا ہے لیکن اس بھنگی کی معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں ہو پاتی ہے۔وہ ان حسرتوں کے ساتھ اپنی زندگی گزار دیتا ہے اور بالآخر دُنیا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ایک بھنگی کو افسانے کا مرکزی کردار بنا کر پیش کرنا اُردو ادب کو دراصل ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔

منٹو اپنے دور کے باغی افسانہ نگار کہے جاتے تھے۔تقسیم ہند کا المیہ، فرقہ وارانہ فسادات کے ساتھ ساتھ جنسی و نفسیاتی کشمکش ان کے افسانوں کے اہم موضوعات رہے ہیں۔وہ ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریے سے پوری طرح اتفاق کرتے تھے۔اُنہوں نے معاشرے کے اس طبقے کے مسائل کو پیش کیا ہے جس پر فکشن نگاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔اُنہوں نے بازاری عورتوں، اُن کے جذبات و احساسات اور داخلی کیفیات کو بڑے موثر انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔منٹو نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان میں سے بیشتر عورتیں کسی نہ کسی وجہ کی شکار ہوتی

ہیں اور بنیادی طور پر یہ بھی عام عورتوں کی طرح پرسکون زندگی کی متلاشی ہوتی ہیں۔منٹو نے اس خاص موضوع کے علاوہ فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم ہنداور بنی نوع انسان کی بے حرمتی، کمزور طبقے کی بے چینی اور عدم مساوات وغیرہ پر افسانے قلم بند کیے ہیں۔کالی شلوار، موذیل، منظور، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون وغیرہ اُن کے نمائندہ افسانے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور اُس کے زیراثر لکھنے والوں میں راجندرسنگھ بیدی بھی کافی اہم نام ہے۔ بیدی نے سماج کے فرسودہ روایات، توہمات وعقائد اور اس کے مضر اثرات کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ بیدی کا ماننا تھا کہ اتنی ترقی کے باوجود لوگوں کا غیر منطقی باتوں پر یقین واعتبار ہوتا ہے جو کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔افسانہ''گرہن'' کی مرکزی کردار ہولی ہے جو کئی بچوں کی ماں ہے۔سورج گرہن ہونے والا ہے اور وہ حاملہ ہے۔اس کی ساس اسے مختلف طریقے سے تنبیہ کرتی ہے اور طعنے دیتی ہے کہ گرہن میں عورت کو کس کس طرح کی احتیاط کرنی چاہیے۔وہ گاہے گاہے ہولی کو مارتی ہے۔ ہولی کا شوہر رسیلا بھی اُسے مارتا ہے لیکن ہولی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ساس کیوں مارتی ہے۔شوہر کا مارنا اُسے کسی حد تک ٹھیک لگتا ہے اس لیے کہ وہ پتی پرمیشور ہے۔ بیدی نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔نسوانی کرداروں کے علاوہ بچوں کی نفسیات کی پیش کش میں بھی بیدی کو ملکہ حاصل ہے۔ بیدی نے متوسط طبقے کے مسائل کو پیش کیا۔ ''تلادان'' اُن کا شاہکار افسانہ ہے جس میں امیر اور غریب بچے کی نفسیات کی مرقع کشی کی گئی ہے۔''لاجونتی'' گرچہ تقسیم ہند کے المیے پر لکھا گیا افسانہ ہے لیکن اس میں بھی عورت ہی کی نفسیات اور حقوق کو موضوع بنایا گیا ہے۔گرم کوٹ، بھولا، لمبی لڑکی، اپنے دکھ مجھے دے دو، پان شاپ وغیرہ بیدی کے نمائندہ افسانے ہیں۔

عصمت چغتائی بھی اسی دور کی ترقی پسند نظریے کی حامل فکشن نگار ہیں۔وہ عموماً متوسط طبقے کے مسلمان گھروں کی تصویرکشی کرتی ہیں۔ خاص طور پر نسوانی کردار ان کے افسانوں کے موضوع ہوا کرتے ہیں۔عصمت نئی زبان، نیا اسلوب اور بے باکانہ انداز وبیان کے لیے جانی جاتی ہیں۔انہوں نے کہا کہ'' لکھنے کے لیے میں نے دنیا کی عظیم ترین کتاب یعنی زندگی کو پڑھا ہے اور اسے بے انتہا دلچسپ اور موثر پایا ہے۔'' عصمت بدایوں، اترپردیش کی رہنے والی تھیں۔ان کے والد تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔اُنہوں نے عصمت کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔عصمت نے علی گڑھ میں بھی تعلیم حاصل کی اور انسپکٹر آف کالج بنیں۔شاہد لطیف سے شادی کی اور بعد میں ممبئ میں سکونت اختیار کر لی۔فلمی دُنیا سے بھی وابستہ رہیں۔یہی سبب ہے کہ اُن کی تحریروں میں جہاں یوپی کے مسلم گھرانوں کی خواتین کی نفسیات کی مرقع کشی ملتی ہے وہیں ممبئ کی زندگی اور وہاں کے نشیب وفراز کی بھی خوبصورت جزئیات نگاری نظر آتی ہے۔اُنہوں نے افسانوں کے ساتھ کئی ناول بھی تحریر کیے جن میں ضدی، معصومہ، ٹیڑھی لکیر، دل کی دُنیا اور ایک قطرہ خوں وغیرہ شامل ہیں۔

سجادظہیر کا شمار اس تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔اس تحریک کو منظم شکل دے کر کامیاب بنانے میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔احتشام حسین کا شمار ترقی پسند نقادووں میں ہوتا ہے۔ یہ مارکسی نظریے کے حامل تھے اور اس کی مدد سے زندگی اور ادب کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔یہ اپنی بات انتہائی نپے تلے انداز میں مدلل طریقے سے پیش کرتے تھے۔محمد حسن بھی ترقی پسند ناقد گزرے ہیں۔کارل مارکس نے اپنی کتاب''سرمایہ'' میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ اتفاق کرتے نظر آتے ہیں۔محمد حسن نے ادب کا رشتہ زندگی اور سماج سے جوڑا ہے۔ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے''ادبی تنقید'' میں ان خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔قمر رئیس کا شمار اردو کے ممتاز ناقدین میں ہوتا ہے۔ان کے ذکر کے بغیر دورجدید کی ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا تصور نامکمل ہے۔ پریم چند اور سجادظہیر کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین

کومنظّم اور متحرک کرنے کے حوالے سے قمر رئیس بلاشبہ سب سے اہم نام ہے جس نے ایک طویل مدت تک انجمن کے مقاصد کے تحت کوئی نہ کوئی سرگرمی جاری رکھی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1۔ ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو'' کس کا قول ہے؟

2۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کسی چار شاعر وادیب کے نام بتایئے؟

24.5 اکتسابی نتائج

☆ ادب میں موضوعاتی اور فنی دونوں سطح پر تبدیلی جزو لاینفک تصور کی جاتی ہے۔ اس تبدیلی سے مراد یہ قطعی نہیں ہے کہ اس سے قبل جو روایت چلی آرہی ہے یا جو کچھ بھی ادب میں پیش کیا جارہا ہے اس میں کمی وکوتاہی ہے۔ تبدیلی نئے ذہن کی پیداوار کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اس سے دل ودماغ اور ذہن کے دریچے وا ہوتے ہیں جس سے تازہ ہوا کی گزر ہوتی ہے اور یہ صحت مندی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

☆ ادب میں تبدیلی بھی بہتری اور اضافے کے لیے ہوتی ہے۔ اور یہ تحریکات ونظریات کے پروان چڑھنے اور مختلف سماجی ومعاشرتی تبدیلیوں کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔

☆ اُردو ادب میں ابتدائی دور ہی سے تحریکات ور جحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایہام گوئی، اصلاح زبان، سرسید تحریک اور پھر بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک وغیرہ۔ ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک رہی ہے۔ اس تحریک نے ادب سے وابستہ بیشتر ناقدین، فکشن نگار، شاعر وادیب کو متاثر کیا ہے۔

☆ سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، اعجاز حسین، احتشام حسین، قمر رئیس وغیرہ ایسے ناقدین ہیں جنھوں نے ادب تخلیق کرنے کی راہ کا تعین کیا۔ اُنھوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ ادب کو کیسا ہونا چاہیے اور ادب سے معاشرے میں کتنی بہتری لائی جاسکتی ہے۔ اُنھوں نے ادب سے اصلاح کی اُمید کی اور اِسے سماجی برائیوں کو ختم کرنے کا ذریعہ تصور کیا۔ اس کے لیے اُنھوں نے حتی المقدور کوششیں کیں۔

☆ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں سے ہی فکشن نگار حضرات وخواتین اس سے وابستہ ہوئے۔ پریم چند ایسے کہانی کار ہیں جنھوں نے تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ان موضوعات کو قلم بند کیا جو بعد میں منشور کا حصہ بنے۔ اُنھوں نے اپنی کہانیوں کے توسط سے سماجی ناہمواری کے تدارک کی کوشش کی ہے۔

☆ پریم چند کے بعد علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، سریندر پرکاش وغیرہ نے اس نظریے کو اپنی کہانیوں کے ذریعے عام کیا۔

☆ اچھوت، گیندا، تلادان، ہتک، کالو بھنگی، ابابیل، آنندی اور بجو کا ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ ناقدین اور فکشن نگاروں کی طرح بے شمار شاعروں کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔

☆ مجاز، سردار جعفری، فیض، مخدوم، ساحر، جاں نثار اختر، مجروح، اختر الایمان، کیفی اعظمی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اِن کے کلام نے پورے زمانے کو متاثر کیا اور تحریک آزادی کے متوالوں کے لہو کو مسلسل گرم رکھنے کا کام کیا۔ ان شعرا نے فنی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے موضوعات کو اہمیت دی اور لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

☆ انہوں نے اپنے قارئین کو یہ باور کرایا کہ ظالم کا ساتھ دینا ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ مظلوم کا ساتھ دینا عوام کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کو اُن کے حقوق ملنے چاہئیں۔

☆ سماج سے استحصال کا خاتمہ ہونا چاہیے اور مساوات عام ہونا چاہیے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کی شعری اور نثری دونوں ہی اصناف کو کافی متاثر کیا اور اِس تحریک کے زیر اثر کثیر تعداد میں ادبی نمونے سامنے آئے جو اُردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

24.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
منشور	بنیادی قانون، آئین
فروغ دینا	ترقی دینا
سرگرداں	حیران و پریشان
بانی	بنیاد ڈالنے والا
سعی	کوشش
دانشور	عقل مند
اصطلاح	کسی لفظ کا عام معنوں سے ہٹ کر خاص معنوں میں استعمال
تقلید	پیروی
تعظیم	عزت، قدر و منزلت
تفہیم	سمجھانا
روایت	کسی پرانی چیز کی نقل، حکایت
مرہونِ منت	احسان مند، شکر گزار
استفادہ	فائدہ حاصل کرنا
تمہید	کسی بات کا آغاز
ترجیح	برتری، فوقیت
مفلوک الحالی	افلاس، تباہ حالی
ہم عصر	ایک ہی زمانے کے

24.7 نمونۂ امتحانی سوالات

24.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1۔ ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو'' کس کا قول ہے؟

2۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کسی ایک شاعر کے نام بتائیے؟

3۔ محمد حسن کے تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام کیا ہے؟

4۔ ''آوارہ'' کس کی نظم ہے؟

5۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانسفرنس کہاں ہوئی؟

6۔ جذبی کا پورا نام کیا تھا؟

7۔ ''پرچھائیاں'' کس شاعر کی نظم ہے؟

8۔ نظم ''ایک لڑکا'' کس کی نظم ہے؟

9۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کا صدارتی خطبہ کس نے دیا؟

10۔ کیا منٹو اور عصمت ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے؟

24.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر افسانہ نگاروں کا محاسبہ کیجیے۔

2۔ ترقی پسند تحریک پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ فیض اور مخدوم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔

4۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر شاعروں کا محاسبہ کیجیے۔

5۔ علی سردار جعفری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

24.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کی وضاحت کیجیے۔

2۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ادبا کا محاسبہ کیجیے۔

3۔ مجاز اور سردار جعفری کی شاعری سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

24.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	حسرت سے فراق تک (کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین)	ایم حبیب خاں
2۔	اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
3۔	اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین
4۔	تین ترقی پسند شاعر	علی احمد فاطمی
5۔	تاریخ ادب اُردو	نور الحسن نقوی

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات : ۷۰ Marks: 70 وقت: 3 گھنٹے Time:3 hours

ہدایات:

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے، تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہیں۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہیں۔ **(1x10 = 10 Marks)**

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔

(5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔

(3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال : 1

(i) ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' کس کی تصنیف ہے؟

(a) مولوی عبدالحق (b) سرسید (c) سید عبداللہ (d) مالک رام

(ii) مشہور کتاب ''پنچ تنتر'' کا تعلق ذیل میں کس قسم کے ادب سے ہے؟

(a) اخلاقی ادب (b) سائنسی ادب (c) قانونی ادب (d) مذہبی ادب

(iii) 'ہندوستانی لسانیات' کس کی تصنیف ہے؟

(a) پروفیسر مسعود حسین خاں (b) نصیرالدین ہاشمی (c) محی الدین قادری زور (d) سید سلیمان ندوی

(iv) ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے'' یہ کس کا قول ہے؟

(a) میرامن (b) محمد حسین آزاد (c) حکیم شمس اللہ قادری (d) سر سید احمد خاں

(v) مغربی ہندی میں کتنی بولیاں شامل ہیں؟

(a) پانچ (b) سات (c) تین (d) بارہ

(vi) ہندوستان کے قدیم باشندے کون تھے؟

(a) منگول (b) دراوڑی (c) نگریٹو (d) آریا

(vii) اردو کی پہلی مثنوی کونسی ہے؟

(a) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (b) قطب مشتری (c) مثنوی نوسرہار (d) گلشن عشق

(viii) ولی کس شہر کے باشندے تھے؟

(a) گجرات (b) بیجاپور (c) گولکنڈہ (d) اورنگ آباد

(ix) ''اصلاح زبان کی تحریک'' کس نے شروع کی تھی؟

(a) ناسخ (b) آتش (c) مصحفی (d) انشاء

(x) داستان قصہ مہر افروز دلبر کس کی تصنیف ہے؟

(a) ہری چند مہر (b) شاہ عالم ثانی (c) عطاحسین خاں تحسین (d) عیسوی خاں بہادر

حصہ دوم

2۔ اردو کے ہند آریائی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

3۔ قطب شاہی دور کے شعروادب پر اظہار خیال کیجیے۔

4۔ کسی دو شاعروں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1۔حسن شوقی 2۔شاہی 3۔نصرتی 4۔ہاشمی

5۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی شاعری میں فرق واضح کریں۔

6۔ اردوادب میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت کیوں ہے؟ بیان کیجیے۔

7۔ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

8۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر افسانہ نگاروں کا محاسبہ کیجیے۔

9۔ مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' پر مختصر نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10۔ اردو زبان کے آغاز کے بارے میں مسعود حسین خاں کے نظریے کا خلاصہ پیش کیجیے۔

11۔ شمالی ہند میں اردوادب کے تہذیبی وسماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

12۔ اردوادب کی نشوونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

13۔ ولؔی کے حالات زندگی اوران کے کلام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

14۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔